دلہن نمبر

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

ستمبر 2014

نگران اعلیٰ

معراج رسول

اعتبارِ وفا..... نگہت سیما کا تازہ ناول

شمیم فضل خالق سے دلچسپ باتیں



مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات



شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی ناز ش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: نازیہ علی .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 42 • شمارہ 06 • ستمبر 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



آج کے معاشرے کو ذہانت کا معاشرہ کہا جاتا ہے۔ جو بات بھی ہو جائے اسے کم سمجھا جاتا ہے۔ تیز رفتاری اور باخبری نے فوائد سے زیادہ ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ پہلے ہم زیادہ پرسکون اور پراطمینان انداز میں رہا کرتے تھے اور اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔

اس تیز رفتاری کے عالم میں روایات اور اقدار نے بھی تیزی سے اپنی شکل تبدیل کر لی ہے۔ پہلے روپیہ حاصل کر کے جمع کرنے کا رجحان مقبول تھا۔ اب روپیہ حاصل کرنا تو سماج کی ایک قدر ہے مگر جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اترانے اور اڑا دینے کے لیے۔

اب آپ جتنا زیادہ پیسہ حاصل کر کے خرچ کر سکتے ہیں، اتنے ہی بڑے عزت دار ہیں۔

آپ کا گھر جتنا زیادہ بڑا ہے...... اور جتنی مہنگی اور زیادہ کاریں آپ کے پاس ہیں آپ اتنے ہی بڑے مرتبے کے حامل ہیں، چاہے بے شک آپ کے اخلاق میں کیڑے پڑے ہوئے ہوں اور بات کرنے سے قبل آپ کے لہجے سے تکبر کے بھبکے آتے ہوں۔ یوں اس ''حاصل کرو اور اڑا دو'' کی بڑھتی ہوئی ذہنیت نے ہمارے معاشرے سے صدیوں پرانی ان اقدار کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا ہے۔ جیسے توکل، صبر، برداشت، قناعت اور کفایت شعاری کہتے تھے۔

ہمارے بزرگوں کی بھی لمبی عمروں، قابل رشک صحت اور بھرپور مطمئن زندگی میں بہت بڑا دخل صبر و قناعت کا بھی تھا۔

پہلے لوگ کسی کا حق نہیں مارا کرتے تھے اور نہ ہی دولت کی ہوس کسی بیماری کی طرح ان کے دل و زبان پر حاوی تھی۔ ان کا ایمان تھا کہ جتنا ان کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے...... وہ ان کو مل رہا ہے...... اور ملے گا جس کو دنیا کی کوئی طاقت ان سے نہیں چھین سکتی۔

اور آج ہمیں آپ سے یہی کہنا ہے کہ اپنے رب پر پورا یقین رکھیں...... اس نے جو اور جتنا آپ کے نصیب میں لکھ دیا ہے۔ وہ ایمانداری کے طفیل بھی ضرور ملے گا۔ اس کے لیے نہ ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناجائز انداز میں کچھ حاصل کرنے کے لیے خوار ہونا چاہیے۔

مدیرہ
انجم انصار









علم... معرفت الٰہی

1۔ سر اگر آنسوؤں اور رطوبتوں کا مرکز نہ ہوتا تو خشکی کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور بال اس لیے سر پر ہیں کہ ان کی جڑوں سے تیل (تری) وغیرہ دماغ تک پہنچتا رہے اور بہت سے دماغی ابخرے نکلتے رہیں۔ دماغ گرمی اور زیادہ سردی سے محفوظ رہے۔

2۔ پیشانی بالوں سے اس لیے خالی ہے کہ اس جگہ سے آنکھوں میں نور پہنچتا ہے۔ پیشانی میں خطوط اور شکن اس لیے ہیں کہ سر سے جو پسینہ گرے وہ آنکھوں میں نہ پڑ جائے...... جبکہ شکنوں میں پسینہ جمع ہو تو انسان اسے پونچھ کر پھینک دے۔

3۔ پلکیں اس لیے ہیں کہ آفتاب کی روشنی اسی قدر ان پر پڑے جتنی کہ ضرورت ہے۔ نیز سونے میں مدد دے سکیں۔

4۔ ناک کو دونوں آنکھوں کے درمیان اس لیے رکھا کہ مجمع نور سے روشنی تقسیم ہو کر برابر دونوں آنکھوں کو پہنچے۔

5۔ آنکھوں کو بادامی شکل کا اس لیے بنایا ہے کہ بوقت ضرورت سلائی کے ذریعے سے دوا اور سرمہ وغیرہ اس میں آسانی سے پہنچ جائے۔ چوکور یا گول ہوتی تو سلائی کا اس میں پھیرنا مشکل ہوتا...... دوا اس میں بخوبی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

6۔ ناک کا سوراخ نیچے اس لیے بنایا ہے کہ دماغی رطوبتیں آسانی سے نکل سکیں...... اگر اوپر کو ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی...... اور دماغ تک کسی چیز کی بو بھی جلد نہیں پہنچ پاتی۔

7۔ ہونٹ منہ پر اس لیے لگائے گئے ہیں کہ جو رطوبتیں دماغ سے منہ میں آئیں وہ رکی رہیں اور کھانا بھی انسان کے اختیار میں رہے۔ جب چاہے پھینک دے اور تھوک دے۔

8۔ اگلے دانت اس لیے تیز ہیں کہ کسی چیز کا کاٹنا آسان ہو اور داڑھ کو چوڑا اس لیے بنایا گیا کہ غذا پیسنا اور چبانا آسان ہو......

9۔ ہتھیلیوں پر بال اس لیے نہیں کہ کسی چیز کو چھونے سے اس کی نرمی، سختی اور گرمی اور سردی وغیرہ آسانی سے معلوم ہو جائے۔

10۔ داڑھی مردوں کو اس لیے دی کہ مرد اور عورت میں تمیز ہو جائے۔

11۔ بال اور ناخن میں جان اس لیے نہیں کہ ان چیزوں کا بڑھنا برا معلوم ہوتا ہے تو اس کو کاٹنا ہوتا ہے اگر اس میں جان ہوتی تو کاٹتے ہوئے تکلیف ہوتی۔

12۔ دل صنوبری شکل کا اس لیے ہے کہ بہ آسانی پھیپھڑے میں ہوا داخل ہو سکے...... اور دل اس کی ہوا سے ٹھنڈک پاتا رہے۔

13۔ پھیپھڑوں کے دو ٹکڑے اس لیے ہیں کہ دل ان کے درمیان رہے۔

14۔ جگر محدب اس لیے ہے کہ اچھی طرح معدے کے اوپر جگہ پکڑے اور اپنی گرانی اور گرمی سے غذا کو ہضم کر دے۔

15۔ گھٹنے پیچھے کی طرف اس لیے نہیں جھکتے کہ چلنے میں آسانی ہو...... اگر ایسا نہ ہوتا تو آدمی چلتے وقت گر، گر جاتا......

16۔ دونوں پیروں کے تلوے بیچ سے اس لیے خالی ہیں کہ دونوں کناروں پر بوجھ پڑنے سے بہ آسانی پیر اٹھ سکیں اگر ایسا نہ ہوتا اور پورے بدن کا بوجھ پیروں پر پڑتا تو بدن کا بوجھ اٹھانا دشوار ہو جاتا۔

یہ جوابات سن کر ہندوستانی طبیب حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ آپؓ نے یہ علم کس سے سیکھا؟

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا......

''میں نے علم اپنے دادا سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا اور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سیکھا ہے۔'' اس طبیب نے کہا ''واقعی میں گواہی دیتا ہوں'' کہتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھا...... اور مزید کہا ''آپؒ اس زمانے میں سب سے بڑے عالم ہیں۔''

☆☆☆

تابعین میں ایک معتبر ترین نام ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا...... آپ ایک عظیم الشان فقیہہ اور محدث تھے...... اہل بیتؓ کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا کہنا تھا کہ حدیث وفقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت کے مکتب سے نکلے ہیں۔

ایک بار امامؒ نے فرمایا کہ اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان (ابوحنیفہ) ہلاک ہو جاتا...... ان کا اشارہ ان دو سالوں کی طرف تھا جس میں وہ تحصیل علم کے لیے حضرت امام جعفر صادقؒ کی صحبت میں رہے۔

ایک دفعہ مخالفین اسلام میں سے ایک شخص عالم وفاضل اپنی ایک مذہبی جماعت کو لے کر بغداد پہنچا اور وہاں اس نے اعلان کروایا کہ ''اگر تم لوگ ہمارے چار سوالوں کے جواب دو گے تو ہم یقیناً مسلمان ہو جائیں گے اور اگر تم لوگ جواب نہ دے سکے تو تم کو ہمارا مذہب قبول کرنا ہوگا......'' چنانچہ ایک روز اس نے عظیم الشان مجمع کر کے اس کے درمیان ایک منبر سجایا پھر حاضرین سے خطاب کر کے کہا۔

''تم میں سے کوئی جواب دینے کے لیے تیار ہو تو میں وہ چاروں سوال پیش کروں......'' جس کے جواب میں سب پر ایک سکوت طاری تھا لیکن ایک گوشے سے کسی نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے سوالات کا جواب دوں گا مگر اس شرط پر کہ تم منبر سے نیچے اتر آؤ اور میں منبر پر بیٹھ کر جواب دوں اس لیے کہ تم سائل ہو اور میں مجیب ہوں۔'' یہ سن کر عالم منبر سے نیچے اتر آیا لوگوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان جو ابھی طالب علم ہی ہے اس مجمع میں سے اٹھ کر آیا اور منبر پر بیٹھ گیا اور پھر اس عالم سے کہا۔ ''آپ اپنے سوالات بیان کریں ہم جواب دیں گے۔'' چنانچہ اس نے سوال شروع کیے۔

پہلا سوال...... ''اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟''

آپ نے جواب دیا...... ''اس وقت خدا یہ کر رہا ہے کہ تم جیسے عالم وفاضل کو اس نے منبر سے اتار دیا اور مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو منبر پر بٹھا دیا...... یعنی وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔'' یہ جواب سن کر وہ دم بخود رہ گیا۔

تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا...... ''دوسرا سوال پیش کرو......''

دوسرا سوال...... اس نے دریافت کیا کہ ''خدا کا منہ کس طرف ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر شمع روشن کا منہ بتا دیں کہ وہ کس طرف ہے تو یہی جواب جناب کے سوال کا ہے...... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ قیامت تک شمع روشن کا منہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کس طرف ہے لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لیں کہ روئے ایزدی کی یہی مثال ہے کہ وہ چاروں طرف اپنے نور سے عالم کو منور کرتا رہتا ہے۔'' یہ سن کر وہ بہت نادم ہوا۔

(جاری ہے)

امانت

رفعت سراج

آخری قسط

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دیتا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دُشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر



"روما......! کائناز کے گھر میں شاہ صاحب اور کائناز کے علاوہ تو کوئی نہیں رہتا ناں......؟ میرا مطلب ہے کائناز کا کوئی بھائی یا بہن وغیرہ......؟" برہان اور روما لان میں بیٹھے تھے۔ کائناز اسپتال میں تھی، برہان نے روما سے کہا کہ وہ اپنی بکس لے کر لان میں آجائے۔

نہ جانے کیوں روما کے ساتھ بند ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے خیال سے ہی اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ یہ لڑکی پہلے ہی دن سے اسے بند کتاب لگی تھی اور انتہائی رات کو دو مرتبہ اسے تنہا بیٹھ کر روتے ہوئے بھی دیکھا تھا...... بس جب بھی اس کا دھیان آتا تو بڑی شدت سے احساس ہوتا کہ اس کے اور روما کے درمیان کوئی دردِ مشترک ہے...... وہ بھی اسے اجنبی نہیں لگی۔ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک...... یوں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے چلے آرہے ہوں۔ جبکہ کائناز ہمیشہ کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی محسوس ہوئی۔

"سر......! کائناز بالکل اکیلی ہے...... بس یوں سمجھیں میں ہی اس کی سب کچھ ہوں، بہن، کزن، دوست۔" روما نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اچھا......!" برہان کے لہجے میں بلا کا استعجاب تھا۔

"آپ کو کائناز نے نہیں بتایا کہ اس کا کوئی بہن، بھائی نہیں ہے۔" روما نے بڑی معصومیت سے برہان کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔ برہان فوراً نظریں چرا گیا۔

"پھر وہ کون تھی...... اس کا لباس نوکروں والا نہیں تھا۔" برہان کی آنکھوں کے سامنے سرو قد رابی آ کھڑی ہوئی۔ رائل بلیو بڑا اسٹائلش سا ڈریس، سر پر گرے اسکارف اور چہرہ برہان نے چشمِ تصور سے رابی کو دیکھا تو جھرجھری سی آگئی۔ کیسا عجیب سا چہرہ تھا...... بڑے عجیب سے داغ تھے...... یوں جیسے کسی بچے نے مونالیزا کی پینٹنگ پر آڑا ترچھا برش چلا دیا ہو...... اس نے ایسے عجیب داغوں والا چہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"آپ کے تو اور بہن بھائی ہیں ناں......؟" برہان نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر کسوٹی کھیلنا شروع کی۔

"بھائی نہیں ہے، ایک بہن ہے...... رابی آپا...... بس!" روما نے بدستور بے پروائی سے جواب دیا۔

اب برہان چونک پڑا تھا۔

"اوہ...... تو شاید...... مگر......" وہ پھر الجھا۔

"آپ کی سسٹر میرڈ ہیں؟" برہان نے نہ چاہتے ہوئے پھر سوال کر دیا۔

"نو سر...... اللہ کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے، ان کی شادی ہو جائے۔" روما ایک دم افسردہ نظر آنے لگی۔

"میں آپ کو ان سے ضرور ملواتی مگر ایک مسئلہ ہو گیا تھا۔ وہ اب سوائے ہمارے کسی کے سامنے نہیں آتیں۔" روما سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

اب برہان نے خود کو روک لیا۔ مزید سوال کا مطلب تھا کہ وہ پرسنل ہو رہا ہے۔

"جب ان کی کاسمیٹک سرجری ہو جائے گی تو میں انہیں آپ سے ملواؤں گی۔" روما نے آئندہ کے لیے وعدے وعید کرنا شروع کر دیے۔

"اوہ...... تو پھر وہی ہو گی۔" کاسمیٹک سرجری کا اشارہ ملا۔ کسوٹی مکمل ہوئی۔ گویا اس نے بوجھ لیا۔

اس نے روما پر ایک غیر ارادی نگاہ ڈالی پھر نوٹ بک اٹھا کر پوائنٹس دیکھنے لگا جو روما بطور ہوم ورک کر کے لائی تھی مگر اب وہ دیانتداری سے اپنا فریضہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ ذہن کسی ایک نکتے پر مرکوز ہی نہیں تھا۔

روما اپنا پریکٹیکل جرنل کھول کر برہان کو نہ جانے کیا دکھانا چاہ رہی تھی۔ بار بار صفحات الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ خاموشی سے بڑی پناہ و عافیت کیا ہو گی۔ برہان کے لیے روما کی مصروفیت ڈھال تھی۔ آگ اور پھونس کا کھیل ایسی بے لگام تنہائی میں ہی شروع ہو سکتا ہے۔ برہان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اٹھ کر چل دیا۔ روما حیرت سے سر...... سر کہتی رہ گئی۔

☆☆☆

"کیوں آئے ہو......؟" برہان، جابر علی کے سامنے کھڑا تھا۔ جابر علی پولیس یونیفارم کے بجائے قیدی کے یونیفارم میں تھا سر پر جالی کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، داڑھی گھنی اور دراز ہو چکی تھی۔ اس کی شرٹ پر 107 کا ہندسہ نقش تھا۔ چہرے پر خشونت، آنکھوں میں نفرت تھی۔ جیسے بیٹے کو نہیں دشمن کو دیکھ رہا ہو۔

"آپ نے ضمانت کے لیے ہمارا احسان لینے سے انکار کر دیا تھا... اور اس کے بعد ہمیں سمجھ نہ آئی کہ کیا کریں...... معافی مانگنے آیا ہوں۔" برہان کال کوٹھری کی سلاخیں پکڑے سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

"مجھے دنیا داروں کا احسان نہیں چاہیے...... مادّہ پرستوں کی اس دنیا پر تھوک دیا ہے میں نے...... تم نے ایک رئیس آدمی کی پوتی سے شادی کر کے مجھ پر مزید ظلم کیا ہے۔ آج کے دور میں جب تک انسان حرام، حلال اکٹھا نہ کرلے، رئیس نہیں بن سکتا۔" جابر علی نے حقارت سے برہان کی طرف دیکھا۔

"آپ کا بیٹا ہوں...... شادی نہیں کی احسان اتارا ہے...... اور اس شادی کی ذمّے داری بھی آپ پر ہے۔ صرف وارث علی کی وجہ سے ہم اپنا گھر چھوڑ کر نکلے اور کسی کے گھر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ آخر اس احسان کا بوجھ تو اتارنا تھا ناں......" برہان اسی طرح سر جھکائے مؤدبانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ہاں جب دوزخ میں جاؤ گے تب بھی یہی کہنا کہ باپ کی وجہ سے دوزخ میں آئے ہیں...... بس سارا کچرا میرے سر پر پھینک کر صاف ستھرے ہو جاؤ۔ تم کیا سمجھ رہے ہو...... مجھے پھانسی لگنے والی ہے، میں مرنے والا ہوں۔ نہیں، میں جامِ شہادت نوش کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے ظلم اور بد دیانتی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ کبھی نماز قضا نہیں کی، اپنے ہوش میں کبھی روزہ نہیں چھوڑا...... پولیس ڈپارٹمنٹ میں ٹیبل پر رکھی ہوئی مٹھائی نہیں کھائی۔ کامیاب ریڈ پر پھولوں کا ہار نہیں پہنا......" جابر علی متکبرانہ انداز میں اپنی نیکیاں گنوا رہا تھا۔

برہان نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا۔

"اللہ کے ایک نیک بندے نے ہمیں بتایا ہے کہ بہترین تقویٰ وہ ہے جو چھپایا جائے۔ ہر انسان نیک عمل اپنے لیے کرتا ہے۔" برہان کہے بنا رہ نہ سکا۔

"تم دنیا داروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہو...... اور دنیا داروں کے پاس دین کا علم نہیں آسکتا، تم اپنی معلومات اپنے پاس رکھو...... خدا حافظ......"

"وہ شبینہ آپ سے ملنا چاہتی ہے...... کل میں اسے لے آؤں......؟" برہان نے پوچھا۔

"پہلے باپ سے ملنے کا خیال نہیں آیا...... ماں کے کہنے پر چل رہی تھی۔ اب کوئی مجھ سے ملنے نہ آئے۔" جابر علی نے صاف منع کر دیا۔

☆☆☆

"آپ یہاں بیٹھے ہیں...... میں نے سارا گھر چھان مارا۔" کائناز اسے تلاش کرتی ہوئی شاہ عالم کی اسٹڈی میں آگئی تھی۔

برہان نے چونک کر خالی، خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ مجھے تو آپ ڈپریسڈ دکھائی دے رہے ہیں۔ خیریت ہے ناں......؟'' کائناز اس کے اندازِ نظر سے پریشان ہوگئی۔

''ارے نہیں...... اس او کے...... ویسے ہی اباجان کا خیال آ گیا تھا۔ انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''اوہ گاڈ...... اب بس بھی کریں...... چلیں اٹھیں...... آج اتنی important بزنس پارٹی ہے...... بہت اچھی طرح تیار ہونا ہے آپ کو......'' کائناز، برہان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔

''میرا موڈ نہیں ہے...... تم روما کو لے کر چلی جاؤ۔'' برہان نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''وہ رابی آپا کے پاس اسپتال میں ہے۔ ورنہ آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چلیں اٹھیں ناں......''

کائناز نے پھر ہاتھ پکڑ کر کھینچا تانی کی۔

''سوری کائناز...... I'm not feeling well!'' برہان ہاتھ چھڑا کر لائبریری سے جانے لگا۔

''پتا ہے مجھے...... آپ کو تو ویسے بھی دو بیویوں کو ساتھ لے جاتے ہوئے شرم آتی ہے......'' اب کائناز برا سامنہ بنا کر بولی تھی۔ برہان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چلا گیا، کائناز دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''دماغ تو ٹھیک ہے...... آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟'' برہان کے سر پر تو گویا ایک زبردست دھماکا ہوا تھا۔

''آخر اس کا کیا بنے گا......؟'' میں اس کے لیے نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا...... باپ تو اس کا تھا نہیں اب تو اس کی اماں جان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ خالہ جانی ہر وقت بیمار رہتی ہیں...... رابی آپا کو نشے نے اسپتال پہنچا دیا ہے...... ذرا سوچیں تو......''

''ہاں تو ٹھیک ہے اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرتے ہیں...... اخبار میں ایڈ دیتے ہیں، آفس میں بات کرتے ہیں۔''

روما کا نام لے کر کائناز نے ایک قیامت برپا کر دی تھی...... زندگی کا پہلا اور آخری حسین خواب...... جس نے برہان کی پوری زندگی کا احاطہ کر لیا تھا...... اس خواب کی تعبیر اس انداز میں سامنے آئے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

''زندگی کو ایک مذاق سمجھ لیا ہے تم نے...... اگر اتنا ہی شوق ہے نیک کام کرنے کا تو برابر طریقے سے کوئی ویلفیئر آرگنائزیشن بنا لو...... اس طرح صرف روما کا نہیں بے شمار لوگوں کا بھلا ہوگا۔''

''آپ کا کوئی بھائی ہوتا تو میں زبردستی روما کی شادی اس کے ساتھ کرا دیتی مگر آپ کے پیرنٹس تو بہت کنجوس نکلے...... جن کے ہاں تین بچے پیدا ہو سکتے ہیں تو پانچ چھ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔''

برہان چکرا کر رہ گیا تھا۔ کائناز بڑے تسلسل سے حملے کر رہی تھی۔ اس کی فطری بے ساختگی جو کمال کی مقناطیسیت رکھتی تھی اب ایک طوفانِ بلاخیز دکھائی دیتی تھی۔ اگر عقل کی حد ہو سکتی ہے تو حماقت کی بھی ہونی چاہیے۔

''دیکھو کائناز کوئی بیوی مذاق میں تو اپنے شوہر سے اس طرح کی بات کر سکتی ہے مگر سنجیدگی کے موڈ میں...... ہرگز نہیں کر سکتی......'' برہان کا اپنا ذہن اور فراست اسے باور کرا رہی تھی کہ مارے جوش و جذبات کے وہ کچھ کہہ بیٹھی ہے...... چند گھنٹوں بعد اپنی باتوں پر غور کرے گی تو سمجھ آ جائے گی۔

''تو پھر آپ بتائیں کہ کہاں جائے وہ......؟ کیا ساری زندگی پاگلوں کی خدمت کرتی رہے......؟ اس

نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ جب سے پیدا ہوئی ہے بس رو رہی ہے۔ آپ کو اس پر ترس نہیں آتا......؟'' کائناز اب چلا کر بولی تھی۔ برہان اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''اس شہر میں ہزاروں لڑکیاں ایسی ہوں گی جن پر رحم کھانا چاہیے...... سب سے نکاح پڑھوا دو میرا......''

وہ اب بھی بڑے تحمل سے اسے ناپختہ ذہن تسلیم کرتے جواب دے رہا تھا۔

''تو پھر آپ مجھے چھوڑ کر اس سے شادی کر لیں...... میں دوست کی خاطر یہ قربانی دینے کو تیار ہوں...... اب بولیں......'' کائناز نے پھر غبارے میں بارود بھر کر اڑایا...... برہان نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ارے قربانی کا اصل جانور تو میں ہوں...... خبردار جو میرا ٹائٹل چھیننے کی کوشش کی...... چلو بیڈروم میں، میں تمہارا بی پی چیک کرتا ہوں......'' اس نے کائناز کا ہاتھ تھام کر قدم بڑھائے۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ...... آپ تو بے حس ہیں کسی کے دکھ کا احساس تک نہیں......'' کائناز نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور برہان سے پہلے اسٹڈی سے نکل گئی۔

برہان، شاہ عالم کی یادگار رائزی چیئر پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

''مجھے تمہارے اس دکھ کا احساس ہے کائناز جو تم اپنے ہوش و حواس میں مفت میں خریدنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میری اس خوشی کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہو جس سے میں دست بردار ہو چکا ہوں...... شاہ صاحب کا احسان بہت بڑا تھا۔ میری محبت کے قدموں تلے تو زمین ہی نہیں تھی۔''

روما اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی...... تاریک دنوں میں کبھی یہی روشنی کی کرن تھی۔ جو اب کالی آندھی بن کر چھا رہی تھی۔

☆☆☆

پرانے وقتوں کی ایک کہاوت ہے کہ سوکن تو چون (آٹے) کی بھی بری ہے...... مطلب یہ ہے کہ کسی نے آٹے کا پتلا بنا کر عورت سے مذاقاً کہا یہ تیری سوکن ہے تو عورت غصے اور حسد سے پاگل ہونے لگی۔

''یہ بچوں والی باتیں ہیں بیٹا...... عقل سے بہت دور کی باتیں......'' گل جان یہ کہہ کر ان ہیلر سے اپنی کھانسی رفع کرنے کی کوشش کرنے لگی...... اور تین چار مرتبہ پمپ کر کے گم صم بیٹھی کائناز کی طرف دیکھا۔

''کوئی کام جو پہلے کبھی نہیں کیا گیا ہو...... کبھی نہ کبھی تو ہو سکتا ہے ناں...... مجھ سے روما کی اداسی نہیں دیکھی جاتی...... میں اپنا سب کچھ اسے دے کر صرف اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔'' کائناز سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔

''کوئی ماں سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے بھلا؟ جو بچے کو جنم دینے کے فوراً بعد سے ہی بہت حسین خواب دیکھنے لگتی ہے۔ اور ہر خواب اس کے بچے کی خوشی سے شروع ہو کر اسی کی خوشی پر ختم ہوتا ہے۔'' گل جان بہ مشکل اپنی سانسوں کو ہموار کر رہی تھی۔

''تو پھر آپ صرف روما کی خوشی دیکھیں، میری طرف نہ دیکھیں...... ماں بن کر خود غرضی دکھائیں......''

کائناز برجستہ بولی۔

''کسی کام کو شروع کرتے وقت اس کے نتیجے پر بھی نظر رکھنی چاہیے...... اسی کو عقل مندی کہتے ہیں......''

گل جان نے کائناز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت پیار سے دیکھا...... اسے کائناز پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔

ایک ماں کو وہ آنکھیں دنیا کی سب سے حسین آنکھیں دکھائی دیتی ہیں جو اس کے بچے کو پیار سے دیکھتی ہوں۔

''میں روما سے کبھی jealous نہیں ہو سکتی...... مجھے اس سے زیادہ پیارا کوئی نہیں ہے۔ برہان بھی نہیں ہے۔ خالہ جانی میں نے برہان سے لو میرج نہیں کی ہے...... یہ شادی تو دادا جان کی مرضی سے ہوئی تھی...... مجھے تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دادا جان سیریس بیمار تھے، میں ان کو دکھ نہیں دے سکتی تھی اس وقت تو وہ مجھے زہر کھانے کو بھی کہتے تو میں کھا لیتی۔ یقین کریں میں نے تو ابھی تک برہان کو ذہنی طور پر شوہر کی حیثیت سے قبول ہی نہیں کیا ہے۔ وہ سامنے ہوتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ کہیں گے چلو گُبک کھولو...... آج کا لیکچر دکھاؤ......'' یہ کہہ کر کائناز بے معنی سا مسکرانے لگی۔ گل جان بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''ترکے، وراثت کی بحث تب شروع ہوتی ہے جب پلے کچھ ہوتا ہے۔ ننگی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا......؟'' گل جان تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

''ابھی سامنے سوکن نہیں ہے تو سب کچھ آسان لگ رہا ہے۔ مگر یہ آسان نہیں ہے بیٹا...... تم روما کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرو...... دو چار لوگوں سے میں نے بھی کہا ہوا ہے...... اللہ مالک ہے۔ رابی نے تو مجھے ساری ذمے داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔'' گل جان کا لہجہ بے حد شکستہ تھا۔

☆☆☆

''آپا...... آخر آپ کو مسئلہ کیا ہے۔ زندگی دھوئیں میں اڑانے کے لیے نہیں ہے۔'' روما نے رابی کی انگلیوں سے سگریٹ چھین لی تھی۔

''تم میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے والی کون ہوتی ہو......؟ زیادہ ڈاکٹر صاحبہ بننے کی کوشش نہ کرو۔'' رابی نے روما کی انگلیوں سے سگریٹ جھپٹتے ہوئے غضبناک ہو کر کہا۔

''آپا نشے کا مطلب خود کشی ہے......'' روما نے آنسو پیتے ہوئے بڑی بے بسی سے کہا تھا۔

''نہیں...... نشے کا مطلب ہے جو قریب ہے وہ دور ہو گیا ہے جو دور ہے قریب ہو گیا ہے...... دنیا کی دوزخ، جنت میں بدل گئی ہے۔ جنت ہتھیلی پر آ گئی ہے۔ دشمن مر کھپ گئے ہیں، پیارے پھول ہاتھ میں لیے پاس بیٹھے ہیں۔''

یہ کہہ کر رابی نے سگریٹ کا کش لے کر زبردست قہقہہ لگایا اور اسے اُچھو لگ گیا...... کھانس، کھانس کر وہ دُہری ہونے لگی۔

☆☆☆

بڑے سے لان میں دیوار کے ساتھ بہت خوب صورت سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ بیس، پچیس کے قریب راؤنڈ ٹیبل لگی ہوئی تھیں۔ اونچے، اونچے درختوں پر چراغاں تھا...... پودوں کی کیاریوں کے ساتھ، ساتھ لگی ہوئی روشنیاں بہت حسین نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ شاہ عالم کی پوتی کی شادی پر شہر کی اشرافیہ مدعو تھی۔ ساری زندگی شاہ عالم سب کی خوشیوں میں شرکت کرتے رہے۔ اب انہوں نے اپنی خوشی پر جس کو بلایا وہ چلا آیا گویا اشارے کا منتظر تھا۔ برہان اور کائناز آراستہ صوفے پر دولھا، دلہن کے روپ میں بیٹھے تھے، سب مہمان اس کپل کو سراہ رہے تھے۔ چاند، سورج کی جوڑی کہہ رہے تھے۔ روما اور صابرہ اسٹیج پر موجود تھیں۔ احمر، فائزہ بھی اپنے والدین کے ہمراہ اس تقریب میں شریک تھے اور بڑے قیمتی تحائف لائے تھے۔ اسٹیج کے بائیں جانب رکھی بڑی سی ٹیبل پر تحائف کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ شبینہ انہی کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔

پروفیشنل فوٹو گرافر دولھا، دلہن کے یادگار پوز سلولائڈ پر منتقل کر رہا تھا۔

عین اسی وقت رابی نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ وہ اپنے خوب صورت چہرے کے ساتھ سب کو حیران کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے بغیر اطلاع دیے آئی تھی مگر باہر ہی کاروں کی لمبی قطار نے اسے حیران کر دیا تھا...... برا خیال اس لیے نہ آیا کہ گھر پر چراغاں تھا۔ حیرانی تو تھی...... پریشانی نہیں تھی۔ وہ حیران کرنے آئی تھی اب خود حیران ہو کر لب بستہ کھڑی تھی۔ ذرا آگے بڑھی تو اتنا پیچھے چلی گئی کہ وجود عدم ہو گیا...... یوں جیسے وہ پیدا نہیں ہوئی...... اور اس زمانے میں ٹھہر گئی جہاں عدم وجود ہونے کا منتظر ہوتا ہے...... صدائے کُن پر سماعت چوکس ہوتی ہے۔

برہان سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس گلے میں تازہ سرخ گلابوں کا ہار پہنے کائناز کے شانوں کو تھامے فوٹو گرافر کی ہدایت کے مطابق کوئی پوز بنا رہا تھا۔ آتشیں سرخ عروسی لباس میں کائناز غضب ڈھا رہی تھی۔ شادی کا اہتمام گھر پر ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے خاندانی ہیرے جواہرات کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔

اس لیے وہ آج کے دور کی سب سے زیادہ دیکھی اور پسند کی جانے والی دلہن بن گئی تھی۔ آرٹیفشل جیولری پہنی ہوئی دلہن کی پچاس فیصد اٹریکشن تو ویسے ہی کم ہو جاتی ہے۔

اکثر خواتین دلہن کو خاص طور پر جب قریب سے دیکھتی ہیں تو ان کی خصوصی دلچسپی کی وجہ اس کا پہنا ہوا اصلی زیور ہوتا ہے۔

کائناز تو اپنی ماں اور دادی کے نادر قسم کے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ مہمان خواتین نے اس کی پہنی ہوئی جیولری میں بے حد دلچسپی لی تھی۔

آج کل تو سونے کے نقلی زیورات کی بھی بھرمار ہے مگر خواتین زیور کو تاڑنے میں قیامت کی نظر رکھتی ہیں۔

اسی لیے اسٹیج پر چڑھنے، اترنے کا سلسلہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رابی سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

میری بربادیوں کو تیری صورت تو نہیں کہتے
غمِ ہستی کو بیدادِ مشیّت تو نہیں کہتے
وہ وعدہ جو غریبوں کی تسلی کا بہانہ ہے
اسی وعدے کو یارب باغِ جنت تو نہیں کہتے
ریاضِ خلد سے نکلا تھا آدم جس کی برکت سے
عدمؔ اس حادثے کو آدمیت تو نہیں کہتے

''تمہاری ماں کا نام آسیہ تھا...... اسی نے تمہارا نام رابعہ رکھا تھا۔ بی بی جان نے تمہیں رابی کہنا شروع کیا تو پھر یہی تمہارا نام ہو گیا۔ وہ ایک رئیس کی اکلوتی بیٹی تھی...... اس نے اصیل خان کے ساتھ کاروباری شراکت کی تھی۔ جب وہ ایک ناسمجھ میں آنے والی بیماری میں مبتلا ہوئی تو اصیل خان نے اس پر اپنی محبت کا جال ڈال کر گھیر لیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد مر جائے گی...... اور اس کی بے حساب دولت اصیل خان کو مل جائے گی......'' گل جان آہستہ، آہستہ یوں بول رہی تھی جیسے لکھا ہوا پڑھ کر سنا رہی ہو...... رابی اس کے زانو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ گل جان کی انگلیاں بڑی نرمی سے اس کے گھنیرے بالوں میں متحرک تھیں۔

''لیکن آپ تو بتاتی ہیں میرا باپ تو خود جاگیردار تھا۔ پھر انہیں کسی عورت کی دولت حاصل کرنے کی ضرورت تھی؟'' رابی نے غور سے گل جان کا چہرہ دیکھتے ہوئے الجھ کر سوال کیا۔

''جس کے پاس دولت ہوتی ہے اسی کو تو مزید دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دولت لمبی، لمبی امیدوں میں الجھا دیتی ہے...... موت کو بھلا دیتی ہے۔ قیامت تک زندہ رہنے کی دیوانگی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جب جائز ناجائز دولت کے ڈھیر لگ جاتے ہیں تو انسان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ عقل مایوس ہو کر اپنا راستہ لیتی ہے۔ عیاش، لالچی ہوتا ہے، لالچی محروم ہوتا ہے...... مگر اسے اپنی محرومی کا اندازہ تب ہوتا ہے جب وہ سب سے بڑے نقصان سے گزر جاتا ہے۔''

''پھر میری ماں مر گئی...... میرے باپ کو اس کی ساری دولت مل گئی ہے'' رابی نے بے تابی سے آگے جاننے کی غرض سے سوال کیا۔

''ہاں...... وہ علاج کے لیے باہر گئی تو پتا چلا اسے کینسر ہے...... ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے...... مگر معاملہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ بچہ ضائع کرنا بہت بڑا خطرہ تھا......''

''کاش ضائع کر دیا ہوتا۔'' رابی نے بے ساختگی سے قطع کلامی کی۔ گل جان کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے اس نے جھک کر رابی کی پیشانی چوم لی۔

''اگر اس وقت اصیل خان کا بس چلتا تو واقعی ضائع کرا دیتا۔'' گل جان کے لہجے میں گہرے دکھ کی چیخ تھی۔

''بی بی جان لندن سے واپس آئیں تو تم دو سال کی ہو چکی تھیں۔ بی بی جان کے آنے کے آٹھ مہینے بعد میں نے روما کو جنم دیا۔ اس وقت اصیل خان اور بی بی جان کی شادی ہو چکی تھی اور یہ کہانی تو میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ تم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ روما غیر نہیں تمہاری اپنی سگی بہن ہے، بس ماں دوسری ہے۔''

☆☆☆

''جب میری شادی ہونے والی تھی تب تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا......؟'' مہر جان، گل جان کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ رہی تھیں۔

''کیسے بتاتی، اصیل خان تو اجنبی بن گیا تھا......'' گل جان خوف اور دکھ سے بری طرح رو رہی تھی۔

''اس کا پول کھول دیتیں تو میں اس پر تھوکتی بھی نہیں۔'' مہر جان کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔

''شادی میری ہوئی ہے، بچہ تم پیدا کرو گی...... شکر ہے یہ سب دیکھنے کے لیے بابا زندہ نہیں ہیں۔ میرے خدایا...... اتنا بڑا دھوکا!'' مہر جان صدمے سے پاگل ہو رہی تھیں۔

''آپ مجھ پر تھوکیے...... میں نے امانت میں خیانت کی ہے۔ خدا کی قسم وہ رو، رو کر مجھ سے کہتا تھا کہ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ یہ بچپن کی منگنی تو اس کے لیے بہت بڑا عذاب بن گئی ہے۔ مہر جان سے اس نے کبھی محبت نہیں کی۔''

''وہ شراب پی کر یہ سب کچھ تم سے کہتا ہوگا۔ عموماً نشے میں دُھت ہو کر لوگ یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ سچ مچ رو بھی پڑتے ہیں...... مگر تم عقل کی اندھی تمیز ہی نہیں کر سکیں۔ اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو تم اصیل خان کی محبت میں اور کیا، کیا کر سکتی ہو......؟ چلو میں اس سے خلع لے لیتی ہوں، تمہاری شادی کرا دیتی ہوں۔ یہی کر سکتی ہوں ناں......؟'' مہر جان کے اعصاب مردوں کی طرح مضبوط تھے۔ وہ بہت ہمت سے خود کو سنبھال کر گل

جان سے بات کر رہی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ اصیل خان کی دھوکے بازی نے انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے لیے تو یہ ایسا ہی تھا جیسے ہمالیہ کی تہ میں بھڑکتا ہوا آتش فشاں......

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، میں اس فراڈیے سے شادی کروں گی۔ جس نے میری آنکھوں کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کر شادی کر لی کہ میں چاچاجی کی روح کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔'' گل جان یہ کہہ کر بھل، بھل رو پڑی۔

''اصیل خان سے تو میرا ہر رشتہ آج کی تاریخ میں ختم ہو گیا۔ وہ میرا کچھ نہیں لگتا...... مگر میں اپنی عزت کو چوک پر نیلام نہیں کر سکتی۔ ڈیڑھ مہینہ پہلے ہزار مہمانوں کے سامنے وہ میرا شوہر بنا ہے۔ میرا باپ عزت اور بھرم بناتے، بناتے دنیا سے چلا گیا۔ اللہ نے انہیں بیٹا نہیں دیا تو انہوں نے اپنی انا کی خاطر مجھے اپنا جانشین سمجھ لیا...... صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کی بیٹی برادری کے سو بیٹوں پر بھاری ہے۔ مجھے لندن تک جانے کی اجازت دے دی۔ میں تو بھرم بنا کر رکھوں گی ناں میری مجبوری ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اندر سے تو تم دونوں نے مجھے مار دیا ہے...... ختم کر دیا ہے۔'' مہر جان کا لہجہ سپاٹ تھا...... وہ خیمے جل جانے کے بعد صرف راکھ اُڑنے کا مشاہدہ کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

''روما کا کیا بنے گا...... روما کا کیا بنے گا...... ارے بھئی یہ فکر اس کی خالہ کو ہونی چاہیے۔'' برہان نے عاجز آ کر کہا تھا۔

''اب میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ جسے آپ روما کی خالہ سمجھتے ہیں وہی روما کی سگی ماں ہیں... پر روما ان کی ناجائز بیٹی ہے۔ جس کا باپ لاپتا ہو اس سے کون شادی کرتا ہے؟ اس کا کوئی قصور نہیں مگر دنیا تو اسے اس کے ماں، باپ کے کیے کی سزا دے گی ناں...... یہی ہوتا چلا آیا ہے۔'' کائناز بول رہی تھی اور برہان دم بخود اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

''ناجائز بیٹی......؟'' دو لفظ بازگشت بن کر رہ گئے۔

''باپ اوروں کے لیے لاپتا و بے نشان ہوگا...... روما کی ماں کو تو پتا ضرور ہوگا اس ظالم کا......'' چند لمحوں بعد خود کو سنبھال کر کسی خیال میں کھو کر وہ بے ساختہ گویا ہوا تھا۔

''اگر پتا.... بھی ہے تو کیا ہوگا، کیا وہ دنیا کے سامنے آ کر کہہ دے گا یہ میری بیٹی ہے؟'' کائناز تڑ کی بہ تڑ کی بولی تھی۔

''تم تو اسکالر ہو گئی ہو......؟'' برہان نے ستائشی نظروں سے کائناز کی طرف دیکھا تھا۔

''اچھا بس چھوڑیں...... بتائیں کر رہے ہیں روما سے شادی......؟'' کائناز پر برہان کی تعریف و توصیف کا کوئی اثر نہ ہوا۔

''شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے پر میرا تو نہیں ہوا ناں......؟''

''چلیے یہی سہی...... ایک بیوی پاگل ہے تو دوسری سمجھدار لے آئیں...... ویکینسی تو نکل آئی ناں۔'' کائناز پوری تیاری کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ برہان نے اب غور سے کائناز کی طرف دیکھا۔ فیروزی، کاسنی اور زرد رنگوں کے امتزاج سے تیار بہت خوب صورت جدید اسٹائل کے چوڑی دار کرتے پاجامے میں ملبوس بڑی.... بے نیازی سے خود میں مگن چوٹی میں بل ڈال رہی تھی۔ چہرے پر کوئی الجھن، تردد یا سوچ کا تاثر نہیں تھا۔ بس ایک

بچے کی سی ضد کا عکس آنکھوں سے مترشح تھا۔

برہان نے ایک گہری سانس لی اور کائناز کے عین مقابل آکر کھڑا ہوگیا اور آہستہ سے اس کی ٹھوڑی اپنی انگلی سے چھو کر چہرہ اونچا کیا۔

"میری زندگی میں کوئی دوسری عورت آجائے گی تمہیں کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا؟"

"دوسری عورت نہیں...... صرف روما...... جس کے لیے میں بڑی سے بڑی قربانی بھی دے سکتی ہوں۔" کائناز نے خفا، خفا لہجے میں جواب دیا۔

"ذرا تصور کرو...... میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بند بیڈروم میں ہوں اور تم کسی اور کمرے میں تنہا...... بالکل اکیلی...... ایسے میں کیا سوچو گی بھلا؟"

"یہی کہ اس وقت روما کتنی خوش اور ریلیکسڈ ہے۔"

"تمہارے شوہر کے ساتھ......؟" برہان نے بات کاٹ کر برجستہ کہا۔

"آپ میرے زبردستی کے شوہر ہیں...... accidently husband" کائناز اپنے مخصوص بے دھڑک انداز میں کہہ گئی۔

برہان لاشعوری طور پر بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"دادا جان نے تمہیں پریشرائز کیا تھا......؟" اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ احسان مندی کے ہاتھوں فروخت ہوگیا...... خواب کا ایک محل چند دنوں پہلے ہی تعمیر ہوا تھا...... اور سارے دروازے کھڑکیاں، روشن دان بند کرنے پڑ گئے...... بلکہ محل کے چاروں طرف فلک بوس دیواریں اٹھا دیں...... تاکہ کوئی اندر جھانک بھی نہ سکے...... "اور یہ، یہ کیا کہہ گئی...... کیا اسے پتا ہے کہ اس نے کیا کہہ دیا......؟" برہان کی ہستی کسی طوفان کی زد میں ہچکولے کھانے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں...... مدر ٹریسا کوڑھیوں کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت کرتی تھیں' آپ انسانیت کے ناتے اتنا بھی نہیں کر سکتے......؟" کائناز نے بڑے بے ڈھنگے پن سے دلیل دی۔

"اوہ...... تو یہ انسانیت کی خدمت ہے......" برہان اور کائناز میں ذہنی لحاظ سے زمین، آسمان کا فرق تھا...... ذہنی ناپختگی ہی تو تھی جو وہ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ گئی تھی۔

برہان کو اسے اکثر شاہ عالم کے انداز میں ٹریٹ کرنا پڑ جاتا تھا...... مگر اس وقت بڑی بے بسی کی سی کیفیت تھی۔

"ذرا غور کریں سوچیں...... کون آئے گا اس سے شادی کرنے......؟" کائناز بری طرح جھنجلا کر کہہ رہی تھی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے زندگی کا مقصد صرف شادی ہی نہیں...... اس سے بھی ضروری کام ہیں جو اپنی زندگی میں کر لینا چاہئیں...... اسے کسی حقیقی این جی او کی سربراہ بنا دو...... انسانیت کی خدمت کا اس سے بہتر راستہ کوئی نہیں...... فنڈز اکٹھے کرے گی، گاؤں دیہات میں اسکول' اسپتال بنوائے گی۔ بے سہارا لوگوں کے لیے شیلٹر ہوم بنوائے گی...... سیلاب زدگان کی مدد کرے گی۔"

"اچھا بس کریں' اس میں اتنا ٹیلنٹ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ سر پھوڑتی......؟" کائناز اب زور سے بولی تھی۔

"آہستہ...... زبردستی کا شوہر ہوں...... مگر شوہر ہوں...... تم میرے پاس دادا جان کی امانت ہو...... تمہاری بے وقوفیاں برداشت کرنا میری اخلاقی ذمے داری ہے۔" اس سے قبل کہ کائناز پھر کچھ بولتی برہان

کمرے سے باہر چلا گیا۔

"سیلفش انسان...... کسی کے دکھ تکلیف کا احساس نہیں......" کائناز بری طرح بھنا رہی تھی۔

اسے احساس نہیں تھا کہ بے دھڑک انداز میں ایک راز کا انکشاف کر کے اس نے برہان کو کس ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا ہے۔

☆☆☆

رابی آئینے کے سامنے کھڑی خود کو بغور دیکھ رہی تھی۔ میرون ٹی شرٹ، بلیک وگرے کے امتزاج سے تیار اسٹائلش جینز...... کندھوں سے اونچے سیاہ چمک دار بال جو گالوں کی طرف قدرے خمیدہ تھے۔ اس کی ستواں ناک میں ڈائمنڈ کی لونگ چمک رہی تھی جو کسی وقت گل جان نے اصرار کر کے پہنائی تھی۔ چہرے کی سفیدی میں سندوری جھلک تھی۔ اس نے اپنے حسن و جمال کا جی بھر کر نظارہ کیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے روشن چہرے کے سوا ہر سو تاریکی ہے۔ ایک روپہلی روشنی کے تعاقب میں وہ دیوانہ وار دوڑتی یہاں تک پہنچی تھی مگر...... اِک آن میں وہ روپہلی روشنی غائب ہوگئی اور وہ ٹھوکریں کھانے لگی۔

کوئی اتنے جتن کے بعد بھی خالی...... کوئی جھولی بھر کر آنچل بھی بھر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کی انا نے کبھی اسے آنسو بہانے نہیں دیا...... غصے کی آگ میں اتنی شدت ہوتی تھی کہ روح میں اترنے والی ہر نمی بھاپ بن کر اڑ جاتی تھی۔

"برہان...... تمہیں تو شاید میرا نام بھی نہیں معلوم...... اور میں تمہارے سائے سے لپٹ گئی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے...... اتنا خوف ناک خیال تو کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ تم کائناز کے ہوگئے...... میں تمہارے قدموں کے نشان گن رہی ہوں' وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

"رابی نشہ کرنے لگی ہے، پہلے پہل تو میں سمجھی کہ وہ لندن سے خراب ہو کر واپس آئی ہے، سگریٹ پینے لگی ہے۔ لیکن کل رات وہ نشے میں میرے پاس آگئی اور پتا نہیں کیا، کیا الٹی سیدھی بولنے لگی۔ ساری رات پلک نہیں لگی۔ اب یہ کسر باقی رہ گئی تھی۔" گل جان کی بات کا اختتام آنسوؤں پر ہوا۔

روما شدید صدمے کی کیفیت میں گنگ بیٹھی تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے وہ لندن سے یہ لت لگا کر آئی ہے۔ آزادی مل گئی تھی ناں......" گل جان روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں خالہ جانی...... آپا بالکل ٹھیک واپس آئی تھیں۔ مجھ سے لندن کی بہت باتیں کی تھیں...... میں خود رات کو ان کے کمرے میں جاتی تھی۔ وہ بہت چپ، چپ سی تو لگتی تھیں مگر میں نے انہیں کسی وقت بھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔" روما نے گل جان کے خیالات کی یکسر تردید کی تھی۔

"میں مان ہی نہیں سکتی...... تمہارے سامنے احتیاط کرتی ہوگی...... مگر یہ ایسی بات ہے کہ کوئی کتنا بھی چھپانے کی کوشش کرے چھپ نہیں سکتی......" گل جان پر روما کی تردید سے کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کل تو وہ بہت روئی...... جو کچھ اس کے دل میں تھا زبان پر آگیا...... سب کچھ کہہ بیٹھی۔ وہ باتیں جو شاید ہوش میں کبھی نہیں کہتی۔"

"مثلاً؟" روما نے حق دق ہو کر گل جان کی شکل دیکھی۔

گل جان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''وارثت میں خون میں محرومیاں آئی ہیں...... کسی کے خواب تعبیر تک نہیں آئیں گے...... کسی کا دل پھول بن کر نہیں کھلے گا...... اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے دیکھنا ہماری تقدیر ہے۔'' گل جان مبہم سا جواب دے کر اٹھ کر چلی گئی۔

روما حیران پریشان بیٹھی معنی ہی ڈھونڈتی رہ گئی۔

☆☆☆

''اب بھی آدھی رات کو اٹھ کر روتی ہو؟'' برہان، روما کی طرف دیکھ کر پوچھ رہا تھا جو حیران پریشان دَم سادھے برہان کو تک رہی تھی جو آج اچانک اس کے گھر چلا آیا تھا۔ تھکا، تھکا، الجھا، الجھا...... وائٹ ٹی شرٹ بلیک ڈریس پینٹ میں ملبوس...... چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا دیر سے ہجوم میں کسی اپنے کو تلاش کرتے، کرتے نڈھال ہوگیا ہو۔

''رونا تو زندگی بھر کا ہے...... آدھی رات یا بھری دوپہر...... وقت کی پابندی تو نہیں ہے...... جن کے ماں، باپ عیاش ہوتے ہیں ان کی اولادیں آخری سانس تک ان کی عیاشیوں کی قیمت ادا کرتی ہیں...... وہ خود پر پابندیاں نہیں لگاتے۔ اس لیے ان کے بچے زنجیریں پہن کر پیدا ہوتے ہیں۔'' وقت اور حالات روما کو قبل از وقت بڑھاپے کی دہلیز پر لے آئے تھے۔ برہان، روما کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''مگر تمہارے باپ نے اپنے گناہ کی کچھ کم سزا نہیں کاٹی...... بلکہ اپنے لیے خود سزا تجویز کی...... دنیا کی نعمتیں خود پر حرام کرلیں۔ اب تو اسے معاف کردو۔'' برہان کے لہجے میں دردمندی تھی۔

''آپ نے اپنے باپ کو معاف کردیا؟'' روما کا سوال برجستہ تھا۔ ایک لمحے کو تو برہان لاجواب سا ہوکر رہ گیا۔

''ہمارا مذہب تو یہی سکھاتا ہے..... اسے برا نہ کہو کیونکہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا...... سب سے بڑی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوگیا......''

''میں پوچھ رہی ہوں آپ نے معاف کردیا؟'' روما نے جلتی سلگتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

''ہاں...... جس نے جرم کی سزا پائی وہ پاک ہوگیا...... قانون تو یہی کہتا ہے اور...... روما اگر میں اپنے باپ کو معاف نہ کرتا تو کیا کرتا؟ بہن کی مظلومیت پر آج بھی دل روتا ہے...... کل بھی روئے گا...... مگر اسے اب ہمارے جذبات یا نیک خیالات کی ضرورت ہی نہیں...... وہ بہت دور جاچکی ہے...... اور ہم اس کے پیچھے جارہے ہیں آج نہیں تو کل...... قبائلی جنگیں ہزاروں، لاکھوں کا خون پی کر بھی سیراب نہیں ہوتیں۔ معاف نہ کرنے والا تو بہت قابلِ رحم ہوتا ہے، وہ قرض چکاتا ہے جو اس کے ذمے ہی نہیں ہوتے...... نیند سے راحت نہیں ملتی...... عبادت سے روحانی سکون نہیں ملتا...... لوگ خود تو ایک بار مرگئے...... ہم کیا روز، روز مریں......؟'' یہ کہہ کر برہان نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

''اتنے بڑے، بڑے حوصلے تو پیغمبروں اور ولیوں کے ہوتے ہیں۔'' روما نے گویا معذرت کی تھی۔

''نہیں پیغمبر، ولی تو یہ سب کچھ اس لیے کرکے دکھاتے ہیں کہ دیکھو انسان یہ سب کچھ کرسکتا ہے...... بہانے باز اسے ناممکن نہ کہیں...... لیکن جب ہر شے کو ترسوں گی تو ان لوگوں کو بددعا ضرور دوں گی جن کی وجہ

سے میری قسمت میں صرف دکھ لکھے ہیں...... اماں جان مرحومہ تو ہماری محسن ہیں انہوں نے دنیا کے سامنے ہمیں ذلیل ہونے سے بچایا...... مگر بی بی گل جان کی تو شکل دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔'' روما، برہان کے سامنے پہلی بار خالہ جانی کے بجائے بی بی گل جان کہہ رہی تھی۔ ''میرا بس چلے تو بی بی گل جان کو اس گھر سے نکال دوں یا خود نکل جاؤں...... ساری زندگی مجھے ڈھونڈیں تو بھی نہ ملوں......''

وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر کہہ رہی تھی...... برہان سر جھکائے سن رہا تھا۔

''اور دیکھیے گا ایک دن میں چلی بھی جاؤں گی...... کہاں......؟ مجھے بھی نہیں پتا...... رات کی تاریکی میں نکلوں گی اور سیدھی چلتی، چلی جاؤں گی۔'' روما کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے۔

برہان اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''آپ یقیناً کائناز کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر آئے ہیں...... مگر وہ یہاں نہیں ہے، شاید سپر اسٹور تک گئی ہوگی...... آپ گھر جائیں وہ آچکی ہوگی۔'' روما نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی خود ہی یہاں آجائے......'' برہان نے کن انکھیوں سے دیکھا...... پھر گہری سانس لے کر گویا ہوا۔

''ایک کپ کافی تو پلاؤ روما......''

روما نے گھنیری پلکیں اٹھائیں جن پر آنسوؤں کی چمک تھی۔ جیسے سمندر کی لہروں پر ڈھلتے سورج کا عکس...... حیرت کی قوسِ قزح بھی شاملِ حال تھی۔

☆☆☆

''اگر کوئی شخص تمہیں اپنی خوشی سے تیسری یا چوتھی بیوی بھی بنائے تو بھی میں راضی ہوں...... بے نشان رہنے سے تو اچھا ہے عورت کسی عزت دار کی بیوی کہلائے۔ تمہاری آنکھوں سے نکلتے ہوئے نفرت کے شعلے...... تمہارے اندر کی دہکتی ہوئی آگ کا پتا دیتے ہیں، اتنی اذیت تو بی بی جان کی نفرت نے نہیں دی...... جتنی اذیت تمہاری نفرت دیتی ہے۔ نو مہینے اپنی کوکھ میں سینچا ہے...... پھر موت کا دامن پکڑا یہ الگ بات کہ وہ دامن چھڑا کر بھاگ گئی۔''

گل جان نے اب ایک دم چونک کر بند آنکھیں کھول دیں۔

''دوپہر کے بارہ بج گئے۔ مجھے تو اسپتال پہنچنا تھا۔ رابی انتظار کررہی ہوگی...... شکر ہے کہ وہ سنبھل رہی ہے۔''

☆☆☆

''یہ آپ نے کیا، کیا برہان بھائی؟ اگر امی زندہ ہوتیں تو آپ کو کبھی دوسری شادی نہ کرنے دیتیں۔''

''میں کائناز کے بقول اس کا...زبردستی کا شوہر ہوں...... سات سال وہ میرے پاس بیٹھ کر روما، روما کرتی رہی...... جب گھر میں داخل ہوا بیوی نظر نہیں آئی...... روما کی بیسٹ فرینڈ نظر آئی۔''

''شاہ صاحب کی روح کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی...... کہ ان کی پوتی کے سر پر سوتن لاکر بٹھادی۔'' شبینہ صدمے سے ادھ موئی ہورہی تھی۔ اس کا چھ سال کا بیٹا ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا...... اسے کسی مسئلے میں ماں کی مدد چاہیے تھی مگر شبینہ اپنی کیفیت میں اس کے ہاتھ سے بار، بار اپنا ہاتھ چھڑا لیتی تھی۔

''یہ کائناز کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ بے شک پوچھ لو اس سے جاکر......''

''کیا پاگل ہے وہ......؟ کوئی عورت اپنی خوشی سے بھی سوتن لاسکتی ہے۔''

"احمر ٹی وی ڈراما دیکھتے ہوئے کسی آرٹسٹ کی تعریف کردیں تو میں jealous ہو جاتی ہوں۔"

"مرد اور عورت کی فطرت میں بہت فرق ہوتا ہے شبینہ...... مجھے تو دوسری شادی کرنے کے لیے شاید کسی بہانے کی ضرورت تھی...... شادی کے بعد میں نے کائناز کے منہ سے سوائے روما کے کچھ نہیں سنا...... یوں لگتا تھا جیسے شاہ صاحب نے اسے اور چیزوں کے ساتھ، ساتھ شوہر بھی بازار سے خرید کر دیا ہے۔"

"وہ خوش ہے......؟" شبینہ بہ مشکل خود کو سنبھال کر پوچھنے لگی۔

"خوشی سے پاگل ہے...... دونوں مال گئی ہوئی ہیں۔" برہان نے ذو معنی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر تو کائناز ابنارمل ہے......" شبینہ نے گویا فتویٰ صادر کیا۔

"مگر میں کائناز کا شکر گزار ہوں...... کتنا دل چاہتا تھا اپنی انگلیوں سے روما کے آنسو پونچھوں...... میرے دل نے پہلی صدا روما کے نام کی بلند کی...... پھر کائناز ملی، پل یہ نام لیتی رہی...... یوں جیسے میں بھول نہ جاؤں...... روما خوش ہے کہ ذلت کی بھاری زنجیریں کٹ گئیں۔ کائناز خوش ہے کہ دوست کے دکھ دور ہوگئے۔ اور میں......؟"

"بھائی کیا سوچنے لگے......؟" شبینہ، برہان کی گہری خاموشی پر پریشان ہوگئی۔

"اتنی مختصری زندگی میں کتنے سارے کام ہیں۔" برہان مسکرایا۔

"کام کرتو بیٹھے ہیں...... اللہ رحم کرے...... دیکھیں آگے، آگے کیا ہوتا ہے۔" شبینہ نے بیٹے کی کھینچا تانی سے تنگ آکر اسے چوزے کی طرح دبوچ کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

"ماما نئی مامی لائے ہیں...... دیکھنے چلیں۔" وہ بیٹے کو بہلا بھی رہی تھی اور الجھ بھی رہی تھی۔

☆☆☆

"کائناز نے بہت بڑا دل کیا ہے...... میں اس کے اس احسان کا بدلہ مر کر بھی نہیں اتار سکتی...... میرے چاروں طرف اندھیرے تھے...... زندگی بھیانک اور موت حسین لگتی تھی۔" بولتے، بولتے روما کی آواز بھرّانے لگی۔

برہان نیم دراز جبکہ روما اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ موتیا کلر کا چم، چم کرتا ملبوس اس کے چہرے کو بھی منعکس کررہا تھا۔

انسان کے دل میں چھپے ہوئے خیالات کا حسن ہی دراصل چہرے کا حسن ہے۔ وہ کائناز کے لیے احسان مندی اور محبت کے جذبات اپنے دل میں موجزن محسوس کررہی تھی۔ شوریدہ لہریں چہرے کے ساحل سے دیوانہ وار ٹکرا رہی تھیں۔

اور برہان اس کے برعکس سوچ رہا تھا۔

"زبردستی کا شوہر......" اس نے عالمِ نزع کی کیفیت میں مبتلا دادا کی خواہش کا احترام کیا تھا شاید اسی لیے وہ کبھی اس کی محبت میں مبتلا نہ ہوسکی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی...... برہان اور روما دونوں اپنے اپنے خیالات سے چونک پڑے۔ روما جلدی سے بیڈ سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ روما کو اٹھتا دیکھ کر برہان نے خود اٹھنے کا ارادہ ترک کردیا اور اسی حال میں دراز رہا۔

روما نے دروازہ کھولا...... سامنے کائناز ریڈ سلک کی نائٹی میں ملبوس کھڑی تھی۔ بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگالیا تھا پھر بھی دو چار لٹیں رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات تھے۔

"جب پتا تھا کہ میں ابھی جاگ رہی ہوں تو دروازہ لاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ انسان کو کچھ خیال بھی کرنا

چاہیے۔" اس کی نظریں برہان پر تھیں۔ جس نے کائناز کو ایک نظر دیکھنے کے بعد آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

"سوری، تمہارے بیڈروم کا دروازہ بند تھا، میں سمجھی تم سو چکی ہو۔" روما قدرے شرمسار انداز میں گویا ہوئی۔

"ہاں تو دیکھ لیا کرو کہ سو گئی ہوں یا جاگ رہی ہوں...... اتنے بڑے گھر کی خاموشی بعض اوقات بہت ڈراتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ برہان کے قریب چلی گئی۔ "زیادہ سونے کی ایکٹنگ نہ کریں...... چلیں اٹھیں۔" اس نے برہان کا بازو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

"اٹھ کر کیا کروں......؟" برہان نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" وہ دھپ سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"رات کا ایک بج رہا ہے۔ کل دیکھتے ہیں۔" برہان نے کروٹ لے کر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے...... پہلے کبھی نہیں گئے رات ایک بجے......؟ چلیں اٹھیں۔" کائناز نے اصرار کیا۔

"change کرنا پڑے گا...... میرا موڈ نہیں بہت تھکا ہوا ہوں۔" برہان نے بیزاری سے جواب دیا۔

"اچھا چھوڑیں، میں روما کو لے جاتی ہوں اس نے تو ابھی چینج نہیں کیا ناں......؟"

"اتنی رات کو اکیلی جاؤ گی؟" برہان بری طرح الجھ گیا۔

"اکیلی......؟ میں اور روما...... ہم دو ہیں...... بلکہ ایک اور ایک گیارہ ہیں۔ یعنی کہ پوری ٹیم...... چلو روما...... یہ تو ایسے ہی بور کرتے ہیں۔" کائناز نے اٹھ کر روما کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا...... جو بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ بار، بار برہان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نائٹی میں باہر جاؤ گی......؟" روما جزبز ہو کر بولی۔

"ارے دو منٹ میں چینج کرتی ہوں۔" وہ کھٹ سے بولی۔

"حالات بہت خراب ہیں...... یہ وقت باہر جانے کے لیے مناسب نہیں۔" برہان بری طرح تپ رہا تھا۔

"ہمیں باہر دیکھ کر لوگوں پر بہت اچھا امپریشن پڑے گا...... سب کو سکون محسوس ہوگا کہ اب حالات بہت اچھے ہیں...... لڑکیاں آئس کریم کھا رہی ہیں۔" برہان اٹھ کر بیٹھ گیا...... وہ ایک خلجان میں مبتلا ہو چکا تھا۔

"تم چینج کرو...... میں بھی چینج کر کے آتا ہوں......" چار و ناچار وہ بیڈ سے اتر گیا۔

کائناز کے باہر جاتے ہی روما نے برہان کی طرف دیکھا وہ نظریں چرا گیا۔

"بعض مال دار لڑکیوں کو ڈریس جیولری کی طرح شوہر بھی خرید کر دیے جاتے ہیں۔" وہ سلیپر پاؤں میں پھنسا کر جل بھن کر کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان کی سوتے میں حرکتِ قلب بند ہوگئی تھی یا انجانے میں گل جان کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ بعض اوقات وہ مہر جان کو دو مرتبہ خواب آور گولی کھلا دیا کرتی تھی۔

مہر جان کے بعد اصیل خان نے یہ کہہ کر گھر چھوڑ دیا تھا کہ "جس کی وجہ سے میں اس گھر میں اپنے کیے کی سزا کاٹ رہا تھا وہ تو خود زندگی کی قید سے آزاد ہوگئی...... اب میری بیٹیوں کو بتا دینا کہ ان کا باپ کون ہے۔ کیونکہ ہر انسان اس وقت تک عالمِ بے چارگی میں ہے جب تک اسے پتا نہیں چل جاتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اب میری بیٹیوں کا امتحان ختم ہو جانا چاہیے۔ پھر میں ان کا سامنا کیسے کرسکتا ہوں۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" گل جان نے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جائے گا؟ تو اس نے جواب دیا تھا۔ "اپنے گاؤں کی ویران

زمینیں جو اُگلیں گی خیرات کر دیا کروں گا۔ شاید نجات ہو جائے۔''
زمینیں آباد کروں گا...... زمینیں جو اُگلیں گی خیرات کر دیا کروں گا۔ شاید نجات ہو جائے۔''

پھر ایک روز گل جان سو کر اٹھی تو اصیل خان کوٹھی میں نہیں تھا۔ رابی، مہر جان کی زندگی ہی میں نشے کی لت کا شکار ہو گئی تھی کیونکہ پاکستان واپس آئی تو ادراک ہوا کہ خواب، خواب ہی ہوتے ہیں۔ برہان اس کی دسترس سے بہت دور ہو جا چکا تھا پھر بھی وہ خود کو بہلانے سمجھانے کی تگ و دو میں لگ گئی تھی۔

مگر اس روح فرسا انکشاف کے بعد کہ بابا اصیل خان اس کا باپ ہے، وہ اپنے ہوش قائم نہیں رکھ سکی۔ صبح ہی کار کی چابی اٹھا کر گھر سے نکل جاتی تھی۔ ایک رات گھر میں داخل ہوئی تو کار کی ہیڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور وہ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

☆☆☆

''آنٹی کتنی اچھی تھیں ناں...... میں نے ان جیسی عورت آج تک نہیں دیکھی۔'' روما، برہان کے ساتھ ... یادگار فوٹوز...... البم میں لگاتے ہوئے بہت محبت سے صابرہ کے بارے میں کہہ رہی تھی۔

''انسپکٹر جابر علی کا ساتھ نبھانے والی عورت کوئی معمولی یا عام سی عورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اس نے مجھے اولاد دی، حلال کمائی لانے والا عزت دار شوہر دیا...... جب عورتوں کو محنت مزدوری کرتے دیکھتی ہوں تو اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اپنے گھر میں بیٹھی ہوں نامحرموں کے سامنے نہیں جانا پڑتا...... عورت باہر نکلتی ہے تو ہر طرح کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ میں نے اپنی ماں سے زیادہ صابر و شاکر عورت نہیں دیکھی۔ وہ خوف سے نہیں دل سے میرے باپ کی عزت کرتی تھیں۔ جب پہلی بار انہوں نے میرے باپ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، مجھے حیرت سے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔'' برہان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ جیسے وہ اسکرین پر کوئی دلچسپ منظر دیکھ رہا ہو۔

''کیا کہا تھا آنٹی نے؟'' روما نے البم میں لگی صابرہ کی فوٹو پر نظر جما کر بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''کہہ رہی تھیں میں دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں سے ایک ہوں۔ اپنے مرد کی وجہ سے پردے میں رہتی ہوں۔ ماں ہوں اولاد کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتی ہوں...... پرندوں کی طرح مجھے رزق ملتا ہے۔ مجھے آٹے، دال کا بھاؤ معلوم نہیں۔ تمہارے ابا جان ضرورت کی ہر چیز گھر میں لا کر رکھتے ہیں۔ امی کی باتیں سنتے ہوئے مجھے ابا جان کی چیخ پکار یاد آ رہی تھی۔ روما وہ چیخ پکار ایسی ہوتی تھی کہ گھر سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔'' برہان کے سینے سے ایک آہِ سرد خارج ہوئی۔

''میری ماں ان کی چیخ پکار کے جواب میں کبھی نہیں چلائی۔ کیونکہ اسے شکر کرنے کی پکی عادت پڑ گئی تھی...... شکر کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیتی تھی وہ۔'' برہان کی آنکھوں میں ماں کی یاد سے نمی اترنے لگی۔

''شی واز سو گریٹ......'' روما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اس سے بھی کچھ زیادہ...... اللہ کی مہربانی سے اگر مسلمان نہ ہوتا تو شاید ماں کا بت بنا کر پوجا کرتا۔''

برہان نے صابرہ کی جوانی کی کارڈ سائز تصویر اٹھا کر چوم لی۔

''کاش میں بھی آنٹی جیسی بن جاؤں۔'' روما اسی بے ساختگی کے ساتھ گویا ہوئی۔

اسی لمحے دروازہ دھڑ سے کھلا تھا...... کائنات اپنی مخصوص بے دھڑک چال کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

''اُف...... تم یہ کیا فضول سا کام کر رہی ہو؟'' اس نے البم اور فوٹو پر نظر ڈال کر کوفت سے منہ بنایا۔

''میرے کمرے میں آؤ...... مووی دیکھتے ہیں...... بور ہو رہی ہوں میں...... برہان کو تو مووی کا شوق ہی

نہیں ہے ورنہ یہیں لگا لیتے۔'' وہ روما کا بازو پکڑ کر زبردستی اٹھا رہی تھی۔

برہان نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا...... ''آنٹی'' جیسی بننے کے چکر میں روما نے صبر کا گھونٹ پی لیا۔

☆☆☆

''میں تمہیں کافی دیر سے بیڈ روم کی بالکنی سے دیکھ رہا تھا۔ خیریت ہے مراقبہ ہو رہا ہے؟'' احمر، شبینہ کے پاس لان میں چلا آیا تھا۔

''نہیں...... ایسا کچھ نہیں۔'' شبینہ واجبی سا مسکرائی۔

''ہو ہی نہیں سکتا، میں اتنی دیر سے بالکنی میں کھڑا تھا اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ سوچ رہا تھا تمہاری نظر مجھ پر پڑے تو کچھ اشارے بازی ہی کر لوں...... شادی سے پہلے تو تم نے مجھے چھیڑ چھاڑ کا موقع ہی نہیں دیا۔'' احمر نے شوخی سے کہا۔

شبینہ نے ایک نظر اپنے بیٹے امان پر ڈالی جو پھول توڑ، توڑ کر گھاس پر پھینک رہا تھا پھر مسکرا کر گویا ہوئی۔

''ارے میں ایسا کچھ خاص نہیں سوچ رہی تھی۔ بس ستارہ کا خیال آ گیا تھا...... بہت یاد آ رہی تھی۔''

احمر کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی جھلکنے لگی۔

''جانے والے یاد تو آتے ہیں...... حافظہ ایسی ہی شے ہے۔ جو کچھ اس میں آتا ہے اسٹور ہو جاتا ہے۔ اپنے اختیار سے کچھ بھی ڈیلیٹ نہیں ہوتا۔ بس جب اس کی یاد آئے مغفرت کی دعا کیا کرو...... یہی ہمارے اختیار میں ہے۔''

''امی کو بس اس کا غم ہی کھا گیا...... ورنہ ان کی عمر تو جانے کی نہیں تھی۔'' شبینہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''اپنے پیروں سے چل کر اسپتال گئی تھیں۔ تیز بخار تھا...... جو دماغ پر چڑھ گیا...... مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا کہ وہ جا چکی ہیں۔ کوئی لمبی بیماری نہیں کاٹی...... کسی سے خدمت نہیں لی...... میں تو پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے کھڑی رہ گئی۔'' شبینہ نے ٹھنڈی آہ بھری......

''میں نے یہی سنا ہے کہ نیک لوگوں کی روح بڑی آسانی سے نکل جاتی ہے۔'' احمر نے شبینہ کی تقویت کے لیے ایک مناسب جملہ ترتیب دے ہی لیا۔

''نیک تو وہ بہت تھیں......'' شبینہ نے گم صم کیفیت میں کہا۔

''میری ماں بھی تمہاری ماں ہے شبینہ......''

''دل سے مانتی ہوں...... مگر......'' شبینہ رک گئی۔

''میں جانتا ہوں مگر سے آگے کیا ہے...... دیکھو جب بیٹا اپنی پسند سے شادی کرتا ہے تو اسی طرح ہوتا ہے...... مگر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ امان سے کتنا پیار کرتی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آہستہ، آہستہ حقیقت کو قبول کرتی جا رہی ہیں۔ فائزہ بھی جب آتی ہے ممی کو ڈوز دے کر جاتی ہے۔ تمہیں کیا فکر ہے میں تو تمہارے ساتھ ہوں ناں...... ماں کے صبر کی مثال دیتی ہو...... تمہیں بھی تھوڑا سا صبر کرنا ہوگا۔'' احمر، شبینہ کی دل جوئی کر رہا تھا۔

''شکر ہے مجھے تھوڑا صبر کرنا ہے۔ میری ماں نے تو صبر کے پہاڑ کاٹے ہیں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

''ماما دیکھیں کتنے سارے فلاورز......'' امان اپنی ماں سے کہہ رہا تھا اور وہ اپنی ماں کی یادوں میں گم تھی۔

☆☆☆

ایک حادثہ ہوا اور سب کچھ بدل گیا۔ جوئے کے اڈے پر جو دشمنی شروع ہوئی تھی وہ ایک عظیم قیامت پر

انجام کو پہنچی۔ تائی جی...... لان میں گوڈی کر رہی تھیں نامراد گھر میں گھس کر اٹھا کر لے گئے۔'' گل جان بھرائی ہوئی آواز میں دلدوز سانحہ رابی کو سنا رہی تھی۔

''ایک بوڑھی عورت کو اغوا کر کے لے گئے؟'' رابی نے حیرانی کی انتہا پر سوال کیا۔

''ماں غیرت کا نشان ہوتی ہے...... اصیل خان شاید اس سے کم پر ہار بھی نہیں مانتا...... قدرت ہر شے کا ٹھیک ٹھاک حساب کرنا جانتی ہے۔'' گل جان کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی۔

''پھر......؟'' رابی کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''میری تائی جی جو پردہ لگائے بغیر کبھی موٹر میں نہیں بیٹھتی تھیں شرم سے مر گئیں...... ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔ لوگوں کی قیامت تو جب آئے گی تب آئے گی۔ ان کی تو آ گئی تھی۔''

''پھر......؟'' رابی کا سکتہ بہ مشکل ٹوٹا۔

''مر گئیں ناں بیٹا...... اب کیا... مگر اب اصیل خان، اصیل خان نہ رہا تھا۔ جس روز تمہاری ماں آسیہ تمہیں بی بی جان کے حوالے کر کے گئی۔ یہ اس کے ایک ہفتے بعد کا حادثہ ہے...... اصیل خان نے سب کچھ چھوڑ دیا...... وہ تو ملک سے باہر جانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کے اور بی بی جان کے درمیان وہ فاصلے آ چکے تھے جن کی حدوں کو ناپا نہیں جا سکتا تھا۔ مگر قدرت اس پر نشانہ باندھے ہوئے تھی۔ بی بی جان بہت انا پرست تھیں۔ مردوں کی طرح غیرت مند تھیں۔ انہوں نے اصیل خان کو کہہ دیا تھا کہ وہ خلع، طلاق کے کاغذ نہیں لکھوائیں گی...... وہ جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے ان کی طرف سے آزاد ہے۔ بے کسی کی موت مرنے والی ماں نے اصیل خان کو دوسرا جنم دیا۔ اسے بیٹیاں جان سے زیادہ عزیز ہو گئیں۔ اس نے بی بی جان سے ہاتھ جوڑ کر منت کی، وہ اپنی بیٹیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے لیے خود سزا تجویز کی۔ دنیا کی لذتوں سے منہ موڑ لیا۔ کھدر پہن لیا۔ روکھی، سوکھی کھانے لگا۔ روما جب پیدا ہوئی تو وہ تہجد پڑھنے لگا تھا۔'' وہ نہ جانے کون، کون سے ناقابلِ یقین واقعات سناتی جا رہی تھی۔'' بی بی جان نے روما کے کان میں اسی سے اذان دینے کو کہا تھا۔ اصیل خان روما کے کان میں اذان دیتے ہوئے رو رہا تھا۔ وہ اذان دے کر باہر گیا تو بی بی جان نے میرے منہ پر بہت زور سے تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ بچی مہر جان کی بیٹی ہے...... کاش تو اسے جنم دیتے ہوئے مر جاتی۔ ساری دنیا میں لاکھوں عورتیں ڈلیوری کیسز میں مر جاتی ہیں۔ مگر تو، تو بہت ہی ڈھیٹ ہڈی ہے۔

''ٹھیک ہی تو کہتی تھیں وہ...... بہت ہی ڈھیٹ ہڈی ہوں میں، ہاں رابی موت بھی شاید خوش نصیبوں کے لیے ہوتی ہے۔'' گل جان سسکیوں کو دبانے کے جتن کرنے لگی۔

رابی، دم بخود کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اب نہ ذہن میں سوال تھے نہ جستجو...... نہ دنیا تھی نہ کائنات...... نہ چاند نہ کہکشائیں...... صدائے کُن سے پہلے کا عالم تھا۔ ازل اور ابد کے درمیان پھیلی ہوئی لازوال خاموشی...... لازوال خاموشی کے گرد تخلیقِ لوح و قلم کا اوّلین تفکر...... اور اس تفکر پر محیط محبت کا نور...... زندہ باپ کی محبت بغیر ارادے کے ماہتاب کی طرح دل کے مطلع پر نمودار ہوئی۔

''کتنی ہمت سے میرے باپ نے اپنے جرم کی سزا تو کاٹی ہے۔ اس دنیا میں تو لوگ درندوں کی طرح جیتے ہیں اور انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' صدائے کُن کے ارتعاش کے ساتھ زندگی متحرک ہو گئی۔ رابی نے فطرت کے سینے سے سر ٹکا کر بڑا دل سوز سچ بولا تھا۔

☆☆☆

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آج آپ میرے بیڈروم میں سوئیں گے۔ جب سے آئے ہیں یہاں دھرنا دیے بیٹھے ہیں...... روما تمہیں خود بھی سوچنا چاہیے۔'' کائناز بیک وقت برہان اور روما سے بڑے آف موڈ میں کہہ رہی تھی۔

''روما کو بہت تیز بخار ہے...... تمہیں پتا ہے ناں یہ پریگننٹ بھی ہے۔'' برہان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''تو جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ لوگوں کے ہاں دس، دس سال بعد بھی اولاد ہو جاتی ہے...... پھر مجھے ہرٹ کیوں کر رہے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ...... میں تمہیں پچویشن بتا رہا ہوں......'' برہان نے جز بز ہو کر کہا۔ روما نے بخار کی شدت سے تپتی سرخ آنکھوں کو کائناز پر جماتے ہوئے کہا۔

''تم انہیں لے جاؤ کائناز، یہ اپنی مرضی سے یہاں بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے نہیں کہا۔''

''کائناز تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ...... روما کا ٹمپریچر ڈاؤن ہو جائے گا تو میں آ جاؤں گا...... دل بڑا کیا تھا تو ثابت بھی کرو۔'' برہان کے لہجے میں غیر ارادی طور پر تلخی اترنے لگی۔

''ارے بھئی سب کچھ میں ہی کروں...... اگر اس نے میڈیسن لے لی ہے تو تھوڑی دیر میں سو جائے گی...... آپ اس کے سر پر بیٹھ کر مچھر ماریں گے...... چلیں اٹھیں، میں بور ہو رہی ہوں......'' کائناز نے برہان کا بازو دبوچ لیا۔

''یار انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' برہان نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

''آپ دونوں میرے گھر میں مزے سے رہتے ہیں...... انسانیت تو ہم نے سکھائی ہے آپ کو۔'' کائناز اپنی عادت کے مطابق بے سوچے سمجھے بول گئی۔ روما تو بخار سے نڈھال تھی مگر برہان کو یوں محسوس ہوا جیسے قاضیِ شہر نے حد جاری کر دی ہو اور شہر کا شہر ہاتھوں میں پتھر لیے سنگساری کو آن پہنچا ہو۔

وہ ایک دم سے بیڈ سے اتر گیا۔

''یہ انسانیت کا سبق آپ کے مرحوم دادا جان نے پڑھایا تھا۔''

''مگر میں نے روما سے ہمدردی کی تھی...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اسٹور کا سامان سمجھ کر ایک طرف پھینک دیا جائے۔ ابھی یہ پریگننٹ ہے تو آپ کو میری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں...... جب بچہ دنیا میں آ جائے گا تو آپ میرا نام پوچھا کریں گے کہ میں کون ہوں۔'' کائناز مشتعل ہو کر کہہ رہی تھی۔

روما نے بدقت تمام اپنی آنکھیں کھولیں۔

''آپ جاتے کیوں نہیں...... آئندہ آپ کائناز سے اجازت لے کر میرے پاس آئیں گے...... پلیز آپ دونوں میرے حال پر رحم کریں......'' وہ ہانپتے ہوئے یوں کہہ رہی تھی گویا جسم میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہو۔

''موڈ خراب کر کے ایک ہی بیڈروم میں ایک ہی بیڈ پر ایک دوسرے سے منہ موڑ کر لیٹنے سے بہتر نہیں ہے کہ دس بارہ نفل پڑھ لیے جائیں اور اس کے بعد کوئی اچھی کتاب......'' برہان نے غصہ دبا کر بہت نرمی سے کہا تھا۔

''میری باری پر نفلیں یاد آ جاتی ہیں...... go to hell'' کائناز پاؤں پٹختے ہوئی باہر نکل گئی۔

''برہان پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں...... میں آپ سے ریکویسٹ کرتی ہوں۔'' روما نے نڈھال ہو کر

باقاعدہ درخواست کرڈالی۔

برہان نے بڑے صبر وضبط سے خود کو سنبھالا اور آہستہ قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''بیٹا جو تربیت ایک اچھی ماں کرتی ہے وہ تو میں نہیں کرسکا ہوں گا۔خون کے رشتوں سے حادثاتی دوری نے مجھے بہت نرم مزاج بنادیا ہے۔کائناز کے اندر بہت بچپنا ہے...... جو بات دل میں ہوتی ہے کہہ دیتی ہے، سنبھال لینا۔'' شاہ عالم شادی ہوجانے کے کچھ دن بعد برہان کو سمجھا رہے تھے۔

ممنون ومشکور ہونے کی وجہ سے برہان کو یہ سب کچھ بہت سہل وآسان لگا تھا...... مگر گزرتے وقت نے سمجھا دیا تھا کہ لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔

روما تک جانے کا تو بہانہ چاہیے تھا۔

کائناز کی حماقتوں سے اعصاب شل تھے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو...... سیرابی کے لیے خالی چھاگل لیے سراب در سراب کے سفر سے دوچار تھی۔

پھر جس نے دل کو صحرا کیا تھا اسی نے نخلستان تک بھی پہنچایا...... مگر نخلستان کے پانی پر پہرہ تھا...... پیاس بجھانے کو پانی ضرور ملتا تھا...... سیراب ہونے کے لیے نہیں...... فرات کے کنارے ایک تیرانداز چوکس رہتا تھا۔

☆☆☆

تم جس بات پر ہنستے ہو میں رو پڑتا ہوں
میں جس بات پر روتا ہوں تم ہنس دیتے ہو
میں جس بات پر بجھ جاؤں تم کِھل جاتے ہو
میں جس بات پر مرتا ہوں تم جی اٹھتے ہو
میں جس بات پر درد میں ڈوبا رہتا ہوں
تم اس بات پر روشن ، روشن لگتے ہو
سوچ رہا ہوں کتنے زیادہ الگ ، الگ ہیں
تیری میری سوچ کے دھارے
کتنے زیادہ جدا ، جدا ہیں
اب میں سوچ رہا ہوں
اتنے مخالف طوفانوں کو سہیں گے کیسے؟
تم اور میں ایک چھت کے نیچے رہیں گے کیسے؟

''برہان میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر بتائیں آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا روما سے......؟'' کائناز نے برہان کا ہاتھ زبردستی کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

''کیا مذاق ہے یار......؟ چھوڑو میرا ہاتھ......'' برہان نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کی...... اس کا اعصابی نظام آندھیوں کی زد میں آچکا تھا۔

''نہیں، آپ کو جواب دینا پڑے گا...... سچی، سچی بولیں...... اگر آپ ایسا سچ بولیں گے جو میرے خلاف ہو تو میں برا نہیں مانوں گی...... البتہ میرا ذہن ایک طرف ہوجائے گا۔'' کائناز کی گرفت اس کے

ہاتھ پر مضبوط تھی۔

''میری تمہاری لو میرج نہیں تھی کائناز...... ہمارا رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ خود بخود مضبوط ہوتا چلا جائے گا...... اتنے سال ہوگئے ہماری شادی کو یار اب تو کچھ میچور ہوجاؤ۔'' برہان نے ڈپلومیسی سے اسے بہلانے کی کوشش کی اور بمشکل اپنے لہجے کی بیزاری کو قابو کیا۔

''نہیں...... بس میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں، آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا روما سے؟'' کائناز پھر برہان کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر دباؤ ڈال رہی تھی۔

''کم آن کائناز...... پلیز یہ بچوں والی باتیں اب چھوڑ دو...... روما سے شادی کے لیے تم میرے پیچھے پڑی تھیں اور دلائل دیے تھے کہ وہ اپنی ماں کی ناجائز اولاد ہے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا یا میں نے تم سے دوسری شادی کی فرمائش کی تھی؟'' برہان نے زچ ہوکر سوال کیا تھا۔

''بے وقوف تھی میں...... مگر اب سمجھدار ہوگئی ہوں...... آپ کو قسم کھا کر جواب دینا پڑے گا...... آج میں آپ کو یہاں سے ہلنے نہیں دوں گی......'' کائناز پر جیسے دیوانگی طاری ہوچکی تھی۔

برہان کو بے بسی کے احساس نے لب بستہ کرکے رکھ دیا تھا۔

''قسم کھائیں...... بلکہ آپ کو صابرہ آنٹی کی قسم ہے... بالکل سچ بولیں۔'' کائناز کی گرفت برہان کے ہاتھ پر مزید مضبوط ہوگئی۔

کائناز کے ایک جملے نے برہان کے اندر ایک طوفان اٹھا دیا تھا۔ وہ اسے عزیز از جان ماں کی قسم بھی دے رہی تھی...... جو اگر زندہ ہوتیں تو وہ ان پر سو مرتبہ جان نثار کرنے کو تیار رہتا۔

''بس کرو کائناز...... چھوڑو میرا ہاتھ۔'' برہان نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اب تو میں آپ کو آپ کی ماں کی قسم بھی دے چکی ہوں۔'' کائناز نے بھوکی شیرنی کی طرح پھر اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

''کائناز...... تم میرے سچ کو برداشت نہیں کرسکو گی...... ضد نہ کرو۔'' اب برہان نے بہت صبر وسکون سے کہا تھا۔

''جو بھی ہے...... کہہ دیں...... اب کہہ بھی چکیں...... کائناز کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''میں نے روما سے اس وقت محبت کی جب تم میری بیوی نہیں تھیں۔ وہی میرا پہلا اور آخری خواب رہی...... اس کے بغیر زندگی بالکل خالی، ادھوری لگتی تھی...... اب نہیں لگتی...... تمہارے احسان نے مجھے مکمل کردیا ہے...... اگر مجھے روما سے سچ مچ پیار نہ ہوتا تو تم دس بار بھی پیدا ہوجاتیں تو میری دوسری شادی نہیں کرا سکتی تھیں۔ پھر بھی میں نے احسان کو محبت پر مقدم رکھا...... روما سے زیادہ تمہیں وقت دیا...... اگر تمہارے دادا جان اندھیروں میں روشنی بن کر نہ ملتے تو کسی صورت میری شادی تمہارے ساتھ نہیں ہوسکتی تھی۔'' کائناز سکتے کی کیفیت میں برہان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ برہان نے آرام سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کائناز نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

☆☆☆

وہ قیامتیں جو گزر گئیں
امانتیں تھیں کئی سال کی

روما اور برہان کی دن، رات کی محنت ولگن رنگ لے آئی تھی۔ رابی کی حالت بہت بہتر ہوگئی تھی۔ اسے کچھ عرصہ انجیکشن و ٹیبلیٹس لیتے رہنا تھا۔

رابی اسپتال سے آنے کے بعد چند دن بہت بے قرار رہی پھر گل جان سے یہ کہہ کر گھر سے نکل گئی کہ وہ بابا اصیل خان کو لینے گاؤں جارہی ہے۔ گل جان کچھ نہ کہہ سکی۔ اصیل خان نے جب رابی کو سامنے پایا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

''باپ تو اعزاز ہوتا ہے بابا...... اور یتیمی دائمی ماتم...... خدا بن کر جزا، سزا کے فیصلے ہم ہی نے کرنے ہیں تو پھر خدا نے کیا کرنا ہے؟'' اس نے اصیل خان کے بوڑھے مگر فراخ سینے پر سر ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

''بیٹا یہ عقل وشعور انسان کے پاس اللہ کی امانت ہوتا ہے۔ اس کا درست استعمال امانت داری اور غلط استعمال خیانت ہے۔

اسی سے اس بھاری ذمے داری کا اندازہ لگالیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کی سورۂ احزاب آیت 72 میں فرماتا ہے۔

''ہم نے اسے (قرآن) کو زمینوں، آسمانوں، پہاڑوں، جو کچھ ان کے درمیان ہے کے سامنے پیش کیا کہ کوئی ہے جو اس امانت کا بوجھ اٹھائے؟ سب نے انکار کردیا مگر انسان نے اٹھانے کا اقرار کرلیا۔ بے شک انسان ظالم ہے، جاہل ہے۔ اور بیٹا قرآن کیا ہے؟ wisdom ہے، شعور ہے عقل ہے جو شیطان کو مایوس کرنے کے طریقے بتاتی ہے۔'' برہان انہیں سن رہا تھا۔

''ماشاء اللہ آپ بہت سمجھدار اور بردبار ہیں...... کائناز کو بلوریں کانچ کی طرح سنبھالنا ہوگا...... بچی ہے...... کم عمر ہے......'' شاہ عالم نے کتنے مان اور محبت سے کہا تھا۔

''مجھے معاف کردیجیے گا شاہ صاحب...... میں نے بہت کوشش کی...... میں نے پورے ہوش وحواس میں امانت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ بہن، بھائی کا رشتہ نفرتوں کے ساتھ نبھ سکتا ہے مگر میاں، بیوی کے رشتے میں لفظ نفرت دو دریاؤں کے درمیان فرق ڈالنے والی لکیر ہے۔ وہ مجھے منافق، جھوٹا، ریاکار کہتی ہے...... سچ سننے پر اصرار تو تھا مگر...... مگر سچ برداشت کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ جن کے درمیان محبت کا نہ سہی معاملات ہی کا رشتہ ہوان کو اپنی، اپنی جگہ خود کو امانت دار ثابت کرنا ہوتا ہے۔''

برہان کے سامنے کائناز کی طرف سے بھیجے گئے خلع کے ڈاکومنٹس پڑے ہوئے تھے جو وہ نہ جانے کتنی بار بہت توجہ وعرق ریزی سے پڑھ چکا تھا...... گزشتہ ایک ہفتے سے یہ ڈاکومنٹس اس کی ٹیبل پر تھے۔ ابھی تک اس نے روما سے بھی یہ سب کچھ پوشیدہ رکھا ہوا تھا...... کائناز کے lawyer کا کئی مرتبہ یاددہانی کا فون بھی آچکا تھا۔

برہان نے ایک گہری سانس کھینچی اور کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح شام یہ ایک ہی رنگ ہے
پریشانی کا
اور پھر جیسے ایک ایسا ہی دوسرا رنگ ہے

پریشانی سے نجات کی حیرانی کا
جو لگتا ہے خوشی کا رنگ ہے
پر ایسا نہیں ہے
کیونکہ خوشی کا رنگ میں نے دیکھا ہے
میری روح نے نہیں دیکھا
وہ میری سوچ سے بھی زیادہ گہرائی میں رہتی ہے
وہ مجھ سے دور......
میری گزری نسلوں
میرے شہرِ آبائی میں رہتی ہے

برہان تھکے، تھکے قدموں سے اپنے ڈرائیور کے پیچھے، پیچھے چل رہا تھا جو اس کا بھاری بریف کیس اٹھائے پارکنگ لاٹ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

سر سے کوئی بوجھ اترا اور سرک کر دل پر آپڑا۔

اسے دائیں جانب یوں محسوس ہوا گویا شاہ عالم اس کے ہم قدم ہیں...... ان کی سفید تراشیدہ داڑھی ان کے آنسوؤں سے تر ہے......

''شاہ صاحب آپ بھی نہیں تھے۔ دعا کرنے والی ماں بھی نہیں تھی...... بہت اکیلا تھا...... مُردہ بچہ گود میں لے کر تو ماں بھی نہیں بیٹھتی۔ ناچار دفنا دیتی ہے۔ جنگ طویل ہوسکتی تھی، فیصلہ کُن نہیں...... مجھے معاف کردیں، لوح وقلم کے یہی اشارے تھے۔''

ہر انسان اپنی ذات کی پہنائیوں میں ایک عظیم خوف چھپائے پھرتا ہے۔ بیشتر لوگ اپنے اس خوف کو کوئی نام نہیں دے پاتے...... کچھ لوگوں کے عظیم خوف نام بھی رکھتے ہیں جیسے ....

دولت مند کو دولت ضائع ہونے اور کسی نقصان سے دوچار ہوجانے کا خوف خوشیوں میں جھومتے شخص کو خوشیوں کے پلٹ جانے کا خوف...... محبت کی سرشاری میں بھیگتے، بھیگتے اچانک کسی کے جدا ہوجانے کا خوف بیمار کو موت کا خوف صحت مند کو بیماری کا خوف...... غریب کو ایک وقت کا کھاتے ہوئے دوسرے وقت فاقے کا خوف...... بادشاہ کو سازشوں کا خوف...... جمہوریت کو ڈکٹیٹر کا خوف...... سچ بولنے والے کو دشمنوں کا خوف...... جھوٹے کو جھوٹ پکڑے جانے کا خوف...... جوانی کو بڑھاپے کا خوف...... بڑھاپے کو عمر کی نقدی ختم ہوجانے کا خوف...... غلام کو آقا کے غصے کا خوف...... نوکر کو نوکری جانے کا خوف...... باس کو آڈٹ کا خوف...... ملازم کو باس کا خوف...... آجر کو ٹیکس کا خوف...... مزدور کو آجر کی بلیک میلنگ کا خوف......

رابی بھی ایک عظیم خوف کو گردن سے دبوچ کر ان دیکھے گڑھے میں دھکیلنے کی کوشش کرتی رہتی تھی...... ایک ہی خوف تھا...... محبوب کے چھن جانے یا دسترس سے دور چلے جانے کا خوف......

خوف سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ جس امر کے بارے میں خوف ہو اس سے گزر کر دیکھ لو...... حقیقت سامنے آجائے گی خوف سے جان چھوٹ جائے گی...

مگر وہ ابھی عملی قدم اٹھانے سے معذور ومجبور تھی...... خوف سے دو، دو ہاتھ ہورہے تھے کہ قدرتاً خوف

سے جان چھوٹ گئی...... اپنے حسن و جمال کی بلائیں لیتے اپنی ادا پر خود ہی فدا ہوتے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو پتا چلا جس کے چھن جانے، نہ ملنے کا خوف تھا...... وہ چھن چکا...... دسترس سے باہر جاچکا۔

چکراتے ذہن کو سنبھالنے کے لیے نشے کا سہارا لیا تو گل جان اسپتال میں پھینک کر چلی گئی۔

بہترین معالجین، نفسیاتی ماہرین بڑی جان فشانی سے اس کی جوانی پر ترس کھاتے ہوئے زندگی کی طرف موڑنے میں کامیاب ہوئے تو وہ کچھ پیش آیا جو ہر خوف سے نجات کے بعد تھا۔

روما اس کی اپنی بہن برہان کی بیوی بن کر سامنے آگئی۔ سونے کو ایک حد تک آنچ دے کر تپایا جاتا ہے تو وہ کندن بن جاتا ہے، کوئی سونے کو آگ میں پھینک کر دنیا کی سیاحت کو نہیں جاتا...... وہ یک بارگی عظیم خوف سے گزر چکی تھی۔

محبوب کے ساتھ بہن کو دیکھ کر خود اپنے آپ پر ہنسنے لگی...... اب کوئی خوف نہیں تھا...... وہ جی بھر کر ہنس سکتی تھی...... اصل میں تو دل کھول کر ہنسنے کے موسم تو اب آئے تھے...... دو تین مرتبہ روما، برہان کے ساتھ اس کی عیادت کو اسپتال آئی۔ پھر ایک دن برہان اکیلا چلا آیا...... وجہ یہ بتائی کہ آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا اس لیے سوچا کہ سالی کی خیر خیریت لیتا چلوں...... رابی نے بہت دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ بہت ہینڈسم، ڈیشنگ، اسمیشنگ مگر بہنوئی......

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا

شاعر نے شاید یہ short cut رابی جیسے لوگوں کو ہی بتایا تھا...... رابی نے اس کا بھرپور استقبال کیا تھا...... وی آئی پی روم میں ہر سہولت موجود تھی اس نے برہان کو اپنے ہاتھ سے بہترین کریم کافی تیار کر کے پلائی تھی اور ساتھ ہی یہ خوش خبری سنائی تھی کہ وہ اسی ہفتے ڈسچارج ہوجائے گی۔ برہان نے اس سے سوال کیا کہ اب وہ زندگی کو کس طرح دیکھتی ہے؟ اسپتال سے باہر آکر اس کی کیا مصروفیات ہوں گی؟

”پہلے تو کھلی فضا میں جی بھر کر سانس لوں گی پھر خوف سے آزاد زندگی کو انجوائے کروں گی۔“ رابی نے جواب دیا تھا۔

”پھر آپ کے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ تلاش کریں......“ برہان نے مارے احساسِ ذمے داری کے پوچھ لیا تھا۔ روما سے وابستہ ہر رشتہ اس کی ذات کا حصہ تھا۔

”ارے نہیں...... اب زندگی کو رشتوں سے بوجھل نہیں بنانا ہے...... اتنی مشکلوں سے تو ہلکے، پھلکے ہوئے ہیں۔“ رابی کے لہجے میں تلخی کے بجائے تازگی تھی۔

”اچھی پارٹنر شپ بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔“ برہان نے دلیل دی۔

”اور نعمت ہمیشہ نہیں رہتی......“ رابی نے برجستہ کہا اور بہت گہری نظر سے برہان کی طرف دیکھا تھا۔

”کسی کو ایک نظر دیکھ کر اپنا ہونے کا احتمال ہوا تھا...... وہ اپنا تو تھا مگر کسی مناسب اور معتبر حوالے سے۔“

”آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں؟“ برہان بڑی سادگی و ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔

”جو سو سال میں سوچنا تھا...... وہ پچیس سال میں سوچ لیا۔ اب اس جاب سے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔“ رابی ہنس پڑی تھی۔

”زوردار دیکھے، کرپٹ دیکھے...... تو سوچو ہے کھا کر جج کو جانے والی بلیاں دیکھیں...... لوگ اتنا زور شور

...تے ہیں پھر آرام سے مر جاتے ہیں۔'' رابی کا لہجہ معنی خیز اور برہان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''میری آنکھوں میں دیکھیے برہان......'' بڑا عجیب مطالبہ تھا۔ برہان بری طرح سٹپٹا کر رہ گیا۔

''دیکھیے ناں......'' رابی نے اصرار کیا...... برہان نے جھجکتے ہوئے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

''میری آنکھیں کتنی چمک دار ہیں...... بالکل صاف شفاف...... پتا ہے کیوں......؟'' وہ پھر سوال ...ر رہی تھی۔

برہان بری طرح الجھ رہا تھا۔

''اس لیے کہ میں نے ہر شے کو اس کے جائز مقام پر رکھنا سیکھ لیا ہے۔ اب جیسی میری آنکھیں ہیں ویسا ...ں میرا دل...... روما آپ کے ساتھ اتنی مطمئن و خوش دکھائی دیتی ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے میں نے اسے یہ خوشی ...زار سے خرید کر دی ہے۔''

برہان کی سمجھ میں خاک نہیں آیا پھر بھی مدبروں کی طرح سر ہلا رہا تھا۔

☆☆☆

اندھیرا تو روشنی کا پہلا قدم ہے
اندھیرا تو رنگ و نور کا نظم ہے
اندھیرا نہ ہو تو اجالا کیا
اندھیرا نہ ہو تو شوالہ کیا
اندھیرے سے تو روشنی کا امکان ہے
اندھیرا ہی روشنی کی پہچان ہے
اندھیرے سے گھبرانے والو
اندھیرے سے خوف کھانے والو
سنو......!
آج کے اندھیرے کل کے اجالے ہیں
شب کے ہاتھوں نے جو اُچھالے ہیں
آؤ......!
اندھیروں سے گزر جائیں
جئیں اس ادا سے کہ امر ہو جائیں
چلو......!
اب اندھیروں سے ڈرنا چھوڑیں
اجالے کے سواگت کو دوڑیں
زندگی اس مکاں میں اِک بار ملتی ہے
جو ساتھ دے تو لامکاں تک ساتھ چلتی ہے
یارو......!
اندھیرا روشنی کی امانت ہے

اجالوں کی ضمانت ہے
ڈاکٹر مہر جان کی پرشکوہ کوٹھی کے دائیں جانب بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر بڑی خوب صورت خطاطی میں Mother hood day care لکھا ہوا تھا۔

روما چھ ماہ کی معیشہ کو گود میں اٹھائے کاندھے پر اُس کی ضروریات سے بھرا بیگ لٹکائے ہال میں داخل ہوئی...... رابی گود میں ایک سال بھر کے بچے کو بھرے فیڈر سے دودھ پلانے کے جتن کر رہی تھی۔ تین چار میڈ سات، آٹھ بچوں کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔

رنگ برنگے کھلونوں، جھالروالی cots سے سجا ہوا بڑا سا ہال بہت پُررونق تھا...... بچوں کے رونے کی آوازوں سے ماحول بہت دلچسپ ہو رہا تھا۔ رابی نے روما کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر معیشہ کے رخسار پر بوسا دیا۔

''کہیں جارہی ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... مگر معیشہ آپ کے پاس رہے گی...... اب یہ بھی آپ کے ڈے کیئر...... سینٹر کی مہمان ہے...... آپ ہی سنبھالیں گی اسے۔'' روما بولی۔

''خیریت...... تم کہاں جارہی ہو؟'' رابی نے حیرت سے سوال کیا۔

''برہان نے لیدر گارمنٹس کی فیکٹری اسٹارٹ کردی ہے۔ مگر ان کا آؤٹ ڈور کام بہت ہے...... اِن ڈور میں دیکھوں گی...... ابھی ہمارے بجٹ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی heavy salaried منیجر افورڈ کرسکیں...... کمائیں گے تو دیں گے ناں......'' روما بیگ رکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ وہ بہت بُردبار، ذمّے دار اور پُراعتماد نظر آرہی تھی۔

''افوہ...... بڑی ذمّے دار بن گئی ہو......'' رابی نے میڈ کو اپنے پاس اشارے سے بلاتے ہوئے روما کو چھیڑا۔

میڈ قریب آئی تو رابی نے بچہ اور فیڈر اسے تھمادی اور معیشہ کو گود میں لے کر چومنے لگی۔

''برہان کی ڈٹو کاپی ہے یہ......'' وہ پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اب اس کا دل کائناتی محبت کی شاہراہ عام تھا۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

''سریلیک، دودھ، فیڈر، کپڑے، پیمپرز...... سب اس میں ہیں۔'' روما نے پرپل کلر کے دیدہ زیب بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اوکے...... جاؤ تم اپنا کام کرو...... میرا مطلب ہے ہر سال نئے کلینڈر کے ساتھ ایک بے بی...... یا بابا آنا چاہیے...... بندے کو الجھا کر اپنے ساتھ لگائے رکھنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔'' رابی نے شرارت سے کہا۔

''توبہ ہے آپا......'' روما شرما گئی پھر اس نے رابی کے رخسار پر محبت بھرا بوسہ ثبت کیا۔

☆☆☆

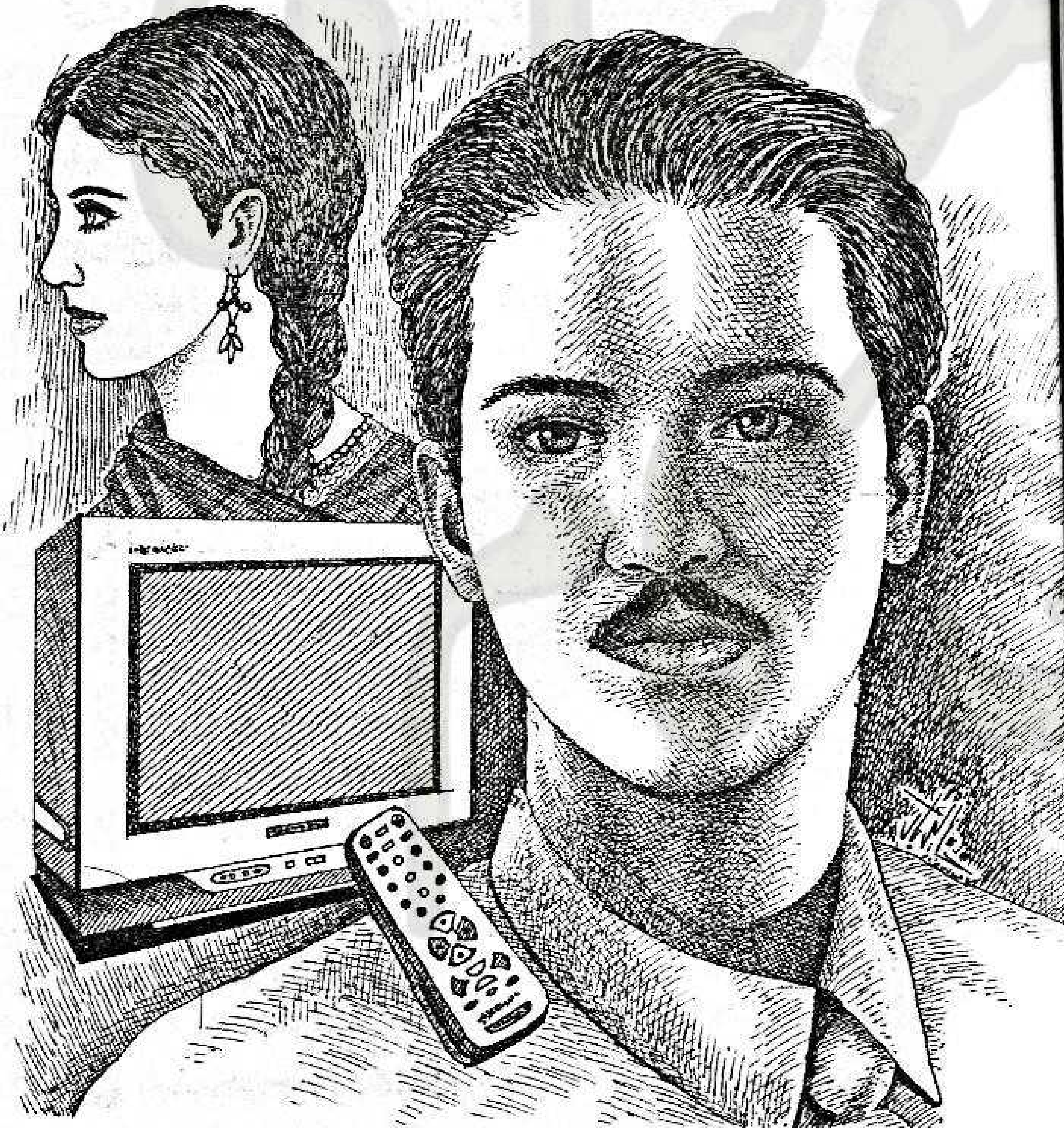
کائناز کے گھر کے سامنے ایک بڑا ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ گیٹ چوپٹ کُھلا ہوا تھا۔ مزدور ٹرک سے سیمنٹ، بلاکس وغیرہ اتار کر اندر لے کر جارہے تھے۔ کچھ مزدور چھت پر چڑھے ہوئے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شاہ عالم کی کوٹھی کی چھت پر بنی ہوئی چہار دیواری، چار فٹ اونچی تھی۔ کائناز اس چہار دیواری کی اونچائی آٹھ فٹ کروا رہی تھی تاکہ کسی وقت وہ چھت پر جائے تو روما کا گھر اسے دکھائی نہ دے۔ اپنے گھر کی چھت پر کھلی ہوا میں بیٹھنے کا آخر اس کو پورا، پورا حق تھا۔ اُسے شعلوں کو ہوا دینے والی ہوا نہیں چاہیے تھی۔

(ختم شد)

قولِ و فعل

ہالہ احمد

''بھئی تم جو مرضی کہہ لو! میں اب لاکھ کوشش کرلوں مگر فرحینہ سے پہلے کی طرح تو ہرگز نہیں مل سکتی۔'' اریبہ نے کوئی تیسری مرتبہ یہ جملہ ادا کیا تھا۔ وہ پچھلے بیس منٹ سے موبائل فون کان سے لگائے اپنی کسی سہیلی سے محوِ گفتگو تھی...... سامنے ہی صوفے پر ان کا شوہر ساجد بھی بیٹھا تھا جو اپنی توجہ ٹی وی پر چلتے ایک دلچسپ شو کی جانب مبذول رکھنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا مگر اریبہ کی طویل تر ہوتی بحث



اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ تھوڑی، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھتا مگر اریبہ بالکل بھی اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنی بحث کی طرف لگا ہوا تھا۔ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کو وہ تیار نہیں تھی۔

بات صرف اتنی تھی کہ اریبہ کا اپنی سہیلی فرحینہ سے کچھ عرصہ پہلے کسی بات پر اختلاف کے بعد بول چال اور ملنا جلنا ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ بقولِ اریبہ کے فرحینہ اس سے بلاوجہ اختلاف کر رہی تھی اور اپنی بات کو درست ثابت کرنے پر اریبہ کو چاہے کتنی بھی لمبی بحث کرنا پڑتی وہ کامیابی کے ساتھ کرتی۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا تھا کہ فرحینہ نے غصے میں آ کر فون ہی پٹخ دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، دونوں میں کوئی رابطہ دوبارہ نہیں ہو پایا تھا۔ دونوں آپس میں اچھی دوست تھیں سو دوسری تمام دوستوں کو اس بات کا خاصا قلق تھا...... اور وہ وقتاً فوقتاً دونوں کے دل صاف کرنے کی کوششوں میں لگی رہتیں۔ اس وقت بھی دونوں کی مشترکہ دوستوں میں سے ایک دوست اریبہ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ فرحینہ سے تعلقات بحال کر لے...... جبکہ اریبہ کا کہنا یہ تھا کہ وہ اب کبھی فرحینہ سے پہلے جیسے تعلقات نہیں رکھ پائے گی اس لیے یہ کوشش بیکار ہے۔ اریبہ تو کسی طرح مان کر نہ دی مگر دوسری طرف اس کی دوست نے تھک ہار کر اسے خدا حافظ ضرور کہہ دیا تھا۔ اریبہ نے سر جھٹک کر موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھا تو ساجد نے بھی سکون کی سانس لی اور اس سے بولا۔

''کیا حرج ہے یار اگر تم اپنی دوست سے ایک بار مل لو...... سارے گلے دُور ہو جائیں گے ختم کرو بس اب بات کو۔''

''ساجد مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں فرحینہ سے ملنا نہیں چاہتی۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ اس سے ملنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے دل میں جو گرہ ایک دفعہ لگ گئی ہے۔ وہ کبھی نہیں کُھلے گی...... تم جانتے ہو اس بات کو۔'' اریبہ نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

''بہت پرانی دوست ہے وہ تمہاری۔'' ساجد نے کوشش جاری رکھی تھی۔

''بے شک! مگر میرے دل سے کسی بات کا نکلنا بہت محال ہے۔'' اریبہ بھی ڈٹی رہی۔ ساجد کو ہلکا سا غصہ آ گیا پر وہ اپنے غصے کو تھوڑا دباتے ہوئے بولا۔

''محال تو خیر کچھ بھی نہیں ہوتا...... تم اگر چاہو تو تم دونوں کے تعلقات پھر سے بحال ہو سکتے ہیں تم ہی اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار نہیں ہو۔''

''یہ میری بچپن کی عادت ہے ساجد! اب اگر میں چاہوں بھی تو اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک بار اگر کسی کے لیے کوئی بات دل میں آ گئی تو بس پھر وہ نکالی نہیں جاتی مجھ سے۔'' اریبہ نے جیسے تھوڑی سے بے بسی دکھائی۔

''انسان چاہے تو گھٹی میں پڑی عادتوں کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔ یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہیں۔ بس ذرا سی کوشش کی بات ہے...... لیکن اگر تم یہ کوشش کرنا ہی نہ چاہو تو الگ بات ہے۔'' ساجد نہ جانے کیوں اریبہ سے بحث کرنے لگا تھا۔

''نہیں جی، یہ اتنا بھی آسان نہیں عادتیں بڑی مشکل سے چھوٹتی ہیں۔'' اریبہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''کوئی عادت ختم کرنا انسان کے بس سے باہر نہیں ہوتا اریبہ......! وہ چاہے تو اپنی کسی بھی عادت کو آسانی سے چھوڑ سکتا ہے۔ آخر کیا مشکل ہے اس میں؟'' ساجد ایک، ایک لفظ پر زور دیتا بولا تھا۔ اریبہ نے بات کا موضوع ہی پلٹ دیا اور وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''خیر چھوڑیں اس بات کو۔ ۔ ۔ ۔ میں کھانا لگانے لگی ہوں، آپ ذرا اب اپنی توجہ ٹی وی اسکرین سے ہٹا لیں۔'' اریبہ جب بھی صلح کے موڈ

میں ہوتی تو ساجد کو آپ جناب سے بلانے لگتی تھی۔

پانچ منٹ میں کھانا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ وہ رومال میں لپٹی روٹیاں پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''ساجد! کھانا لگ چکا ہے، ٹی وی بند کر دیں اب۔'' اسے کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھنا سخت ناپسند تھا اور ساجد کو اتنا ہی پسند...... ساجد ٹیبل پر تو آ گیا تھا مگر نظریں ہنوز اسکرین پر ہی لگی تھیں۔ اریبہ نے اس کی پلیٹ میں سالن نکالا اور اسے روٹی تھماتے ہوئے بولی۔

''میں کہہ رہی ہوں ٹی وی بند کرو اب کھانا تو کھا لو سکون سے۔'' ساجد کی توجہ تو ٹی وی سے نہ ہٹی البتہ اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا۔

اریبہ چند لمحے تو دیکھتی رہی پھر رہ نہ سکی۔

''تمہیں پتا ہے مجھے کھانے کے وقت ٹی وی دیکھنا کتنا برا لگتا ہے...... ایسا بھی کیا؟ بندہ کھانا تو سکون سے کھائے ایک دوسرے کے ساتھ۔''

''بھئی مجھے عادت ہے ناں کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھنے کی۔'' ساجد نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''تو ختم کرو اس عادت کو۔'' اریبہ تنک کر بولی۔ جس پر ساجد نے صفاچٹ انداز میں جواب دیا۔

''ارے بچپن کی عادت ہے میری...... ایسے کیسے جائے گی بھلا؟ ٹی وی نہ چل رہا ہو تو میں کھانا نہیں کھا سکتا......'' اریبہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

''کوئی بھی عادت ختم کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔ انسان چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ جتا رہی تھی...... مگر ساجد کی توجہ ہرگز بھی اس کے لہجے کی طرف نہ تھی جو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''انسان تو اس قدر بااختیار ہے کہ وہ اپنی گھٹی میں پڑی عادتوں کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ کوشش تو کرے......''

''نہیں بھئی نہیں...... اتنا آسان نہیں ہوتا، اپنی عادت کو چھوڑنا اور وہ بھی بچپن کی عادت...... میرا تو کھانا محال ہو جائے اگر میرے سامنے ٹی وی نہ ہو تو۔'' ساجد جتنے بے پروا انداز میں کہہ رہا تھا اریبہ اتنی ہی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساجد کی نظریں پلیٹ سے ٹی وی اور ٹی وی سے پلیٹ کے درمیان ہی بھٹک رہی تھیں۔ اریبہ نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھا اور خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ ساجد کی نظریں اب بھی ٹی وی کی طرف تھیں۔ کچھ دیر پہلے بیوی کو یہی سبق دینے والا ساجد دس منٹ میں خود بھی سب کچھ بھول چکا تھا۔

ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



آٹھواں حصہ



ہالہ صاحبہ کی دعوت کے لیے اس نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا...... ڈیڑھ گھنٹا لگا کر تو اس نے محض صرف کھانے پینے کی اشیا کے متعلق لسٹ بنائی تھی، سوسے سے لے کر پفان کوخن تک البتہ پڑا اس نے خود ہی بیک کر لیا تھا، کیرشے، ار دبیرے اور پفیر زخ کی سلاد بنائی پھر ہن خن (چوزے کے گوشت) کو سیخوں پر بھونا...... کوئلے دہکا کر سیخوں پر بوٹی چڑھا کر پکانے کا الگ ہی مزہ تھا تاہم یہاں وہ کوئلے لانے کا تردد کیسے

کرتی......؟ نرم، نرم بوٹیوں کو سیخوں میں گھُما کر الیکٹرک تندور میں پکایا تھا۔ پھر جب ایک، ایک کر کے تمام سیخیں ٹرے میں سجائیں تو پورا کچن اشتہا انگیز خوشبو سے مہک گیا تھا...... املی اور آلو بخارے کی چٹنی بوٹیوں پر پگھل رہی تھی...... کھٹی میٹھی اور نمکین سے ذائقے اور خوشبو میں لتھڑی بوٹیوں نے چاچو کو کمرے سے کھینچ کر باہر نکال دیا تھا...... وہ خوشبو کا پیچھا کرتے دبے قدموں کچن میں چلے آئے...... مالا نے سیخیں ٹرے میں سجا کر رکھی تھیں۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اور اب وہ پزا بیک کرنے کی تیاریوں میں مگن تھی۔

چاچو نے ایک سیخ اڑائی اور پھر الٹے قدموں واپس ہولیے۔ عموماً عیسٰی ان کا ڈائٹ چارٹ بناتا تھا جس میں ایسی کسی بد پرہیزی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی...... مگر وہ کبھی کبھار ایسی انجوائے منٹ ضرور کرلیتے تھے۔ اب ہوا یوں کہ چاچو چپکے سے کھسک لیے تھے جبکہ مالا کو ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ جیسے کوئی کچن میں دبے قدموں داخل ہوا تھا... پزا کے لیے ٹائمر سیٹ کرتے مالا کے ہاتھ ہولے سے کپکپا گئے تھے۔ اس کا دل یک لخت بہت زور سے دھڑکا تھا مگر اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ خوف کچھ اس طرح سے حواسوں پر چھایا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ ”اوف“ کی بھیانک آواز نے مالا کو گردن موڑ کر پہلے دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ پھر چاچو کو سیخ چھپاتے اور ہونٹ سہلاتے دیکھ کر مالا گویا سمجھ گئی تھی۔ وہ گرما گرم بوٹی منہ میں رکھنے کی غلطی میں ”پکڑے“ جا چکے تھے۔ صورت حال مضحکہ خیز تھی۔ مالا کو بے طرح ہنسی آگئی۔

”دیکھ لیا چوری کرنے کا انجام......“ وہ صافی سے ہاتھ پونچھتی چاچو تک آئی تھی جو ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم اسے ہنستا دیکھ کر قدرے برا مان گئے۔

”تم ہنس لو، ہمارے حال پر......“ وہ پھونک مار کر خالص دیسی طریقے سے بوٹی کھاتے ہوئے مزے سے بولے تھے۔ مالا انہیں کیے بعد دیگرے تیسری بوٹی پہ ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر فوراً چیخی تھی۔

”بس کریں چاچو! کیوں اپنے بیٹے سے مجھے پٹوانا ہے۔“ وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ املی کی کھٹی چٹنی کے اثرات جلد ہی ان کی خرابیِ طبیعت کی صورت میں ظاہر ہوسکتے تھے پھر عیسٰی کا غصہ سہنا الگ تھا...... وہ اس بات پر ذرا بھی کمپرومائز نہیں کرتا تھا۔ اپنے باپ کی صحت اور ان کی زندگی عیسٰی کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔ وہ اپنے باپ پر جان دیتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ مما کی دائمی جدائی پر وہ جلد سنبھل گیا تھا مگر باپ سے کچھ ایسا لافانی عشق تھا کہ اسے لگتا، پاپا کو کچھ ہوگیا تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گا...... کچھ ایسی ہی محبت میں وہ مبتلا تھا۔ جب سے وہ اسپتال رہ کر آئے تھے تب سے تو عیسٰی کچھ زیادہ ہی بے یقینی کا شکار تھا۔ گھر میں ہوتا تو رات کو لازمی دو تین مرتبہ پاپا کے کمرے میں جھانک کر آتا۔ اکثر وہ عیسٰی کی چوری پکڑ لیتے۔ وہ آتا بھی تو دبے پاؤں تھا۔ پاپا کو سوتا دیکھ کر پُرسکون ہوجاتا اور جاگتا دیکھ کر جھینپ جاتا۔

”نہیں مرنے والا میں...... ابھی تمہارے بچوں کے بچوں کو بھی کھلانا ہے۔ کیوں دھڑکا لگا رہتا ہے تمہیں۔“ اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تب عیسٰی کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کی خوب کلاس لیتے مگر اس ڈانٹ ڈپٹ میں بھی محبت کا الگ قسم اور رنگ کا ذائقہ گھلا ہوتا تھا۔ وہ عیسٰی ہی کیا جو اُن کی ڈانٹ پر کان دھر لیتا...... اس نے اپنی روٹین ترک نہیں کی تھی۔ وہی صبح ان کو اپنی نگرانی میں کچھ نہ کچھ کھلاتا، لنچ ٹائم میں مالا کو ہدایات اور ڈنر کے وقت پھر سے کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ اکثر چاچو چڑنے لگتے۔

”میرے کھانے پینے کے دشمن! کھالینے دو مجھے، اپنے حصے کا رزق ختم کرتا ہوں۔“ وہ بد پرہیزی میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھے۔ انہیں بھلا کون روک سکتا تھا۔ جس طرح مالا اب بھی انہیں روک نہیں پائی تھی اور وہ مزے سے کوک کا گلاس بھی چڑھا گئے تھے پھر جیسے

انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

”یہ نینی کدھر ہے؟“ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ذرا حیران ہوئے۔

”وہ چھٹی پر ہے۔“ مالا نے بے پروائی سے بتایا تھا۔ وہ سادہ اسفنج کیک شیشے کے چمکیلے باؤل میں سجا کر کیک کے اوپر جیم کی موٹی تہ جما رہی تھی پھر اس نے کیک کے سینڈ وچ بنالیے، درمیان میں خوب ڈھیر سارا جیم بھر رکھا تھا۔ ان سلائسز کو کرسٹل کے ڈش نما باؤل میں سلیقے سے اس نے پھیلا دیا تھا۔ اب وہ فریج سے دودھ نکال رہی تھی جس میں اس نے بالائی پہلے سے مکس کر رکھی تھی۔ کام کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان چاچو کی طرف تھا۔

”یہ نینی بہت چھٹیاں کرنے لگی ہے۔ اسے خبر بھی ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں مگر یہ سیلفش لوگ، بس اپنی دفعہ ہزار رونے سنا دے گی مگر دوسروں کی پروا نہیں۔“ انہیں مالا کی بہت فکر تھی سو اسی لیے نینی کو ڈانٹ رہے تھے حالانکہ نینی کو اس گھر میں خاصی کھلی چھوٹ دی گئی تھی۔

”میں ٹھیک تو ہوں چاچو......“ مالا جھینپی جھینپی سی بولی تھی۔ آج کل اس کی خرابیِ طبیعت بھی عیسٰی اور چاچو کے لیے سخت قسم کا ایشو بنا ہوا تھا۔ ان دونوں باپ، بیٹے کو مالا کے آرام، صحت اور ڈائٹ کے متعلق ہدایات دینے کا خبط سوار تھا اور دونوں ہی مالا کے لیے حد درجہ کانشس تھے۔ چاچو کو تو مالا کا کچن میں ان دنوں جانا سرے سے گوارا ہی نہیں تھا۔ یہ تو مالا جان بوجھ کر ضد کرلیا کرتی تھی۔ ویسے بھی وہ آرام کر کر کے اور فارغ رہ، رہ کر اکتا چکی تھی۔ ان دنوں عیسٰی نے اس کا شولے جانا بھی بند کر رکھا تھا سو وہ کبھی اکتائیاں کرتی اور کچھ دیر آرام کر کے پھر کچن میں گھس جاتی۔ دراصل کچن کی مصروفیت کے علاوہ کوئی اور مصروفیت بھی تو نہیں تھی۔

”ہاں...... ٹھیک تو ہو ماشاء اللہ سے۔“ انہوں نے مالا کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولے۔ ”کب تک آئیں گے مہمان؟“ ان کی نگاہ گھڑی پر جمی تھی، مالا نے بھی گھڑی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”بس ایک گھنٹے تک......“ اب وہ جیم بھرے کیک کے ٹکڑوں پر ٹھنڈا کسٹرڈ ڈال رہی تھی۔ پھر اس نے کٹی ہوئی چیری اور کیلے بھی کسٹرڈ پر پھیلا دیے۔ جیلی کے ٹکڑے بھی سج گئے تھے۔ یہ کچن میں آخری آئٹم اس کے ہاتھوں تیار ہوا تھا۔ اب وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے ہی باہر نکل آئی تھی۔ چاچو کمرے میں جانے کے بجائے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ یقیناً مہمانوں کے استقبال اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے...... ویسے بھی ہالہ صاحبہ کا ان لوگوں کے دلوں میں بڑا احترام بھر گیا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب انہوں نے مالا کے دل سے آسیب کا وہم نکال دیا تھا۔ اب چاچو اسے آسیب کے حوالے سے چھیڑتے نہیں تھے، وہ تو اسی بات پر ہالہ صاحبہ کے شکر گزار تھے جنہوں نے مالا کے ذہن سے وسوسے نکال دیے تھے۔ اب بھی ہالہ صاحبہ کے متعلق باتیں کرتے انہوں نے اچانک افی کی فیملی کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔

”کیا سامنے والوں کو کھانے پر نہیں بلایا؟“ چاچو نے کچھ چونک کر مالا سے پوچھا تھا جو جانے کس مراقبے میں مصروف تھی۔ ایک دم ہڑ بڑا کر اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بلایا ہے چاچو......! عیسٰی نے خود انہیں انوائٹ کیا ہے۔“ مالا کچھ کھنچے، کھنچے انداز میں بولی تھی۔ چاچو نے اپنے دھیان میں مالا کا رویہ نوٹ نہیں کیا تھا ورنہ وہ ضرور کھٹکتے...... افی کی فیملی سے مالا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں بخوشی کھانے پہ بلاتی مگر آج کے بلاوے کا کچھ خاص مقصد تھا۔ یعنی آج عیسٰی، افی کی ممی سے آفاق اور افی کے نکاح کی بات کرنے والا تھا اور مالا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ عیسٰی کو کیسے روکے...... افی کو آفاق کی اصلیت کیسے بتائے؟ اور وہ اس بہت اچھی فیملی کو آفاق کے ”شر“ سے کیسے محفوظ کرے، کبھی اس کا دل چاہتا وہ افی کو صاف،

صاف آفاق اور سوزن کی ملی بھگت کا بتادے......؟ مگر وہ بتائے بھی کیا......؟ اگر کسی نے ثبوت مانگ لیا تو...... یہاں آکر اس کے تمام ارادے ڈانواں ڈول ہوجاتے تھے۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ کبھی عیسیٰ اور افی کو آفاق کے کرتوت بتاسکے گی۔ یہ کہ رات کی تاریکی میں وہ مالا کے گھر میں، مالا کو ہی آسیب کا دھوکا دے کر سوزن اور مون کے ساتھ گہری پلاننگ کے بعد سے ''خوفزدہ'' کررہا ہے۔ بات عقل میں سمانے والی تو تھی اگر کوئی سمجھ لیتا تو تب ناں...... افی تو عیسیٰ کی طرح ہی آفاق کی اچھائیوں اور محبت میں اندھی ہوچکی تھی۔ اسے تو آفاق کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح عیسیٰ بھی آفاق پر اندھا اعتماد کرتا تھا...... اگر جو میکس کے گھر میں ہونے والی سوزن، مون اور آفاق کی گفتگو عیسیٰ کو سنوادی جاتی تو تب...... ہاں تب عیسیٰ یقین کرسکتا تھا...... پھر اسے کسی اور ثبوت کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی...... اور شاید بہت سے لوگ آفاق کے شر سے محفوظ رہ جاتے۔ تو کیا اسے کوئی ریکارڈ پلیئر اپنے ساتھ رکھنا چاہیے تھا؟ ہُوں، ہاں، وہ ایک ریکارڈ پلیئر ضرور خریدے گی۔ پہلی فرصت میں، آج نہیں کل ہر صورت......'' وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ کر مطمئن ہوگئی تھی۔ چاچو اس کی سوچوں سے بے نیاز مشہور اتھلیٹ کارل لیوس کے کارنامے ٹی وی پہ ملاحظہ کررہے تھے پھر انہوں نے گردن موڑ کر مالا کو دیکھا اور بولے۔

''میں عیسیٰ سے کہوں گا، اب آفاق اور افی کے بارے میں بھی کچھ سوچ لے۔ افی کے یہاں آنے سے تمہاری تنہائی بٹ جائے گی۔ میں بڈھا تو بیماری کے جھٹکے کی وجہ سے اب بولنے اور گپ شپ لگانے سے بھی ریٹائرڈ ہوگیا ہوں۔'' وہ مالا کو گم صم بیٹھا دیکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کررہے تھے۔ مالا کچھ سوچ کر سیدھی ہوگئی تھی پھر اس نے حیرانی سے چاچو کو مخاطب کیا تھا۔

''تو کیا شادی کے بعد بھی آفاق اِدھر رہے گا؟''

اس کے لہجے میں واضح چبھن اور ناگواری تھی۔ یوں کہ لاؤنج کے دروازے سے اندر آتا آفاق لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''میری اور عیسیٰ کی خواہش تو یہی ہے۔ تاہم آفاق شاید نہ مانے۔'' چاچو نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ گویا اس موضوع پر وہ آفاق سے طویل بحث کرچکے تھے مگر آفاق شاید مان نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود مالا نے حیرت اور ناگواری کا برملا اظہار کرتے ہوئے آفاق کے سر پر طنز کی ضربیں ماری تھیں۔ وہ آفاق کو اندر آتے اور دروازے میں رکتے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ اتنا سنہری موقع بھلا کیسے گنوادیتی۔ آفاق کو غیرت دلانے کا یہی تو بہترین وقت تھا۔

''آفاق کیوں نہیں مانے گا، یہ جگہ ہر لحاظ سے بہتر ہے اس کے لیے، نہ کرائے کا جھنجٹ اور نہ کھانے کا بل...... سب کچھ ریڈی میڈ اور فری میں مل جاتا ہے۔'' مالا نے کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے آفاق کے جوتے نظر آرہے تھے۔ وہ زمین پر پیر جمائے کھڑا تھا۔ شاید خفت زدہ تھا یا غصے میں۔۔۔ بہرحال، مالا اس کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ وہ آفاق کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔

''وہ تو بڑا خوددار لڑکا ہے بیٹا......! بس عیسیٰ کی وجہ سے مجبور ہوجاتا ہے۔'' چاچو نے برابر آفاق کی حمایت جاری رکھی تھی۔ اِدھر مالا، آفاق کی تلملاہٹ کا مزہ لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھپ کر ذلیل اور خوفزدہ کرتا تھا، مالا اسے سامنے کھڑا کرکے طنز کے تیر پھینک رہی تھی۔ اب اتنا تو وہ جانتی ہی تھی کہ آفاق اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے والا نہیں۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت تو اس میں غیرت ضرور ہوگی۔ اب مالا کے اتنے کھلم کھلا اشارے کو بھی نہ سمجھتا تو پھر آفاق کی مکاری پر بھی لعنت ہی تھی مگر وہ بے غیرت اتنی مراعات چھوڑ کر جاتا بھی کیوں...... یہاں سے چلا جاتا تو مالا کو آنوں بہانوں سے خوف زدہ کیسے کرتا؟ آفاق کو تو ہر پہلو پہ سوچنا تھا جبکہ مالا سمجھ رہی تھی کہ اس کی طنزیہ گفتگو سن کر وہ بوریا بستر سمیٹے فوراً نو دو گیارہ ہوجائے گا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ وہ چاچو کے محبت بھرے جملوں کو سیلوٹ کرتا فوراً اندر چلا

آیا تھا۔ پہلے کی طرح ہشاش بشاش اور ہنستا مسکراتا...... وہ کمال کا ایکٹر تھا۔ اتنی بکواس سن کر بھی بے غیرتوں اور ڈھیٹوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اپنے جلد آنے کی اس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ عیسیٰ نے اسے گھر بھیجا تھا تاکہ وہ مالا کی کچھ مدد کروادے۔ مارکیٹ سے کچھ لانا ہے تو وہ بھی لاکردے۔ چاچو تو آفاق کو دیکھ کر ویسے بھی کھل اٹھتے تھے۔ اب بھی اسے کچن کے کاموں میں دلچسپی لیتا دیکھ کر فوراً بولے۔

''مالا نے سب کچھ بنالیا ہے۔ تم چینج کرکے آجاؤ، شطرنج کی ایک بازی ہوجائے۔'' چاچو کا جوش دیدنی تھا۔ مالا پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی تھی جبکہ آفاق نے مسکراتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ایسا ڈھیٹ اور بے غیرت انسان مالا نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میکس کی پارٹی کے بعد سے مالا نے آفاق سے بات چیت بند کررکھی تھی۔ وہ اس کا ناشتا بھی نہیں بناتی تھی اور جب بھی موقع ملتا طنز کے تیر پھینک دیتی۔ اس کا اکھڑا اکھڑا رویّہ ابھی تک کسی اور کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ عیسیٰ نہ سہی چاچو تو لازمی وجہ دریافت کرتے۔ وہ آفاق کے ساتھ ان دنوں کسی کوڑھ زدہ مریض جیسا سلوک کررہی تھی۔ اس کے نزدیک آفاق اس رویّے سے بھی زیادہ کا حق دار تھا۔ جو کچھ وہ اپنے کانوں سے سن کر آئی تھی اس پر کوئی اور بے شک یقین نہ کرتا تاہم وہ خود تو آفاق کی ذہنی غلاظت سے واقف ہوچکی تھی پھر کیسے پہلے کی طرح آفاق کے ساتھ مخلص رہتی اور آفاق اتنا ڈھیٹ اور خبیث تھا کہ مالا کے مزاج اور تیور دیکھ کر بھی سوال نہیں کرتا تھا۔ اپنے کرتوت جانتا جو تھا کہ اگر مالا سے وجہ پوچھی تو اپنی ہی گردن شکنجے میں آپھنسے گی۔

وہ زیادہ دیر آفاق کی کمینگی پہ غور و فکر نہیں کرسکی تھی۔ جلد اسے باہر آنا پڑا تھا۔ عیسیٰ گھر آچکا تھا اور اب مہمان بھی آرہے تھے۔ افی کی پوری فیملی آچکی تھی، اس کا بھائی ابھی تک پاکستان میں تھا اور فی الحال واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ایمی، افی اور ان کی ممی تشریف لے آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ابوبکر، ہیرا اور ہالہ صاحبہ بھی آگئیں پھر میکس، انجلس اور ایوا بھی پہنچ گئے تھے۔ عیسیٰ نے اپنے ایک دو قریبی جاننے والوں کو بھی بلا رکھا تھا۔ کیونکہ اس تقریب میں باقاعدہ آفاق اور افی کے نکاح کی ڈیٹ بھی رکھی جانی تھی۔ ہالہ صاحبہ کے اعزاز میں دی گئی یہ دعوت بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ کم از کم...آفاق کے لیے تو بہت ہی مبارک تھی۔ اس کے من کی مراد بر آئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اسی طرح افی کے پیر بھی زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ مالا ان دونوں پر سوائے افسوس کرنے کے کچھ اور نہیں کرسکتی تھی۔ آفاق کو تو خوش ہونا ہی تھا۔ اس کی زندگی سنور رہی تھی۔ اس کا فیوچر بننے والا تھا۔ کچھ سال اور گزرتے تو نیشنلٹی بھی مل جاتی پھر افی کا کیا حشر ہوتا؟ یہ مالا تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی۔ اتنی حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی کو آفاق کے ہاتھوں خوار ہوتے دیکھنے کا حوصلہ کم از کم مالا میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ صرف ایک مرتبہ تو وہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے افی کی آنکھیں ضرور کھولے گی۔ آگے جو بھی ہو، وہ اس کے نصیب ہوں گے یا احمقانہ فیصلے...... کم از کم وہ گلٹی فیل تو نہیں کرسکے گی ناں...... اسے یہ دیکھ کر اور پچھتاوا تو نہ ہوگا کہ اس نے افی جیسی لڑکی کو دھوکے میں رکھا اور آفاق کی گھناؤنی شکل دکھا نہیں پائی۔

اس تقریب کے اختتام پر بزرگ مہمان گھروں کو روزانہ ہوگئے تھے جن میں ہالہ صاحبہ بھی شامل تھیں۔ البتہ مالا کے کچھ کلاس فیلوز اور افی، ایمی ابھی تک یہیں تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ابوبکر اور ہیرا نے برج کھیلنے کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ یہاں پر تقریباً سبھی برج کے شائقین تھے جن میں عیسیٰ صاحب بھی سرفہرست تھے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کم از کم مالا کے لیے ایک واقعہ ہی تھا۔ کنٹریکٹ برج سے پہلے مون صاحبہ تشریف لے آئیں۔ توقع کے برخلاف، بالکل اچانک، بیمار باپ کا احوال پوچھنے تو آنہیں سکی تھی۔ اب جانے کس مقصد کے تحت آئی تھی۔ سوزن،

آفاق کے بعد اسے اب مون سے بھی نفرت سی ہونے لگی تھی۔ یہی تو تھی جس کی پلاننگ کے اہم کردار آفاق اور سوزن تھے۔ اصل فساد کی جڑ تو مون تھی۔ آفاق اور سوزن تو محض پتلیاں تھیں جن کی ڈوریں مون حسیب نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں اور زمین پر تکبر کی ایک واضح مثال بنی بیٹھی تھی۔

وہی لمبا سا گھیر دار بوارین فراک پہنے جس کی فرل کارپٹ کو چھوتی تھی۔ بلاؤز کا گلا سفید موتیوں سے کڑھا تھا۔ گلے میں ننھے سے موتی کا نیکلس جو دودھ جیسی گردن سے چپک گیا تھا۔ اس کے بال آج بھی انتہائی ریشمی اور چمکدار سرخی مائل کمر کو چھوتے تھے۔ اونچی سی پونی میں جگمگاتے ہیرے جیسے موتی سجے تھے اور اس کے سر کا کراؤن جو اسے کسی ریاست کی شہزادی ظاہر کرتا تھا۔ موٹا سا ہیرا جس کے آس پاس یاقوت کے دانے بکھرے تھے۔ اس کے ہیرے کی چمک نے محفل میں موجود کتنے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ جانِ محفل تھی۔ مالا نے آج تک کسی انسانی وجود سے محفل کے رنگ کو بدلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی نے جیسے اتنے ہنگامے اور شور بھرے ماحول کو بجلی کے بٹن دبانے جتنی مدت میں ساکت کر دیا تھا۔ کھلاڑیوں کے ہاتھ میں تاش کے پتے بھنچ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مون کو جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے وہ اس کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گئے تھے۔ اتنا سناٹا لمحے بھر میں چھا گیا تھا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی......

پھر اس جادو نگری کی ساحرہ نے سب کو مخاطب کر کے ماحول پر چھایا طلسم توڑ ڈالا تھا۔ تعارفی مراحل کے بعد وہ برج کی طرف متوجہ ہوئی۔ لمحے بھر میں پارٹنر منتخب ہوئے اور وہ عیسیٰ کی پارٹنر بن گئی۔ اس دفعہ باقی سب کپلز تھے سوائے مالا اور عیسیٰ کے۔ عیسیٰ تو کھیل کی طرف متوجہ تھا جبکہ مالا سانس روکے مون کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہی چکنا سفید بے داغ چہرہ...... جھکی پلکوں والی لمبی آنکھیں اور عجیب تر آنکھیں...... کیا کبھی حسین چہرے بھی خوف زدہ کرتے ہیں؟ ایسا کبھی نہیں ہوا...... ایسا ہوتا ہی نہیں...... مگر مالا کے ساتھ ضرور ہو جاتا تھا۔ جب وہ مون کو دیکھتی تھی اس کے دل پر وحشت سوار ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آتی۔ اسے مون کی حسین صورت سے خوف آنے لگتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی تھی سو وہ اب بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے ہیرا کا چہرہ دیکھا۔ شوخ و شنگ سا ایرانی حسن کا مجسمہ، اس نے انی اور ایمی کو دیکھا، جیسے جرمنی کا حسن ان کے چہروں پر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایوا اور اینجلس کو دیکھا...... وہاں کوئی بھی بدصورت نہیں تھا۔ سب خوش شکل، خوش لباس لوگ تھے پھر مون میں ایسا کیا تھا جو اسے خوف زدہ کر دیتا تھا جو اسے وحشت زدہ کر دیتا تھا۔

اس نے مون کو پھر دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا...... کئی بار دیکھا، ہزار بار دیکھا۔ وہ پلکیں جھپک، جھپک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نرم رخساروں پر جیسے، جیسے...... مکھن، سفید گلابی مائل...... ملائم مکھن پگھل رہا تھا...... جیسے پلکوں کی جھالر مکھن جیسے رخساروں سے چپک گئی تھی۔ وہ نگاہ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھتی تھی۔ یہ اس کی انفرادیت تھی؟ یا انداز تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی۔ مون کسی کو دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی، یہ ایک بات تو جیسے طے تھی۔ اب بھی وہ اپنے بھائی کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی اور عیسیٰ کا بھلا کیا حال تھا؟ مالا شاید لفظوں میں بیان نہ کر پاتی۔ وہ مون کو اتنے نارمل طریقے سے اس کی کسی محفل میں شریک دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ اس خوشی کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ اسے مون کا گھر آنا اور ان کی محفل میں شریک ہونا خوشی سے دیوانہ کر رہا تھا اور نہ صرف مون محفل میں شریک ہوئی تھی بلکہ گیم میں بھی شامل ہو گئی پھر عیسیٰ نے ان سب کو جیسے بڑے تفاخر سے بتایا تھا۔

''میری بہن شطرنج کی گرینڈ ماسٹر ہے۔ اگر یہ کسی عالمی مقابلے میں حصہ لیتی تو دنیا کی سب سے کم عمر عالمی شطرنج چیمپئن بن سکتی تھی۔ اس نے دس سال کی عمر میں شطرنج کھیلنا سیکھا اور یہاں کے گرینڈ ماسٹر مائیکل

کیمے کو شکست دی تھی۔ یہ عالمی سطح پر اپنی نخریلی اور ضدی عادت کے باعث جا ہی نہیں سکی۔ ورنہ ورلڈ ریکارڈ بک میں آج اس کا نام بھی شامل ہوتا اور یہ کارپوف کا ریکارڈ بھی توڑ ڈالتی۔'' عیسیٰ نے مون کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جس محبت اور عقیدت کے ساتھ حاضرین کو اپنی بہن کی ذہانت کے بارے میں بتایا تھا، وہ سب کے لیے حیران کن تھا۔ مون حسیب کتنی ذہین تھی، کتنی قابلیت رکھتی تھی؟ اور وہ کیا تھی۔ شاید مون کا حقیقی بھائی اس کے ساتھ پلنے بڑھنے والا بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ تہ در تہ انکشافات اور ذہانت کا مرقع تھی۔ اللہ نے اسے دو بڑے خطرناک قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر رکھا تھا، ایک حسن اور دوسری ذہانت، اپنے حسن سے وہ خود آگاہ تھی یا نہیں؟ تاہم ذہانت میں اس کی ٹکر کا شاید کوئی نہیں تھا۔ اور اس کے آس پاس رہنے والے لوگ بھی اس کی اصل قابلیت سے اتنے واقف نہیں تھے۔ وہ ایسے سیپ کے مانند تھی جسے آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔ نہ اس کا کوئی رہنما تھا، نہ اسے کوئی رہنما ملا اور نہ کسی کی راہنمائی پائی۔

ورنہ جس طرح 1814ء میں لوچاؤ کے رہنے والے کارل وٹے نے جرمنی کی گیسن یونی ورسٹی سے ریاضی میں ڈاکٹریٹ کی سند بارہ سال کی عمر میں حاصل کی تھی اسی طرح مون حسیب دس سال کی عمر میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ذہین آفیسرز کو چاروں شانے چت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

مگر ہوا کیا تھا؟ اسے کوئی راہنما نہ مل سکا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی قابل تھی کہ یو ایس اے کی ریاست الاباما کے مقام موبائلے سے تعلق رکھنے والے مائیکل کیمے کی طرح دس سال چار ماہ کی عمر میں گریجویشن کر لیتی اور آج اس کا نام بھی سنہری حروف میں لکھا جاتا مگر بہت سارے معاملات میں خوش نصیب ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ انتہا کی بدقسمت بھی تھی۔ اسے پھر کوئی صحیح رہنما نہ مل سکا۔

اور اِدھر اس کا بھائی کتنے تفاخر سے اس کا ذکر کر رہا تھا جیسے وہ عالمی ریکارڈ توڑے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ کوئی خلاباز اور ہواباز تھی، آہ...... وہ تو بس مون حسیب تھی۔ اس کے نام سے پہلے کچھ بھی نہ لگا۔

اور ابھی اس وقت تہ در تہ چھپی ذہانت کے ایک ہی وار میں اس نے برج کے انتہائی کامیاب کھلاڑی ڈاکٹر ابوبکر کو ہرا کر رکھ دیا تھا۔ ابوبکر برج کا شیدائی تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی اسے ہرا نہیں سکتا۔ پہلی مرتبہ وہ پارٹنر کی نااہلی کی وجہ سے ہارا تھا، دوسری مرتبہ وہ اکیلا کھیلا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ مون حسیب سے سو پوائنٹس سے ہارتا گیا تھا۔ وہ سب لوگ دم بخود تھے۔ ابوبکر کو ہرانا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے عیسیٰ بھی حیران تھا اور ہیرا تو جیسے ششدر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی قابلیت سے واقف تھی اور اسے ایک عورت سے ہارتا دیکھ کر منجمد رہ گئی تھی۔

''یہ ٹھیک نہیں، مون نے بے ایمانی کی ہے...... ابوبکر برج میں کم از کم کبھی نہیں ہار سکتا۔'' ہیرا شاکڈ تھی، بے یقین تھی جبکہ ابوبکر بھی کچھ متحیر تھا۔ وہ ننانوے پوائنٹس سے ہارا تھا۔ وہ جیت رہا تھا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ ایک قابل ترین ڈاکٹر تھا، ایک ذہین ترین ماہرِ نفسیات تھا۔ اسے لگا جیسے مون اس کے ہاتھ میں موجود پتوں کو کھوج رہی تھی پھر جیسے اس نے اپنے حق میں جاتا پتا پھینکنا چاہا تو بلا ارادہ ہی اس نے دوسرا پتا پھینک دیا۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ سب غیر ارادی طور پر ہوا۔ وہ پتا پھینک کر حیران رہ گیا۔ مون آخری پتا پھینک کر آخری بچا ہوا پوائنٹ بھی لے گئی۔ یعنی برج کی بازی وہ آرام سے جیت گئی۔ دیکھنے میں یہ ایک کھیل ہی تھا۔ سب اسے کھیل سمجھ کر انجوائے کر رہے تھے۔ عیسیٰ اور مون کو مبارک باد دے رہے تھے مگر ڈاکٹر ابوبکر کا رویہ کچھ مختلف تھا۔ اسے گیم ہارنے کا دکھ نہیں تھا۔ یقیناً یہ ایک گیم تھا مگر اسے کچھ الگ سا فیل ہوا تھا۔ کچھ ایسا جو حیران کن تھا۔ کچھ عجیب تھا، کچھ غیر معمولی تھا، وہ پُرسوچ نظروں سے مون کو دیکھتا رہا، وہ اس کا چہرہ

کھوجتا رہا پھر جیسے مون کے سپاٹ تاثرات نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا مگر وہ اپنے ذہن میں آئے خیالات کو جھٹک نہیں پا رہا تھا۔

دوسرا مقابلہ کوئز کا تھا جس میں اس کی بیوی سمیت مون بھی پیش، پیش تھی۔ دس دس سوالات کا یہ مقابلہ تھا۔ دو، دو لوگوں کے گروپس بن گئے تھے۔ سب سے پہلے میکس اور ایوا نے سوال کیے، جن کے جواب انی اور آفاق نے دیے تھے۔ ان کے دو سوالوں کے جوابات دینے کے علاوہ باقی سب غلط تھے۔ یعنی انی اور آفاق دو پوائنٹ لے کر گیم سے باہر ہوگے۔ اب تالیاں بجا بجا کر دوسروں کو کنفیوژ کررہے تھے پھر اینجلس اور ایمی نے ابوبکر اور ہیرا سے سوال کیے۔ ان کے نو جواب ٹھیک اور ایک غلط نکلا...... اب ابوبکر اور ہیرا نے مون اور عیسیٰ سے سوال کرنا تھے۔ مالا اس دفعہ بھی گیم سے باہر محض خاموش تماشائی تھی اور یک ٹک صرف مون کو دیکھے جارہی تھی جیسے کوئی پتھر کی مورت ہو۔

گیم کے رول اور قواعد کے مطابق ابوبکر نے سوال لکھ کر نیچے جواب بھی لکھ کر اپنی پارٹنر ہیرا کو پرچہ پکڑا دیا تھا تاکہ پارٹنر کنفیوژ نہ ہو۔ سوال لکھنے کے دوران باقی سب لوگوں نے خوب ہاہا کاری مچائی تھی۔ تالیاں، سیٹیاں اور شور بڑھتا رہا۔ جب سوالوں کی باری آئی تب ماحول پہ خود بخود سناٹا چھا گیا تھا۔ مالا بھی ابوبکر اور ہیرا کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ ہیرا بہت پُرجوش تھی۔ اسے امید تھی، اس کے ڈاکٹر شوہر نے جو سوال لکھے تھے ان کے جوابات کم از کم عیسیٰ اور مون نہیں دے سکتے۔ یہ سائنسی سوال تھے، حیران کُن اور ذرا مختلف...... ڈاکٹر بندے سے بھلا اور امید بھی کیا کی جاسکتی تھی، ہیرا کی مسکراہٹوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ لوگ عیسیٰ اور مون کو ہرانے والے تھے۔ باقی لوگ گیم سے پہلے ہی باہر ہوچکے تھے۔ ہیرا کو پورا یقین تھا برج نہ سہی، کوئز مقابلے میں انہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ ہر بندے نے اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال پوچھنے تھے۔ چاہے کوئی ڈاکٹر تھا، ٹیچر تھا یا بزنس مین۔

ادھر مالا عجیب کیفیات کا شکار تھی اسے لگا جیسے برج کی گیم جیت کر مون نے اس پر ثابت کردیا تھا کہ وہ کبھی ہار نہیں سکتی۔ بساط شطرنج کی ہو یا بازی تاش کی؛ اسے صرف جیتنا ہے۔ مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ گیم کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا شوہر مون کا پارٹنر تھا۔ اس کی دعائیں عیسیٰ کے ساتھ تھیں مگر وہ پھر بھی چاہتی تھی مون اس دفعہ ضرور ہار جائے۔ مالا کو لگتا تھا، وہ گیمز جیت کر اس پر بہت کچھ ثابت کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسی لیے گیمز میں حصہ لے رہی تھی۔ وہ مالا کو مزید ہراساں کررہی تھی۔ وہ اسے جتا رہی تھی کہ علی عیسیٰ کی زندگی سے مالا کو نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور وہ جلد اس کی زندگی کا پانسہ بھی الٹنے والی تھی۔

گیم شروع ہوئی تو انی، آفاق، میکس اور ایوا وغیرہ نے چیخ، چیخ کر ہیرا، ابوبکر اور مون، عیسیٰ کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ گیم یوں تھی کہ کچھ سوال عیسیٰ سے کیے جاتے تھے اور کچھ سوال مون سے...... مگر مون نے کہا تھا، وہ سب سوالوں کے خود جواب دے گی۔ اس کے اعتماد نے ابوبکر سمیت سب کو ایک مرتبہ پھر حیران کردیا تھا۔ ابوبکر نے مون سے کہا۔

''ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ عیسیٰ تمہاری مدد کرسکتا ہے۔'' وہ اسے ''جتا'' رہا تھا کہ سوال مشکل ہیں۔ وہ اپنی ذہانت پر اتنا مت اترائے مگر مون نے ناک چڑھا کر انکار کردیا تھا۔ تب عیسیٰ، مالا کو بیٹھنے کا اشارہ کرکے خود اٹھ کر کچن میں ان سب کے لیے چائے بنانے چلا گیا تھا۔ آفاق بھی اس کی مدد کے خیال سے اٹھ گیا۔ باقی لوگ بہت متجسس تھے اور ڈاکٹر ابوبکر کو گیم شروع کرنے پر فورس کررہے تھے۔ تب مالا نے بھی جیسے ''جتا'' کر کہا تھا۔ وہ مون کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ابوبکر بھائی! آپ سوال کریں......'' اس کی نیک تمنائیں ہیرا اور ابوبکر کے لیے تھیں۔ اللہ، اللہ کرکے پہلا سوال آیا۔ وہ سب انتہائی پُرجوش ہوگئے تھے۔ سوال ابوبکر کررہا تھا۔ اور مون متوجہ ہیرا کی طرف

تھی۔ اس کے ہر کام میں نرالا پن تو ضرور ہوتا تھا۔

ابوبکر نے بڑی پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے انسان، دماغ کا کون سا حصہ استعمال کرتے ہیں؟'' ابوبکر کی طرف سے یہ پہلا سوال تھا۔ انتہائی مشکل اور پیچیدہ۔ ہر ایک کے لیے یہ آسانی تھی کہ وہ اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال کرسکتا تھا۔ جبکہ جواب دینے والے کے لیے سخت مشکل ہوتا تھا جواب دینا۔ اب ایک ٹیچر یا انجینئر سے بزنس کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ بھلا کیا جواب دیتا۔ جبکہ اس وقت ایک ماہر ڈاکٹر ایسی لڑکی سے سائنسی نوعیت کے پیچیدہ سوال کررہا تھا جس نے دنیاوی تعلیم کے حساب سے صرف گنتی کی دس جماعتیں پاس کررکھی تھیں۔ مقابلہ سخت بھی تھا، مشکل ترین بھی تھا۔ اسی لیے سبھی تقریباً ہمہ تن گوش تھے اور سانس روکے جواب کے منتظر تھے جبکہ مون کے پاس نو سیکنڈ کا وقت تھا۔ ان نو سیکنڈ میں وہ پلک جھپکائے بغیر ہیرا کو دیکھ رہی تھی یک ٹک، بِنا نگاہ ہٹائے...... جیسے۔ جیسے اپنی غیر معمولی ذہین آنکھوں سے ہیرا کا ذہن کھنگال رہی تھی۔ جیسے اس کی سوچ کو پڑھ رہی تھی اور جیسے ہیرا کے ہاتھ میں موجود پرچے پہ لکھے جوابات کو ہیرا کے ذہن میں سے نوچ کھسوٹ کر اپنے ذہن تک لانے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ محفل میں موجود کوئی بھی فرد مون اور ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایوا، ایمی کو اپنی انگوٹھی دکھا رہی تھی۔ انی، اینجلس کی طرف متوجہ تھی۔ آفاق اور عیسیٰ کچن میں تھے۔ میکس بھی انگوٹھی کے ڈیزائن پر تبصرہ کررہا تھا۔ بس لمحے بھر کی چُوک میں وہ سب مبتلا تھے اور ہوائیں کہ مون کی گہری بولتی نگاہ ہیرا کے چہرے سے ہٹ گئی۔ اب وہ بڑے مطمئن انداز میں جواب دے رہی تھی۔

''انسانی دماغ کے دو حصے ہیں۔ دائیں اور بائیں سمت والا۔ دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے، بائیں سمت والا دماغ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے دائیں سمت والا دماغ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ قدرتی عمل کے تحت ہوتا ہے......'' جواب کسی بھی دلیل اور سوچ و بچار کے بغیر مکمل تھا۔ حاضرین نے فی الفور اپنی، اپنی مصروفیات ترک کرکے زور شور سے تالیاں بجائی تھیں۔ جبکہ ہیرا کے علاوہ ڈاکٹر ابوبکر اور مالا دم بخود تھے۔ جتنا ابوبکر حیران تھا اسی قدر مالا بھی حیرت سے منجمد ہوگئی تھی۔ گویا مون ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ ایک ذہین ڈاکٹر کا مقابلہ بھی کرسکتی تھی۔ مگر نہیں...... مالا کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو نو سوال اور بھی باقی تھے۔ وہ بڑی امید بھری نظر سے ڈاکٹر ابوبکر کو دیکھ رہی تھی جیسے اب تو وہ مون کو لاجواب کرنے ہی والا تھا۔

''انسانی آنکھ کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟'' ابوبکر نے کچھ دیر بعد ایک اور سوال پوچھا تھا۔ اس دفعہ بھی مون نے ابوبکر کو دیکھے بنا ہیرا پہ نگاہ جمائے رکھی۔ یہ جواب دو سیکنڈ میں اسے مل گیا تھا۔ مون کو اس دفعہ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔

''انسانی آنکھ پچاس میل دور جلنے والی موم بتی کا شعلہ دیکھ سکتی ہے۔'' مون کا اعتماد اب کی دفعہ بھی قابلِ دید تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن ہوچکی تھی۔ گویا وہ اب تو ہرگز بھی ہارنے والی نہیں تھی۔ اس مرتبہ ابوبکر کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات تھے جبکہ ہیرا جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ وہ قطعاً ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کی طرف بھی متوجہ نہیں تھی۔ اگر مالا غور نہ کرتی تو باقی سب کی طرح اسے بھی پتا نہ چلتا کہ ہیرا تو مون کی دودھیا گردن سے چپکی چین اور ہیرے موتی کی طرف متوجہ تھی۔ مالا شاید بے اختیاری میں ہیرا کو پکار ہی لیتی مگر ڈاکٹر ابوبکر نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ وہ مون سے ایک اور سوال کررہا تھا۔

''آنکھ ایک دن میں کتنی بار جھپکتی ہے؟'' ابوبکر کا لہجہ سنجیدہ تر ہوتا چلا گیا تھا۔ مون کے لیے یہ سوال بھی مشکل نہیں تھا۔

''انسانی آنکھ دن میں بیس ہزار بار جھپکتی ہے۔''

وہ پُراعتماد طریقے سے بول رہی تھی جیسے یہ سوال اس کے نزدیک ننھے منے چیونٹے کی طرح تھے۔ جنہیں وہ پیروں تلے مسل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ذرا محظوظ قسم کی مسکراہٹ در آئی۔ جیسے وہ ابوبکر کو زچ کرکے لطف اندوز ہورہی تھی۔

''انسانی آنکھ کتنے رنگوں اور سایوں میں تمیز کرسکتی ہے؟'' ابوبکر نے ایک اور سوال کیا۔

''آنکھ ایک کروڑ مختلف رنگوں اور سایوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' مون کے لیے جواب مشکل نہیں تھا۔ پھر سوال پر سوال ہوتے چلے گئے۔ ایک کے بعد ایک سوال۔

''آنکھ آواز کو محسوس کرسکتی ہے یانہیں؟'' وہ پہلے سے زیادہ بے چین اور سنجیدہ تھا۔

''آنکھ آواز کو ارتعاش سے محسوس کرسکتی ہے۔'' مون پہلے سے بڑھ کر مطمئن تھی۔

''ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے ہوئے انسانی دماغ تک پیغام کتنے میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے؟'' وہ اور بھی بے چین ہوا۔

''ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے وقت دماغ تک ''پیغام'' 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے۔'' مون مسکرائی۔ حالانکہ وہ مسکراتی نہیں تھی۔ جواب اس کی نوکِ زبان پہ مچل رہے تھے۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جواب دے رہی تھی۔

''کیا کسی انسان کے فنگر پرنٹس کسی دوسرے انسان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتے ہیں؟'' ابوبکر نے پہلو بدلا تھا۔

''کسی بھی انسان کے فنگر پرنٹس کسی دوسرے انسان سے نہیں ملتے۔'' مون محظوظ ہوئی۔ جیت قریب تھی، ہار دور ہورہی تھی۔ ابوبکر پریشان تھا اور مالا دم بخود تھی۔

''کان آواز کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟'' ابوبکر نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

''کان ہوا کی وائبریشن (ارتعاش) سے آواز کو پہچانتے ہیں۔'' مون کا غرور بڑھ رہا تھا، مالا کی امید گھٹ رہی تھی۔ اللہ نے مون کو پہاڑ پہ کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ ان سب سے بلند تھی۔ وہ لوگ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے۔

''کاربن کی قلمی اشکال کا پتا ہے؟'' ابوبکر خود بھی کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ شاید وہ ہار گیا تھا مگر ایک سوال اب بھی باقی تھا۔

''ہاں، پتا ہے۔'' مون مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اسی کی طرح عجیب ہوتی تھی۔ ''کاربن کی دونوں قلمی، بہروپی اشکال ہیں اور انھی حالتوں میں کاربن قدرتی طور پر آزاد حالت میں پایا جاتا ہے۔'' مون نے کہنا شروع کیا تھا۔ وہی عجیب ترین مسکراہٹ تھی۔ عجیب ترین تاثرات کے ساتھ۔

''نمبر ایک ہیرا اور نمبر دو گریفائیٹ۔'' وہ ہیرا کو دیکھ کر جیسے پھر سے محظوظ ہوئی تھی۔ ''اس ہیرا کی بات نہیں کررہی۔''

وہ گم صم بیٹھی ہیرا کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ اس کا جواب ابھی نامکمل تھا۔ وہ اب ہیرا اور گریفائیٹ کے فوائد اور خواص بتا رہی تھی۔

''ہیرا یعنی ڈائمنڈ، کاربن کی خالص ترین شکل ہے۔ یہ انتہائی سخت، چمکدار اور شفاف ٹھوس حالت میں پایا جاتا ہے۔ جبکہ گریفائیٹ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نرم ٹھوس ہوتا ہے......'' مون نے اس سے اگلا جواب بھی مکمل کردیا تھا۔ یقیناً وہ جیت کے قریب تھی۔ تب اچانک ابوبکر نے گم صم بیٹھی ہیرا کو ٹھوکا دیا تھا اور ہیرا جیسے نیند سے ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ ابوبکر کے احساس دلانے اور ڈپٹنے پر...... وہ سیدھی ہوگئی تھی جیسے وہ سنبھل گئی تھی۔ وہ پچھلے ساڑھے چار منٹ تک بے حواس یا گم صم رہی تھی یا پھر جیسے اونگھ گئی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ چار منٹ تک جانے اس پر نیند طاری ہوگئی تھی۔ اکثر بیٹھے بٹھائے اونگھ آہی جاتی ہے۔ اس میں پریشان ہونا ضروری نہیں۔ وہ بھی شاید تھکاوٹ کے باعث چار منٹ کے لیے سوگئی تھی اور اب ہڑبڑا کر

اردگرد اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہاں سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔ کوئی بھی ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر ابوبکر نے اسے اٹھا دیا۔

''جاؤ، منہ پہ دو چھپاکے مار آؤ۔'' ہیرا کو واش روم کی طرف بھیج کر ابوبکر پھر سے مون کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پہلے جیسی بے چینی نہیں تھی۔ جھنجلاہٹ نہیں تھی۔ پہلے جیسی حیرانی نہیں تھی۔ اب اس کے چہرے پر تجسس تھا، کھوج تھا۔ گویا وہ کوئی سراغ پانا چاہتا تھا۔ کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے چہرے پر سے کیا کھوجنا چاہتا تھا؟ تھوڑی دیر بعد اس نے مون سے ایک عجیب سوال کیا تھا، سوال عجیب نہیں تھا۔ تھوڑی گہرائی لیے ہوئے تھا۔ ابوبکر کے بولنے پر وہ سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات ترک کرکے ایک مرتبہ پھر ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''کیا تم مجھے ہیرا (ڈائمنڈ) اور گریفائیٹ کے خواص، فوائد اور استعمال بتا سکتی ہو؟'' ابوبکر نے بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مون کی طرف دیکھا تھا۔ یک دم مون کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مالا گویا حیران رہ گئی تھی۔ کیا مون کا سپاٹ چہرہ بھی رنگ بدل سکتا تھا؟

''میں جواب دے چکی ہوں۔'' وہ پتھریلے لہجے میں بولی۔ اسے ابوبکر کا سوال سخت برا لگا تھا جیسے اسے اب مزید سوال کی امید نہیں تھی۔

''مجھے کچھ وضاحت چاہیے۔'' اب کہ محظوظ ہونے کی باری کسی اور کی تھی اور ان میں ابوبکر اور مالا بھی شامل تھے۔ مالا کا روم روم جیسے سماعت بن گیا۔

''میں وضاحت دینے کی پابند نہیں۔'' وہ رکھائی سے کہہ رہی تھی۔ گویا صاف جواب دے رہی تھی۔ ابوبکر کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ گلا کھنکھار کے سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''اگرچہ تم جیت گئی ہو، اگرچہ تم نے ٹھیک جوابات دیے۔ اس کے باوجود میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ چلو تم وضاحت نہیں کرنا چاہتی تو میں وضاحت کردیتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

''تقریباً پندرہ سال سے میں پروفیشنل کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ جتنی تمہاری عمر ہے اس سے ذرا کچھ کم تجربہ تو بہرحال میرے پاس ہے ہی...... تم نے کہا کہ تم ہیرے اور گریفائیٹ میں وضاحت نہیں کروگی۔ مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہیرے اور گریفائیٹ میں کیا فرق ہے؟ تو سنو! ہیرا خالص حالت میں بے رنگ اور شفاف ہوتا ہے۔ بالکل تمہارے کراؤن جیسا قیمتی اور چمکدار۔ جب اس کی تراش خراش کی جاتی ہے تو یہ انتہائی چمکدار، لشکارے مارتا نظر آتا ہے۔ یہ قدرتی حالت میں پائی جانے والی سخت ترین شے ہے۔ اس کی کثافت 3.3 گرام فی مکعب سم ہوتی ہے۔ یہ برقی رو کے لیے ناقص موصل ہے یعنی اس میں سے بجلی نہیں گزر سکتی۔ اگر اسے برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک رکھا جائے تو یہ گریفائیٹ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے ہیرے میں پائے جانے والے ایٹم ہر طرف سے جڑے ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے یہ زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ سخت ہونے کی وجہ سے شیشہ کاٹنے اور دوسرے آلات میں استعمال ہوتا ہے۔ ہیرے کے جڑاؤ سے قیمتی زیورات تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ڈائمنڈ کی خصوصیات ہیں۔ جو تمہارے کراؤن میں سجا ہے۔ اور تم ان خصوصیات سے یقینی طور پہ ناواقف تھیں اور ہو بھی......

اب سنو کہ گریفائیٹ کیا ہے؟ اور میں نے تم سے یہ سوال کیوں پوچھا؟ اس کی وضاحت بھی کرتا ہوں۔ گریفائیٹ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نرم ٹھوس ہوتا ہے۔ یہ ملائم، نرم اور چکنا ہوتا ہے۔ یہ بجلی اور حرارت کا اچھا موصل ہے۔ اس کی کثافت 2.2 سے 2.5 تک ہوتی ہے۔ برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک گرم کرنے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ گریفائیٹ بطور مارکر نشان لگانے کے کام آتا ہے۔ چکنا ہونے کی وجہ سے مشینوں میں بطور ''گریس'' استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہی فرق ہے گریفائیٹ اور ڈائمنڈ میں۔ اور

میرا سوال تم سے یہ ہے کہ تم خود کو ہیرا یعنی ڈائمنڈ سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟" ابوبکر کی طویل تر تقریر نے ان سب کو جیسے پتھر بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھے کھیل، کھیل میں بات کہاں سے کہاں نکل گئی تھی...... ابوبکر ابھی تک مون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع آیا تھا جب وہ کسی سوال پہ لاجواب ہوئی تھی ورنہ وہ تو لاجواب کرتی آئی تھی۔ اس نے لاجواب ہونا کہاں سیکھا تھا؟ وہ دم بخود نہ ہوتی تو کیا کرتی؟

سب کی نظریں مون کے چہرے پہ جمی تھیں اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا جواب دے؟ ابوبکر کچھ دیر اس کا چہرہ کھوجنے کے بعد خود ہی بولا۔

"ڈائمنڈ اور گریفائیٹ دونوں کا اپنا، اپنا مقام ہے۔ دونوں بے فائدہ نہیں۔ ایک زیورات میں سجتا ہے اور اپنا حسن اور قیمت بڑھا دیتا ہے اور ایک مشین چلانے میں کام آتا ہے۔ مگر پھر بھی ہیرا، گریفائیٹ سے افضل ہے۔ تو تم بتاؤ؟ کیا تم خود کو "ہیرا" سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟" ابوبکر اتنی آسانی سے بخشنے والا نہیں تھا۔ اس کا سوال مون کے آس پاس ہی گھوم رہا تھا۔ شاید اس نے مون کے اندر کچھ غیر معمولی چیز پالی تھی۔ شاید ابوبکر نے اپنی "کھوج" مکمل کر لی تھی اور اب وہ نفسیاتی حربوں سے مون کا اندر کھنگال رہا تھا۔ وہ گویا جیسے لمحے بھر کے لیے گم صم رہ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ اور یہ ابوبکر کیا پوچھنا چاہتا تھا؟

"سوال مشکل تو نہیں۔ پھر بھی اتنی دیر؟" ابوبکر معنی خیزی سے مسکرایا۔ کچھ دیر تک ماحول پہ سناٹا چھایا رہا۔ پھر جیسے طلسم خود ہی ٹوٹ گیا۔ ابوبکر نے جواب کو بھی مکمل کر دیا تھا۔ وہ اپنے تجربات کی رو سے مون حسیب کے چھکے چھڑا رہا تھا، وہ جو آج تک لوگوں کو ایک اسم سے ساکت کرتی آئی تھی لمحے بھر کے لیے خود منجمد ہو گئی تھی۔

"تم ڈائمنڈ ہو مون حسیب! اور تم اس بات سے واقف نہیں۔ تمہارے زرگر اتنے جوہر شناس نہیں تھے اور نہ ہی تم اتنی عقل مند تھیں جو غلط اور ٹھیک کی پہچان کر سکتیں۔ تمہیں اللہ نے خالص اور قدرتی حالت میں ہیرے کی شکل دی۔ تمہیں تراشنے والے ہاتھ ناکارہ اور نااہل تھے۔ ان کے پاس ہیرے کو تراشنے کا علم، ہنر اور فن نہیں تھا۔ وہ بے چارے تو بے خبری میں مارے گئے اور تم نے یوں کیا کہ خود کو زیادہ دیر تک برقی بھٹی میں رکھا، یہاں تک کہ ہیرا پگھل کر گریفائیٹ یعنی چپچپاتی گریس بن گیا۔ جو اپنا اصل اور حقیقی مقام کھو گیا۔ اب گریس اور ڈائمنڈ کا کیا مقابلہ؟ ہیرے کا مقام تو گریس سے بہت اوپر ہے۔ مگر پھر بھی دیکھو اللہ نے تمہیں گریفائیٹ بنا کر بھی بے فائدہ نہیں کیا۔ تم اب بھی فائدہ مند ہو۔ یہ باتیں ہیں ذرا حکمت اور دانائی کی۔ کبھی اکیلے میں غور و فکر کرنا کہ تم کوئز مقابلہ ہو یا زندگی کا مقابلہ...... شطرنج کی بازی ہو یا تاش کی۔ بھلا کس طرح سے دوسروں کو پچھاڑتی ہو؟ ایک غیر فطری عمل سے جسے عام طور پر بے ایمانی کہا جاتا ہے۔ ایسی جیت سے تو ہزار بار مات اچھی ہے......" ابوبکر نے جیسے اپنا فصیح بیان ختم کر دیا تھا۔ اس نے سر محفل مون حسیب کو کیا، کیا جتایا تھا؟ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا؟ اور اس نے مون کو پرکھنے اور کھوجنے میں کہاں تک اندازوں کی درستگی پائی تھی۔ پوری محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر جیسے چائے کی پیالیوں کا شور اٹھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں لاؤنج کے دروازے پہ کھڑے تھے۔ اتنے ہی ساکت اور گم صم۔ جیسے مون کو اندر تک کھنگال کر اس کی ذات کے متعلق ایسی جامع تشریح پہ ابوبکر کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے تھے۔ ابوبکر وہ واحد بندہ تھا جس نے مون حسیب کے مقابل بیٹھ کر اس کے چھکے چھڑا دیے تھے اور مون اتنی بے بس تھی کہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ یہاں محفل میں بیٹھے ہر ایک فرد کی کیفیات مختلف تھیں۔ جو جرأت ابوبکر نے کی تھی ایسی جرأت کا مظاہرہ نہ میکس کر سکتا تھا اور نہ ہی آفاق، حتیٰ کہ آج تک علی عیسیٰ کو بھی مون نے اپنی ذات میں مداخلت کرنے نہیں دی تھی۔ وہ ایک ترقی یافتہ ملک کی آزاد شہری تھی۔ بھلا اس کے باپ اور بھائی کی جرأت تھی جو وہ اس کی ذات پہ بات کرتے، اسے

سمجھاتے یا اس کی غلطیوں پہ ٹک یا کراس لگاتے۔ یہ تو ڈاکٹر ابوبکر تھا جس نے محفل کے ہر فرد کو حیرت سے منجمد کر دیا تھا۔ محض دو لفظوں میں پوری مون کی شخصیت کا نچوڑ نکال دیا تھا۔

"تم نے برقی بھٹی میں خود کو اتنی دیر تک رکھا۔ یہاں تک کہ تم ہیرے سے گریفائیٹ میں بدل گئیں۔ تم اپنے اصل مقام سے نیچے آ گئیں۔" یہ ڈاکٹر ابوبکر کے الفاظ تھے۔ آخر اس نے مون حسیب میں کھوجا ہی کیا تھا؟ محفل میں موجود ہر آنکھ کا سوال بڑا ہی بے چین قسم کا تھا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر جیسے محفل کا اختتام ہو گیا۔ سب لوگ چائے سے لطف اندوز ہو کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ حتیٰ کے مون بھی ابوبکر سے ملنے والے جھٹکوں پر خفا ہو کر نہیں اٹھی تھی۔ وہ اپنی کمزوری غصہ ظاہر کر کے سب کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ سو چائے پی کر پاپا سے ملنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ آج عیسیٰ نے اسے روکا نہیں تھا۔ حسیب احمد بس اسی میں خوش تھے کہ مون آ تو گئی تھی۔ محفل کے اختتام پر برتن آفاق اور عیسیٰ نے سمیٹے تھے اور وہ دونوں زیر لب نینی کو کوسنے دے رہے تھے۔

"اب یہ چنگیزی بھینس آئے تو اسے فارغ کر دینا۔ ایک تو اتنی خوفناک ہے اور دوسرے اتنی چھٹیاں کرتی ہے۔ کان سے پکڑ کر نکال دینا۔" آفاق جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ عیسیٰ خود بھی نینی سے عاجز لگتا تھا۔ اور اس کی "خوفناکی" پر وہ دونوں تبصرے کیے جا رہے تھے۔

"یہ نینی خاصی خوفناک اور پُراسرار لگتی ہے۔" عیسیٰ بھی پُرسوچ انداز میں بولا تھا۔ آفاق نے زور شور سے سر ہلایا۔

"تو اور کیا...... میں تو کہتا ہوں، اسے فارغ کر دو۔ زیادہ "ہراس" اس گھر میں نینی کا پھیلایا لگتا ہے۔" وہ سمجھداری سے کہہ رہا تھا۔ آفاق سر ہلا کر رہ گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"یار! وہم کا کچھ نہ کچھ حقیقت سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ حقیقت کچھ نہ کچھ ہو تو "وہم" بھی ہوتا ہے۔" وہ برتن دھوتا بہت سنجیدہ تھا۔ عیسیٰ کے کافی پھینٹتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر آفاق کو دیکھا۔

"تمہاری بات کا مفہوم یہ ہے کہ مالا کو جو کچھ دکھائی دیتا ہے یا محسوس ہوتا ہے، وہ ٹھیک ہے؟" عیسیٰ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔

اس کے تاثرات سنجیدہ تھے اور آنکھوں میں ناگواری تھی۔

"زیادہ نہ سہی مگر کچھ تو ضرور ہے۔ دیکھو بالکل بھی مالا کو غلط کہنا مناسب نہیں۔" برتن دھل چکے تھے۔ اب وہ انہیں خشک کر رہا تھا۔ عیسیٰ کے چہرے پہ بھی ناگواری دوڑی تھی۔ ادھر کچن میں آتی مالا ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"مالا کو غلط کون کہہ رہا ہے؟ ایسی بات ہوتی تو ہالہ صاحبہ کو کیوں بلایا جاتا۔" وہ جیسے برا مان گیا تھا۔

"تم نے کبھی غور نہیں کیا یہ اچانک ہی مالا کو عجیب و غریب چیزیں نظر کیوں آنے لگی ہیں۔" آفاق نے اس کے برا ماننے پر دھیان دیے بغیر ایک اور نکتہ اٹھا لیا۔ مالا کچھ تھم سی گئی۔ یہ آفاق کی باتوں کا آخر مقصد کیا تھا؟

"پہلے ایسا نہیں تھا یعنی تمہاری شادی کے شروع دنوں میں۔" اسے چپ کھڑا دیکھ کر آفاق نے مزید ٹکڑا لگایا پھر ریک میں خشک برتن سجا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ سلسلہ کچھ دن پہلے شروع ہوا ہے آخر وجہ تو دریافت کرنا چاہیے تھی۔" وہ بے انتہا سنجیدہ تھا عیسیٰ بھی کچھ چونک گیا۔

"تو وجہ کس سے دریافت کروں؟" عیسیٰ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"خود سے۔" آفاق کا جواب حیرت میں مبتلا کر دینے والا تھا وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" عیسیٰ خفگی سے بولا۔

"سو فیصد ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن تھا۔

"تو پھر؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"پھر یہ کہ تم اپنے تئیں یعنی خود سے کوشش کیوں نہیں کرتے، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ تمہاری موجودگی میں ناگوار واقعات پیش نہیں آتے۔ تمہاری غیر موجودگی میں ہی کیوں؟" آفاق نے بڑی گہری بات کی تھی یوں کہ عیسیٰ جیسے حیران رہ گیا مگر وہ اسے جھٹلا نہیں پایا تھا۔ اِدھر مالا حق دق رہ گئی تھی۔ اسے آفاق سے ایسی لگائی بجھائی کی امید نہیں تھی مگر اسے آفاق سے ہر قسم کی امید رکھنی چاہیے تھی۔

"یہ تو سوچنے کی بات ہے۔" عیسیٰ نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ مالا جیسے پتھر ہوگئی تھی تو آفاق، عیسیٰ کو بدگمان کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

"تو پھر سوچو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟" آفاق نے ہمدردی سے عیسیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "اور یاد رکھنا یہ معمولی واقعات نہیں۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ مالا کے اندر تنفر کی لہر ابھری تھی۔ غصے سے اس کی بھویں تن گئیں اور مارے اہانت کے وہ تیورانے لگی تھی پھر وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اگر مزید کھڑی رہتی تو آفاق کے گریبان تک پہنچ جاتی۔ جس کا ابھی مناسب وقت نہیں تھا۔ مالا کے آنے اور پھر جانے سے بے نیاز آفاق، عیسیٰ کو سمجھا رہا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، یہ نادیدہ دشمن صرف مالا کا ہے۔ تمہارا نہیں کیونکہ یہ صرف مالا کو تنگ کرتا ہے اور تمہاری غیر موجودگی میں آتا ہے۔" آفاق نے بہت اہم نکتہ اٹھایا اب کہ عیسیٰ بھی حیران رہ گیا۔ آفاق ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں آفاق کی ذہانت کو سراہا۔ یہ ایسا پہلو تھا کہ اس نے اس پر سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اسے سوچنے کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ پاپا کی بیماری، مالا کا ڈپریشن اور بزنس کے بکھیڑوں میں الجھ کر وہ وقتی طور پر کسی بھی طرف دھیان نہیں دے پایا تھا اور اسی بات پر مطمئن ہو چکا تھا کہ مالا کے ڈپریشن یا خود ساختہ وہم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب جو آفاق نے اس کا دھیان دوسری سمت مبذول کروایا تو وہ اسی پہلو پر غور کرنے لگا تھا۔

"تو اس کا کوئی ٹھوس حل؟" وہ بے انتہا سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"ہے ناں۔" آفاق جیسے پُرجوش ہوگیا۔ "ہمیں اس نادیدہ دشمن کو کھوجنا ہے اور یہ بڑا آسان کام ہے۔" اب وہ عیسیٰ کے کان پر جھک آیا تھا۔

"کیسے؟" عیسیٰ بھی متجسس ہوگیا۔

"میں آج ہی کچھ حساس آلے، کیمرے اور سسٹم خریدتا ہوں جن کو گھر کے مختلف کونوں میں نصب کریں گے پھر دیکھنا نہ کوئی آسیب رہے گا اور نہ کوئی وہم یا وسوسہ۔ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔" آفاق نے بہت ٹھوس لہجے میں بڑا مضبوط حل پیش کیا تھا یوں کہ علی عیسیٰ نے آفاق کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

"تو گریٹ ہے یار! آخر میں نے اس نادیدہ آسیب کو ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔" وہ اپنی نااہلی پر خود کو ملامت کر رہا تھا تب آفاق نے برجستہ چہک کر کہا۔

"اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ خوبرو تو ہو سکتے ہو مگر چالاک نہیں۔" آفاق نے قہقہہ لگایا اور عیسیٰ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا پھر پلاننگ کے پہلے آئٹم کے لیے بجٹ کے حساب سے اسے رقم دے کر وہ لائٹس آف کرتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا اور اسے کمرے میں داخل ہو کر اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مالا نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی حالانکہ عیسیٰ اسے سونے کی تلقین کر کے کچن میں گیا تھا۔ آج کی دعوت نے بلاشبہ مالا کو تھکا دیا تھا سو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کھانا سمیٹتے اور برتن دھوتے ہوئے وہ اور زیادہ تھک جائے۔ اس کی طبیعت ان دنوں بہت بوجھل تھی اور اکثر وہ کسی وجہ کے بغیر بھی رونے لگتی تھی۔ عیسیٰ سمجھتا تھا، وہ اپنی ماں، باپ اور بہن بھائیوں کو بہت مس کرتی ہے اور اس نے مالا سے وعدہ کر رکھا تھا وہ ڈلیوری کے فوراً بعد اسے پاکستان لے جائے گا۔ اسے خود بھی اپنے کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا اور صرف تصویروں کی حد تک اس نے انہیں دیکھ رکھا تھا۔

اس وقت وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ

تک آیا تھا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ وہ رو رہی تھی، وہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید وہ بہت تھک گئی تھی یا اس کی طبیعت خراب تھی یا پھر وہ ان دنوں ویسے ہی زودرنج رہتی تھی۔ عیسیٰ کچھ بے قراری سے دوزانو اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر اس نے مالا کا بھیگا چہرہ ٹٹولا۔ اس کے رخسار نم تھے عیسیٰ کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ رو رہی تھی مگر عیسیٰ کو دیکھ کر عجلت میں آنسو پونچھنے لگی تھی لیکن عیسیٰ کی نظر سے اس کے آنسو پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔ وہ اتنا ہی بے قرار ہوگیا تھا جس قدر بے چینی سے وہ سسکاریاں بھر رہی تھی۔

"کیوں رو رہی مالا؟ کیا گھر والے یاد آرہے ہیں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ مالا کچھ پل کے لیے چپ رہ گئی تھی پھر بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تو پھر...... کیا بیمار ہو...... کہیں درد ہے؟" وہ اور بھی فکرمند ہوگیا مالا نے سر کو ایک مرتبہ پھر دائیں بائیں نفی میں ہلایا۔

"کچھ بھی نہیں۔" مالا بھینچی آواز میں بولی۔

"کچھ تو ہے۔" وہ ذرا بھی مطمئن نہیں ہوا جانے کیوں اسے پاپا اور مالا کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا جیسے کچھ ہو جائے گا...... جیسے کچھ ہو جائے گا۔

"نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔" مالا نے سر جھکا لیا وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی جیسے بہت مضطرب تھی پھر عیسیٰ کیوں نہ متفکر ہوتا۔

"پھر مجھے کیوں نہیں ٹھیک لگ رہیں؟" وہ نرمی سے جتا کر بولا تھا۔

"پتا نہیں۔" مالا جھنجلائی۔

"کسے پتا ہے؟" عیسیٰ بھی اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ تب مالا جیسے تھک گئی۔ اسے لگا وہ کبھی عیسیٰ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ وہ اپنے دل میں کچھ نہیں رکھ سکتی۔ وہ عیسیٰ سے شیئر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دل پر بوجھ لادے وہ پہلے ہی تھکنے لگی تھی۔ اب اور ضبط اور جبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے اس کی برداشت اور صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ وہ ایک دم پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ دل پر صدمات کی کثافتیں جم گئی تھیں۔ اذیت کی کائی اُبلنے لگی تھی دکھ کا سیل بہہ رہا تھا۔ وہ ذرا بھی تحمل کا مظاہرہ نہ کر سکی اور جذباتیت میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی۔ عیسیٰ کے لیے اس کا رونا، تڑپنا دیکھ کر چپ رہنا محال تھا۔ وہ بھی گھبرا اٹھا۔ جانے مالا کو اتنی سی دیر میں کیا ہوا تھا وہ کیوں رو رہی تھی جب اسے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں تھا پھر یہ پگھلتے آنسو......!

"مالا! بتاتی کیوں نہیں؟" عیسیٰ عاجز آکر بول اٹھا۔ اس کے آنسو اور سسکنا، تڑپنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مالا جیسے رو، رو کر تھک گئی تھی پھر خود ہی سسکاریاں بھرتی چپ کر گئی۔

"بولو مالا...... ہوا کیا ہے؟" وہ نرمی اور تحمل سے پوچھ رہا تھا تب مالا نے اپنے بھرے دل کی ساری حکایت بتا دی تھی۔

"وہ آفاق کا بچہ آپ کو میرے متعلق بدگمان کر رہا تھا۔" اس نے بالآخر بچہ اگل ہی دی تھی جسے سن کر عیسیٰ نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔

"نہیں تو...... تم نے کیسے سمجھ لیا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" عیسیٰ جیسے ساری بات سمجھ کر اب وضاحت کر رہا تھا۔ یقیناً وہ ان دونوں کی کچھ باتیں سن کر بدگمان ہو رہی تھی۔ وہ غلط گمان میں پڑ رہی تھی۔ آفاق پر شک کر رہی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی بھی شخص کم از کم علی عیسیٰ کو اس سچے موتی جیسی لڑکی سے بدگمان نہیں کر سکتا تھا بھلا یہ بات وہ مالا کو کیسے بتاتا، کس طرح سے سمجھاتا، وہ مالا سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔

"میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے وہ کہتا ہے یہاں کوئی آسیب نہیں اور جو کوئی بھی ہے آپ کی موجودگی میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔" وہ انتہا کی گرد اپنے دل پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے آفاق کی باتوں کا الٹ مفہوم نکالا تھا حالانکہ آفاق تو درست مشورے دے رہا تھا۔ وہ تو انہیں مشکلات سے نکال کر ٹھیک

رہنمائی کرنے کی کوشش کررہا تھا جس بات کی طرف آفاق نے اس کا دھیان لگایا تھا وہ ایک دم ٹھیک اور پرفیکٹ تھی۔ وہ گھر میں حساس آلے فٹ کروا کر اپنے دشمن تک رسائی پاسکتا تھا جو مالا کا دشمن تھا، وہ پہلے عیسیٰ کا اپنا دشمن تھا اور ایک بات تو طے تھی اس گھر پر کسی کا آسیب یا سایہ نہیں تھا۔ یہ کوئی آستین میں چھپا دشمن تھا جس تک پہنچنا اب مشکل نہیں تھا۔

وہ مالا کی بدگمانی فی الوقت دور کرتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔ اس نے آفاق کا مشورہ بھی مالا سے شیئر کیا۔ تب وہ کیمروں کا سن کر حیران رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ آفاق ایسا بھی کوئی مشورہ دے سکتا ہے۔ کیا اسے اپنے پکڑے جانے کا خوف نہیں یا وہ خود کو ضرورت سے زیادہ شاطر سمجھتا ہے آخر وہ اتنا پُراعتماد ہو کر کیسے گھر میں کیمرے فٹ کرنے کی بات کرسکتا تھا؟ کیا اس بات کے پیچھے بھی کوئی پلاننگ تھی؟ کوئی انہونا سا منصوبہ؟ کوئی جامع پلاننگ کے ساتھ انوکھی چال؟ مالا اب آفاق پر بھروسا کرنے والی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی کسی چال میں آسکتی تھی۔ اب وہ محض تیل کی دھار دیکھ رہی تھی یا پھر وقت کی چال بھلا پانسہ کب تک الٹنے والا تھا؟

☆☆☆

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا ملگجا سا اندھیرا جو اتنا بھی ملگجا نہیں تھا۔ نائٹ بلب کے ساتھ ٹیبل لیمپ کی روشنی بھی غبار کے مانند پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک خاموش ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کررہی تھی یہ رات کا دوسرا پہر تھا۔ ہیرا نے اپنی ہیروں جیسی دمکتی آنکھوں کے ساتھ گردن موڑ کر کاؤچ کی طرف دیکھا تھا۔ ڈاکٹر ابوبکر نفسیات کی کوئی بہت موٹی کتاب کھولے صفحوں پر نظر جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ہیرا کچھ متحیر رہ گئی تھی وہ جب سے مالا کے گھر سے آئی تھی اس نے ابوبکر کو گم صم سا پایا تھا۔ وہ اتنا چپ، چپ کبھی نہیں رہا تھا مگر پچھلے کچھ گھنٹوں سے اس کی کیفیات بڑی عجیب و غریب قسم کی تھیں۔ ہیرا کے لیے یہ صورتِ حال خاصی تشویش ناک تھی۔ وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھ کر اونچی ہوئی پھر اس نے کتاب کے ٹائٹل پر انگلی بجا کر جیسے ابوبکر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ابوبکر نے گردن موڑ کر ہیرا کو دیکھا۔ وہ اسے جاگتا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گیا تھا۔

''تم ابھی تک سوئی نہیں؟'' وہ متفکر سا بولا انداز اب بھی کچھ کھویا، کھویا سا تھا ایک دم مضطرب سا۔

''میں سو کر اٹھ بھی گئی اور تم لگتا ہے ایک دفعہ بھی نہیں سوئے۔'' ہیرا بھی فکر مند ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے خاصی حساس تھی۔

''آں...... ہاں، بس نیند نہیں آئی۔'' ابوبکر کچھ چونک گیا۔

''نیند کیوں نہیں آئی، خیر تو ہے؟'' ہیرا بے چین ہو کر اٹھ گئی۔ ابوبکر جاگ رہا تھا پھر وہ کیسے سو جاتی۔ ابوبکر بے چین تھا ہیرا کیسے چین پالیتی۔

''پتا نہیں تم کیوں اٹھ گئیں شاید روشنی کی وجہ سے۔ ٹھہرو میں لائٹ آف کرتا ہوں۔'' وہ لیمپ کا بٹن دبانے لگا تھا جب ہیرا نے عجلت میں اسے روک دیا۔

''اندھیرا مت کرو، روشنی ٹھیک ہے۔'' وہ تکیہ پیچھے ٹکائے اس رخ سے بیٹھ گئی جس سے وہ ابوبکر کا چہرہ دھیان سے دیکھ سکے۔ ہیرا کی دمکتی آنکھوں میں چھپا تفکر اور کچھ کھوج اسے حیران کررہا تھا اور کچھ کچھ جھنجلاہٹ میں بھی مبتلا کررہا تھا۔ تبھی وہ نگاہ چرا کر کتاب کے صفحے الٹنے لگا مگر ہیرا کی تکرار اس کا دھیان کتاب میں ٹکنے نہیں دے رہی تھی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' ابوبکر نے الجھ کر پوچھا۔ تب ہیرا گہری سانس کھینچتی الجھتی سنبھلتی متفکر سی بول اٹھی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ جب سے آئے ہو ایک دم چپ، چپ اور خاموش ہو؟'' ہیرا بے چین ہوگئی تھی تب ابوبکر کو کچھ احساس ہوا۔ وہ اپنی وجہ سے اپنی بہت لاڈلی سی نٹ کھٹ بیوی کو پریشان کررہا تھا اور یہ ٹھیک نہیں تھا۔

''تم نے کچھ نوٹ کیا ہے ہیرا؟'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے وہی بات چھیڑ دی جو اسے کب سے مضطرب اور بے چین کررہی تھی۔ ہیرا جانتی تھی جب وہ کسی بات پر سخت سوچ و بچار میں مبتلا ہوتا تھا تب وہ اسی طرح گم صم اور خاموش ہو جاتا۔ اب چونکہ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے کچھ شیئر کرنے والا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

''کیا......؟'' اس کی دمکتی آنکھوں میں تجسس بھر گیا۔

''وہ جو عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نند ہے...... وہ کس قدر مختلف سی ہے۔'' ابوبکر نے جو کچھ اتنی بچار کے بعد کہا تھا وہ ہیرا کا بے ساختہ موڈ آف کرگیا۔ اب یہاں مون نامہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ کچھ بدمزہ سی ہوگئی۔ عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نند اسے پسند جو نہیں آئی تھی۔

''وہ مختلف ہے ناں؟'' ابوبکر اسے خاموش پا کر جیسے تائید چاہ رہا تھا تب ہیرا کو سر ہلانا ہی پڑا۔

''مختلف نہیں، حسین ہے۔'' ہیرا نے دل پر پتھر رکھ کر کہہ ہی دیا۔ تصور میں مون کا شہزادیوں جیسا سراپا گھوم گیا۔ اللہ بھی کچھ لوگوں کو بے بہا نواز دیتا ہے۔ ہیرا کو غائبانہ سا بے ضرر قسم کا حسد ہوا۔

''شاید حسین ہے مگر بہت عجیب بھی ہے۔ کیا تمہیں وہ عجیب نہیں لگی؟'' ابوبکر نے کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ تب ہیرا جیسے پُرجوش ہوگئی تھی۔

''ہاں...... مجھے بھی بہت عجیب لگی خصوصاً اس کی آنکھیں...... ان آنکھوں کی چمک عجیب سی بجلی جیسی لپک...... یوں لگتا تھا بیٹھے بٹھائے ہپناٹائز کردے گی۔'' ہیرا نے جذباتی انداز میں فرفر تقریر سی جھاڑ دی۔ تب ابوبکر نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے پھر اس نے ہیرا پر جیسے آسمان گرادیا۔

''اور تمہیں پتا بھی نہیں چلا، اس نے بیٹھے بٹھائے تمہیں ہپناٹائز کردیا۔'' ابوبکر نے جس سنجیدگی سے بات کی تھی وہاں مذاق کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ ہیرا ہکا بکا رہ گئی۔

''تم مذاق کررہے ہو؟'' وہ بے ربط سی کہہ گئی۔

''نہیں، حقیقت کہہ رہا ہوں۔'' ابوبکر اب بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے نفسیات کی موٹی سی کتاب کو بند کرکے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے نیم دراز ہوگیا۔

''کک...... کیا...... یہ ٹھیک ہے؟'' ہیرا تو گھبرا اٹھی تھی اس کے نزدیک ابوبکر اس سے مذاق کررہا تھا مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔

''ہاں، میں نے یہی محسوس کیا۔ وہ بہت عجیب لڑکی ہے۔ میں نے ہر رنگ کے لوگ دیکھے ہیں طرح، طرح کے مریضوں سے واسطہ پڑا ہے مگر وہ بہت عجیب لگی۔'' ابوبکر اپنی کیفیات شیئر کررہا تھا۔ اس نے کیا محسوس کیا، کس طرح محسوس کیا؟ اور مون میں اس نے کیا، کیا بہت انوکھا اور عجیب دیکھا؟ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر بہت مختلف تھی۔ حسن اس کی اضافی خوبی تھی اور معلومات کے لحاظ سے جیسے اس کے پاس کوئی خزانہ دفن تھا۔ وہ واجبی سی تعلیم یافتہ تھی اور یوں لگتا تھا جیسے زمانے کا علم حفظ کیے بیٹھی ہے پھر بہت دیر تک وہ دونوں مون حسیب کو ڈسکس کرتے رہے۔

ہیرا نے اسے بتایا کہ وہ چار منٹ کے لیے اونگھ گئی تھی جیسے سوگئی تھی مگر یوں لگ رہا تھا وہ فل حواسوں میں ہے۔ سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اس کے تمام دماغی افعال کام کررہے تھے۔ نیند کے باعث اس کا بیرونی دنیا سے عام نیند کی طرح رابطہ منقطع نہیں تھا۔ آخر وہ چار منٹ تک اتنی بے نیاز کیوں ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کوئز مقابلے کے آخری سوال وہ سن نہیں پائی تھی۔

ابوبکر بہت خاموشی سے ہیرا کی باتیں سن رہا تھا جیسے ... کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بہت قابل ترین ماہرِ نفسیات تھا۔ اسے انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے میں بہت لطف آتا تھا۔

''وہ لڑکی صرف عجیب نہیں، بہت خطرناک ذہن کی مالک ہے۔'' ہیرا اس کی بات پر دم بخود رہ گئی۔

☆☆☆

یہ رات کا تیسرا پہر تھا باہر گھور اندھیرا اور اندر بھی گھور تاریکی تھی۔ جرمنی میں چوبیس گھنٹوں والا سسٹم رائج تھا۔ سو یہاں کے وقت اور ٹائم کے مطابق پندرہ بج کر کچھ ہی منٹ ہوئے تھے۔

رات کے سیاہ پردوں میں بہت سے بھید چھپے تھے۔ رات جو شر بھی تھی اور جس میں خیر بھی چھپا تھا۔ جو خوف بھی تھی اور امن بھی تھی اس میں راحت بھی تھی، بے چینی بھی تھی۔

رات کا تیسرا پہر پھسل رہا تھا۔ کہیں دور کسی جنگل کے کنارے مرغابیاں سر نیہواڑے اونگھ رہی تھیں۔ تالاب کے پار کہیں آسمانی پریاں اتری تھیں۔ کوئی میاں محمد صاحب کی رباعی گا رہا تھا۔ گہری، مدہوش اور پُرسکون نیند میں گم، باہر کی دنیا سے تمام کنکشن ختم ہونے کے باوجود جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جیسے ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے مٹ گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا پھر جانے کس احساس کے تحت حلق پر ہاتھ پھیرتا سلیپر پہنے باہر نکل آیا۔

اسے شاید پانی پینا تھا، وہ کچن کی طرف جانا چاہتا تھا مگر جگر جگر کرتے لاؤنج کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پورے لاؤنج کی لائٹس آن تھیں۔ پنکھے چل رہے تھے شدید سردی کے باوجود اے سی تک آن تھے۔ اس کی سانس جیسے اٹک اٹک کر چلنے لگی۔

”گھر میں کوئی ہے......گھر میں کوئی ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ کسی گوند کے ساتھ ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر زمین اس کے قدم پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہ آگے بڑھ پا رہا تھا نہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کر سکتا تھا بس ایک احساس جس نے اس کے پورے وجود پر پنجہ جما رکھا تھا اور وہ احساس تھا صرف خوف کا۔ مالا ایسے بھیانک خوف سے کئی مرتبہ گزری تھی تاہم آفاق کی باری آج آئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے پورے لاؤنج میں دیکھ رہا تھا کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی پھر اس کا دل داخلی دروازے کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا تھا، دروازہ کھلا تھا۔

”تو کیا کوئی ابھی تک اندر موجود تھا؟“ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی تھی پھر کسی غیبی طاقت کے بل بوتے پر اس نے گھر کا کونا، کونا چھان مارا تھا۔ اسے کوئی بھی انسانی وجود نظر نہیں آیا پھر وہ حواس باختہ سا باہر آیا۔ اسے پھولوں کے اونچے جھنڈ کے پاس کسی وجود کا گمان ہوا، وہاں کوئی موجود تھا مگر پلک جھپکنے کی دیر میں جھنڈ جیسے خالی ہو گیا اب وہاں کوئی سایہ نہیں تھا۔ آفاق کا دل چاہا وہ سائے کا پیچھا کرے مگر عجیب سے خوف نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ پسینہ، پسینہ وجود لیے واپس مڑ آیا تھا۔ اس کے حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔ ہر قدم پر اسے چکر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھ رہا تھا حالانکہ لاؤنج کے چھوٹے بڑے فانوس جل رہے تھے۔ مالا کتنی سچی تھی، آفاق کو جیسے یقین آ گیا۔ گھر میں کوئی بھیدی آتا تھا۔ رات کی تاریکی میں......مگر سوچنے کی بات یہ تھی وہ بھیدی رات کی تاریکی میں ہی کیوں آتا تھا؟ محض ہراس پھیلانے کے لیے۔

وہ اپنے گول، گول گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے عیسیٰ کے کمرے تک آیا۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حواس باختہ سے عیسیٰ نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے آفاق کو کھڑا دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا تھا۔

”آفاق تم! خیر تو ہے؟“ عیسیٰ آنکھیں مسلتا ہوا جیسے حیرانی اور بوکھلاہٹ میں پوچھ رہا تھا حالانکہ اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ جس حواس باختگی سے آفاق دروازہ پیٹ رہا تھا، خیریت بھلا کہاں ممکن تھی۔

”خیر کہاں ہے......ذرا باہر آؤ۔“ وہ اس کا بازو دبوچے لاؤنج میں گھسیٹ لایا۔ عیسیٰ حیران پریشان اس کے ساتھ گھسٹتا چلا آیا تھا۔ لاؤنج کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پورا لاؤنج روشنیوں میں نہایا تھا ہر چھوٹا بڑا فانوس جگر جگر کر رہا تھا۔ پنکھے فل اسپیڈ میں چل رہے تھے حتیٰ کہ اے سی تک آن تھے اور پھر عیسیٰ کی

نگاہ دیوار پر نصب ہیٹر تک گئی۔

”یہ ہیٹر کس نے آن کیا؟“ وہ دوسرے ہی پل اے سی، پنکھے، گلوب ہیٹر بند کرتا حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”شاباش عیسیٰ صاحب، مجھ سے پوچھ رہے ہو ہیٹر کس نے آن کیا؟ یہ گلوب، پنکھے اور اے سی دکھائی نہیں دیے؟“ آفاق اتنے بڑے جھٹکے سے سنبھل کر گویا ہوا تب عیسیٰ نے گردن موڑ کر دیکھا داخلی دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ پھر سے شاکڈ ہوا۔

”یہ کس نے کھولا ہے؟“ دوسرے ہی پل وہ دروازے کا لاک چیک کرتا متحیر تھا۔ رات کو سونے سے پہلے تمام دروازے، کھڑکیاں اس نے خود چیک کر کے لاک کیے تھے۔ چابیاں ابھی تک اس کے تکیے کے نیچے پڑی تھیں پھر یہ دروازے کا لاک بنا چابی کے کیسے کھلا تھا؟ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ آج بہت دن بعد پھر وہی واقعہ رونما ہوا تھا فرق صرف اتنا تھا اس دفعہ مالا کے بجائے آفاق کو جھٹکے لگے تھے۔ وہ اسے کسی انسانی سائے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج میں کارپٹ پر سر تھامے بیٹھے تھے۔ دونوں کے پاس کہنے کو جیسے کچھ نہیں بچا تھا۔ دونوں متحیر تھے کچھ، کچھ خوف زدہ بھی تھے۔ خوف محض اس لیے تھا کہ اگر ان کی موجودگی کی بھی پروا کیے بغیر کوئی گھر میں دیدہ دلیری سے گھس آیا تھا تو غیر موجودگی میں کیا کرتا؟ اگر پاپا، مالا کو کوئی نقصان پہنچا دیتا؟ اب تو اسے ہر قسم کی اس نادیدہ دشمن سے امید ہو چلی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا چاہتا تو سامنے سے وار کرتا، چاہتا تو پشت میں چھرا گھونپ دیتا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت دیر بعد عیسیٰ نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔ جہاں انسانی سوچ کی انتہا ہو جاتی تھی وہیں اس کے گھر میں اچانک رونما ہونے والے واقعات کی شروعات ہوتی تھی۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔

”مجھے تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ آفاق تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ابھی سونے سے پہلے ہی تو وہ کیمرے اور حساس سسٹم خریدنے کی بات کر رہا تھا۔

اب یہ کیمرے کتنے ناگزیر ہو گئے تھے۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں ان کی اہمیت سمجھتے تھے۔

”آفاق! تم کیا کہتے ہو؟ میں یہ گھر چھوڑ نہ دوں؟“ بہت دیر کی بے چینی نما خاموشی اور سوچ بچار کے بعد عیسیٰ نے نہایت بے چارگی سے آفاق کو مخاطب کیا تب آفاق بھی ٹھٹک گیا۔

”تم کیوں گھر چھوڑو گے؟ یار یہ تو بزدلی ہے۔“ آفاق نے سنبھل کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا کروں؟ میرا چین، سکون گم گیا ہے۔“ وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے۔ جانے وقت علی عیسیٰ کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے والا تھا۔ وہ پہلے بھی مالا کے خوف کو معمولی خیال کر کے نظر انداز نہیں کرتا تھا مگر اب تو جیسے کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچتا بے انتہا متفکر تھا۔ آفاق اسے پریشان دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

”عیسیٰ تم پریشان نہ ہو۔ میں صبح ہی کچھ کرتا ہوں۔ دیکھنا جلد ہم اس ذہنی اذیت سے چھٹکارا پالیں

خواب

اسے کہنا
تمہاری یاد کے جگنو
اب میری
آنکھوں میں دمکنے لگے ہیں
درد کے سارے موسم
قلب و جاں میں
اترنے لگے ہیں
میرے اشکوں کی تپش سے
میرے سارے خواب
جلنے لگے ہیں

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

گے۔'' آفاق نے دوستی کا حق ادا کرتے اسے تسلی دی۔ وہ خود بھی بہت متفکر تھا اسے لگ رہا تھا مالا کے اکھڑے روییے کے پیچھے بھی یہی ذہنی اذیت پوشیدہ ہے۔ وہ آفاق سے بہت اکھڑی، اکھڑی رہنے لگی تھی۔ بات، بات پر طنز کرتی۔ آفاق کو لگتا تھا وہ مینٹلی ڈسٹرب ہے تبھی اس کے ساتھ بھی اکھڑی رہتی ہے۔ ہر وقت چہرے پر ناراضی، غصہ اور ماتھے پر سلوٹیں تو عام طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ شاید اسی جھنجلاہٹ اور ذہنی اذیت کے باعث...... آخر یہ جھٹکے کوئی معمولی تو نہ تھے۔ وہ جو مالا کے کئی دفعہ بولے گئے طنزیہ جملوں پر ڈسٹرب ہو جاتا تھا اسے آج ہر طرح کے روییے کے لیے حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں تو نارمل انسان پاگل ہونے لگتا ہے اور وہ نہ جانے کس حد تک ڈسٹرب تھی۔ اسے اس وقت مالا سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

''پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔'' عیسیٰ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام رکھا تھا۔ وہ اس وقت بہت بکھرا بکھرا نظر آ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا تم تسلی رکھو۔'' آفاق نے اس کے شانے دبائے۔

''نہیں آفاق، یہ وسوسے یا واہمے نہیں، تم دیکھ لینا کوئی منحوس گھڑی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ مجھے آنے والے وقت کی منحوس آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔'' وہ لفظوں سے بہلنے والا نہیں تھا جو کچھ آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اسے بھلا کیسے جھٹلا دیتا؟ اب تو کسی شک وشبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''کیا پولیس کی مدد لوں؟'' کچھ دیر بعد اس نے آفاق سے مشورہ لینا چاہا تھا تب آفاق نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرا خیال ہے ابھی مناسب نہیں ہے...... کچھ انتظار کر لیتے ہیں...... ایک دو دن تک۔'' آفاق سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''اور ایک دو دن میں کچھ اور نہ ہو جائے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان؟'' عیسیٰ کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔

''اللہ رحم کرے، کچھ نہیں ہوتا۔'' آفاق کا انداز بھرپور تسلی دینے والا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا جب کسی احساس کے تحت اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لاؤنج کے دروازے پر مالا کھڑی تھی۔ بکھرے بال لیے اور اس کی آنکھیں ٹیچن کے رنگ جیسی سرخ تھیں۔ جیسے ابھی آنکھوں سے لہو پھوٹنے والا تھا اور تاثرات کیسے تھے؟ آفاق لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔ وہ کسی بپھرے طوفان کے مانند لگ رہی تھی جیسے ایک ہی جھٹکے میں تنکا، تنکا سب کچھ بکھیرنے والی تھی۔ اس کے چہرے پر غیظ بھر رہا تھا اور لبوں سے جیسے جھاگ نکلنے والا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں آئی۔ نہ جانے وہ کب سے ان کی باتیں سن رہی تھی اب جو اس کا ضبط جواب دے گیا تو پھٹ پڑی۔

''اللہ تو رحیم ہے، رحم کرتا ہے مگر اس کے بندے، بندوں پر رحم اور ترس نہیں کرتے۔ جب موقع ملتا ہے ڈس لیتے ہیں۔ نہ دوست کی پشت دیکھتے ہیں نہ دشمن کا سینہ۔ آستین میں چھپ کر ڈستے ہیں اور پھر بھی ہمدردی کا امرت ٹپکانے کا ڈراما کرتے ہیں۔ آفرین ہے ایسے آستین کے ڈیش...... ڈیش...... سانپوں پر۔'' وہ کسی خونخوار بپھری شیرنی کی طرح غیظ وغضب سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے جبکہ عیسیٰ اور آفاق دم بخود رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں سب سے پہلے عیسیٰ ہی سنبھل کر آگے بڑھا تھا۔

''مالا! تمہیں کیا ہوا ہے؟'' عیسیٰ نے گھبرا کر مالا کے دونوں شانے تھامے۔ وہ غصے اور نفرت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کے اس غلیظ سوچ رکھنے والے دوست کی اصلیت کھل گئی ہے۔'' آج جیسے یومِ حساب آ چکا تھا۔ آج آفاق کے کرتوت کھلنے کا وقت آ چکا تھا۔ یہ رات سارے بھید، سارے بھرم توڑنے والی تھی۔ سارے راز کھولنے والی تھی۔ اب

کچھ بھی ڈھکا چھپا رہنے والا نہیں تھا۔ مالا، علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والے سانپ کے سر کو کچلنے والی تھی۔ وہ اس کے گریبان کو پکڑنے والی تھی۔

''کیا بکواس ہے مالا؟'' علی عیسیٰ گھبرا گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ گردن موڑے آفاق کو دیکھ رہا تھا جو کسی پتھر کے بت میں ڈھلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی رنگت انتہائی زرد ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو کر تھرتھرا رہے تھے اور اس کا پورا جسم بھی کانپ رہا تھا۔ وہ ایک مرد ہو کر بری طرح تھرتھرا رہا تھا شاید جو کچھ مالا کہنے والی تھی وہ سب کم از کم عیسیٰ کے سامنے سننے کا آفاق میں حوصلہ نہیں تھا۔

''جو کہہ رہی ہوں آپ بھی سن لیں۔ ہمارے گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں، نہ ہمارا کوئی دشمن موجود ہے۔ یہ سب کیا دھرا سوزن اور آفاق کا ہے اور ان کی پشت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے یہ آپ کو آفاق خود بتائے گا۔ یہی آپ کا سب سے بڑا دشمن...... آپ کو اذیت پہنچانے والا، آپ کی آستین میں آرام فرمانے والا، عیسیٰ اسے گھر سے نکال دیجیے۔ یہ ہمیں ڈس لے گا۔ ہماری خوشیوں کو نگل جائے گا۔ یہ کسی جامع سازش کو لے کر آیا ہے۔ یہ ہمارے درمیان جدائی ڈالنے آیا ہے۔'' وہ عیسیٰ کی شرٹ نوچے چیخ، چیخ کر رو رہی تھی۔ وہ حال سے بے حال تھی۔ وہ بے انتہا نڈھال تھی، وہ ذہنی اذیت کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی شاید وہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی شاید اس کے صبر، ضبط اور برداشت کی آخری حد ختم ہو چکی تھی۔

''یہ سوزن کے کہنے پر مجھے ٹارچر کرتا ہے۔ وہی سوزن جو آپ سے محبت کرتی ہے اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے صرف اپنے مذہب پر قائم رہ کر اور آپ کو اپنے مذہب کی طرف راغب کر کے۔ یہ ایک بڑی سازش کے تحت ہو رہا ہے، یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ یہ ہمیں تباہ کر دیں گے، یہ ہمیں جدا کر دیں گے۔'' وہ عیسیٰ کا گریبان جھنجوڑ رہی تھی اور عیسیٰ اتنا دم بخود تھا کہ اسے روک بھی نہیں پا رہا تھا۔ اسے چپ بھی نہیں کروا پا رہا تھا۔

''عیسیٰ! یہ ہمیں الگ کر دیں گے، مجھے آپ سے دور کر دیں گے۔'' وہ چیخ رہی تھی، رو رہی تھی۔ وہ نڈھال تھی، بے حال تھی اور عیسیٰ کے بدن میں دوڑتا لہو جم جم جا رہا تھا وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

''مالا...... ہوش کرو، کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی تمہیں مجھ سے دور نہیں کرسکتا۔'' عیسیٰ نے بہ مشکل اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔ وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

''آپ...... آپ اسے نکالتے کیوں نہیں۔ آپ اسے ابھی گھر سے نکال دیں۔ یہ مجھے نظر نہ آئے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟'' وہ عیسیٰ کی منتیں کر رہی تھی۔ عیسیٰ جیسے اس کے آنسوؤں سے پگھل رہا تھا، بے بس ہو رہا تھا اور وہ آفاق کے سامنے شرمندہ بھی تھا۔ اسے شرمندہ دیکھ کر آفاق نے سنبھل کر اسے اشارہ کیا۔

''تم فکر نہ کرو بس مالا کو دیکھو۔ میں برا ماننے والا نہیں۔'' آفاق نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ مالا کو اندر لے جائے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور عیسیٰ کم از کم آفاق کی فکر نہ کرے۔ وہ مالا کے الفاظ کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آفاق کی طرف سے حوصلہ افزا اشارے نے عیسیٰ کی جھکی آنکھوں کو کچھ اٹھا دیا تھا۔ وہ مالا کو لے کر بہ مشکل اندر گیا۔ وہ اب بھی چیخ رہی تھی اور عیسیٰ کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ان دونوں کے اندر جاتے ہی آفاق بے دم ہو کر صوفے پر ڈھے گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا اور سخت مضطرب کیفیت میں اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس کے دل پر کون سی قیامت گزر رہی تھی، یہ مالا نہیں جانتی تھی، علی عیسیٰ بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ بس مالا کی نفرت اور حقارت کی انتہا کو سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کہاں تک نیچے جا کر سوچتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی تھی؟ آفاق میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اسی لمحے سامان اٹھا کر اس گھر پر لعنت بھیجتا، ٹھوکروں سے ہر چیز اڑاتا چلا جاتا

مگر اسے جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرنا تھا۔ اسے عجلت نہیں دکھانی تھی بلکہ مشن امپاسبل کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔ وہ ناممکن نظر آنے والی ادھوری چیزوں کو... بے ترتیب چیزوں کو کس طرح سے ممکن بنا سکتا تھا اسے بگڑی ترتیب کو درست کرنا تھا اور یہ درستگی بھلا کون سا طوفان اٹھانے والی تھی یہ بات آفاق نہیں جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والی پُر اذیت اور انتہائی اعصاب شکن سچویشن کو بھلا کر آئندہ کی صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ اگلا منصوبہ؟ اگلا لائحہ عمل؟ اگلی پلاننگ یا اگلی کوئی کہانی......؟

مالا اسے گالیاں دے کر گئی تھی، طعنے مار کے گئی تھی، نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کر کے گئی تھی۔ اسے گھر تک سے نکالنے کی عیسیٰ کے سامنے التجا کر کے گئی تھی۔ وہ غیرت مند ہوتا تو عیسیٰ کے سامنے ہر چیز کو ٹھوکر سے اڑا کر چلا جاتا مگر بس ایک احساس تھا، جس نے اسے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روک رکھا تھا، بس ایک جذبہ صرف ایک احساس۔

☆☆☆

صبح تک مالا جیسے نارمل ہوگئی تھی حالانکہ رات کو جس طرح وہ کسی دورے کا شکار لگ رہی تھی کسی کو بھی اس کے سنبھلنے کی امید نہیں تھی مگر صبح ہوتے ہی اس کا ذہن پُرسکون ہوگیا۔ وہ ایک ان دیکھے بوجھ سے آزاد ہوچکی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جس ذہنی کرب سے گزر رہی تھی یوں لگ رہا تھا سب کچھ کہہ سن کر اس کا دماغ اور دل کپاس کے مانند ہلکے ہوگئے تھے۔ وہ عیسیٰ کو سب بتا کر جیسے آزاد ہوگئی تھی۔ اب اس کے من پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اسے قوی امید اور بڑا مستحکم یقین تھا کہ علی عیسیٰ اب اپنے دشمنوں کی نشاندہی ہوچکنے کے بعد اب ان سے خود ہی نپٹ لے گا۔ مالا کے نزدیک کہانی کھل کر سامنے آگئی تھی۔ آخر سوزن اور آفاق کی ملی بھگت کو مالا نے کھوج لیا تھا۔ سوزن جو اپنے رد کیے جانے کے توہین نما احساس میں جکڑی تھی۔ بظاہر مالا کے لیے بے انتہا مخلص تھی اور در پردہ آفاق کے ساتھ مل کر اسے ٹارچر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ علی عیسیٰ، مالا کو نفسیاتی مریضہ سمجھ کر کسی اسپتال میں پھینک آتا۔ سوزن اپنے تئیں رستے صاف کر رہی تھی۔ آفاق کو جانے کتنے پیسوں کا لالچ دے رکھا تھا مگر ایک بات تو مالا سمجھ چکی تھی۔ آفاق صرف سوزن کے لیے کام کرتا تھا اور سوزن کچھ تو اپنے لیے اور کچھ مون کے حصے کا غصہ بھی مالا پر آرام سے نکال رہی تھی۔ اسے بے وقوف بنا کر اس پر غصہ اور خوف طاری کر کے وہ لوگ بس علی عیسیٰ کی نگاہ میں اسے گرانا چاہتے تھے اور مالا ان کے انتہائی غلیظ مقاصد کو سمجھ چکی تھی اور آج وہ مطمئن اس لیے تھی کہ علی عیسیٰ کی آنکھیں بھی اس نے کھول دی تھیں۔

شاید آج مالا کے سکون اور اطمینان کا دن تھا۔ اگرچہ علی عیسیٰ نے اسے کی تمام باتوں اور بدگمانیوں کے جواب میں کوئی سوال نہیں پوچھے تھے مگر وہ کسی بھی وقت مالا سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا۔ وہ اس سے کوئی ثبوت مانگ لیتا یا دلیل جانچتا تو مالا بھلا کیا جواب دیتی؟ اس کے پاس فی الحال کوئی ثبوت نہیں تھا اور ثبوت اکٹھا کرنے کے لیے اسے سوزن اور آفاق کی باتیں ریکارڈ کرنا تھیں۔ مالا کا یقین مستحکم تھا کہ ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق نفسیاتی طور پر اسے ٹارچر کرنے کے لیے عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آئیں گے تب اس کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈر کا ہونا بہت ضروری تھا۔

وہ آج عیسیٰ اور آفاق کے جاتے ہی قریبی مارکیٹ اکیلی چلی آئی تھی۔ اسے ایک بہت چھوٹا سا فلیش ڈرائیو جتنا ریکارڈر چاہیے تھا جسے وہ اپنے بالوں کے پیچھے پن اپ کرسکتی۔

آج وہ اکیلی علی عیسیٰ کے من ہائیم کی چمکتی شفاف سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ یہ من ہائیم تھا جو مالا کے من میں بہتا تھا۔ یہاں انسان نہیں طلسماتی، رومانوی کردار بسا کرتے تھے۔ کالی، چمکیلی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی اور وفا گندھی ہوئی تھی۔

سرمئی سڑکوں پر خوش پوشاک، خوب صورت، صحت مند لوگ چلتے تھے اور شیشوں کی دکانوں میں چینی کی گڑیا جیسی سیلز گرلز راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھیں۔

اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سرمئی چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان، جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے!

اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مالا کی یہی سوچ تھی، اس سرزمین سے مالا کے قدم اکھڑنے کے وقت بھی یہی سوچ تھی۔ وہ کچھ خواب کی سی کیفیت میں چلتی شیشے کے ریکس دیکھنے لگی۔ جن پر جدید قسم کے ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، موبائل اور مختلف قسم کا الیکٹرونکس کا سامان پڑا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کرسٹل نما فش کی شیپ میں پڑے ریکارڈر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اسے جلد ہی گوہرِ مقصود مل گیا تھا۔ اس نے کرسٹل کا فش نما ریکارڈر اٹھا کر سیلز گرل کے سامنے رکھا۔

''یہ کتنے کا ہے؟'' مالا نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔ وہ ببل گم چباتی اپنی پونی ٹیل ہلا کر اس کی طرح ہنستی مسکراتی نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ ٹائپ کی سیلز گرل تھی۔ بہت خوب صورت، صحت مند اور اجلی اجلی سی۔ مالا عموماً اس کے پاس خریداری کے لیے آتی تھی۔ اس نے ایک ریک کے طرف ڈھیروں میگزین بھی رکھے ہوئے تھے۔ اکثر خریداری کے دوران مرد حضرات ان میگزین کی تب تک ورق گردانی کرتے تھے جب تک ان کی خواتین شاپنگ سے فارغ نہیں ہوجاتیں۔ جب وہ جانے لگتے تب یہ سیل گرل ان کو لجاجت سے مخاطب کرتی۔

''کیا میگ پیک کردوں؟ یا میگزین چاہیے؟'' اکثریت اس کی لجاجت کو دیکھتے ہوئے میگزین خریدنے کو ترجیح دیتے تاہم کچھ مالا جیسے لوگ بھی تھے جو بن دیکھے انکار کردیتے تھے۔ تاہم یہ لڑکی ہر کسی کو جاتے ہوئے میگزین خریدنے پر ضرور اکساتی تھی۔ جانے یہ میگزین کیسے تھے؟ فی الوقت مالا کو ریکارڈر خریدنے کی جلدی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر تانک جھانک کرکے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سیلز گرل کو بتایا۔

''میں یہ لوں گی۔'' اس کی ڈوچ اتنی امپرووتو ہوگئی تھی جو وہ اب انگریزی کا ٹوٹا پھوٹا سہارا لیے بغیر اور آئی ول ٹیک اٹ بولے بنا کسی بھی دکان سے کچھ بھی خرید سکتی تھی۔ سیل گرل نے اس کا مطالبہ سن کر ریکارڈر پیک کردیا تھا۔ قیمت اوپر ہی چسپاں تھی مالا نے رقم پکڑا کر دانکے شون (آپ کا شکریہ) بولا اور پھر پلٹ کر جانے لگی تب اسی لڑکی نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔

''تم میگزین لوگی؟'' وہ مالا سے مخاطب تھی جب دو تین اور کسٹمر پہنچ گئے۔ وہ اسے چھوڑ کر انہیں فارغ کرنے لگی تھی۔ مالا نے اچٹتی سی نگاہ میگزین کے سرورق پر ڈالی اور دوسری نگاہ ڈالنے کا گناہ کیے بغیر استغفراللہ بولتی جھپاک سے باہر نکلنے لگی تھی معاً اپنے پیچھے ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کون تھا؟ جو جدید قسم کے کیمروں کا پوچھ رہا تھا اور اس کی مانوس سی آواز میں ''بیتے سیگن زی میر۔'' (برائے مہربانی مجھے دکھایئے) سن کر وہ پلٹ ضرور جاتی جو لوگوں کا ایک ہجوم اس طرف امڈ نہ آتا۔ اتنے رش کا اسے گمان نہیں تھا۔ ایک دم بھانت بھانت کے لوگ آگئے تھے۔ مختلف آوازیں مگر مطالبہ اور خواہش صرف ایک تھی۔

''نیا میگ آیا ہے؟'' وہ لوگ میگزین کے ڈھیر پر مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ سیل گرل کی مسکراہٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ پہلے والی ناگواری اور سنجیدگی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ وہ خوش اخلاقی سے انتہائی عریاں تصویروں والا میگ ایک، ایک گاہک کو پکڑا رہی تھی۔

مالا استغفار، استغفار کا ورد کرتی کانوں کو ہاتھ لگاتی رائل روڈ پر چل رہی تھی مگر اس کے کان ابھی تک اسی مانوس آواز کی بازگشت کو سن رہے تھے بلاشبہ وہ آفاق کی آواز تھی یا تو اس نے مالا کو دیکھا نہیں تھا یا پھر دیکھ کر جان بوجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔ آخر شرم اور شرمندگی کے باعث کیسے سامنا کرتا؟ وہ بھی اس

صورت میں جب مالا اس کی چالوں اور منصوبوں کو جان چکی تھی۔ اب اپنا کریہہ روپ اور بدنما شکل لے کر مالا کا سامنا کیسے کر پاتا؟ یوں کہ عیسیٰ بھی اسے اب گھاس ڈالنے والا نہیں تھا۔ مالا کو قوی امید تھی کہ آج نہ سہی تو اگلی سویر تک عیسیٰ، آفاق کو گھر اور جاب سے نکال دے گا۔ دراصل عیسیٰ بڑا بااصول بندہ تھا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ضابطے میں رہ کر کارروائی کرتا اور مالا کو پوری امید تھی کہ عیسیٰ، آفاق کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی اس پر اندھا بھروسا ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کرے گا۔ مالا کو اب صرف رات کا یا اگلی سویر تک کا انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اس سے زیادہ آفاق کو گھر میں رکھ کر مالا کو ذہنی اذیت اور ڈپریشن کا شکار کبھی نہیں کرے گا۔ اسے مالا دنیا میں اپنے باپ اور بہن کے بعد ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز تھی۔

وہ اپنی اسٹریٹ پر آئی تو اچانک انی کے مکان پر نظر پڑی۔ وہاں سفید نائیلون کے جالی دار پردوں والی کھڑکیوں کے بیرونی طرف پھولوں سے لدی ٹوکریوں کے ایک جانب بورڈ پر ابھی تک زیمر فری یعنی روم فار رینٹ لکھا تھا۔ کرایے کے لیے ابھی تک کمرا خالی تھا اور انی کو کرایے دار آج تک نہیں ملا تھا۔ خیر انی کی یہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی۔ آج شام تک یا اگلی صبح تک علی عیسیٰ، آفاق کو گھر سے نکال کر جاب سے فارغ کرنے والا تھا۔ ایسے فریبی، مکار، ذلیل اور آستین کے سانپ جیسے ہم وطنوں کا علاج بھی یہی تھا۔ انہیں عزت اور رزق راس آنے والا نہیں تھا۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر بھلا کیسے چین پا سکتے تھے؟ اب اسے خوار ہونا تھا۔ اپنی جلد بازی، کمینی فطرت اور لالچ کے باعث وہ مالا کے دل سے تو اترا ہی تھا عیسیٰ کی نگاہ اور دل سے بھی نکل گیا تھا۔ اب کیسے ماں کو حج کروائے گا، کس طرح دادی کو کڑے بنوا کر دے گا اور کیسے بہنوئیوں کو سیٹ کرے گا' بہنیں بیاہے گا؟ دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر کے سکھ پانا کوئی آسان نہیں ہوتا، کاش کہ کم فہم آفاق جان جاتا۔ لالچ میں آ کر عیسیٰ کے دل سے نہ اترتا۔ اس کے گھر سے نہ نکلتا تو آئندہ سالوں میں اس ملک جرمنی کا باعزت شہری بن جاتا مگر عزت اور حلال رزق کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے، ہر کسی کے نہیں۔

جانے کون سی ایسی طاقت تھی جو اسے مالا اپنے گھر کے بجائے انی کے گھر لے آئی تھی۔ دراصل وہ انی کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ انی کو آفاق کے ایک ایک کرتوت، چال، منصوبے اور مکاری کے بارے میں بتانے کا پختہ ارادہ کر کے آئی تھی پھر اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر انی کو سب کچھ بتا دیا۔ سوزن کی عیسیٰ سے محبت، سوزن کی چال، آفاق اور سوزن کی دوستی، ان کا منصوبہ اور مالا کو پے در پے خوف زدہ کرنے تک۔ وہ ایک ایک کہانی کھول کھول کر بتا رہی تھی۔ وہ آفاق کی بدفطرت کے ایک، ایک بھیانک پہلو کو اجاگر کر رہی تھی۔ اسے انی جیسی معصوم لڑکی کو آنے والے فریب اور دھوکے سے بچانا تھا۔ وہ صاف نیت اور خلوص لے کر آئی تھی۔ وہ انی کی ہمدرد دوست اور اچھی پڑوسن کا حق ادا کرنے آئی تھی مگر انی نے بھلا کیا سمجھا؟

وہ اسے حاسد اور بدفطرت سمجھنے لگی۔ یہ کہ مالا اس کی خوشیوں سے جلنے لگی تھی۔ آج شام ان کا نکاح تھا اور مالا رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئی تھی۔ وہ تو نکاح کی خبر پر ہی شاکڈ تھی لیکن انی کی بدگمانی، غصہ اور رونے دھونے کو دیکھ کر اور بھی ڈھے گئی۔ وہ انی کو بچانا چاہتی تھی مگر انی خود ہی گڑھے میں گرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ انی نے اس کی پوری بات سن کر شاکڈ سی کیفیت میں کہا تھا۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تم میری خوشی میں رکاوٹ بن جاؤ گی۔ تمہیں کیا خبر یورپین کنٹریز میں پاکستانی لڑکیوں کو اچھے رشتے ملنا کتنا مشکل اور کٹھن ہوتا ہے۔ میری ماں کی نیندیں حرام ہیں اور میرا بھائی پاکستان میں رشتے داروں کے گھروں میں ہمارے لیے اچھے بر تلاشنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ مجھے

تمہاری سوچ پر بہت افسوس ہے، کیا اتنے عرصے بعد تمہیں اچانک آفاق اپنا دشمن نظر آنے لگا ہے؟ آخر پہلے بھی تو وہی آفاق تھا جس کے تمہارے شوہر اور تم گن گایا کرتے تھے۔ اب آفاق میں کیسے کیڑے نظر آ گئے؟ اور تم یقیناً کسی غلط گمان میں ہو، آفاق ایسا نہیں ہے۔“ انی نے دکھ کی انتہا پر پہنچ کر مالا کے سارے طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ مالا کو برا بھلا کہہ رہی تھی، غصہ کر رہی تھی اور ناراض ہو رہی تھی۔ اس کی ممی اور ایمی نے بھی جیسے فساد کھڑا کر دیا تھا۔ عین نکاح والے دن مالا کا آفاق کے بارے میں برائی نامہ سن کر انہیں یہی کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔

اِدھر مالا اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ وہ ان لوگوں کو جہنم میں جاؤ کہہ کر واپس پلٹ آئی۔ اسے انی کی بدگمانی کا بہت دکھ تھا۔ دوستی کا لحاظ کیے بغیر اس نے مالا کو کیسے منہ پھاڑ کر حاسد کہہ دیا تھا۔ اسے رنج نہ ہوتا تو پھر وہ شادیانے بجاتی کیا؟ وہ بہت بکھری ٹوٹی حالت میں جرمنی جیسے ملک میں موجود اپنی دوسری سہیلی سے بھی ناتا توڑ آئی تھی۔ سوزن سے تو رشتہ ختم ہوا ہی تھا، آج انی بھی ہمیشہ کے لیے پرائی ہو گئی تھی۔ مالا کا دل ٹوٹ سا گیا۔ انی نے جس طرح کا رویہ اس کے ساتھ رکھا تھا وہ مالا کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق ایک لفظ بھی برا نہیں سننا چاہتی تھی اسے مالا ایک نمبر کی منافق، جھوٹی، گھٹی اور مکار نظر آئی تھی۔ انی کی نظر میں اس کا امیج بگڑ گیا تھا۔ مالا روتی چلاتی یا دکھی کیوں نہ ہوتی۔

وہ بھیگے چہرے کے ساتھ تالاب کے قریب سے گزر رہی تھی جب اس نے کچھ فاصلے پر پھولوں کے اونچے جھنڈ کے ایک طرف سرسراہٹ سی محسوس کی تھی۔ وہ شاید اپنے دکھوں اور رونے دھونے میں مشغول بھی نہ متوجہ ہوتی جب تک وہ ”او میرے مالک!“ جیسی آواز نہ سن لیتی۔ کوئی جھنڈ کے دوسری طرف دوزانو بیٹھا نوکیلی گھاس میں ہاتھ مارتا شاکڈ سا تھا۔

مالا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اسے آفاق کی جیکٹ نظر آ گئی تھی اور اس کا مخصوص لیدر بیگ جس کو اس نے کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ اللہ جانے وہ مارکیٹ سے سیدھا گھر آ رہا تھا یا پھر گھر سے اب دوبارہ کہیں جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھٹک کر آفاق کو دیکھنے لگی۔ اس نے گھاس میں سے کچھ تلاش کر کے اسے اپنے ہاتھ میں ٹٹولا پھر ”او میرے مالک!“ بول کر اس چیز کو عجلت میں اپنے لیدر بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کا چہرہ انتہائی سرخ تھا۔ آنکھوں میں حیرت اور عجیب سا تعجب تھا جیسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ نوکیلی گھاس میں سے کوئی اس قسم کی چیز بھی دریافت کر سکتا تھا۔ جس کی نہ تو اسے کوئی توقع تھی اور نہ کوئی امید۔ وہ اتنا ہی شاکڈ، حیران، متحیر اور دم بخود تھا پھر جیسے وہ اس جھٹکے سے سنبھل کر اپنی جگہ سے اٹھا تھا تب اس کی مالا پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ یہ اتفاقاً مالا سے دوسرا ٹکراؤ تھا۔ مارکیٹ کے بعد وہ اب دوبارہ اسے دیکھ رہا تھا حالانکہ فی الحال وہ اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔

”گھر کے اہم مقامات پر کیمرے فٹ کر دیے ہیں۔ دیکھ لینا جلد حقیقت سامنے آ جائے گی، سچ کو کھلتے دیر نہیں لگے گی۔“ وہ مالا کو ہرگز بھی نہ بلاتا مگر پھر بھی خود کو روک نہیں پایا تھا۔ رات کے ایک، ایک منظر کو ایک، ایک اذیت کی لہر دبانے کے بعد نظرانداز کرنا بہت مشکل تھا مگر آفاق نے یہ مشکل اور کٹھن مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا تھا۔

”سچ تو کھل گیا۔“ مالا انتہائی تنفر سے بولی تھی۔ جی چاہ رہا تھا آفاق کا مکاری بھرا چہرہ ناخنوں سے کھسوٹ ڈالے مگر اس خواہش پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔

”یہ سچ آدھا ہے...... پورا کھلنے سے پہلے حتمی فیصلہ نہیں چاہیے ورنہ پچھتاوے گھیر لیتے ہیں۔“ وہ عجیب سے کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مالا کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا تھا۔

”ہونہہ...... پورا سچ...... اب کسے دھوکا دینا چاہتے ہو؟ عیسیٰ نے تمہارا کریہہ روپ تو دیکھ لیا ہے۔“

وہ زہر خند ہوئی۔

''عیسیٰ نے ابھی میرا ہی روپ دیکھا ہے وہ بھی تمہاری نظر سے۔ اسے اب اپنی نظر سے بھی کچھ دیکھنے دو۔ تم نے اپنی پٹی ہی اس کی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے۔'' آفاق بھی تلخی سے بولا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آفاق کی بات کو مذاق سمجھ کر انجوائے کرتی مگر اب تو اس کا دماغ آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔

''عیسیٰ نے تمہارے کرتوت دیکھ لیے ہیں۔ اب تم بس فیصلے تک کا انتظار کرو۔'' مالا اسے دھتکار رہی تھی۔ آفاق کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''فیصلے سے زیادہ میں اسے کچھ ایسا ضرور دکھاؤں گا جو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہے گا۔ تم بھی انتظار کرو۔'' اس نے گویا بدلہ اتارا تھا۔

''تمہیں غرور کس بات پر ہے؟ اپنے شاطر ذہن پر یا اعلیٰ منصوبے پر...... جو تمہارے ہی منہ پر آپڑا ہے۔'' وہ آگ بگولہ ہوگئی۔

''ایک طرف کی کہانی، فلم کا آدھا پارٹ، ناول کا پہلا حصہ، ڈرامے کی ابتدائی قسطیں...... بھلا اصل کہانی اور انجام تک پہنچنے سے پہلے تم فردِ جرم کیسے عائد کرسکتی ہو؟ کم از کم میں عیسیٰ کو تمہارے جیسا جلد باز یا جذباتی نہیں سمجھتا۔'' آفاق نے کچھ جھنجلا کر کہا تھا۔

''تو پھر آج شام یا کل صبح تک انتظار کرلینا۔ عیسیٰ تمہیں خود گھر سے باہر نکال دیں گے۔ آستین کے دشمن۔'' وہ غیظ کے مارے لرز گئی تھی۔

''عیسیٰ مجھے کیوں نکالے گا؟ میں اس کے دھکے دینے سے پہلے ہی تمہارا گھر چھوڑ دوں گا مگر عیسیٰ کو کچھ دکھانے کے بعد۔ مجھے ابھی اپنے نکاح کے وقت کوئی بدمزگی نہیں پھیلانی...... نکاح کے بعد بتادوں گا کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔'' آفاق غضب ناک تیور لیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے لیدر بیگ کو سینے سے چمٹائے باہر کی طرف چلا گیا تھا جبکہ مالا سر جھٹکتی اندر آگئی۔

☆☆☆

آفاق کی باتوں نے اس کا دماغ سلگا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جونہی کمرے میں داخل ہوئی اسے اپنے کمرے میں جگہ، جگہ کچھ میگزین بکھرے دکھائی دیے تھے۔ اس نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ اس کے کمرے میں کوئی حساس سسٹم یا کیمرا نہیں تھا اور یہ میگزین نہ جانے کس نے پھیلا رکھے تھے۔ تقریباً بیس تیس کے قریب رسائل تھے۔ مالا شاکڈ اس لیے رہ گئی تھی کہ آخر یہ کارنامہ کس کا تھا کس نے رسائل کا انبار بیڈ، کاؤچ، کارپٹ اور صوفوں پر لگا رکھا تھا؟ وہ میگزین سے بچتی بچاتی صوفے تک آئی تھی پھر اس نے جھک کر غیر ارادی طور پر میگزین اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آگئی تھیں۔ یہ وہی رسائل تھے جنہیں مالا نے مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ ایک نہیں، دو نہیں بلکہ پورا ڈھیر...... ان کی فحش عریاں اور واہیات تصویریں تھیں کہ مالا کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ وہ آگ برساتی آنکھیں لیے نینی کے سر پر سوار ہوگئی۔

''یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟'' مالا نے غضب ناک تیور لیے نینی سے پوچھا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق نینی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ آج سے پہلے بھی اِکا دُکا ایسے بے ہودہ رسائل گھر میں دکھائی دیے تھے مگر مالا تب غور نہ کرپائی تھی کہ انہیں کون لاتا ہے۔

''مجھے نہیں پتا، آفاق سر کو پتا ہوگا۔ وہی تو ابھی مارکیٹ سے آئے ہیں۔'' نینی کے سادگی بھرے جواب نے مالا کو آگ لگا دی تھی۔ آخر یہ آفاق کرنا کیا چاہتا تھا؟ اس قسم کے میگزین اس کے کمرے میں رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ صرف اور صرف عیسیٰ کو بدگمان کرنا؟ مالا آنسو بہاتی ''اور اللہ تمہیں سمجھے آفاق'' کہتی تمام میگزین اٹھا کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال رہی تھی۔ جب علی عیسیٰ بھی اچانک گھر آگیا۔ اب مالا کی حالت اس کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی پھر جو اس نے میگزین دیکھ لیے تو اس کا پارہ بھی بنا سوچے سمجھے چڑھ گیا تھا۔

''یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟'' اس کی آنکھیں غصے کے مارے سرخ ہوگئی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتا ہی تھا کہ مالا اس قسم کی نازیبا اور گھٹیا حرکات نہیں

کر سکتی اور نہ شوہر کی غیر موجودگی میں ایسی نیچ سطح کی بے ہودہ تفریح سے لطف اندوز ہونے والی تھی۔ سو اسے مالا پر غصہ ہرگز نہیں آیا تھا اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ عیسٰی کا بھی پہلا دھیان آفاق کی طرف گیا۔

”آفاق کے علاوہ اس گھر میں کون ہے؟“ مالا، عیسٰی کے سامنے پانی، پانی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظر چرائے کھڑے تھے اور عیسٰی جیسے سنجیدگی اور غصے کی انتہا پر کھڑا فیصلہ سنا رہا تھا۔

”آج شام کو اس خبیث آدمی کا نکاح ہے۔ میں اسے آج ہی یہاں سے فارغ کرتا ہوں۔ بس نکاح ہونے کا انتظار ہے۔“ وہ لب بھینچے دوبارہ دفتر چلا گیا تھا جبکہ مالا گویا سر تھام کر رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

”اور نہ جانے ابھی کیا، کیا ہونا باقی تھا؟“ اس کے ذہن اور خیال میں تھا کہ آفاق کو گھر سے نکالتے ہی ان کی زندگیوں کا انتشار اور بے ترتیبی ختم ہو جائے گی۔ وہ بلا کی ناسمجھ اور کم فہم تھی۔ تبھی اس امید پر خود کو پُرسکون کیے ہوئے تھی۔

سہ پہر ڈھلے بالکل غیر متوقع طور پر پاکستان سے اس کی بہن بندیا کی کال آگئی۔ اس کے ہمیشہ والے شکوے اور شکایات کو سنتی مالا چند لمحوں کے لیے اپنے پُرسکون گھر میں ذہنی طور پر چلی گئی اس کے بابل کا آنگن، چھجلے، لائق فائق خوب صورت بھائی، نٹ کھٹ سی بہن، شفیق سی ممی جیسے زندگی کے رنگ مکمل ہونے لگے تھے مگر یہ مکمل رنگ ایک خواب کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ پلک جھپکنے کی دیر میں حقیقت پھن پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ بندیا تو شکوے کر سکتی تھی مگر وہ شکوہ بھی نہ کر سکی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی۔

”بابل نے مجھے کس اجنبی دیس بھیج دیا جیسے کوئی جادو نگری ہو، جیسے کوئی طلسماتی دنیا ہو، جہاں سازشوں کے جال، جہاں مکاریاں اور عیاریاں ہیں، جہاں تالاب پر پریاں اترتی ہیں پر وہ پریاں بدیع الجمال کی طرح ہرگز نہیں.....“ وہ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

کوئی شکوہ نہ کر سکی، نہ حرفِ شکایت لبوں پر آیا۔ بندیا کے پاس مالا کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بہت سے انکشاف، بہت سی خبریں۔

”ذیشان بھائی کے تیور ٹھیک نہیں، آتے جاتے عینی کے گیت سناتا ہے۔ لمبی لمبی ٹیلی فونک باتیں، آج کل عینی کا بھوت ذیشان بھائی کے سر پر ناچ رہا ہے۔ شامی اور ذی شاہ کی اپنی مصروفیات، تمہارے بعد میں اکیلی ہوگئی ہوں۔“ خاندان کی چیدہ چیدہ خبریں بتاتے ہوئے وہ آخر میں دکھی ہوگئی تھی اور اپنے دکھوں میں اس نے مالا کی خاموشی کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔

”تم اپنے عیسٰی کو لے کر کب آؤ گی؟ مجھے نہیں لگتا تم جلد آپاؤ گی؟ عیسٰی کی پوری ٹیم جب تک تیار نہ ہوگی۔“ اب وہ بڑے بھنائے سے لہجے میں کہہ رہی تھی تب مالا قدرے چونک گئی۔ اس نے بے خیالی میں اِدھر اُدھر دیکھا اسے بندیا کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”ویسے تم ایسی بے مروت تو نہ تھیں۔ ہزار مرتبہ کہا ہے، عیسٰی کی اور اپنی فوٹو ہی بھجوا دو نہیں تو انٹرنیٹ یا فیس بک یوز کرلو پر تمہارے پاس فرصت ہی کہاں ہے؟ میں تو اپنے بھانجے کو دیکھنے کے لیے بھی ترس جاؤں گی۔“ بندیا تُرخ کر کہہ رہی تھی وہ دوسروں کی کم ہی سنتی تھی، بس اپنی سنائے جاتی۔

”ایک بات سچ، سچ بتاؤ، کیا عیسٰی تم سے جاب کرواتا ہے؟ یا پھر گھر کے کام اتنے زیادہ ہوتے ہیں جو تمہیں فرصت نہیں ملتی؟“ وہ غصے اور ناراضی سے پوچھ رہی تھی تب مالا کو بھی چونکنا پڑا تھا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں، مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ہے اور تم جانتی تو ہو عیسٰی فنانشلی کتنے اسٹرانگ ہیں۔“ مالا نے بے ساختہ وضاحت کی تھی تب بندیا جیسے مطمئن ہوگئی۔

”اچھا تو پھر میں سمجھ لیتی ہوں، عیسٰی بھائی کی سنگت نے تمہیں اتنا خود میں محو کر رکھا ہے کہ تمہیں ہم یاد نہیں آتے۔ اچھا ہے ناں بس تم سکھی اور آباد رہو۔“ نٹ کھٹ سی بندیا شوخ لہجے میں کہتی آخر میں سنجیدہ

ہوگئی تھی تب مالا نے ڈیڈی، ممی اور بھائیوں کا حال احوال پوچھ کر فون بند کر دیا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل بھر بھر آنے لگا۔ سب بے طرح یاد آنے لگے۔

سوچوں کے تانوں بانوں نے اسے الجھا رکھا تھا تب چاچو کی کراہ اسے حال کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی چاچو تک پہنچی تھی ان کی طبیعت خراب لگ رہی تھی۔ وہی سینے کا پرانا درد تھا مالا نے چاچو کو دوا دی ان کا سینہ اور بازو مسلا تو ایک دم انہیں افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ مالا چاہتی تھی کہ عیسیٰ کو اطلاع کر دے مگر چاچو نے منع کر دیا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہے تھے مگر وہ ٹھیک نہیں تھے۔ مالا جانتی تھی پر چاچو اسے اٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا مالا ان کے قریب رہے اور ان سے باتیں کرے۔ وہ گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی رنگت کتنی پھیکی تھی اور ماتھے پر بار بار ابھرتی بوندیں...... مالا کا دل خدشات میں لپٹ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا جیسے قریب، قریب کوئی خاص آہٹیں سنائی دے رہی تھی۔ چاچو بھیگی آواز میں بتا رہے تھے۔

"موں کی کال آئی تھی۔" ان کا لہجہ بھرا ابھرا تھا۔

مالا نے گہری سانس لی۔ موں کی کال جب بھی آتی وہ اسی طرح بیمار ہو جاتے تھے۔ انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، رنگت پھیکی پڑ جاتی، سینے میں درد اٹھنے لگتا۔ جانے یہ موں کیسی بیٹی تھی؟ کیسی اولاد تھی جو ٹھنڈک بننے کے بجائے کوئی عذاب یا سزا کی طرح نازل تھی۔

"کیا کہتی ہے؟" مالا نے حتی المقدور سرسری لہجے میں پوچھا تھا حالانکہ موں کے ذکر سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا اور اندر کہیں دور گہرائی میں خوف کی لہریں ابھرنے لگتیں۔

"بس ایسے ہی۔" انہوں نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش کی تھی مگر وہ مسکرا نہیں پائے تھے۔ مالا بغور انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اپنی عمر سے ذرا بھی بڑے نہیں لگتے تھے بلکہ چار پانچ سال چھوٹے ہی لگتے۔ اونچے، لمبے، مضبوط اور بے انتہا خوب صورت۔ شاید چاچی، چاچو کے حسن میں گرفتار ہوگئی تھیں۔ چاچو کا سحر بھلا جوانی میں کیسا ہوگا؟ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تو علی عیسیٰ کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

ہاں عیسیٰ چاچو کی جوانی ہی تو تھا۔ انہی جیسا خوب صورت اور حلیم الطبع۔ نہ جانے چاچی مزاجاً کیسی تھیں؟ وہ تو عمر بھر پاکستان نہیں گئی تھیں نہ چاچو اور بچوں کو جانے دیا اور ان کے مر جانے کے بعد دونوں بھائیوں نے ایک تیسرا مضبوط رشتہ اپنے درمیان قائم کر لیا تھا مالا اور عیسیٰ کی صورت میں۔

وہ چاچو کو بغور دیکھتی رہی تھی وہ اب بھی بہت گریس فل اور جوان لگتے تھے مگر موں کی وجہ سے مالا کو لگتا تھا وہ اندر ہی اندر کھوکھلے ہو رہے تھے پھر جیسے انہوں نے مالا کی سوچ کو زبان دے دی تھی۔

"میرا جرمنی میں ہمیشہ رہنے کا فیصلہ بہت غلط تھا بیٹا۔ ہم پاکستانی لوگ ایک عمر اجنبی دیس میں گزار کر جب اولاد کے ہاتھوں پامال ہونے لگتے ہیں تب، تب پھر اپنی قدریں، اپنی تہذیب اور اپنا وطن یاد آتا ہے۔ مجھے جلد یہاں سے لوٹ جانا چاہیے تھا مگر میں واپس پلٹ نہ سکا۔ مریم واپس نہیں جانا چاہتی تھی، اپنی ماں کو چھوڑنا اس کے لیے مشکل تھا اور میں ایسا خود غرض کے اپنی ماں کو چھوڑ آیا۔ کبھی لگتا ہے یہ ماں کے آنسوؤں کی سزا ہے۔ یہ موں میرے لیے ایک سزا ہی تو ہے۔" ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہے تھے۔ اپنی غلطیاں اب اتنا وقت بیت جانے کے بعد پہاڑ جتنی لگ رہی تھیں۔ مالا سے ان کا کرب دیکھا نہیں گیا تھا۔

"اس میں آپ کا کیا قصور چاچو، یہ تو رزق باندھ لیتا ہے۔" اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے تھے۔ وہ ان کے بال سہلا رہی تھی۔ یہ بھی تو ایک بیٹی ہی تھی۔ سات سمندر پار سے اپنے اپنوں کو چھوڑ کر آئی صرف ان کے علی عیسیٰ کے لیے۔ اپنے ماں، باپ کے لیے بھی ٹھنڈک، چچا کے لیے بھی ٹھنڈک اور شوہر کے دل کا چین و قرار۔ کبھی کبھی ان کا

بھی دل چاہتا تھا، وہ اپنی موں کی شادی کریں۔ اسے شوہر کے ہمراہ ہنستا، بستا دیکھیں۔ اس کے بچوں کو گود میں اٹھائیں۔ ان کی قلقاریاں سنیں مگر موں ان کی کوئی خواہش پوری کرنے والی نہیں تھی۔ بس ایک دل کو ٹھیس لگی تو سارے رشتوں کی مٹھاس بھول گئی۔

"دل بہلاوے کی باتیں ہیں ساری، سچ تو یہ تھا میں واپس جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ جرمنی کا حسن بھی بنگال کا کالا جادو ہے جو ایک دفعہ طاری ہوا تو پھر عمر بھر کے لیے نہ ٹوٹا۔" ان کی آواز بھیگ گئی۔ وہ رندھے لہجے میں رونے لگے تھے۔ مالا کے سامنے آج تک وہ اتنے کمزور نہیں پڑے تھے۔ جانے آج کیا ہوا تھا؟ وہ اتنے زود رنج کیوں ہونے لگے؟ وہ اتنے بکھر کیوں رہے تھے پھر وہ بہت دیر تک مالا سے باتیں کرتے رہے پھر جیسے انہیں نیند آنے لگی۔ وہ اونگھ رہے تھے جب مالا احتیاط سے اٹھ کر ان کا وجود کمبل سے ڈھانپ کر باہر نکل آئی۔

آج معمول سے بڑھ کر سناٹا تھا۔ نینی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ مالا نے سفید نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ سامنے والے گھر میں چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج روشنیوں کا شمار کوئی نہیں تھا۔ انی کی ممی پوری بجت بھلائے سارے گلوب آن کر رہی تھیں۔ مالا کو ڈھولکی کی تھاپ سنائی دی تھی۔ انی کی کزنز اور دوست آتی جاتی، بھاگتی دوڑتی، ہنستی مسکراتی نظر آ رہی تھیں۔ مالا کی آنکھ میں کچھ چبھنے لگا۔ اس نے روشنیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آج روم فار رینٹ کی تختی بھی اکھڑ چکی تھی۔ انہیں مستقل کرایے دار مل چکا تھا۔ مالا کا دل بھر سا آیا۔ انی کی... اعتباری نے سینے میں پھانس گاڑ دی تھی۔ وہ اس کا بھلے سے اعتبار نہ کرتی پر اتنی رکھائی تو نہ دکھاتی، اتنی توہین تو نہ کرتی۔ مالا نے نم آنکھوں سے آخری دفعہ انی کے گھر پر نگاہ ڈال کر پردے برابر کر دیے تھے۔ اب عمر بھر کے لیے اس نے سامنے والے گھر کو نہیں دیکھنا تھا۔

وہ واپس پلٹ کر کمرے میں آئی تو کچھ ہی دیر بعد علی عیسیٰ بھی چلا آیا۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر آ رہا تھا۔ گلے میں ٹائی لٹک رہی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا پژمردہ لگ رہا تھا۔ مالا نے چاچو کی خرابیٔ طبیعت کا بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی پہلے اسے کچھ کھانے پینے کو دے گی پھر چاچو کا بتائے گی ویسے بھی اب وہ پہلے سے بہتر تھے اور اونگھ رہے تھے مگر اس کے باوجود عیسیٰ چاچو کے کمرے میں جھانک کر انہیں سوتا دیکھنے کے بعد مطمئن سا واپس آیا تھا تب تک مالا گرما گرم چائے اور اسنیکس لے آئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے جیسے وہ فریش سا ہو گیا تھا تب مالا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"آفاق اور انی کا آج نکاح ہے؟ وہ بھی اتنا اچانک؟" مالا نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے ہی تو اسے آفاق کے نکاح کا پتا چلا تھا اور وہ اسی لیے حیران بھی تھی۔

"ہاں، انی کی ممی کو بہت جلدی ہے۔ ایک لحاظ سے بہتر ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ آفاق کا نکاح جلدی ہو جائے اور وہ یہاں سے چلا جائے۔" گرما گرم چائے کے گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ عیسیٰ کے تاثرات سپاٹ قسم کے تھے۔ مالا کو یوں لگا کہ وہ آفاق کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا تاہم نکاح میں شرکت کا وہ ارادہ ضرور رکھتا تھا۔ با اصول بندہ جو تھا ہر کام ضابطے اور قاعدے سے کرتا تھا۔ مالا نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

"میں انی کے گھر نہیں جاؤں گی۔" مالا نے لگے ہاتھوں طبیعت کا بہانہ بنا کر انی کی اور اپنی تلخ گفتگو کو چھپا لیا تھا۔ عیسیٰ نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ تاہم وہ سر ہلا کر تائید ضرور کر رہا تھا پھر موضوع گفتگو خود بخود بدل گیا۔ عیسیٰ بہت سنجیدہ اور کچھ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ مالا سے گزرے ہوئے چیدہ، چیدہ انہونے واقعات پوچھنے لگا۔ پچھلے دنوں مالا کو کیا کچھ نظر آیا، گھر میں لائٹس آن کرنے سے لے کر وہ اجنبی غائبانہ سی

آواز تک۔ ایک، ایک بات وہ پوری جزئیات کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ سوال کر رہا تھا اور نکتے بھی اٹھا رہا تھا پھر جب مالا نے نماز پڑھنے کے دوران اس عورت کا ذکر کیا اور تالاب پر اسے کلی مارنے کا واقعہ دوبارہ سنایا تب علی عیسٰی بری طرح سے چونک گیا تھا۔ نہ صرف وہ چونکا بلکہ پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر بڑی بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''آں......ہاں، ذرا پھر سے بتاؤ۔ تالاب پر بدیع الجمال پری آئی اور اس نے کیا کہا؟'' علی عیسٰی کی دلچسپی کا کوئی انت نہیں تھا۔ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا تھا اور اب مسکراہٹ چھپائے بغیر پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے والے سنجیدہ اور سپاٹ قسم کے تاثرات اب کہیں نہیں تھے۔ وہ اتنا پُرجوش نظر آرہا تھا کہ حد نہیں۔

''نہیں......نہیں تو، بدیع الجمال نہیں تھی وہ......بدیع الجمال وہ ہو بھی کیسے سکتی تھی؟'' مالا فوراً برا مان گئی تھی جیسے اس کے پسندیدہ کردار بدیع الجمال کو اس جھوٹی، فریبی اور ماسک زدہ چہرے والی عورت سے ملا کر عیسٰی نے کوئی جرم کر ڈالا تھا۔ تب عیسٰی نے فوراً معذرت کی۔

''تو اچھا......وہ سیف الملوک کی بدیع الجمال نہیں تھی؟'' وہ ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ چھپا کر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کی زبانی سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال اس نے کئی ہزار مرتبہ سن رکھا تھا۔ وہ لافانی قسم کی محبت میں مبتلا تھی یعنی سیف الملوک اور بدیع الجمال کی محبت کو بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اب بھی عیسٰی کی شرارت محسوس کر کے اس نے فوراً تڑخ کر جواب دیا تھا۔

''وہ سیف الملوک کی بدیع الجمال نہیں بلکہ آپ کی منکوحہ تھی۔'' اس نے چڑچڑے پن سے تلخی بھرے لہجے میں کہا تب عیسٰی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا، وہ اتنی بے فکری سے ہنستا ہوا مالا کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی فدا ہونے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا عیسٰی یوں ہی بے فکری سے ہنستا رہے مگر بعض دعائیں اور بعض خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ اس کی یہ دعا بھی ادھوری رہ گئی۔

''ہیں......میری منکوحہ؟'' وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔ مالا اس کی اداکاری پر چڑ گئی تھی۔

''وہ کہہ رہی تھی جب میرا نکاح آپ کے ساتھ ہوا تب آٹومیٹک وہ بھی آپ کے نکاح میں آگئی۔ قوم جن کی عورتوں کا شاید ایسے ہی نکاح ہوتا ہے۔'' وہ منہ پھلا کر بتانے لگی تب عیسٰی کی پھر سے ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ تو کمال ہو گیا، نکاح نہ ہوا آٹومیٹک لاک ہو گیا۔ ویسے میری نادیدہ بیگم ہیں کہاں؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتی؟'' عیسٰی بے قرار سا ہو گیا تھا مالا بھنا اٹھی۔

''وہ مجھ سے ملاقات جو کر لیتی ہے۔ آپ سے شاید ڈرتی ہو گی۔'' وہ جیسے جتا کر کہہ رہی تھی۔ تب عیسٰی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''مجھ سے کہاں، تمہی سے ڈرتی ہو گی۔ تم نے کلی چھینکی اور وہ ڈر ایسا بھاگی کہ دوبارہ پلٹی ہی نہیں۔'' عیسٰی دکھی سا ہو گیا تھا اور مالا اس کی مزید ایکٹنگ سنے بغیر اور نظر ڈالے بنا ہی باہر چلی گئی۔ جانتی تھی کہ اب عیسٰی اسے جان بوجھ کر تنگ کرتا رہے گا حالانکہ وہ بھی مالا کی طرح جان چکا تھا کہ پری وغیرہ کا قصہ جھوٹ ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی بیک پر کسی اور کا ہاتھ تھا اور عیسٰی نے اسی ہاتھ پر پنجہ گاڑنا تھا۔ اسے امید تھی وہ جلد اپنے اور مالا کے نادیدہ دشمن تک پہنچ جائے گا۔ اگرچہ پہنچ تو وہ چکا ہی تھا اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے تک کا انتظار تھا۔

محض تین چار گھنٹوں تک بہت کچھ کھل کے سامنے آنے والا تھا۔ تب وہ آفاق کا بھلا کیا حشر کرتا؟ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا۔ دوستی میں جان بھی وار دیتا اور دشمنی میں ہاتھ ڈال کر جان باہر نکال لیتا تھا۔ آفاق جانے کس بھول میں تھا کہ وہ عیسٰی کو چکما دے کر نکل بھاگے گا۔ اگر تو آفاق کے بارے میں مالا کی کہی باتیں درست نکلتیں تب وہ اسے جرمنی میں سے کتے کی موت دے کر باہر نکالتا۔ اسے آفاق پر بڑا مان تھا۔ اپنے باپ کی خواہش پر اس نے آفاق کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ وہ ہر اجنبی پاکستانی کی مدد کرتا تھا۔ یہ اس کے باپ کی خواہش ہی نہیں حکم بھی تھا۔ اس نے آفاق پر کوئی الگ سے احسان نہیں کیے تھے۔ وہ پہلے بھی بہت سے لوگوں کو جرمنی میں سیٹل کر چکا تھا۔ ان کی مدد کرتا، پیپرز بنواتا، مکان خرید دیتا۔ پاپا کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی نیکیاں تھیں جو اس کا نامۂ اعمال سنوار سکتی تھیں۔ پاپا کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کے باپ نے بھی بہت سے لوگوں پر احسان کیے تھے انہی میں ایک پروفیسر بشر بھی تھا مگر وہ بھی ایک خبیث اور خودغرض انسان نکلا تھا جیسا کہ آفاق ثابت ہو رہا تھا۔

سوزن کے ساتھ مل کر اس کی زندگی میں تلخیاں گھول رہا تھا۔ سوزن نے اسے کون سا لالچ دیا ہو گا؟ شادی کا نہیں پیسے کا لالچ یا پھر ویزا بڑھانے کا لالچ کچھ تو سبز باغ آفاق کو بھی دکھائے گئے تھے تبھی اس نے دوست کے سینے میں خنجر گھونپ ڈالا تھا۔ اب عیسٰی کو کچھ گھنٹوں کے بعد آفاق سے ملاقات کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا، نکاح کے بعد وہ عیسٰی کو کچھ دکھانے والا ہے؟ وہ کیا دکھانے والا تھا، یہ تو عیسٰی نہیں جانتا تھا تاہم اس کی چھٹی حس کسی غلط اور انہونی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے سوزن سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کی پچھلی باتیں بھلا کر دوبارہ تعلقات بحال کر چکا تھا مگر سوزن نے کیا، کیا؟ اجنبی ناموں سے مالا کے لیے تحائف بھیجتی رہی۔ اسے ذہنی طور پر شکستہ کرتی رہی، خوف زدہ کرتی رہی۔ مینٹلی ٹارچر کرنا اسی کو کہتے تھے۔ وہ نفسیاتی حربوں سے مالا سے اس کو بدگمان کرنا چاہتی تھی مگر عیسٰی بھلا مالا سے بدگمان ہو سکتا تھا؟ سوزن کی اصلیت کھل چکی تھی اور اب آفاق کے چہرے سے نقاب ہٹنے والا تھا۔ اگر تو آفاق اس منصوبے میں سوزن کے ساتھ برابر کا شریک ہوا تب اس کی زندگی کا یہ آخری دن ہو سکتا تھا۔ اپنی شادی والی شام مرنے والا وہ جرمن میں پہلا دولہا ہو گا۔ دھوکے باز، منافق، احسان فراموش لوگوں کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔

علی عیسٰی سلک کے پردے کو ہٹا کر اس کے دوسرے حصے یعنی سفید نائیلون کے جالی دار پردے پر ہاتھ پھیرتا گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ شاید اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ آفاق سے ملاقات کے بعد اگر کوئی ثبوت اس کے ہاتھ آ گیا تو اسے کیا کرنا ہو گا؟ اب وہ مڑ کر اپنے لائسنس شدہ ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا۔ ریوالور لوڈ ہو کر ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ اس نے ریوالور کو احتیاط سے شرٹ کے پیچھے سے پینٹ میں اڑس لیا۔ اب وہ آفاق کے میسج پر سامنے والے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے آفاق کے نکاح میں شرکت بھی تو کرنا تھی۔

☆☆☆

وقت کی تھیلی میں کس کے لیے کیا رکھا تھا؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر حقیقت میں کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ دل میں وسوسے تھے، کسی پل قرار نہیں تھا۔ عجیب بے چینی تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کے دل کو پتنگے لگے تھے، وہ بے چین سی گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹ رہی تھی۔ عیسٰی ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور یہ انتظار بڑا اذیت ناک تھا اسے ایک کہاوت یاد آ رہی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پیر تھکنے لگے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔

time is too slow for those who wait

(انتظار کرنے والوں کے لیے وقت بہت سست رفتار ہوتا ہے)

اس نے گھڑی کو دیکھا، وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا پھر جیسے باہر کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ مالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک دم گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ ہتھیلیوں میں نمی اتر آئی۔

too swift for those who fear

(جو ڈرتے ہیں ان کے لیے بہت تیز رفتار)

وہ ڈرنے لگی تو سوئیاں بھی بھاگنے لگیں۔ بیس، پچیس،

تیس منٹ جیسے پھسل، پھسل گئے، وقت بھاگنے لگا تھا۔

too long for those who grieve

(جو غمزدہ ہوتے ہیں، ان کے لیے بہت طویل)

ہاں، اس کے اندر غم تھا عیسیٰ سے بچھڑ جانے کا خوف تھا، جدائی کا وسوسہ تھا۔ یہ لاشعوری غم تھے مالا نہ بھی سوچتی تب بھی یہ خوف ذہن میں پنجہ جمانے لگتے۔

too short for those who rejoice

(جو خوشی مناتے ہیں، ان کے لیے مختصر)

اس نے زمانے بھر کی خوشیاں علی عیسیٰ کی ہمراہی میں پالی تھیں۔ وقت اسی لیے مختصر ہو رہا تھا۔ مالا یہ تنگ پڑ رہا تھا۔ کاش کہ وہ وقت بدلنے کی طاقت رکھتی مگر یہ ممکن ہی کہاں تھا۔

but for those who love time is eternity.

(لیکن جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے وقت ابد تک پھیل جاتا ہے)

اور وقت مالا علی عیسیٰ کے لیے ابد تک پھیلنے والا تھا۔ اس نے محبت کی تھی، اسے محبت ہوئی تھی۔ بالکل ایسی ہی محبت جو سیف الملوک نے بدیع الجمال سے کی تھی اور تاریخ نے اس محبت کو سنہری حرفوں کے ساتھ کتابوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔ یہ محبت جسموں سے نہیں روح کے تعلق سے ہوئی تھی۔ وہاں روحوں کا ملاپ ہوا تھا۔ یہ روح کی روح سے محبت تھی جو آج تک میاں محمود صاحب کی تصنیف میں زندہ تھی۔

راہِ عشق پل صراط سے کم نہیں جس طرح پل صراط پر چلنا محال ہے اسی طرح عشق کی منزل تک پہنچنا بھی آسان نہیں جس طرح بہشت کی آس، امید کو زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح وچھوڑے اور جدائی میں بھی ملن کی آس زندگی کو آگے گھسیٹنے میں مدد کرتی ہے۔

وہ چلتے چلتے علی عیسیٰ کی تصویر کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کا دل جیسے رک رک کر چلنے لگا اور چل، چل کر تھمنے لگا۔ بن مانگے اللہ کیا، کیا عطا کرتا ہے۔ مالا کو آج پتا چلا تھا۔ اللہ نے اسے علی عیسیٰ کی صورت میں کون سا ہیرا دیا تھا اس کی دنیا مکمل کر دی۔

مالا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے، شکر گزاری کے آنسو... اسے اتنا نیک، ایمان دار اور باکردار شریک حیات ملا تھا۔ یہ اس کی کوئی نیکی کا بدل تھا یا اس کے پرکھوں کی کسی نیکی اور احسان کے بدلے اس پر نعمت پوری کی گئی تھی۔ مالا نہیں جانتی تھی وہ تو صرف اللہ کا شکر ادا کرنا جانتی تھی اور ہر گھڑی، ہر ساعت بس شکر ادا کرتی تھی۔

کتنی ساعتیں چپکے سے پھسل گئیں معا فون کی گھنٹی نے طلسم توڑ ڈالا تھا۔ وہ پیر گھسیٹتی چونک کر فون تک آئی۔ نمبر انجانا تھا اس نے کارڈلیس اٹھا کر کان سے لگایا۔ اس کے کچھ بھی کہے یا بولے بغیر ایک تکبر بھری آواز سماعتوں میں سیسہ اتارنے لگی تھی۔

”بہت جلد واپس پلٹنے والی ہو، کبھی سوچنا تو سہی جہاں سے چلی تھیں وہیں رکو گی۔ اپنے پچھلوں کو جا کر میرا ایک پیغام دینا۔ مون حسیب انتقام اور بدلہ پورا کرنے میں کمال کی مہارت رکھتی ہے۔ جو نفرت کرے، اس سے نفرت کرو۔ جو محبت کرے، اس سے محبت کرو۔ جو دھوکا دے، اسے دھوکا دو۔ جو آگ لگائے، اسے آگ لگا دو۔ جو دل کو ڈھائے، اس کے وجود کی پوری عمارت کو ڈھا دو۔ اپنا تو عمر بھر کے لیے ایک ہی اصول اور ایک ہی قانون رہا ہے جس میں ترمیم تو ہو سکتی ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔“ پھنکارتی ہوئی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس نے محض مالا کو اتنا ہی سمجھانا تھا۔ آگے وہ خود سمجھ دار ہوتی تو سمجھ جاتی مگر وہ سمجھدار ہی تو نہیں تھی۔

”بھلا مون نے پچھلوں کی بات کیوں کی تھی؟ کون سے پچھلے؟ آخر مون کا میرے پچھلوں کے ساتھ تعلق ہی کیا تھا؟ اور وہ کہہ رہی تھی جو آپ کو دھتکارے اسے دھتکار کر سزا دو۔“ وہ مالا کو کیا جتا رہی تھی۔ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا وہ محض اسے خوف زدہ کر رہی تھی یا اس کی آگ برساتی باتوں اور لفظوں میں کوئی معنی بھی چھپے تھے۔

مالا علی عیسیٰ کارڈلیس تھامے بالکل ڈھے گئی۔

اس کا پورا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ آخر مون حسیب اسے کس مقام پر روکنا چاہتی تھی جہاں مالا کے قدم اکھڑ جاتے یا جم جاتے وہ اسے کس کشمکش میں مبتلا کر چکی تھی؟ وہ اسے کس عذاب کے حوالے کر چکی تھی۔

مالا نے سوچا وہ اٹھ کر چاچو کے کمرے کا دروازہ بجائے اور انہیں ان کی بیٹی کے ایک، ایک کارنامے اور منصوبے کا بتائے۔ چاہے وہ یقین کریں یا نہ کریں۔ مالا نے سر کے پیچھے غیر ارادی طور پر ہاتھ مارا۔ قش کی شیپ کا ریکارڈر ساتھ نہیں تھا جانے وہ اسے کہاں رکھ آئی تھی۔ نہانے سے پہلے ڈریسنگ پر یا پھر تکیے کے نیچے۔

وہ تذبذب کے عالم میں سر جھٹکتی چاچو کے کمرے کو دیکھنے لگی۔ اسے تذبذب کی حقیقت کا ادراک بھی آج ہوا تھا۔ تذبذب کیا تھا؟ اس کی تعریف کیا تھی؟ اس کی وضاحت یا تشریح کیا تھی؟ تذبذب ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو..... تو مالا علی عیسیٰ اسی تذبذب کا شکار تھی۔ بے دم اور ساکت تھی نہ آگے بڑھ پا رہی تھی اور نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ تھا۔ وہ آج مون کے اندر کا زہر اور غلاظت بھی کھولنے کا مستحکم عہد باندھنے والی تھی مگر اس کے لیے تھوڑی ہمت بھی درکار تھی۔

اس نے کارڈلیس رکھ کر چھوٹا سا سرخ ہندسوں والا کلینڈر اٹھا لیا تھا۔ چودہ فروری کے ہندسے پر انگلی پھیر کر اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھا۔ انی کا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج انی کا نکاح تھا، انی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آج ویلنٹائن ڈے تھا، فلمی سے ایکٹر نما آفاق نے شادی کے لیے فلمی سا رومانوی دن منتخب کیا تھا۔ اب وہ اپنی نئی زندگی میں اداکاری کر کے کتنا کامیاب ہو سکتا تھا یہ صرف وقت بتانے والا تھا۔

کلینڈر کے نیچے سفید موٹے حروف میں کچھ اور بھی لکھا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے پڑھا نہیں گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ویلز میں لکڑی کے ”مجبتی“ چمچے تیار کر کے چودہ فروری کے روز تحفے کے طور پر دیے جاتے تھے۔ ان چمچوں کو عموماً دلوں، چابیوں اور چابی کے سوراخوں سے سجایا جاتا تھا جن کا مجموعی مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ تم نے میرے دل کا تالا کھول دیا جبکہ آج چودہ فروری کی شام مالا نے اپنے دل کے تالے کو مضبوطی سے بند کر لیا تھا۔ یہاں اب کسی سوزن، انی، مون، آفاق یا کسی اور منافق کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے عمر بھر کے لیے ان لوگوں سے تعلق توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سب مالا کو علی عیسیٰ کی زندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہ سب لوگ کتنے سفاک، بے رحم، کٹھور اور سنگ دل تھے۔ زندگی کو زندگی سے دور کرنا چاہتے تھے۔

پھر جانے کتنا وقت بیت گیا باہر شور کی آواز سنائی دی تھی۔ انی کا نکاح ہو گیا، مہمان چلے گئے تھے پھر یہ شور کیسا تھا؟ مالا نے کان لگائے تو اسے یہ شور اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں سنائی دیا تھا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں گرتی پڑتی بھاگتی ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا کلیجا کانپ رہا تھا۔

”آستین کے سانپ، ذلیل، کتے، نمک حرام..... تو میرے ہی سینے پر خنجر چلا رہا ہے۔ میرے ہی گھر میں بندھے کتے مجھی پر بھونکتا ہے۔“ وہ علی عیسیٰ تھا مگر مالا کو وہ عیسیٰ نہیں لگا۔ اس پر حیوانیت سوار تھی۔ وہ آفاق کو لاتوں، گھونسوں اور جوتوں سے مار رہا تھا۔ اس نے پل بھر میں آفاق کو لہولہان کر دیا تھا پھر مالا نے گردن گھما کر دیکھا وہاں قریب ہی چاچو کھڑے تھے اور مالا کو پہلی نظر میں یوں لگا جیسے ان کے جسم میں سے دھیرے، دھیرے جان نکل رہی ہے۔ وہ کسی پتھریلے بت کے مانند ساکت تھے۔ نہ وہ روک رہے تھے نہ وہ عیسیٰ کو منع کر رہے تھے، نہ وہ بول رہے تھے اور عیسیٰ کو خبر ہی نہیں تھی اس کے پاپا تو دھیرے، دھیرے مر رہے تھے۔

اِدھر آفاق چلا رہا تھا۔ آگ اگل رہا تھا، چیخ رہا

تھا۔ جانے آفاق نے عیسٰی کو کیا دکھایا تھا جو عیسٰی کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ وہاں آفاق کا لیدر بیگ بھی کھلا پڑا تھا اور اس بیگ میں کچھ چمک رہا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے دیکھا نہ گیا۔

"تو مالا کی آنکھ سے دیکھتا ہے، کبھی اپنی آنکھ سے دیکھ، تیرا مجرم تیری اپنی آستین میں ہے۔" آفاق نے چلّاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے سر سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ وہ جرمنی کا پہلا پردیسی دولہا تھا جو اپنی شادی کی شام موت کے دہانے پر کھڑا تڑپ رہا تھا۔ شاید آفاق کا یہی انجام ہونا تھا۔ لالچی اور ذلیل لوگ دنیا میں اسی طرح خوار ہوتے ہیں۔ وہ بھی خوار ہو رہا تھا۔ اس کا انجام یہی تو ہونا تھا پھر مالا کیوں خوش نہیں تھی؟ اس کے دل میں تو بس خوف نے کنڈلی مار رکھی تھی اور یہی خوف اسے چیخنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"بس کریں...... بس کریں...... یہ مر جائے گا۔" مالا تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اس سے عیسٰی کی درندگی دیکھی نہ گئی۔ وہ اتنا صابر، حلیم اور مہذب عیسٰی بالکل وحشی درندہ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہا تھا۔

"تو اس کی جا کر گردن دبوچ...... وہ ہی تو ہے تیری آستین میں......" آفاق سے آگے بولا نہیں گیا تھا۔ عیسٰی نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ اس کا سر فرش پر دھڑ دھڑ ٹکراتا رہا پھر اس نے اپنی شرٹ کے پیچھے پینٹ میں اڑسا ریوالور نکال لیا۔

"پھر لیا تو نے اپنی گندی زبان سے اس کا نام...... اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" عیسٰی نے کف لگتے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا اور ٹریگر دبانے سے پہلے اس نے ایک بھیانک آواز سنی۔ یہ آواز چاچو کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ فرش پر گرے تڑپ رہے تھے پھر جب عیسٰی پستول پھینک کر اپنے باپ کی طرف آیا تب تک مٹی کے بت سے روح بے سکوں کب کی پرواز کر گئی تھی۔

علی عیسٰی کے پاپا مر گئے اور وہ جیسے دیوانہ ہو گیا۔ ان کے مرے ہوئے جسم کو اٹھا کر اسپتالوں میں بھاگتا رہا مگر کسی ڈاکٹر کے پاس اس کے پاپا کی جان واپس لانے کا اسم نہیں تھا۔ تھک ہار کر انہیں سپردِ خاک کر دیا یہ تو کرنا ہی تھا۔ وہ باپ کے قدموں میں سر رکھ کر بچوں کی طرح روتا علی عیسٰی حواس چھوڑ رہا تھا۔ اس کا پہلا عشق اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اس سے دور ہو گیا، چھن گیا تھا وہ راتوں کو اٹھ، اٹھ کر رونے لگتا۔ اس کے دل کا چین سکون کھو گیا تھا، علی عیسٰی جیسے کھو گیا۔ وہ شاید سنبھل ہی جاتے۔ زندگی آہستہ، آہستہ ہی سہی اپنے معمول پر آ جاتی مگر پھر وہ ہو گیا جس کا تصور بھی قیامت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہاں، قیامت مالا اور علی عیسٰی پر بیک وقت ٹوٹ پڑی تھی۔

مالا کی کشتی ایسی تند موجوں کے بھنور میں جا پھنسی تھی جس نے دھکیل کر اسے جرمنی کی سرزمین سے پاکستان لا پٹخا تھا مگر اس دوران ہوا کیا تھا چاچو کے مر جانے کے بعد وہ ایک رات جیسے مالا کی زندگی کا رس نچوڑ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے علی عیسٰی کی زندگی سے نکل گئی مگر اس رات آخر ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

زندگی میں کبھی کبھار بہت عجیب واقعات پیش آتے ہیں۔ اتنے عجیب کہ عقل ان کے جواز ڈھونڈنے کے دوران بالکل دنگ رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھار بہت عجیب طرح سے انہونے واقعے، حادثے یا سانحے پیش آتے ہیں اور عقلِ انسانی کو حیران کر دینے والی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ذی شاہ کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ وہ سوچتا تو حیران رہ جاتا آخر اس کے ذہن میں جرمنی جانے کا انہونا خیال کیسے آیا تھا؟ حالانکہ دیکھا جائے تو جرمنی ان کے لیے ہندوستان کا کالا پانی یا خطرناک جیل کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جی ہاں، یہ وہی جرمنی تھا جس کی طرف کوئی ایک مرتبہ رخ کر لیتا تو یا پھر وہ کبھی نہ لوٹتا ان کے اکلوتے چچا کی طرح یا اگر لوٹ تو آتا مگر ذی شاہ کی بہن جیسے حالات سے گزر کر۔ اپنا دل، دماغ اور سوچیں تک پرائی کر کے اپنے حواس اور شعور تک کو لٹا کر پھر اسے جرمنی جانے کا کیا فائدہ تھا؟ مگر ذی شاہ ہر قسم کے فائدے اور نقصان کو ایک طرف رکھ کے صرف اپنی بہن کے مجرم کو تلاش کرنے آیا تھا۔ جس نے اس کی معصوم بہن کو طلاق دے کر گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ وہ دھکے کھاتی اور جانے کہاں کہاں رُلتی واپس اپنے وطن لوٹ پائی تھی اور اس کے صدمات سے چور وجود کو دیکھ کر ذی شاہ کے ڈیڈی ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کی بہن مالا نے قبل از وقت ذہنی جھٹکوں کی بدولت اپنا بچہ بھی کھو دیا تھا اور خود وہ جیتی جاگتی لاش ہی تو بن گئی تھی۔ تو کیا ذی شاہ کا فرض نہیں بنتا تھا وہ پلٹ کر اپنی بہن کے مجرموں اور قاتلوں سے حساب لیتا۔

اس کے دل میں جرمنی جانے کا پہلا خیال کب آیا تھا؟ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی کچھ مہینے پہلے وہ معمول کے مطابق جاگنگ کے لیے گھر سے نکلا تھا، وہ قریبی پارک میں ورزش کے لیے ہر روز آیا کرتا تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق جاگنگ ٹریک پر دوڑتا کبھی کبھار رک کر ایکسر سائز کرنے لگتا۔

تب دوڑتے اور ورزش کرتے اچانک اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ جیسے کوئی خیال آیا تھا۔ جیسے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام کو جاری رکھنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس کا ذہن ایک نکتے پر جم گیا۔ آگے بڑھ سکا نہ پیچھے ہٹ سکا۔ وہ ایک ہی پیغام کو بار بار وصول کر رہا تھا۔ انسانی ذہن جو ایک موڈیم کی طرح ہوتا ہے بنیادی طور پر ان پٹ آؤٹ پٹ ڈیوائس جیسا۔ جو فون لائن کو کمپیوٹر سے جوڑتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک ڈیٹا حاصل کرنے اور پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے جیسے ایک ذہن کو دوسرے ذہن کے ساتھ جوڑ لیا جائے۔ انسانی ذہن بھی کمپیوٹر کے موڈیم کی طرح ہوتا جو برقی ڈاک (ای میل) پیغامات کو 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے لاکھوں میل کی دوری کے باوجود ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچا دیتا ہے مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ کوئی دماغ اتنی افلاطونی طاقت کیسے رکھتا ہے؟ یقیناً کروڑوں انسانوں کی اس دنیا میں بلاشبہ بے شمار لوگ ایسے تھے جنہیں اللہ نے عقل کو دنگ کر دینے والی نعمتوں سے نوازا تھا۔ کسی کو اتنا علم دیا کہ اس نے جہاز بنا کر اڑا بھی لیا، کسی کو اتنا فہم دیا کہ اس نے اپنے جسم سے بجلی پیدا کر لی، کسی کو اتنی عقل دی کہ وہ سیاروں پر پہنچ گیا۔ کسی کو اتنی ہمت دی کہ اس نے کوہسار فتح کر لیے۔ کسی کے جسم میں ایسی طاقت بھر دی کہ وہ زہریلے اور زہریلے ترین سانپ کے کاٹنے اور سیکنڈوں میں موت کے گھاٹ اتار دینے والے سانپ کے زہر کا انجکشن لگا کر بھی زندہ رہا۔ کسی کو سائنس دان بنا دیا، کسی کو خلاباز بنا دیا، کسی کو زہریلے جانوروں کا شکار کرنا سکھا دیا، کسی کو حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا اور کسی کو انتہائی طاقتور دماغ عنایت کر دیا۔ یہ سب کرشمہ سازی اسی اللہ کی تھی جو جہانوں کا رب ہے۔ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور اس کا شکر ادا کرنے والے بندے بہت کم ہیں لیکن وہ پھر بھی نوازتا ہے۔ اب لینے والے پر منحصر ہے کہ وہ رب کی دی گئی نعمتوں کا مثبت استعمال کتنا کرتا ہے؟ انسانی دماغ سے کیسے کام لیتا ہے کس طرح سے اپنی بے بہا طاقت کا استعمال کرتا ہے۔

انسانی ذہن جو کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک یا موڈیم کے مانند ہے۔ برقی ڈاک کی طرح پیغامات کو لمحوں میں وصول کرتا ہے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر پروگرام جس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک پیغام کو ارسال اور وصول کیا جائے۔ تکنیکی اور مروجہ طور پر ای میل کہلاتا ہے۔ ای میل کا تصور تو اب جا کر 1960ء کی دہائی میں منظرِ عام پر آیا تھا مگر انسانی دماغ اس سے بھی پہلے ای میل کی طرح لاکھوں میل کی دوری سے پیغام ارسال اور وصول کر لیتا تھا۔ بالکل اسی طرح ذی شاہ نے ورزش کرتے ایک پیغام وصول کیا جیسے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

"جرمنی مجھے بلا رہا ہے۔" یہ اس کے ذہن میں

آنے والا پہلا خیال تھا۔ وہ اپنے سر کو جھٹک کر اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ جرمنی اسے بلا رہا تھا؟ جرمنی اسے کیوں بلا رہا تھا؟ گھر واپس جاتے ہوئے اس کا ذہن اس سوال کا جواب تلاشتا رہا اور گھر آنے کے بعد فوارے کے قریب سر جھکائے بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ کر جیسے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

''تو جرمنی مجھے اسی لیے بلا رہا ہے تاکہ میں اپنی معصوم بہن کے مجرم کا گریبان پکڑ سکوں۔'' یہ آخری خیال تھا جو روزمرہ معمول، روٹین اور کاروباری میٹنگز سے ہٹ کر تھا۔ پھر وہ دفتر چلا گیا اور دفتر جانے کے کچھ دیر بعد پھر اس کے ذہن کا کنکشن مالا کی موجودہ.... رنگ ویران زندگی کی طرف جڑ گیا تھا۔ جیسے پھر سے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا۔

''جرمنی تمہیں بلا رہا ہے۔'' اس کا دل بے چین ہوگیا پھر اس کا کسی بھی میٹنگ میں دل نہیں لگا تھا۔ وہ فیصلے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ گیا۔ بہت دن کی سوچ بچار کے بعد آخر فیصلہ ہوگیا۔ اس نے جرمنی جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مالا کی بے رنگ زندگی، گھریلو... حالات کو دیکھتے ہوئے اسے یہی مناسب لگا تھا اگرچہ ذیشان ٹھیک کہتا تھا۔ مالا کے مجرم تک پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ مالا کو طلاق دے چکا تھا مگر ذی شاہ کا یہ حق بنتا تھا کہ وہ طلاق کی وجہ تو معلوم کرے۔ محض صبر شکر کر کے بیٹھ جانا بھی عقلمندی نہیں تھی مگر ذیشان نے ایسے ہی تو کیا تھا۔ وہ اپنے فرائض سے نظر چرا کر نئی نویلی بیوی کی ناز برداریوں میں لگ گیا تھا۔ نہ بہن کی اذیت اور صدمات کی اسے کوئی پروا تھی نہ بیوہ ماں کی خاموشی اسے نظر آتی تھی۔ اب جو بھی کرنا تھا ذی شاہ کو خود ہی کرنا تھا اور اس کے لیے سب سے پہلے جرمنی کا ویزا ضروری تھا۔ چچا کے علاوہ کوئی اور رشتے دار جرمنی میں نہیں تھا اور چاچو بے چارے وفات پا گئے تھے۔ اسے اسپانسر ویزا نہیں مل سکتا تھا۔ اگر اس کا اکلوتا پیارا دوست افراہیم کوشش بھی کرتا تب بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ افراہیم کے وسائل اتنے نہیں تھے جو وہ اسپانسر ویزا کی شرائط پوری کرسکتا۔

جرمنی میں مقیم رشتے داروں یا دوستوں سے ملنے کے لیے جانے والے کو بہت سی چیزوں پر توجہ کرنا ہوتی تھی۔ ایک تو جرمنی میں مقیم اس کا میزبان قانونی حیثیت سے وہاں کاروبار یا ملازمت کررہا ہو اور وہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کا مقروض بھی نہ ہو۔ اس کی مالی حیثیت بھی بہتر ہوتی اگرچہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے وہ افراہیم کو کبھی نہ تنگ کرتا اور نہ اس پر بوجھ ڈالتا پھر بھی بہت ساری باتوں کو نظر میں رکھنا تھا۔

جرمنی کی کمپنی کے ساتھ کاروباری خط کتابت اور کاروباری سرگرمیوں کا ثبوت، ذاتی اخراجات کے لیے بیس ہزار امریکی ڈالرز نقدی کی صورت میں جب منظرِ عام پر آئے اور فضائی ٹکٹوں کی کنفرمیشن کا بڑے بھائی ذیشان کو پتا چلا تو اس نے ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا دیا۔

''تم اتنا خرچہ کر کے جرمنی جارہے ہو، شیئرز کی رقم الگ ادا کرو گے؟ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔'' ذیشان کو جیسے آگ لگ چکی تھی۔ نہ اس نے ماں کا خیال کیا نہ بہنوں کا۔ ذی شاہ کے ساتھ منہ ماری کرتے ہوئے بس ہاتھا پائی کی کسر رہ گئی تھی۔ گھر کا ماحول بگڑ گیا۔ حالات خراب ہوگئے۔ ایک تو آنیہ سے رشتے پر انکار، دوسرے ذی شاہ نے مشترکہ اکاؤنٹ سے ذاتی اخراجات کے لیے بھاری رقم نکلوالی تھی۔ بھلا ذیشان کا پارہ کیوں نہ چڑھتا۔ اسے تو آگ لگنا ہی تھی کیونکہ شعلوں کو ہوا دینے کے لیے عینی جو موجود تھی۔ اس نے بانگِ دہل اعلان کردیا۔ وہ اوپر والے پورشن میں الگ ہوجائے گی۔ اپنا کچن بھی الگ کرلے گی۔ ایسی دھمکیاں ان کے لیے نئی نہیں تھیں مگر پھر بھی می.... بے چاری سہم گئی تھیں۔ یہ تینوں بھائی ان کی زندگی میں ہی الگ ہوجاتے یہ می کو گوارا نہیں تھا۔ وہ ذی شاہ کی ایک مرتبہ پھر منتیں کرنے لگی تھیں۔

''بیٹا تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔'' انہوں نے رات کو ذی شاہ کے گھر آتے ہی بڑی لجاجت سے کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا بڑھنے لگے۔ وہ ابھی ابھی جرمن ایمبیسی کے ایک

قونصلیٹ اور ویزا افسر کے ساتھ فون پر سر کھپا کر آرہا تھا فی الحال کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر مقابل تو ماں تھی اسے جواب دینا ہی پڑا۔

''کیا سوچ لوں می، میں جرمنی جانے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔'' اس نے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا تب می کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگئیں۔

''میں جرمنی جانے کی بات نہیں کررہی ہوں۔'' وہ سر جھکائے کچھ پل کے لیے خاموش ہوگئی تھیں جیسے اگلے الفاظ ترتیب دینا چاہتی تھیں۔

''تو پھر؟'' ذی شاہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھتا ٹھٹک گیا تھا۔ ''او...... اچھا۔'' وہ جیسے سمجھ کر لب بھینچ گیا تب می نے بہت بے قراری اور لجاجت سے کہا تھا۔

''اس میں حرج کیا ہے۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔'' وہ ایک ماں تھیں گھر میں پھوٹ پڑتی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹوں کو جوڑے رکھنا چاہتی تھیں اگر ذی شاہ مان جاتا تو سارے مسئلے ہی حل ہوجاتے۔

''پلیز می، میں نے کبھی آنیہ کے لیے ایسا ویسا کچھ نہیں سوچا۔'' ذی شاہ جھنجلا گیا تھا۔ اگر ماں کی طرف سے زیادہ دباؤ بڑھ جاتا تب اسے یقیناً ماننا پڑتا اور وہ اس سے پہلے کوئی بندھ باندھنا چاہتا تھا۔

''تو اب سوچ لو، وہ عینی سے مختلف ہے۔'' انہوں نے جیسے اسے بہلانا چاہا تھا۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''مما وہ عینی کی بہن ہے، اس سے مختلف ہرگز نہیں ہوگی۔'' ذی شاہ کا ایک ہی جواب تھا۔ ماں جیسے بے بس ہوگئی۔

''ذیشان کی خواہش ہے بیٹا ورنہ وہ الگ ہوجائے گا۔'' انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔ ذیشان کی دھمکی نے انہیں بہت اپ سیٹ کررکھا تھا۔ ذی شاہ کو ذیشان پر بے طرح غصہ آگیا۔

''وہ اپنی شادی بھی اپنی مرضی سے کرتا ہے اور ہماری شادیاں بھی اپنی مرضی سے کرے گا؟ اسے یہ اختیار کس نے دیا؟ وہ ڈیڈی کی جگہ اگر بڑے بھائیوں والا کردار ادا کرتا تو شاید آج میں اسے کبھی انکار نہیں کرتا۔ خامی آنیہ میں نہیں، یہی سمجھیں میں اس کے قابل نہیں۔ میں کسی کو ریجکٹ نہیں کررہا بس اپنی بہنوں سے پہلے گھر بسانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کی خاطر یہ زہر پیتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اگر مالا اور بندیا کی شادی ہوجانے تک ماموں لوگ انتظار کرسکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میری طرف سے جواب ہے۔'' اس نے تحمل سے بات کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا می پھر سے بے بس ہوگئیں۔

''اتنا انتظار تو وہ نہیں کرسکتے۔'' می نے تفکر بھرے لہجے میں کہا۔

''تو نہ کریں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''تم منگنی تو کرلو۔'' می جیسے کچھ سوچ کر بولیں۔

''شادی کے وقت منگنی بھی کرلوں گا۔'' اس کا جواب نہ ہی میں تھا۔

''اور شادی کب کرو گے؟'' وہ جیسے پوروں پر حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

''مالا اور بندیا کو بیاہ کر۔'' ذی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا، ارادہ پختہ تھا۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا تھا۔ می جیسے تھم سی گئیں۔

''بندیا کی تو ٹھیک ہے پر مالا کی شادی؟'' انہوں نے جیسے کوئی انہونی بات سن لی تھی تبھی کچھ حیران رہ گئیں۔

''کیا مطلب...... مالا کی شادی نہیں ہوسکتی؟'' وہ بھویں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔ اسے ماں سے ایسی حیرانی کی توقع نہیں تھی۔

''اس کی شادی تو ہوچکی ہے؟ پھر مطلقہ سے کون کرے گا؟'' وہ بھیگی آواز میں بول رہی تھیں۔ ان کے کرب کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ تو بیٹے کے منہ سے مالا کا دوبارہ گھر بسنے کا کوئی پلان یا بات سن کر ہی متحیر رہ گئی تھیں۔ یہ تو ان کے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ مالا کا دوبارہ گھر بس جاتا تو وہ بھی چین سے مرسکتیں۔

''کوئی تو کرلے گا، ہم نے کون سا اس کے متعلق کچھ سوچا ہے۔ اگر سوچ لیتے تو آج وہ ماضی کی یاد میں

حال سے اتنی غافل نہ ہوتی۔'' ذی شاہ کا لہجہ بلا کا تلخ تھا، ممی کی آنکھیں بہنے لگیں۔

''تمہارا باپ ہوتا تو آج تک بہت کچھ ہو چکا ہوتا۔ بڑا بیٹا نااہل ثابت ہوا تو تم چھوٹوں کو کیا کہوں؟'' انہوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہی تو آپ کی غلطی تھی۔ نہ آپ نے ذیشان کو احساس دلایا اور نہ مجھے کچھ بتایا۔ ممی کچھ ہم جیسے کم فہم بیٹے بھی ہوتے ہیں جو بہنوں کی خاموش آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو خود سے نہیں دیکھ پاتے۔ ہم جیسوں کو احساس دلانا پڑتا ہے۔'' ذی شاہ کا لہجہ ٹوٹ سا گیا۔ مالا کا کرب آمیز چہرہ آنکھوں کی پتلیوں میں عکس بنانے لگا تھا۔ اس نے ضبط کی شدت سے ہونٹ کاٹ لیے تھے۔

''میرا بیٹا تو! اللہ تم کو اس نیکی کا اجر دے۔ تمہاری راہ کی ہر رکاوٹ دور کرے۔ تمہارے لیے آسانیاں ہوں۔'' ممی نے دل سے دعا دیتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ بس اس کی کامیابی کے لیے اس دعا جتنا زادِراہ ہی کافی تھا۔ وہ جیسے ماں کے ٹھنڈے بوسے کو محسوس کر کے مطمئن ہو گیا تھا پھر اسے ذیشان کی طرف سے ہر دھمکی بھی امرت کے مانند لگی تھی حالانکہ اس نے بزنس بھی الگ کرنے کی بات کر کے اپنے گھٹیا پن پر مہر لگا دی تھی وہ گھر بھی چھوڑنا چاہتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ذی شاہ کو فنانشلی ڈاؤن کرنا چاہتا تھا۔

''میں گھر میں سے بھی حصہ لوں گا اور بزنس بھی الگ کروں گا۔ شامی تو ابھی پڑھ رہا ہے تم اپنے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر جاؤ۔ اپنا کوئی بھی نائب چھوڑ جاؤ میں ہرگز بھی تمہارے آفس کا انتظام نہیں سنبھالوں گا۔'' ذیشان آخری حربے کے طور پر یہی کہہ سکتا تھا جو کچھ وہ بول چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کے پاس کوئی اور دھمکی نہیں بچی تھی۔ تب ذی شاہ نے بڑے تحمل کے ساتھ اس کے تمام طبق روشن کر دیے تھے۔

''گھر میں تم ضرور حصہ لو مگر پانچ حصے نکال کر چھٹا حصہ تمہارا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ کاروبار میں بھی ہم سب برابر کے حصے دار ہیں۔ بہنوں کے حصے اور ماں کا حق نکال کر ہم تینوں کا جو کچھ بنے گا اسے برابر تقسیم کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس اتنا سوچ لینا ہماری فرم کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔'' ذی شاہ کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ اپنی بات دُہرایا نہیں کرتا تھا۔ سو آرام سے اٹھ کر چلا گیا پیچھے ذیشان اور عینی تلملاتے رہ گئے تھے۔ اس رات ذیشان نے ممی سے خاصی بدتمیزی کی تھی۔ انہیں بہت پریشان کیا تھا اور ساتھ ڈیڈی کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔

''ڈیڈی نے مالا کے لیے غلط انتخاب کیا تھا۔ انہیں کیا ضرورت تھی بیٹی کو پکڑ کر جرمنی لے جانے کی۔ پھر چاچو کے بیٹے سے نکاح کر دیا۔ مڑ کر خبر بھی نہ لے سکے۔ اس کی ایک بھی تصویر نہیں ہمارے پاس۔'' ذیشان بہت دفعہ پہلے کی دُہرائی جانے والی باتوں کو دوبارہ جتا کر اپنی کھولن نکال رہا تھا۔ عینی برابر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

''تو اور کیا سو فیصد غلط فیصلہ، پکڑ کر لڑکی کو داغ لگا دیا۔ چچا خیر سے مر گئے اب بندہ کس کا گریبان پکڑے؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے خود محترم مفرور ہو گئے جانے خبیث آدمی زندہ بھی ہے یا مر گیا۔'' عینی کی زبان کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ اس کے سفاک لفظوں کی شدت کو محسوس کر کے کونے میں بیٹی مالا تڑپ اٹھی تھی۔

''اللہ نہ کرے۔'' اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ بندیا نے اس کی حرکت ملاحظہ کر کے گھور کر دیکھا تھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی تھی کہ مالا اس قسم کی دعاؤں کے حقوق کھو چکی ہے اور وہ اس بدبخت کے لیے اللہ سے رحم طلب نہ کرے۔

''ممی مجھے نہیں لگتا ذی شاہ رکے گا اور جانے یہ واپس کب آئے۔ مجھے تو اس کی بہت فکر ہے۔'' ذیشان نے ممی کو خاموش دیکھ کر پینترا بدل لیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا ہر بحث فضول اور لاحاصل ہے تاہم اس کے دل میں گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔

''ذی شاہ کی نہیں، آنیہ کی فکر ہے۔'' بندیا بھی

کہاں چپ رہ سکتی تھی۔ اس کے الفاظ نے عینی کو آگ لگا دی تھی۔ وہ اتنی غضب ناک ہوئی کہ حد نہیں، گورے بے داغ گال خون چھلکانے لگے، تیکھی ناک سکڑ گئی، ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''آنیہ کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ تم لوگ نہ جانے کس زعم میں مبتلا ہو۔'' وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی تب مالا اور ممی دونوں سہم گئی تھیں جبکہ بندیا دوبدو مقابلے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اسے کون سا لحاظ تھا کسی کا۔ جب یہ لوگ ڈھیٹ اور بے شرم تھے تو وہ بھی ڈھیٹ اور نڈر ہو گئی تھی۔

''ہم لوگ کسی زعم میں نہیں، بس لوگ ہی میرے بھائیوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ ہی انہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔'' بندیا بھی منہ پھاڑ کر بولی تھی۔ اسے کون سا کسی کی پروا ہوتی تھی۔ اب محاذ دونوں طرف گرم ہو چکا تھا۔ ذیشان کو ہی سیز فائر کروانا پڑا۔ بیوی پر تو زور نہیں چلتا تھا بہن پر سارا نزلہ گرا ڈالا۔

اگلی صبح معمول کے مطابق دونوں بھائی آفس چلے گئے تھے پھر ایک ہفتہ پُرامن نکل گیا۔ عینی کی انا خاصی برہم تھی۔ ناک کٹ رہی تھی سو وہ اپنی بات سے ہٹنے والی نہیں تھی۔ اس نے گھر چھوڑنے پر بالآخر ذیشان کو راضی کر ہی لیا تھا حالانکہ کم از کم وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ عینی کو در پردہ سمجھا تا بھی رہا تھا مگر اس پر ایک ہی دُھن سوار تھی۔ اوپر والے پورشن کے بجائے الگ گھر کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ بالآخر جیت عینی کی ہوئی۔ ذیشان کو ماننا ہی پڑا۔ اس کے بغیر اور کوئی راستہ جو نہیں تھا۔

☆☆☆

ذیشان کے گھر چھوڑنے نے ممی کو بیمار کر دیا تھا وہ اسپتال کیا گئیں مردہ ہوئی مالا کے اندر زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ ممی کی بیماری نے اسے اتنا حساس کر دیا تھا کہ وہ دن رات ممی کی پٹی سے لگی رہتی تھی۔ اسے ڈیڈی کے بعد ممی کی جدائی کے دھڑکے نے متوحش کر دیا تھا۔ وہ دن رات ان کی خدمت کرتی، طویل تر سجدے، لمبی دعاؤں میں اپنی ممی کی صحت اور

تم میرے ہو

آج لکھوں کیا سارے لفظ ہیں خفا مجھ سے
دل پہ اک بوجھ اب بھی باقی ہے
نیند سے عاری آنکھیں
اک سپنے کی تلاش میں ہاری ہیں
اس کے ہونٹوں سے کچھ سننے کی حسرت
اب بھی دل میں باقی ہے
زندگی جینے کو اک بات ہی کافی ہے
وہ اک بار جو بس یہ کہہ دے ایشل
تم میرے ہو

شاعرہ: ایشل شادیان آرائیں، گولارچی

زندگی مانگتی۔ یہ بندیا اور مالا کی دعائیں ہی تھیں جو ممی اس جھٹکے سے سنبھل کر گھر آ گئیں۔ ذی شاہ اور شامی نے گویا سکھ کی سانس لی۔ پھر انہی دنوں ذی شاہ کا ویزا لگ گیا تھا۔ سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔ روانگی سے کچھ دیر پہلے متذبذب سی مالا اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ ہی نہ سکی حالانکہ ذی شاہ نے بہت دفعہ اس سے علی عیسٰی کے گھر کا ایڈریس مانگا تھا مگر مالا کو ایڈریس کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سی لوکیشن اس نے سمجھا دی تھی۔ جو ذی شاہ کو اتنی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ مالا کو ڈھیروں تسلیاں دینا چاہتا تھا مگر وہ بولا تو صرف اتنا۔

''میں تیری ساری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس لاؤں گا مالا۔ یہ تیرے بھائی کا تجھ سے وعدہ ہے۔'' ذی شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ گھٹی، گھٹی آواز میں رونے لگی تھی جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کون سی خوشیاں، کیسی خوشیاں؟

''وہ خوشیاں جو تجھ سے چھن گئیں۔'' ذی شاہ

نے بھرائی آواز میں کہا تو مالا کا جھکا سر نہ اٹھ سکا۔

"تیرے ایک، ایک دکھ کا حساب لوں گا۔" وہ گویا خود کو یقین دلا رہا تھا۔ خود سے عہد باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

اور آج کی رات ذی شاہ کے دل پر بہت بھاری تھی۔ وہ علی عیسٰی کے من ہائیم میں تھا۔ یہ علی عیسٰی کا شہر تھا جس کی خوشبو میں محبت کی باس اب بھی رچی تھی۔ یہاں کی فضا میں مالا کے آنسوؤں کی مہک پھیلی تھی۔ یہاں سے اس کی بہن کو دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ سارے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ مالا کی بربادی اسے رُلا رہی تھی اور آج وہ اپنے سارے خاندان سے چھپ کر دوست کے گھر میں تنہا کمرے اور خاموش ماحول کو پا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ یہ آنسو وہ آخری مرتبہ بہا رہا تھا۔ اب رونے کی باری علی عیسٰی کی تھی۔ مالا تو بہت خوار ہو چکی۔ اب ذلیل ہونے کی باری علی عیسٰی کی تھی۔

وہ اپنا اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ عیسٰی تک پہنچنے کا، اس کے گریبان کو پکڑنے کا اور سب سے بڑی بات اسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ افراہیم اور اس کی فیملی کو ملوث کیے بغیر کرنا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے ان مخلص لوگوں کو کسی بھی مصیبت میں نہیں پھنسا دیکھ سکتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ افراہیم کو اپنے جرمنی آنے کا مقصد ہرگز نہ بتاتا۔ افراہیم کو صرف یہی پتا تھا کہ وہ جرمنی بزنس کی غرض سے آیا ہے وہ کسی علی عیسٰی کو نہیں جانتا اور نہ کسی کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ افراہیم کے تحفظ کا اہم جز اور بے حد ضروری تھا۔ بس انہی سوچوں میں گم وہ سفید بے داغ، بے سلوٹ بستر پر ایسا گرا کہ صبح کا اجالا پھیلنے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اتنی بے خبری کی نیند تو کبھی نہیں سویا تھا بھی حیران سا آنکھیں مسلتا اٹھ گیا۔ معاً اس کی نگاہ داخلی دروازے تک گئی تھی۔ جہاں چپکنے سے کارڈ پر ابھی تک "ویلکو مین ان من ہائیم" لکھا تھا۔ ذی شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی تھی۔ تو گویا اسے من ہائیم میں خوش آمدید کیا گیا تھا۔ ویلکم کا یہ انداز اسے پسند آیا تھا۔

وہ کمرے کی آخری نکر میں موجود باد لے سیمر تک گیا تھا۔ رات کو موتر نے (افراہیم کی ماں) نے غسل خانے کی نشاندہی کر دی تھی۔ وہ اپنے صاف ستھرے کپڑے نکال کر نہانے کی غرض سے آیا تھا اور چمکتے دمکتے باتھ روم کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے متحیر رہ گیا۔ یہ غسل خانہ تھا اتنا شفاف، معطر اور چمکیلا جیسے کوئی شیشے کا ننھا سا محل ہو۔ اجلا چمکدار نہانے کا ٹب اور انیمل، شیشوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ کانچ کا خوب صورت فرش آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اتنے اجلے، خوشبودار باتھ کو دیکھ کر ذی شاہ کو اپنا آپ اور بھی گندا سندا اور میلا، میلا سا لگ رہا تھا۔

وہ نہا کر باہر آیا تب تک افراہیم بھی کمرے میں آچکا تھا۔ اسے فریش، فریش اور تروتازہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"سلام صبح! تم اٹھ گئے، میں تیسری دفعہ دیکھنے آیا ہوں تمہیں۔ ممی نے بریڈ کروا رکھی ہے۔ رات کو ڈنر کیے بغیر جو سو گئے تھے۔" وہ ایک ہی سانس میں بولنے کا عادی تو نہیں تھا مگر فی الحال اس کی اسپیڈ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اسے بال بنانے کی مہلت دے کر جلدی نیچے آنے کا کہتا خود باہر نکل گیا تھا تب ذی شاہ نے اپنے سیمسو نائٹ کیس سے پرفیوم کی بوتل نکال کر خوشبو میں خود کو بھگویا اور پھر سامان سمیٹ کر کمرے کی گلاس ونڈو میں آ کھڑا ہوا۔ دراصل وہ باہر کا موسم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے نائیلون کی جالی والا مہین سا پردہ انگلیوں کی چٹکی میں پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور دوسرے سلک کے پھولدار ریشمی پردے کو سمیٹ دیا۔ اب وہ سلائیڈ ہٹا کر باہر جرمنی کے بکھرے تروتازہ حسن کو دیکھ رہا تھا ایک دم سحر زدہ اور دم بخود، اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا وہ جرمنی کے سحر میں نہیں پھنسے گا مگر اس کا یہ عہد جرمنی کی اس اجلی، حسین، مخملی سویر میں بھربھری ریت کی دیوار ثابت ہو گیا۔ وہ جرمن کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔

وہ یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ دی ویدراز گڈ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کے ہونٹ منجمد تھے اور نگاہیں ساکت۔ دور ہوتے کوہستان آلپس، آسمان میں تیرتی مرغابیاں

رقص کرتی سنہری پریاں، ڈار سے بچھڑی اس کونج کے آس پاس مجورِ رقصاں تھیں۔ ہاں سارے جرمنی کا حسن سمٹ کر ایک نکتے کی شکل میں دائرہ بنا گیا تھا۔

اسے یقین آگیا تھا پورے جرمنی میں ایسا خبطی آئٹم اسے ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہ دیتا۔ تلاش کرنے سے بھی نہ ملتا۔

وہ ایک سفید راج ہنس کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ پھولوں سے لدی ٹوکری آج بھی اس کے قریب رکھی تھی۔ ذی شاہ کو اس کے ہونٹ ہلتے نظر آرہے تھے۔ وہ راج ہنس جیسی سفید لڑکی راج ہنس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ یقیناً وہ راج ہنس سے ہی ہم کلام تھی مگر اس کے بہتے رواں آنسو جیسے کسی ٹونٹی کا ہینڈل لوز ہونے کی وجہ سے مسلسل پانی ٹپک رہا ہو۔ وہ آنکھیں تھیں یا کوئی چھوٹی سی ندی، گہرا سا سمندر یا پہاڑ سے پھوٹنے والا چشمہ؟ جو خشک ہونا تو جانتا ہی نہیں تھا۔

ذی شاہ نے بس اپنی بہن مالا کو روتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس انداز میں مالا بھی کبھی نہیں روئی تھی عموماً جب وہ روتی تھی تب کوئی نہ کوئی اسے فوراً چپ کروا دیتا۔ شروع، شروع میں اسے دورے پڑتے تھے تب وہ چیختی چلاتی تھی مگر اس انداز میں مالا کے آنسو بہتے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ذی شاہ کو کچھ الجھن کے ساتھ عجیب سی بے چینی ہونے لگی تھی تو گویا یہ طے تھا کہ کسی بھی عورت کے آنسو اس سے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ وہ ماں کے آنسو ہوتے یا بہن کے یا پھر کسی اجنبی خبطی آئٹم کے۔ وہ ہرگز بھی عورت کی برستی آنکھیں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ مالا کے آنسو تھے جو اسے کھینچ کر جرمنی لے آئے تھے ورنہ اس کے تو خواب و خیال میں بھی جرمنی آنے کا کوئی پلان نہیں تھا اور اب راج ہنس سے باتیں کرتی اس اجنبی لڑکی کے آنسو اسے بے قرار کر رہے تھے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا دیتا اور وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ بھی ضرور پہنا دیتا اگر وہ لڑکی راج ہنس کو بازوؤں میں دبوچے اٹھ کر اندر کہیں گم نہ ہو جاتی۔

پل بھر کے لیے ذی شاہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے جیسے امید ہی نہیں تھی وہ خبطی آئٹم اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جائے گی۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ دل کیوں ایک دم بجھ گیا تھا اور من ہائیم کا حسن جیسے ماند پڑ گیا تھا۔ اب نہ کوہستانِ آلپس کی حسین چوٹیاں نگاہ کھینچ رہی تھیں نہ بادلوں سے ڈھکے آسمان پر تیرتی کونجیں متوجہ کر رہی تھیں۔ وہ دل کھینچ لینے والی ڈار سے بچھڑی کونج جو کہیں نہیں تھی ذی شاہ کو لگا وہ سارے آس پاس کے منظر کا حسن سمیٹ سمٹ کر اندر گھس گئی تھی۔ اب باہر نہ تو پھولوں کے مکٹ اسے اپنے طرف بلا رہے تھے نہ دور جاگنگ ٹریک کے آس پاس بکھری ہریالی اسے پکار رہی تھی۔ ہر منظر اپنا سحر کھو چکا تھا، ہر خوب صورتی اپنی ترنگ بھول گئی تھی۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا حالانکہ سب کچھ وہیں تھا۔ یہ تو ذی شاہ کے اپنے احساسات تھے جو سارے عہد بھلائے اسے چاروں شانے چت کر رہے تھے گویا اسے جتا رہے تھے تم تو پہلی نگاہ میں ہی دل پرایا کر گئے۔ ادھر ذی شاہ ونڈو کی سلائیڈ کھینچ کر سر جھٹک رہا تھا جیسے خود کو کسی ان دیکھے سحر سے آزاد کر رہا تھا مگر یہ ممکن تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟

یہ دل اور نظر کے سلسلے تھے۔ ذات پات، رنگ، نسل، قومیت سے بے نیاز تو پھر ذی شاہ خود کو کیسے جھوٹے بہلاوے دے پاتا؟ وہ خود کو کیسے بے نیاز کر لیتا؟ وہ خود کو کیسے جھٹلا پاتا۔ دل تو اسی ڈار سے بچھڑی کونج کی طرف کھنچ رہا تھا۔ کھنچا جا رہا تھا۔ یہیں کہیں دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتی اک ننھی سی خواہش انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی۔

"کاش کے وہ ایک مرتبہ پھر نظر آجائے۔"

وہ اندازے سے چلتا ہوا بالکل ٹھیک جگہ یعنی طعام کے کمرے میں بغیر اس گھر کی غلام گردشوں میں کھوئے پہنچ چکا تھا۔ بلیک سوٹ میں انتہائی تروتازہ، صاف ستھرا اور بلا کا فریش...... موتر کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ستائش اتر آئی تھی جبکہ افراہیم کی نٹ کھٹ سی چھوٹی بہن نے گلا کھنکھار کر جانے ڈوئچ میں کیا کہا تھا۔ اسے تو بس "فریوح لیگ" کی آواز آئی تھی۔ اب اس کا مطلب کیا تھا؟ یہ ذی شاہ ہرگز نہیں سمجھ پایا تھا۔ اگرچہ ڈوئچ کی اسے شدھ بدھ

تو تھی ہی بہر حال اسے یہ جرمن زبان خاصی مشکل لگا کرتی تھی۔ اس سے بہتر تو ذی شاہ کی پنجابی تھی جس میں اپنائیت اور مٹھاس محسوس کی جاسکتی تھی جبکہ ڈوچ تو زبان کو تھکا ڈالنے والی نہایت روکھی اور اکھڑ قسم کی بولی تھی۔ سو 'ڈوچ بول چال کے کتابچوں کو اس نے بنا پڑھے ہی سپردِ ہوا کر دیا تھا کیونکہ وہ ڈوچ نہیں بول سکتا تھا۔

"فریوح لینگ۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو افراہیم کی بہن ایمل اس کے کان میں جیسے گھس گئی تھی۔ وہ تیرہ سالہ انتہائی خوب صورت بچی تھی اور بڑی پُرشوق نظروں سے ذی شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کی بات پھر بھی سمجھ نہیں سکا تھا تب اس نے اشارے سے ایک سینری کا بتایا۔ ذی شاہ کو گردن گھمانا پڑی تھی پھر وہ سینری کو دیکھنے لگا تھا یہ پھولوں سے لدی کوئی راہ گزر تھی جس کے آس پاس اونچے پھولوں کے درخت تھے جو ہر طرح کے رنگ برنگے پھولوں سے لدے تھے۔ آغازِ بہار کا تاثر دیتی یہ پینٹنگ بہت خوب صورت تھی پھر ایمل کے اشارے نے اسے کچھ کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ اسے شاید بتا رہی تھی کہ تم بہار کی طرح تروتازہ ہو۔ دوسرے معنوں میں ایمل نے اس کی تعریف کی تھی وہ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ سا گیا۔ کچھ دیر بعد ماں سے نظر بچا کر ایمل پھر اس کے کان میں گھس گئی تھی۔

"رائسنٹ۔" اس نے مسکرا کر ایک گلدان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ایک حرفی معنی خیز لفظ ذی شاہ کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گیا تھا پھر اس نے گلدان پر غور کیا۔ سجا سنورا گلدان توجہ کے قابل تھا خصوصاً اس میں کھلتے سفید تازہ گلاب اس نے نگاہ موڑ کر ایمل کو دیکھا۔ وہ اپنی ٹوٹی انگریزی میں اسے بتا رہی تھی "تم بلا کے اٹریکٹو ہو۔" ایمل کے تعریفی کلمات نے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ رائسنٹ یعنی پُرکشش یعنی کہ اٹریکٹیو۔ وہ بے ساختہ ہنستا چلا گیا۔ اسے ایمل بہت دلچسپ لگی تھی۔ اس کی یک لفظی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ اب وہ جھک کر رازداری سے کچھ اور پوچھنا چاہتی مگر اس سے پہلے اس نے موتر کے کچن میں چلے جانے کی تسلی کر لی تھی۔

"یونگے سلے؟" وہ بہت بے چینی، تجسس اور عجلت میں پوچھ رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ ممی ناشتے کی ٹرے اٹھا کر واپس نہ آ جائیں حالانکہ ابھی ان کا کچن سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ افراہیم کے دوست کی مدارت کے لیے چیز کیک بنا رہی تھیں اور کیک بیک ہونے میں ابھی کچھ ٹائم باقی تھا۔

"یونگے سلے؟" ایمل نے اسے چپ دیکھ کر بے چینی کے عالم میں بازو ہلایا تھا پھر جیسے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر انگریزی اور ڈوچ کے مکسچر کے ساتھ بولی۔

"آر یو یونگے سلے؟" ایمل نے انگریزی اور اطالوی کا مکسچر جو بنایا تھا وہ ذی شاہ کے پلے پھر بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے لفظوں پر غور کیا تو اندازہ ہوا محترمہ کوئی سوال پوچھ رہی تھیں۔ اب یونگے سلے کا مطلب کیا تھا؟ ذی شاہ کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ سو وہ بے بس سا ہو گیا تھا تب ایمل بھاگ کر کارنس پر سجی ایک گڑیا کو اٹھا لائی۔ وہ صرف ایک گڑیا نہیں تھی اس کا دولہا دوست (کچھ بھی کہا جاسکتا ہے) ساتھ تھا۔ ایمل اب دوبارہ اپنا سوال دُہرا رہی تھی۔ ذی شاہ نے پھر سے لفظوں پر غور کیا۔

"آر یو یونگے سلے؟" اس کا کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ کیا تم میڈ ہو یا گونگے ہو یا جرمن سے واقف ہو؟ یونگے سلے کا مفہوم کیا ہوسکتا تھا؟ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں وہ گڑیا اور گڈے کی طرف اشارہ کر رہی تھی پھر اس نے گڑیا کے ہاتھ کو پکڑ کر سامنے کیا تھا۔ باربی کی انگلی میں انگوٹھی تھی۔ اس نے کرسچن برائیڈل ڈریس پہن رکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ اپنے دولہا کے ساتھ کھڑی تھی۔ تو کیا ایمل اس سے یہ تو نہیں پوچھ رہی تھی۔

"آر یو یونگے سلے؟" (کیا تم شادی شدہ ہو؟ یا پھر کیا تم کنوارے ہو؟) ذی شاہ کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ ابھی وہ اپنے اندازے کی درستگی پر ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا جب ایمل نے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کے کسی کونے سے یونگے سلے کا انگریزی ترجمہ "آر یو بیچلر؟" کے طور پر بالآخر نکال ہی لیا تھا۔

"آں...... ہاں...... نہ...... نہ۔" ذی شاہ کا منہ

حیرت سے کھل گیا۔ وہ اس کے نہ نہ کہنے پر بے ساختہ خوش ہوگئی تھی تو گویا وہ اردو سمجھ لیتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی اور اب بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

"ریخ تیگ (ٹھیک، ٹھیک)" اس کی خوشی کا کوئی شمار نہ تھا۔ اگلے پندرہ منٹ میں ذی شاہ کو ایمل کے خوش ہونے کی اصل وجہ سمجھ آ گئی تھی۔ ایمل کو میرڈ لوگ پسند نہیں تھے۔ بیچلر پسند تھے۔ اس کی بہن شادی شدہ ہو کر اسے چھوڑ چکی تھی۔ اب اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی سو ایمل کو بہن کی جدائی کا بہت دکھ تھا۔ اسے شادی بہت بری لگتی، جو بہنوں کو پرایا کر دیتی تھی اور بھائیوں کی مصروفیت بڑھا دیتی۔ بھائی بیویوں کے ہو جاتے اور بہنیں شوہر کی بھلا سب سے چھوٹے بہن بھائی کے حصے میں کیا آتا ہے۔ ڈانٹ، غصہ، ممی کی جھڑکیاں، تنہائی، اکیلا پن سو ایمل کا شادی شدہ لوگوں پر غصہ کرنا بنتا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ میں ایمل اس کی پکی سہیلی بن چکی تھی۔ ممی کے آنے تک ایمل نے ذی شاہ کی کلائی پر فرینڈ شپ بینڈ باندھ دیا تھا۔ اب وہ اس کی بہت اچھی دوست بن چکی تھی جس کی بات سمجھنے میں ذی شاہ کا اتنا ڈھیر سارا ٹائم ویسٹ ہو جاتا تھا۔ آنٹی کے آنے تک اس نے ٹیبل پر برتن بھی نہیں رکھے تھے جس کی وجہ سے ان کا پارہ بگڑ گیا تھا۔

"داس ازت آبر۔" انہوں نے گھور گھور کر ایمل کو دیکھا تھا اور ایمل گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگی تھی۔ ماں کی ڈانٹ بس اسی کو سمجھ آسکتی تھی جبکہ وہ محض مسکراتا ہی رہا تھا اگر جو ڈانٹ کے مفہوم جان جاتا تو ایمل کو ڈانٹ پڑنے پر کچھ افسردہ ہو کر نئی نئی دوستی کا حق ادا کر دیتا مگر وہ "داس ازت آبر" جو انگریزی کے that's a shame سے ملتے جلتے الفاظ کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ سو انجان پنے میں بس مسکرایا تھا۔ اگلے تین چار گھنٹوں میں اس پر واضح ہو چکا تھا اس گھر میں ایمل کو سب سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔ افراہیم سے لے کر ممی تک کیونکہ اس کی بچگانہ حرکتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔

☆☆☆

وہ جس مقصد کے تحت جرمنی آیا تھا اسے بھولا ہرگز نہیں تھا مگر ہر چیز کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں، کچھ قاعدے اور اصول ہوتے ہیں سوائے ایک قاعدے، ضابطے کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ اسٹیپ بائے اسٹیپ قدم بڑھانے تھے۔ وہ عجلت اور جلد بازی میں علی عیسیٰ کو چوکنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو ایک جامع لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

اسے آئے یہاں اڑتیس گھنٹے تو ہو چکے تھے اور ان اڑتیس گھنٹوں میں بلا مبالغہ اس نے اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے کوئی ایک سو ننانوے مرتبہ ڈار سے بچھڑی کونج کو دیکھا تھا۔ وہ اٹھارہ دفعہ تو دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی تھی۔ اکتالیس دفعہ درمیانی سڑک پر چکر کاٹتی دکھائی دی۔ کوئی تیس مرتبہ اس نے اپنا سر کھجایا تھا۔ کھچڑی زدہ لمبے بالوں والا سر۔ پندرہ دفعہ اپنا جوتا اٹھا کر دیکھا شاید جوتے کے اسٹریپ تنگ کر رہے تھے۔ اس کی سوتی روک سڑک پر گھسٹتی پیروں میں رُلتی جا رہی تھی مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ ناک پونچھنے کے لیے ٹشو یا رومال کا تکلف کیے بغیر آرام سے آستین کو استعمال کر لیتی اور جب پینتسویں مرتبہ اس نے ناک آستین سے صاف کی تو ذی شاہ کا جی اوب گیا تھا۔

"ہاؤ ڈسگسٹنگ، چھی چھی۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا مگر نگاہیں پھر بھی موڑ نہ سکا۔ اسے بہتی ناک والے بچے بھی برے لگتے تھے یہ تو پھر اتنی بڑی لڑکی تھی جو ناک پونچھتے ہوئے بچوں کو بھی مات کر رہی تھی۔ یہ پورا دن ذی شاہ کا اسی مصروفیت میں گزرا تھا۔ ایمل اسکول چلی گئی تھی۔ آنٹی کے اپنے بہت سے کام تھے سو وہ کچھ دیر کے لیے شامی سے چیٹ کرتا رہا۔ بندیا سے بات کی اور اب سب سے حسین ترین مصروفیت میں کھو چکا تھا۔

"اور اب یہ اس کا بیالیسواں پھیرا ہوا۔" وہ خبطی آئٹم کو نگاہوں میں سموئے پھر سے بڑبڑایا تھا۔ اس نے پوری سڑک کو جیسے اپنے پیروں تلے روندنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ اپنے پیر ہی تھکا رہی تھی۔ پیروں کی طرف دھیان جاتے ہی ذی شاہ قدرے ٹھٹک گیا تھا۔

"ایں...... یہ کیا اتنا خون...... مگر کہاں سے

آیا؟'' اس نے گردن پوری کھڑکی سے باہر نکال لی تھی۔ اب وہ بہت غور سے سامنے چلتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ واک کر رہی تھی؟ واک اس طرح کرتے ہیں؟ پاگلوں کی طرح سڑک کے چکر کاٹنا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس کی جوتی کہاں تھی؟ شاید اس نے اتار دی تھی اور اب ایڑھیوں سے نکلتا خون۔ جانے اسے کوئی نوکیلا پتھر لگا تھا یا کوئی کانچ مگر بھل بھل نکلتا انسانی خون دیکھنا اس کے لیے محال تھا۔ سڑک پر جگہ، جگہ خون کے دھبے بکھر رہے تھے۔ کیا اسے ذرا بھی درد نہیں ہو رہا تھا اسے ذرا بھی تکلیف نہیں تھی وہ اتنی بے حس کیوں تھی، کیا اسے ایڑھیوں سے نکلتا خون دکھائی یا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا پھر جیسے ایک دم وہ کوئی فیصلہ کرتا پلٹ گیا۔ اس نے اپنے سیمسونائٹ کیس سے ننھا سا فرسٹ ایڈ باکس نکالا پھر دھڑا دھڑ اسٹرھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ آنٹی آس پاس کہیں نہیں تھیں وہ قدرے مطمئن ہو کر باہر چلا آیا۔ وہ سامنے ہی آٹھ دس فرلانگ کے فاصلے پر اونچی سی سڑک کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ ذی شاہ تقریباً بھاگتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔

''اے...... ارے ہیلو۔'' وہ پھولی سانسوں سمیت خبطی آئٹم کے قریب پہنچ گیا تھا پھر جیسے دوزانو دھڑام سے زمین پر گرا۔ اتنی تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے بریک لگانا مشکل تھا مگر وہ کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن یہ کیا؟ وہ خبطی آئٹم کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی ہو گئی تھی۔

''اے...... مائی نیم از ذی شاہ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟ واٹ از یور نیم؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے تھے مگر جواب ندارد۔ وہ گم صم بیٹھی لڑکی اس پر ایک سادہ نگاہ ڈال کر اپنے رِستے پیروں کو دیکھنے لگی تھی۔ ذی شاہ کو لگا وہ انگریزی نہیں سمجھتی۔ ظاہر ہے وہ اپنی زبان میں ہی بات سمجھ سکتی ہوگی۔ وہ تھوڑا مایوس ہو گیا تھا۔ اب کیا کرے؟ کیسے مخاطب کرے؟ بات کس طرح سے ہو؟ وہ اردو، انگریزی سمجھنے والی نہیں تھی۔

''میں تمہارے زخم کو دیکھ کر آیا ہوں...... میرا مطلب ہے یہ خون...... میں تمہیں کب سے دیکھ رہا ہوں اس کھڑکی سے۔'' وہ روانی سے بولتا ہوا سامنے گھر کی اوپر والی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ لڑکی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ یہ بات ماننے والی بھی نہیں تھی بھلا آج کے دور میں کون اتنا فارغ تھا جو کھڑکیوں سے لٹک کر تانکا جھانکی کرے پھر جرمنی جیسے تیز رفتار ملک میں۔ ذی شاہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس لڑکی کو اپنے محسوسات کیسے بتائے؟ اپنے جذبات، اپنی خواہش، دل کی بدلتی کیفیت، یہ میٹھا، میٹھا ابھرتا درد آخر وہ لڑکی اس کی کس، کس بات پر یقین کرے گی؟ وہ پہلی بات میں ہی اسے پاگل قرار دے دے گی پھر یا تو وہ دو چار گالیوں سے نوازے گی یا ایک عدد جھانپڑ رسید کر دے گی۔ اس کی بکواس کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا مگر یہ بکواس کہاں تھی؟ یہ تو اس کے دل میں ابھرنے والے خالص جذبے تھے۔

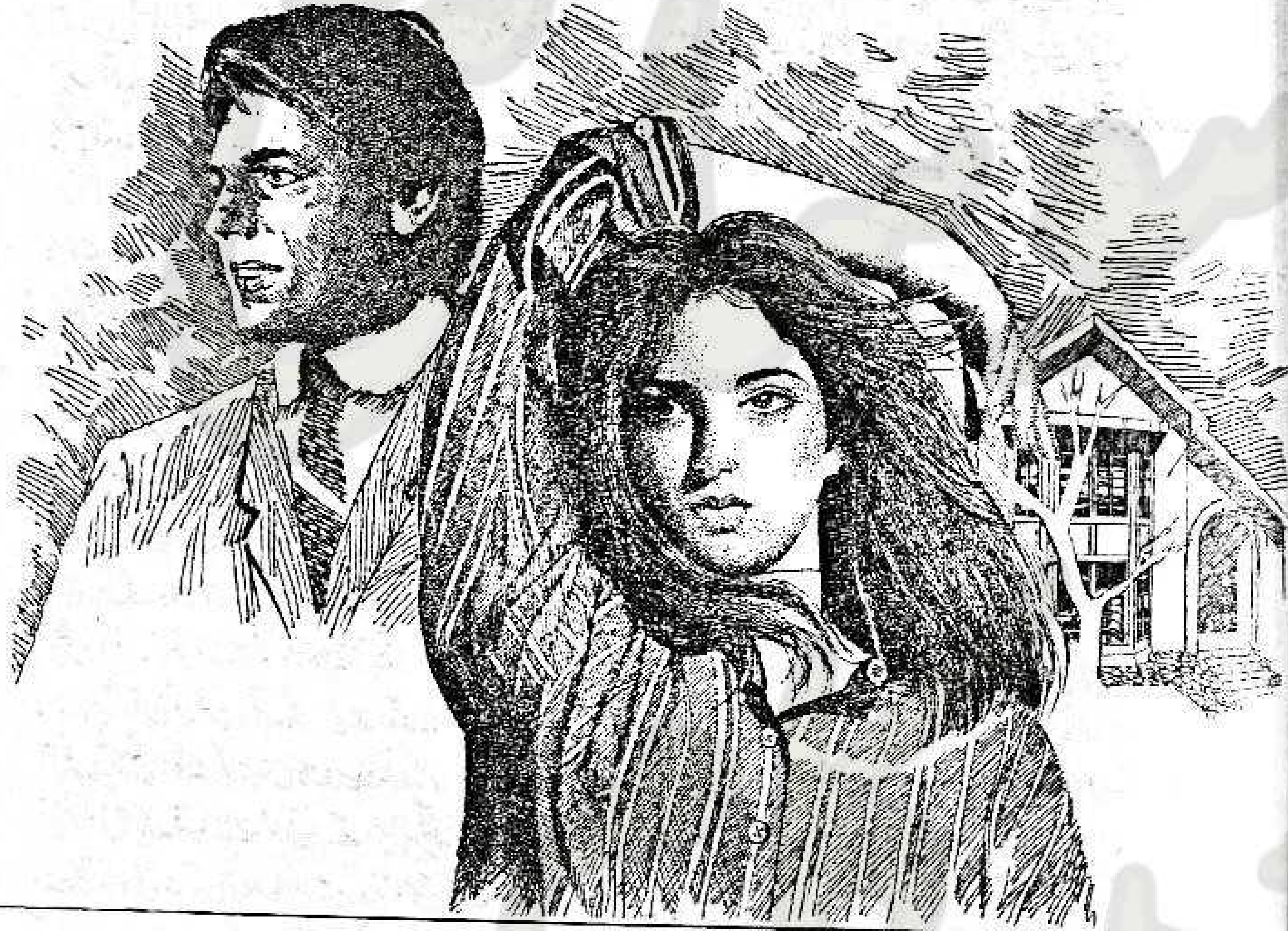
پہلی نظر کی محبت جو اسے پاکستان میں تو کسی سے نہیں ہو سکی تھی۔ آنیہ سے تو چاہ کر بھی نہیں ہو پائی تھی اور اِدھر بے چارے دل بادشاہ فراڈ کھیل گیا تھا۔ وہ بے چارہ کرتا بھی کیا؟ بس فی الوقت تو اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ دل سے تسلیم کر لے کہ جرمنی آنے کے بعد ان اڑتیس گھنٹوں کے دوران کوئی ایک سو نناوے مرتبہ وہ اسے احمقوں کی طرح دیکھ چکا ہے۔ کبھی چلتے، کبھی روتے، کبھی روتے، کبھی خود سے باتیں کرتے۔

''تم مجھے پچھلے اڑتیس گھنٹوں میں ایک سو نناوے مرتبہ دیکھ چکے ہو۔ نائیلون کا جالی دار مہین پردہ ہٹا کر، گردن باہر لٹکائے، میں جانتی ہوں، آگے بتاؤ۔'' گردن کو آلپس کی چوٹیوں کی طرف موڑے اس نے دھڑ دھڑ ذی شاہ کے سر پر حیرتوں کا بینڈ بجا ڈالا تھا وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

> اس رات اور کیا ہوا تھا' مون حسیب کا اگلا شکار کون بننے جا رہا تھا؟ یہ سب جاننے کے لیے اگلے ماہ تک کا انتظار کیجیے

کہیں نہیں کبھی نہیں

غزالہ رشید



وہ جیت لینے کی خواہش میں ہار جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسے فاتح ہونے کے سارے ہنر آزمودہ ٹوٹکوں کی طرح یاد رہتے تھے، ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ثوبان احمد فاروقی کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس کی نئی اسپورٹس بائیک نہ صرف دوستوں میں بلکہ خاندان میں بھی اسے سب سے نمایاں کرتی تھی، اسے احساس تھا، وہ جانتا تھا، اپنے ہر انداز کو اور

اسے خود پر فخر کرنے کا جنون بھی تھا...... جنون انسان کو سب سے الگ کر دیتا ہے۔ بلندی بھی کبھی بشر کو تنہا کر دیتی ہے۔ بالکل سرو کے درخت کی طرح...... اس کے قد و قامت کے اندر بہت سے راز چھپے ہوتے ہیں۔ یہ خوشنمائی کی مثال تو ہے ہی...... لیکن بلندی اور اکیلے پن کی بھی منفرد مثال ہے جسے شاید تنہائی بھی کہتے ہیں۔

''ہائے رحمان بابا...... کیسے ہیں...... اپنا خیال رکھتے ہیں ناں...... اور میری بائیک کا......؟'' ثوبان فاروقی نے مخصوص انداز میں کہا اور بائیک کی طرف دیکھا۔

''جی ثوبان بابا...... فجر کی نماز کے بعد...... ہم سب سے پہلے آپ کی بائیک کو ہی صاف کرتا ہے، چمکاتا ہے، بعد میں بڑے صاحب کی گاڑی دیکھتا ہے جی۔''

''اوہ...... گڈ......'' ثوبان نے بائیک کو کِک ماری اور نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ بائیک کا دھواں فضا میں اُڑاتے ہوئے وہ دوستوں سے ملاقات کو روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''آج رات تم پھر لیٹ آئے ہو ناں......''

آسٹریلیا میں انتظار کرتا اس کا دوست فہد ناراضی سے بولا۔

''ایک تو اتنے شوق سے ویزا لگوایا تو نے اور اب فریادی نہ بن، انسان بن۔'' اس نے اسکائپ آن کرتے ہی اس کی ناراضی کو چٹکی میں اڑایا۔

''تجھے نہیں پتا ناں یار...... بندے کو دوری...... اور وہ بھی گھر کی، دوستوں کی کتنا بیزار کرتی ہے...... یہاں تو کالج سے آ کر اپنے لیے کھانا بھی خود بنانا پڑتا ہے تو یار پھر امی کے ہاتھ کی آلو، بینگن کی سبزی بھی یاد آنے لگتی ہے۔''

''اب تو مرزا غالب نہ بن...... اقبال کا شاہین بن، جو بسیرا کرتا ہے پہاڑوں کی چٹانوں پر۔'' ثوبان نے ریکارڈ لگایا۔

''سامنے ہوتا ناں، یقین کر، تیرا سر دیوار پر مار دیتا۔'' فہد کو ثوبان کا مذاق نہایت کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''میں سامنے ہوتا اگر..تو یقین کر تجھ سے ہی چائے بنواتا...... تجھ سے ہی کپڑے دھلواتا...... اور تو ہی میرے لیے کھانا بناتا...... لیکن دیسی ٹائپ بالکل نہیں تجھے پتا ہے ناں...... میں تو ناشتے میں بھی برگر کھاتا ہوں۔'' ثوبان نے فریج سے جوس نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار...... تیرے لیے تو پاکستان بھی امریکا ہے، یہ مسئلہ تو ہم مڈل کلاس لوگوں کا ہے، تو ٹھہرا بزنس کلاس......'' فہد کی آواز میں اداسی تھی۔

''اب بس......! وہ کیا گانا تھا جو تو گایا کرتا تھا...... جب عینی کی دوستی تیرے کزن فاران سے ہو گئی تھی۔ وہ یاد کر اور پھر سے گانا شروع کر دے...... ہاں یاد آیا۔ وہ شاید عاطف اسلم نے تیرے لیے ہی گایا تھا۔ ہو جائے، بہت دنوں سے تیرے دکھ کو محسوس نہیں کیا...... میں بھی انجوائے کر لوں......'' ثوبان کی محبت کا اپنا انداز تھا...... فہد گا رہا تھا، فاصلے سمٹ رہے تھے۔

''تیری یادیں...... ملاقاتیں
میں کیسے بھولوں، چاہت کی وہ برساتیں
تیری یادیں...... ملاقاتیں
تو ہی میرا دل...... تو ہی میری جاں''

''اوکے، نیند آ رہی ہے، بس اب عید، بقر عید، برساتیں، لڑکیوں کی طرح یاد نہ کر جون، جولائی میں سمر ویکیشن ہوں گی ناں...... آ جانا...... کل پاپا سے بات کر لینا، ان کا بھی فون آیا تھا، پریشان ہو رہے ہیں۔'' ثوبان نے اپنے بچپن کے دوست فہد کو سمجھاتے ہوئے اسکائپ بند کیا...... اور لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر پاپا ہمیشہ کی طرح اخبار ساتھ رکھے مصروف تھے اور ماما نے بھی شام کی پلاننگ پہلے سے کر رکھی تھی۔ تب ہی تو شوبی کی اور اس کی بھی اپنی دنیا تھی، اور اپنی خوشیاں......

''آج تم دونوں کا شام میں کوئی پروگرام تو نہیں ہے ناں......؟'' ماما نے جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں، آپ بتائیں۔'' ثوبان نے شوبی (بہن) کی طرف دیکھا۔

''تمہاری مونا آنٹی کل لندن سے آئی ہیں...... ان کا فیملی ڈنر ہے اور ہم سب بھی انوائٹڈ ہیں۔'' مسز فاروقی نے اپنی میڈ فضیلت کی طرف نخوت سے دیکھا۔ جو ناشتا لگا رہی تھی۔

''ثوبان تم نے اپنی اسٹڈیز کے بعد آفس آنا شروع کرنا ہے۔ you know طٰہٰ صاحب نے کہا ہے، اب میری صحت اجازت نہیں دے رہی کہ میں ایڈمن اور اکاؤنٹس کے ساتھ، ساتھ سیلز اور مارکیٹنگ پر بھی نظر رکھوں...... ویسے بھی تمہاری ایجوکیشن میرے بزنس کے کب کام آئے گی؟'' مخصوص انداز، مخصوص لب و لہجہ......

''dont worry سر، ثوبان آپ کو مایوس نہیں کرے گا، لیکن آج تو میرا بیڈ منٹن کا میچ ہے۔ وقت تیزی سے کیا کر رہا ہے...... ہاں دوڑ رہا ہے ناں...... شوبی، تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' شوبی کا موڈ ہمیشہ کی طرح فریش تھا۔

☆☆☆

''صبح، صبح ہی، صبح ہی صبح......'' ہکلاتے ہوئے اشرف نے کچھ کہنا چاہا، فاروقی صاحب کا مزاج آشنا تھا لیکن کیا کرتا، اس کی اپنی مجبوری تھی۔

''کیا ہو گیا صبح ہی صبح؟'' احمد فاروقی نے پوچھا اور گاڑی کا دروازہ کھلتے دیکھا۔

''صبح ہی صبح سر، آتے ہوئے کسی نے مجھ سے موبائل چھین لیا۔'' اشرف کی ہکلاہٹ میں بے بسی بھی تھی۔

''یہ تو اب ہر روز کا مسئلہ ہے۔'' احمد فاروقی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔ اشرف کو جواب مل چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ کی ذمے داری سنبھالی۔

رحمان بابا نے ثوبان اور شوبی کو دیکھ کر۔ بائیک کی چابی دیتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری...... اور پھر اپنی ڈیوٹی سنبھالی، وقت ظالم تھا۔

☆☆☆

احمد فاروقی سیلف میڈ انسان تھے۔ جن کی رگوں میں ایسے والدین کا خون تھا، جنہوں نے انہیں زندگی برتنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کو برتنے کا ہنر بھی سکھایا تھا۔ لیکن فطری بات ہے انسان خواہ کتنا ہی خود اعتماد کیوں نہ ہو، وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ لوگوں پر بھی اندھا اعتماد کرنے لگتا ہے اور کچھ لوگ اس کی زندگی میں آتے جاتے موسموں کی طرح ہوتے ہیں۔ احمد صاحب بھی اپنی اس عادت سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ جتنے وہ لوگ جو اُن کے اردگرد تھے۔

کبھی کبھی ہم زمین پر رہ کر جب ہر فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں تو کبھی کبھی سورج کبھی چاند...... اور کبھی کبھی تو ننھے پرندے...... بھی ہمارے اس انداز پر مسکراتے ہیں...... اور ہم بے خبر، انجان، مست ہاتھی کی طرح انا کی لمبی سونڈ کو اپنی مرضی سے اٹھاتے ہوئے، کبھی چیختے، چنگھاڑتے ہیں اور کبھی بس چلتے رہتے ہیں منزل سے بے خبر...... بس سفر تیز تر اور تیز اور تیز...... نامعلوم منزل کی جانب......

آفس پہنچنے کی جلدی اور اشرف کی سستی کو فاروقی صاحب سمجھ رہے تھے لیکن اس کے دکھوں کی گٹھڑی سے فی الوقت بے نیازی کی وجہ اس میٹنگ

کی فکر تھی جو آج انہیں اپنے کلائنٹ سے کرنی تھی۔ لوگوں کی بے حسی...... سڑک کی ٹوٹ پھوٹ اور اشرف کی سستی پر انہیں غصہ آرہا تھا لیکن انہیں اس پر بھی قابو پانا آتا تھا۔ اشرف کا دماغ بھی تو کہیں اور ہی چل رہا تھا...... آج ہاجرہ نے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ اسے کئی دن سے کھانسی کا دورہ سا اٹھتا تھا، بچے پریشان ہوجاتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ماں کو کھانسی تھی، اس لیے کہ ماں روٹی نہیں پکاتی تو وہ بھوکے رہ جاتے تھے...... اگر محلے کی تائی اماں کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ ماں کو بھی اس موئی کھانسی کی وجہ سے... بددعائیں دینے لگتے، کیوں نہ دیتے، بھوک کو برداشت کرنا اتنا آسان نہیں...... بس یہ بھوک ہی کا مسئلہ ہے...... اشرف نے تیزی سے بریک لگائے...... شاید سامنے والے کی غلطی تھی یا پھر اشرف کی لیکن فاروقی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔

''اشرف تم آج بہت ڈسٹرب ہو شاید۔'' انہوں نے یہ کہہ کر سگار سلگا لیا۔

اب اشرف کو بھی کھانسی ہونے والی تھی لیکن آفس قریب آچکا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے انہوں نے مس ریما کے سلام کا جواب بھی مسکرا کر نہ دیا اور اپنے روم کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

''ثوبان، آج ہم دونوں فلم دیکھنے چلتے ہیں، یار ماما کے روز کے ڈنر پلان سے آئی فیڈ اپ!'' اس نے کالج کے گیٹ پر اترتے ہوئے کہا۔

''او کے لیکن آج میرا میچ بھی ہے بیڈمنٹن کا۔'' ثوبان بھی جلدی میں تھا۔

''رات کو......؟'' شوبی کو منع کرنا...... ثوبان کے لیے آسان نہ تھا۔

دونوں بہن، بھائی دوست تھے۔ ایسے دوست کہ شاید کسی وقت ماما، پاپا کی بھی بات کرنی ہوتی تو راز دار ہی رہتے، میر جعفر نہ بنتے لیکن ثوبان کی دوستی تو ایک ایسے بندے سے بھی تھی جو شاید...... بچپن ہی سے بس اس کا راز دار تھا' دوست تھا...... رشتے دار تھا...... ہاں بس جو بھی تھا کیا ضروری ہے کہ ہر رشتے کو پہچان بنالیا جائے... گلے میں لٹکا لیا جائے...... غریب کے بچے کے گلے میں پڑے ہوئے کالے دھاگے کی طرح...... فضیلت کتنے مزے سے کہتی تھی مسز فاروقی سے...... ''باجی میرے چھوٹے کا رنگ بہت صاف ہے، نظر لگ جاتی ہے۔''

ثوبان اور شوبی فضیلت کے بچے کی نظر لگنے والی بات پر اکثر ہنس دیتے...... ماما گھورتی رہتیں...... ''کی فرق پیندا اے یار......'' وہ ہنستے، ہنستے کبھی تو گر جاتے تھے۔

☆☆☆

آج ناشتے پر ماما نے ان دونوں کی کلاس لے لی۔ مونا آنٹی...... ماما کی ایسی دوست تھیں کہ اگر وہ پاپا کو چھوڑنے کا مشورہ دیتیں...... تو شاید ایک لمحے کو بھی نہ سوچتیں کہ مونا آنٹی انہیں بہکا رہی ہیں...... لیکن ماما تو سوئٹ ہیں...... خیال رکھنے والی مائیں تو خوش قسمت بچوں کی ہوتی ہیں...... یہ خیال ثوبان اور شوبی کو اکثر آتا...... فی الحال تو ان کو منانا تھا...... ویسے بھی آج سنڈے تھا۔

''ماما...... آج آپ کو اور پاپا کو ڈنر پر لے جانے کا پروگرام ہے، ہمارا۔'' شوبی نے سلائس پر... پی نٹ بٹر لگاتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھلا مانوں تمہارا پروگرام؟'' ماما کی ناراضی حسب توقع تھی۔

''اس لیے کہ آپ ہماری ماما ہیں...... اور میں تو جانتا ہوں، ماما میری بات ہمیشہ مانتی ہیں اور آج بیڈ منٹن میچ جیتنے کی خوشی بھی سیلی بریٹ کرنی ہے۔'' ثوبان نے فضیلت سے دودھ کا گلاس لیا۔

''ڈنر پلان...... گڈ، میرا بھی موڈ ہے۔'' پاپا مسکرائے، وہ کم ہی مسکراتے تھے۔

ثوبان کو پاپا کی مسکراہٹ بہت اچھی لگتی تھی لیکن اس کا خیال تھا پاپا اس لیے مسکرانے میں کنجوسی کرتے ہیں کہ وہ بزنس مین زیادہ ہوگئے ہیں جبکہ پاپا ذرا کم، کم سے رہ گئے ہیں۔ اسے ایسے خیالات نہ جانے کیوں آتے تھے، بس آ ہی جاتے تھے۔ اس نے سب کو خدا حافظ کہا...... اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

پاپا موسم سے زیادہ ماحول کو انجوائے کرتے تھے، اس لیے اکثر ڈنر پر وہ پی سی کے یخ بستہ ماحول میں چائنیز کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ ثوبان احمد فاروقی نے بچپن سے چائنیز کھانا ہی کھایا تھا لیکن جب سے اسپورٹس بائیک چلانی شروع کی تھی...... اسے ڈھابے کا کلچر بھانے لگا تھا...... بلوچی سجی ...... چکن کڑاہی ،تازہ نان...... تازی ہوا...... اور پھر فل آواز میں میوزک اور قہقہے...... تیز ہوا...... اس کی روح کو معطر کرتی تھی۔

ڈنر حسب سابق تھا۔ ماما اور پاپا کے ذوق کے مطابق...... وہ بھی انجوائے کر رہا تھا کیونکہ شوبی کو بات بے بات ہنسنے کی عادت تھی۔

''پاپا...... ثوبی نے سوپ میں اچانک ہی ڈھیر سارا چلی ساس ڈال دیا۔ oh God so spicy میری تو ہنسی نہیں رک رہی تھی ہمارے برابر والی ٹیبل پر ایک لڑکی موبائل پر بات کر رہی تھی...... اس نے ثوبی کو پہلے مسکرا کر دیکھا...... لیکن جب سوپ کا باؤل دیکھا...... پتا ہے پاپا کیا، کیا! اس نے تو اپنی چیئر ہی بدل لی۔'' شوبی کی ہنسی کو روکنا محال تھا۔

''تم ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہو، ثوبی؟'' ماما نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ تو میری پسند کا سوپ تھا، اگر کسی کو اچھا نہیں لگا، میں نے تو اِدھر اُدھر غور ہی نہیں کیا...... کون کیا کر رہا ہے، یہ شوبی ہے ناں...... آپ کی دوست مونا آنٹی کی طرح نیوز رپورٹر بن جاتی ہے۔'' ثوبی نے شوبی کو گھورا۔

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ پاپا نے کال ریسیو کی اور سنجیدگی اختیار کرلی۔

''اوہ نو......!'' پاپا خاموش تھے۔

پاپا کو خاموش ہوجانے کی عادت تھی، ماما کو سوال کرنے کی عادت تھی...... اور اُن دونوں کو ہمیشہ ایسے ہی موقع پر سانس روک لینے کی عادت ہوگئی تھی۔

''اشرف...... گاڑی تیز چلاؤ......'' پاپا کا کہنا تھا اور اشرف نے مرسیڈیز کو ایروپلین بنا دیا۔

☆☆☆

''تمہیں اب پاپا کے ساتھ آفس جانا ہوگا، تمہارے پاپا خاصے ڈسٹرب ہیں آج کل، ان کی زندگی میں جو مقام طٰہٰ احمد فاروقی کا تھا، وہ تو تم جانتے ہو ناں......'' ماما پریشان سی تھیں۔

''اوہ......'' ثوبان نے محسوس کیا۔

''جلدی گھر آجایا کرو...... پاپا کا بلڈ پریشر بہت ہائی رہتا ہے آج کل۔'' شوبی نے آہستہ سے بتایا۔

''ثوبان بابا...... آج تمہارے پاپا نے تمہارے بارے میں پوچھا ہے، چار دفعہ......'' رحمان بابا نے رازداری سے بتایا۔

''ہاں رحمان بابا......'' ثوبان کو اندازہ تھا۔

☆☆☆

''پاپا، کل سے میں آپ کے ساتھ آفس جاؤں گا۔'' رات وہ پاپا کے کمرے میں تھا۔

''تم نے تو آسٹریلیا جانا تھا؟'' پاپا نے مختصراً پوچھا۔

''کچھ عرصے بعد، جب انکل کی جگہ کوئی لے، لے گا تب......'' ثوبان نے عقل کے مطابق جواب دیا۔

''جگہ لینے کا مطلب جانتے ہو؟'' فاروقی صاحب نے طنزیہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

''جی......!'' ثوبان نے دل اور جملہ سنبھالا۔

''تم میری جگہ لوگے ناں؟'' فاروقی صاحب نے پوچھا۔

''کیوں پاپا......؟'' سوال غیر متوقع تھا۔

''بہت آسان ہے لفظوں کا استعمال ...... تم نہیں جانتے، وہ شخص میرے لیے کیا تھا۔'' پاپا کی آواز میں پہلی بار درد کا سمندر تھا۔

''سوری پاپا......! میں سمجھ سکتا ہوں......'' وہ پاپا کے قریب آگیا۔ ''مجھے بھی ان کی ڈیتھ کا بہت دکھ ہے۔''

''تم میرے ساتھ کل سے چلوگے...... سیکھوگے، انرجی تمہاری اور بہت کچھ ابھی تمہیں سیکھنا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''میں اپنی بائیک پر آجاؤں گا؟'' ثوبان مسکرایا۔

''بائیک پر...... آفس......؟'' فاروقی صاحب کی نظریں چشمے میں اور بڑی لگ رہی تھیں۔

ثوبان نے سر کھجایا......اور پھر جھکا لیا......شاید اسے جلد بازی میں یاد نہیں رہا کہ پاپا اس کی اسپورٹس بائیک کو کھلونا سمجھتے ہیں......اور اسے دس سال کا بچہ۔

☆☆☆

''یار...... اب تو بور نہ کر سونے دے۔'' اس نے آج فہد کو موبائل پر ہی میسج لکھ کر سینڈ کر دیا...... اے سی کو اتنا تیز کر دیا کہ کمرا فریزر ہو گیا تھا۔ چیزوں پر ثوبان کو مکمل کنٹرول تھا۔ صبح الارم بج رہا تھا جو ثوبان نے جم جانے کے لیے لگایا تھا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر آج الارم آف کر دیا......

آج جیسے اس کا امتحان تھا......اسے کالج بھی صبح کے وقت جانا... ہمیشہ سب سے برا لگتا تھا۔ وہ سوچتا، یہ آفس کا ٹائم 12:pm کیوں نہیں ہو جاتا، اس کا بس چلتا تو زندگی سے am نکال ہی دیتا...... یا شاید وال کلاک کو الٹا لٹکا دیتا بالکل ایسے، جب جم میں وہ ایکسرسائز کرتا تھا تو اسے کئی لوگوں کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ سوچتا تھا موٹے ہوتے ہی کیوں ہو کہ اتنا......اتنا وقت پھر وزن کم کرنے میں لگاؤ۔ یہ تو شوبی نے سکھایا تھا۔ شوبی کی زندگی میں دو باتوں کا بہت دخل تھا......ایک کیوں اور دوسرا...... بھی کیوں......؟

☆☆☆

وہ قسمت بنانے پر یقین رکھتا تھا۔ اسے ناکام لوگوں کی طرح، ٹھنڈی آہیں بھرنا پسند نہیں تھا۔ اسے خود پر یقین تھا، تب ہی تو ثوبان احمد فاروقی کی آمد سے آفس میں بھی سب کچھ بدل گیا تھا۔ ہر شے نئی، نئی نظر آنے لگی...... نئے لوگ، نیا انداز...... نئی بات...... اور پھر ایسے میں مغرور نظر آتا...... ثوبان احمد فاروقی......کئی لوگوں کا خواب بھی بن گیا تھا۔

خواب......جو زندہ رکھتے ہیں۔

خواب...... جو کہتے ہیں...... کچھ اپنی ہی زبان میں۔

خواب......جو آگہی دیتے ہیں۔

خواب......جو پاس بلاتے ہیں،

بتاتے ہیں...... سکھاتے ہیں......منزل کا نشان بھی بن جاتے ہیں۔

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خد و خال سے آگے
اِک شہر تھا، اس شہرِ مہ و سال سے آگے
اِک دشت رُضا تھا اسی رستے کے کنارے
اے راست رو! اس رہِ پامال سے آگے

☆☆☆

پاپا اس کے تھے اور احمد فاروقی، صرف بزنس سے بزنس تک کامیابی سے سفر کرنے والے، جوہر شناس، آگے بڑھنے والے، قدم روکنے اور کبھی روندنے والے......شجرِ سایہ دار لیکن کبھی بادشاہ اور کبھی بادشاہ بنا دینے والے...... معمار تھے، مصور تھے یا فنکار......

تب ہی تو کل کا لاابالی سا ثوبی، اب ان کی نظروں میں معتبر ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا اب میں سفر پر نکلتا ہوں تو مڑ مڑ کر دیکھنا نہیں پڑتا کیونکہ ثوبان

احمد فاروقی وہاں موجود ہوتا ہے۔ ماما کی آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی تھی...... ''شوبی'' پگلی فوراً ہی نئے موبائل کی فرمائش کر دیتی، اس کا تو شاید یہی شوق تھا......لیکن چھوٹی سی گڑیا......ثوبان احمد فاروقی کی اس میں جان تھی......لیکن......لمحۂ موجود پر بے خبری مسکراتی ہے......وقت استاد ہے ہم سب کا......

''آج میری دوست کی سالگرہ ہے، جلدی سے ساتھ ساتھ روانہ ہونے کا پروگرام بنالیں۔'' شوبی نے ڈائننگ ٹیبل پر سنڈے کو پھر سے منڈے کر دیا۔

''آج میرا اپنی بائیک پر دوستوں کے ساتھ جانے کا پلان ہے۔'' ثوبان احمد فاروقی نے بے بسی سے دیکھا۔

''ماما، آپ نے دیکھا...... پاپا کل آجائیں گے ناں......'' شوبی نے آنکھیں گھمائیں۔

''ایک گھنٹا نکال لو بیٹا۔'' ماما نے شوبی کی حمایت کی۔

''اس کی اردو دیکھی اور سنی آپ نے، پہلے اس کے اردو غلط بولنے پر نمبر کاٹیں۔'' ثوبان نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

''میری اب بھی اردو ساری کلاس میں سے اچھی ہے۔'' شوبی نے اترا کر جواب دیا۔

''میرے لیے تو ماما آپ کچھ اور کہتی تھیں، اردو قومی زبان ہے، ہم سب کو اسے سیکھنا چاہیے۔''

''وقت بدلتا جا رہا ہے ثوبی۔'' ماما نے شوبی کو پیار سے دیکھا۔

''وقت کہاں بدلا ہے ماما...... پہلے اسکول......پھر کالج...... اب آفس...... میرے دوست تو پھر بھی انجوائے کر لیتے ہیں۔'' ثوبی نے معصومیت سے کہا۔

''آج میری جس دوست کی برتھ ڈے ہے اسے میں بھابی بھی بنانے والی ہوں۔'' شوبی کا اطمینان کمال کا تھا۔

''ایکسکیوزمی مائی ڈیئر سسٹر...... میری پسند، میری مرضی، میری زندگی ہے۔'' ثوبان نے کہا۔

''کون ہے وہ...... میرے پرنس بھائی کے لیے۔'' شوبی بضد تھی۔

''لیکن میری لیڈی ڈائنا...... میری پسند کی ہوگی، شہزادی نہ ڈھونڈو تم اپنے لیے پرنس تلاش کرلو۔ اور دو منٹ میں تیار ہو جاؤ......ورنہ بھول جاؤ آج میں پرنس بننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''ماما، آپ بھی ساتھ چلیں ناں......اشرف کا بھی سنڈے ختم کرتے ہیں۔'' شوبی نے انجوائے کیا۔

''اوہ ظالم حکمران، جمہوریت کا مان ہے، تم بھی یاد رکھنا۔'' شوبی نے اخبار آنکھوں کے سامنے کیا۔

''اوہ...... پاپا ڈیر......'' شوبی نے بھائی کے سر پر پیار کیا اور بیڈروم کی طرف مڑ گئی۔

''آج رات مونا کے گھر ڈنر بھی ہے۔'' ماما نے کہا۔

ثوبان نے کانوں کو ہاتھ لگایا، ماما ناراض نہ ہو سکیں، چپت لگائی اور فضیلت کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی نکل گئیں۔

''آج کا پروگرام ڈن ہے ناں؟'' ثوبان نے کال ملائی اور یوں محفل برخاست ہوئی۔

☆☆☆

زندگی کب کیا روپ دکھاتی ہے، ثوبان احمد فاروقی نے ocean mall کے پارکنگ لاٹ میں برابر میں ہی پُراعتماد انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ایمن کو دیکھا...... اور پھر اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ آج یہاں کیوں اور کس لیے آیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی لڑکی اس کی زندگی میں آئی تھی...... اسے پریوں کی کہانیاں تو کسی نے بھی نہیں سنائی تھیں۔ ماما کے پاس فرصت نہیں ہوتی تھی۔ ہاں البتہ کبھی کبھی وہ خواب میں خود کو اڑتا ہوا ضرور دیکھتا تھا۔ اسی لیے وہ کبھی پائلٹ بننے کا پلان

کرتا...... اور کبھی سپر مین، اسپورٹس بائیک بھی اسی لیے اسے پسند تھی۔ وہ ایک لمحے میں آئی اور گزر گئی۔ لیکن دل کے کسی کونے میں...... کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے کبھی کالج یا یونیورسٹی میں بھی جو حرکت نہ کی تھی وہ کر ڈالی۔

گاڑی کا نمبر...... Ac-40500 A cm

گھر کا نمبر ”جیسمین ولا“

اور پھر اس نے پہلی بار...... انڈین فلمی گانا ڈاؤن لوڈ کیا...... اور اس نے بہت سے گانے skype پر اپنے دوستوں سے پوچھنے شروع کیے۔ ظاہر ہے شوبی نے تو مار ہی ڈالنا تھا ناں، ایسے میں فہد ہی اس کی یہ بات سمجھ سکتا تھا۔

وہ ہنستا ہی جا رہا تھا...... اور ثوبی کی بے بسی کا حال عیاں تھا۔

”جی جناب اور لگاؤ، ریکارڈ میرا!“ فہد خوش تھا۔

”یار فہد بہت چیپ لگتا ہے دوستی کرنا، یار میری ٹائپ نہیں وہ۔ ہیلو، آئی لو یو والی لیکن وہ میرے لیے زمین پر آئی ہے، اس پر مجھے یقین ہے۔“

”پری ہے وہ؟“ فہد فل ریکارڈ لگانے کے موڈ میں تھا۔

”ہے تو......“ ثوبان مسکرایا۔

”کون سا گانا سنے گا۔“ فہد ہمیشہ اس کی فرمائش پوری کرتا تھا۔

”بس گانا...... صرف میرے لیے ہونا چاہیے......“ ثوبان کا فطری مزاج حاکمانہ تھا۔

”خود لکھ لے۔“ فہد انجوائے کر رہا تھا۔

”شاید لکھ بھی ڈالوں۔“ ثوبان نے گٹار اٹھایا۔ جو فہد کے جانے کے بعد کونے میں پڑا تھا۔

”ٹرائے پلیز، انجوائے کر، اسے ہی محبت کہتے ہیں۔“ فہد نے کہا۔

”ہاں یار میں نے اس کا گھر بھی ڈھونڈ لیا ہے۔“ ثوبان نے معصومیت سے کہا۔

”بس پھر کیا مسئلہ ہے، ویسے بھی، تجھے کون سی نوکری ڈھونڈنی تھی۔“ فہد نے کہا۔

”یار فہد ایسے ہی بناتے ہیں۔“ ثوبان گنگنا رہا تھا۔ ”دیکھ وہ شاعری بنتی جا رہی ہے، میں شاعری کر رہا ہوں۔“ وہ خود بھی حیران تھا۔

”محبت اس کو کہتے ہیں
محبت اس کو کہتے ہیں
دنوں کو جگمگاتی ہے
کبھی یہ پاس آتی ہے
کبھی یہ روٹھ جاتی ہے
اگر یہ مل گئی یارا
یارا......“

رات کے بارہ بجے...... کمرا فہد اور ثوبان کے میوزک سے گونج رہا تھا۔

شوبی نے آواز سن کر بند کمرے کو حیرانی سے دیکھا لیکن نیند بہت آ رہی تھی...... ورنہ وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتی۔

☆☆☆

”دادو، آپ نے مجھے آج بریانی کی ریسپی بتانی ہے۔“ ایمن نے فریج سے گوشت نکالا۔

”آج آرام کر لو، کل سے پھر پڑھائی میں مصروف ہو جاؤ گی۔“

”تو...... پاپا نے کہا تھا ناں، اس بار وہ آئیں گے، تو بریانی کھائیں گے۔“ ایمن نے ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ کون سا ابھی آ رہا ہے، اس کی مصروفیت تو معلوم ہے تجھے، ابھی وہاں لیکچر دینے جانا ہے۔ ابھی اُس یونیورسٹی میں۔“ دادو نے پیار سے ایمن کی طرف دیکھا۔

”پاپا بہت کام کرتے ہیں، ان کو شادی کر لینی چاہیے، اب میں تو بڑی ہو گئی ہوں۔“ ایمن نے لاڈ سے کہا۔

”وہ تو آج بھی تمہاری ماں عائشہ کو یاد کرتا ہے، سب نے ہی کہا تھا لیکن اس نے تو کتابوں سے شادی کر لی ہے...... شاید۔“ دادو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ویسے دادو، شادی ایسے ہی بندے سے کرنی چاہیے تو اچھا لگے اتنا...... اتنا کہ پھر اس کے بعد کبھی بھی اچھا نہیں لگے۔“ ایمن مسکرائی۔

”ہاں بیٹا...... ہمارے زمانے میں بھی ایسی ہی محبتیں ہوتی تھیں، اب کی طرح نہیں...... آج محبت ہے، کل نفرت...... آنے والی کل میں اگر ہم یوں ہی نفرت کے بیج بوتے رہے تو پھر ہم نفرت کی فصل ہی کاٹیں گے۔“ دادو کا فلسفہ ایمن کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن وہ سر ہلاتی رہی۔ دادو سے باتیں کرنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔

نوید کے ریکارڈ تو ہر موقع پر بج سکتے تھے اب ذرا اس کے دل سے کوئی پوچھے...... جب یہ ہنس کے بے حال ہوتے...... اور نوید معصومیت سے مسکراتا رہ جاتا...... اسے کبھی حاضر جوابی نہیں آئی۔ وہ سب دوست جب کلفٹن کے ڈھابے پر چکن کڑاہی اور پالک پنیر کے مزے لینے نکلتے...... تو کچھ اور بھی تو تھا...... جو یہ احساس ہی نہیں ہونے دیتا تھا کہ نوید ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا...... جسے بہت اچھا لگتا ان سب کے ساتھ باتیں کرنا انجوائے کرنا لیکن اس کے والد صاحب کا حکم تھا، رات دیر تک باہر نہ رہنے کا اور یہ سب مل جاتے...... اس کا دل رک جانے کو بھی مچلتا رہتا...... کیونکہ یہاں کی محفل گھر کی خاموشی سے بہرحال زیادہ اچھی تھی۔ کیا کرتا...... ریکارڈ لگنا ہی سہنا پڑتا تھا۔

رضی کی آواز میں وہ مشہور گانا ان سب ہی کی فرمائش تھی۔ وہ جیسے ہی گانا شروع کرتا...... نوید اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا...... اور کبھی ثوبان کی طرف...... جس کی وجہ سے ابو اس کو اجازت دے دیتے تھے۔ اب کیا کرے کیا نہ کرے...... رضی کو بھی

سب بدل جائے گا

مجھ کو معلوم ہے اب زندگی بدل جائے گی......
میرا بچپن! میری سکھیاں! میری گڑیاں!
سب کہیں گم ہو جائیں گی......
بابل کا آنگن اب چھوٹ جائے گا
ماں کا ہر آنسو! دعا میں بدل جائے گا
بھائی چھپ کر روتے ہیں کہ ستائیں گے کسے؟
میں تو آنسو بھی چھپاتی ہوں کہ بھید کھل جائے گا
اک نیا دیس بسانا ہے مجھے اب......
جس میں ہر انداز، ہر روپ بدل جائے گا......
دل میں اپنا غم چھپائے!
آہوں! سسکیوں کو دبائے......
پیا ملن کی آس لگائے......
میرا شہزادہ مجھے لے جائے گا

شاعرہ: فائزہ شہزاد

انتخاب: ڈاکٹر سعدیہ شہزاد، حیات آباد پشاور

ہر گانا پورا ہی یاد ہوتا...... اب یہی دعا کرتا تھا کہ اللہ کرے رضی گانا بھول جائے اس کی آواز بیٹھ جائے۔

”دل...... دل پاکستان......
جان جان پاکستان
ایسی زمیں اور...... آسمان
اس کے سوا جانا کہاں
چلتی رہے...... یہ زندگی“

موبائل کی بیل نے نوید کی جان ہی نکال دی...... دل، دل پاکستان رضی کے لبوں پر اور نوید کے کان میں...... ابو کے جملے...... نوید کی شکل دیکھ کر تو ثوبان کو بھی آخر کار ترس آ ہی گیا اور یوں...... واپسی کا سفر...... بے حد طویل لگا...... سفر شاید تھکا دینے والا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

ثوبان آفس میں دل نہ لگا پا رہا تھا، یہ بات تو ماما محسوس کر رہی تھیں لیکن اب پچھلے کئی دنوں سے، وہ دیکھ بھی رہی تھیں، ثوبان احمد فاروقی کچھ کھویا سا تھا ورنہ وہ تو گھر میں داخل ہوتا تو فضیلت سے لے کر، رحمان بابا تک سے سب ہی سے بات کرتا تھا لیکن آج کچھ ایسا تھا جو بابا اور شوبی کو متوجہ کر رہا تھا۔

شوبی نے تو اس روز رو، رو کے آنکھیں سرخ کرلی تھیں، وہ تھی ہی ایسی...... محبت بھی شور مچا کے کرتی تھی اور ناراض ہونے پر بھی اسے شور مچانے کی عادت تھی...... بات کچھ بھی نہ تھی لیکن ثوبان نے دو دن سے اس سے بات نہیں کی تھی۔ آتے ہی کمرے میں بند ہوگیا تھا۔ وہ بھلا بھائی کی اس حرکت کو کیسے معاف کرتی۔

''فکر نہ کرو...... آج شام ثوبان سے بات کروں گی۔'' وہ ٹشو پیپر کا پورا ڈبا خالی کر چکی تھی۔

''مجھے تو اب بات ہی نہیں کرنی۔ وہ میرے بھائی نہیں ہیں۔'' شوبی نے سرخ ہوتی ناک کو مزید سرخ کیا۔

قدموں کی آہٹ نے شوبی کو اور بھی ناراض کردیا۔

''ہائے...... مائی ڈیر شوبی......'' ثوبان نے شوبی کے سر پر چپت لگائی۔ لیکن اس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

''ثوبان، اِدھر آؤ۔'' ماما نے ثوبی کی طرف دیکھا۔

''جی مائی ڈیر ماما جان، آپ سے، مجھے بھی ضروری بات کرنی ہے؟ چلیں پہلے کافی پلائیں۔'' ثوبی نے ماما کی گود میں سر رکھ دیا۔

''یار ماما جان، اگر میں آپ سے کہوں، مجھے شادی کرنی ہے، تو آپ کیا کہیں گی؟''

''کیا......؟ یہ پوچھ رہے ہو، بتا رہے ہو یا پھر......؟'' ماما نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا ناں ماما...... کہا تھا ناں۔'' شوبی نے پھر ٹشو پیپر نکالا۔

''یہ جو میری ڈیئر سسٹر ناراض ہے، یہ بھی خوش ہوجائے گی، مان جائے گی۔''

ثوبان احمد فاروقی پُر اعتماد تھا، ہمیشہ کی طرح لیکن یہ بائیک خریدنے کی، موبائل کا نیا ماڈل چینج کرنے کی بات تھی۔ اور نہ ہی ناردرن ایریا کے ٹور کی بات تھی، شریکِ حیات کی، شریکِ سفر کی، شریک زندگی کی بات تھی۔

مسز فاروقی کو یہ امید...... شاید نہیں تھی، وہ گنگ سی ہوگئیں۔

"are you serious or kidd ing" کس سے، کون ہے وہ؟ کس خاندان سے؟'' وہ تو، ثوبان احمد فاروقی سے خوف زدہ تھیں۔

''جو بھی ہے، وہی آپ کی، کون ہوتی ہے...... بہو ناں، شاید ڈاٹر اِن لاء بنے گی۔ یہ ایڈریس سینڈ کر رہا ہوں، اس پر جانا ہوگا۔'' ثوبان احمد فاروقی نے کہا اور چل دیا، اپنے کمرے کی طرف۔

شوبی کے آنسوؤں کے ساتھ، ساتھ اب بڑبڑاہٹ میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

''دیکھا ناں، ماما میں کہتی تھی ناں۔ "Soban is changd"

مسز فاروقی گم صم تھیں، یہ ایک دن، ایک لمحے یا ایک رات کی بات نہیں تھی۔ عمر بھر کی بات تھی بزبان امجد اسلام امجد...... عمر کی بات، دو گھڑی میں......

☆☆☆

مونا آنٹی اس موقع پر پہلی بار ثوبان احمد فاروقی کے دل کی زبان بن گئیں۔ حسنِ اتفاق کہ وہ اس اجنبی...... دل میں اترنے والی سے واقف تھیں...... اور جب ماما کو پتا چلا کہ وہ مسز تابش صدیقی کی پوتی ہے اور جس تقریب میں جانے سے، ثوبان اور شوبی

نے منع کیا تھا...... وہ اس روز وہاں موجود تھی تو انہیں یقین ہوگیا کہ یہ آسمانوں کا فیصلہ تھا، جس سے زمین پر رہنے والے انجان تھے...... بے خبر تھے۔

☆☆☆

وہ لمحہ جو عذاب تھا، نہایت خاموشی سے گلاب بن گیا...... فضا معطر ہوگئی اور دل میں رہنے والے، دل نشین، اب ہم نشیں بننے والے تھے۔ ثوبان احمد فاروقی، آج کا نوجوان تھا۔

محفلوں میں نمایاں رہنے پر فخر کرسکتا تھا۔ جہاں جاتا...... اپنی خوب صورتی...... امارت...... خوش گفتاری سے مرکزِ نگاہ بن جاتا...... تو ایمن کو بھی جیت لینا...... کون سا مشکل تھا۔ تب ہی تو ایمن، بے حد خوشی سے، ثوبان احمد فاروقی کی زندگی میں خوشبو بن کر داخل ہوگئی...... ایمن نے اکثر ہی دادو سے، امی، ابو کی دوستی اور محبت کی کہانی سنی تھی...... وہ حیران تھی...... اب لمحہ حیرانی پر مسرت حکمران تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا ہے زندگی تم ہو
اجنبی کیسے، اجنبی تم ہو

ثوبان احمد فاروقی کو ایمن سے مل کر...... ایسا لگا کہ اب کوئی بھی امتحان زندگی کے سفر میں، اس کا راستہ نہیں روک سکے گا، وہ کبھی موبائل پر اور کبھی ساحل پر گھنٹوں باتیں کرتے...... ایمن کو...... تو زیادہ تر دادو سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔ ایسی باتیں جو ثوبان کو حیران کردیتیں۔

ثوبان احمد فاروقی اور شوبی حیران تھے...... رشتوں کی مہک سے نا آشنا تھے ناں وہ...... کیونکہ اب ہم اکثر ہی اسکائپ کے دوست بن جاتے ہیں، کمرے میں خود کو محصور کرلیتے ہیں...... بند کمروں میں رات کی رانی کی مہک سے محروم ہوجاتے ہیں۔

اور پھر......

خواب پھر نہیں آتے
آنکھ پھر نہیں کھلتی
زندگی تو ملتی ہے
بندگی نہیں ملتی......

ثوبان کو ہر لمحہ اب ایمن کے لیے گفٹ کی تلاش رہتی...... وہ اسے وہی پرفیوم گفٹ کرتا تھا جو اسے پسند تھا۔ ایمن دیر تک ہنستی رہتی...... اور وہ اسے دیکھتا رہتا۔

''او مائی گاڈ...... یار، تم کتنا کھلکھلا کے ہنستی ہو۔'' ثوبان کو اسے روکنا پڑتا۔

ایمن کو ہنستے ہوئے، روکنا مشکل تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ثوبان کو فیصلہ کرتے ہوئے ٹوکنا۔

☆☆☆

''رحمان بابا...... آپ گاؤں کیوں جا رہے ہیں؟'' ثوبان کو جلدی میں یاد بھی رہتا تھا۔

''بس دو دن آنے جانے میں لگتے ہیں...... ہم ایک ماہ بعد نہیں تو پندرہ دن بعد واپس آجائے گا۔''

''میری بائیک کو آپ کی طرح کوئی صاف نہیں کرتا......'' ثوبان نے بائیک کی طرف دیکھا۔

''ہم نے احمد خان کو رکھا ہے ناں...... اچھا بندہ ہے۔'' رحمان بابا مسکرادیے۔

''بس آپ نے واپس آنا ہے۔'' اس نے آفس کے لیے قدم بڑھا دیے۔ آج کل آفس میں بہت کام تھا...... وہ ایمن کو بھی مل نہیں پا رہا تھا۔ وہ سمجھدار تھی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ راضی ہی رہے...... ناراض بھی تو ہوسکتی تھی۔ ثوبان کو اسے منانا، اس کا انتظار کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

اسے یہ ذمے داری اٹھانا بھی اچھا لگتا آخر ایمن کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب کو تکمیل تک بھی تو پہنچانا تھا...... اور مسز فاروقی اور شوبی کبھی حیران ہوتیں اور کبھی مسکرا دیتیں۔ وقت کی رفتار اپنی

تھی...... تیزی سے گزرتا جارہا تھا ان ہی... دنوں ایمن کے ابو، شفیق احمد صدیقی بھی کراچی آگئے تھے۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ موتا آنٹی بھی اب تو ثوبان احمد فاروقی کو اچھی لگنے لگی تھیں۔

ایمن کو اس کے کمرے کا رنگ پسند... نہیں آیا...... وہ مان گیا...... اور پھر ایک دن اسے شرارت سوجھی...... یہ مشورہ فہد کا تھا...... اسکائپ پر اب اس سے کم ہی بات ہوتی تھی لیکن وہ ناراض نہ ہوتا، اس کا خیال تھا...... وہ کہیں بھی ہوگا لیکن ثوبان احمد کو یاد رہے گا۔ یہ مان فہد کا غلط نہ تھا...... کبھی، کبھی روز ملاقات کو بھی...... ہم میں سے کچھ لوگ دوستی سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ ثوبان کا خیال تھا وہ سوچتا تھا...... اب جب اسے فہد یاد آتا تو وہ سوچتا۔ دوستی ...... عادت ہے کیا؟ دوستی ...... محبت ہے کیا؟ اب اسے معلوم ہوا تھا کہ فہد اس کا دوست تھا۔ پیار کرنے والا، تب ہی تو اس نے ایمن کی محبت کو آزمانے کا مشورہ قبول کرلیا۔

☆☆☆

”تم نے جوس منگالیا، میرا تو آئس کریم کھانے کا موڈ تھا۔“ ثوبان نے کہا۔

”لیکن مجھے جوس پسند ہے۔“ وہ مسکرائی۔

کیا کرتا اسے ایمن پسند تھی...... اور ایمن کا کہنا تھا۔

”میری ماما کی آواز بہت خوب صورت تھی، انہوں نے ایک راگ پر میرا نام رکھا تھا...... ایمن، امیر خسرو کا ایجاد کردہ راگ جو سرِ شام گایا جاتا ہے۔“ وہ جوس کے سپ لیتے ہوئے ایمان لوٹ لینے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

”یار، یہ ہسٹری، راگ، یہ سب باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔“ ثوبان کو کچھ خیال آیا۔

”تمہیں پتا ہے، تم سے پہلے، میری ایک محبت تھی، محبت تو عشق تھا شاید۔“ ثوبان کی آنکھوں میں خواب تھے۔

”کیا مطلب؟“ ایمن کو جوس کڑوا لگنے لگا۔

”ہاں ناں...... میں تو اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ملواؤں گا تمہیں بھی۔“

ایمن کا چہرہ دھواں، دھواں تھا...... اس نے جوس کا گلاس وہیں چھوڑ دیا۔

”میں آج بھول گئی، دادو کے ساتھ جانا تھا، وہ ان کی دوست کی ڈیتھ ہوگئی شاید۔“ اس کی مسکراہٹ میں درد تھا۔

”شاید؟“ ثوبان نے چوری پکڑی۔ ”وہ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے، ابھی دادو کی کال آئی تھی۔“ اسے جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں تھا۔

”ابھی......“ فہد کا خیال شیطان بنا ثوبان کے ساتھ تھا۔

”وہ جب تم گاڑی لاک کررہے تھے، اس وقت۔“ وہ جلدی میں تھی۔

”تم شاید...... برا مان گئیں...... میں دراصل تم سے ہر بات شیئر کرنا چاہتا تھا۔“ ثوبان احمد فاروقی کی جان تو شاید اس پری میں ہی تھی۔

”نو، نو کس بات پر؟“ ایمن کو تو سچی محبت کی تلاش تھی۔

”میں، مذاق کررہا تھا۔“ ثوبان گھبرا گیا۔

”ایسا مذاق......؟“ وہ بے یقین تھی۔

”کل ملواؤں گا اس سے، تمہیں بھی پسند آجائے گی، ہوسکتا ہے پھر تم بھی......“ فہد اس کے خیال میں تھا، ثوبان گڑبڑا رہا تھا۔

”لیکن مجھے جانا ہے۔“ ایمن کا دل نہیں لگا۔ وہ آئس کریم پارلر سے باہر نکلنے کو بے تاب بھی تھی۔

☆☆☆

”دادو، میں ثوبان سے شادی نہیں کرسکتی، وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”پگلی، مذاق کررہا تھا۔“ دادو مطمئن تھیں۔

”یہ کون سا مذاق ہے؟“ ایمن خفا تھی

”ابھی سمجھ نہیں آئے گا۔“ دادو مسکرا رہی تھیں۔

”آپ کو اس پر اتنا یقین کیسے ہے؟“ ایمن کو دادو پر یقین تھا۔

”ماں ہوں اور تم ابھی ننھی سی گڑیا......“ دادو نے ماتھے پر پیار کیا۔

”گڑیا تو اب بڑی ہوگئی ہے۔“ شفیق احمد بھی کمرے سے نکل آئے۔ ”بھئی آج تو کھانا باہر کھائیں گے، فاروقی صاحب سے بھی پوچھ لو، فون کرکے۔“ پاپا اسے اس وقت بالکل بھی اچھے نہیں لگے۔ اتنی اچانک، ایسا سرپرائز، بتایا بھی نہیں، وہ ناراض ہوگئی تھی۔

”نہیں پاپا، سر میں درد ہے۔“ ایمن نے اداسی سے کہا۔

”میرے نہیں ہے، چلو تیار ہوجاؤ۔“ شفیق احمد مسکرائے۔

”آپ لوگ چلے جائیں......“ وہ منہ بنا کر کمرے سے نکل گئی۔ لو بھلا پاپا بھی اجنبی ہوگئے ہیں۔ اس نے سوچا۔

☆☆☆

سیل فون آف تھا اور اسکائپ پر فہد کا ہنس، ہنس کر برا حال تھا۔

”تم بہت ہی فضول لگ رہے ہو، آئندہ کبھی تمہاری بات نہیں مانوں گا؟“ ثوبان چھوٹے بچے کی طرح سہما ہوا تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا......“ فہد نے اطمینان سے کہا۔

”اس کا سیل آف ہے۔“ ثوبان کا برا حال تھا

”اپنا بتا...... میٹر آف ہے، اب یاد کر، میرا ریکارڈ کیسے لگاتا تھا؟“ فہد ہنس رہا تھا۔

”ہاں یار...... محبت بہت ہی مشکل چیز ہے، سانس رکنے لگتی ہے۔ جب سوچتا ہوں، ایمن کی ناراضی کے بارے میں......“ ثوبان نے معصومیت سے اعتراف کیا۔ ”آج کل ویسے بھی میڈم کے والدِ بزرگوار آئے ہوئے ہیں، لفٹ ہی نہیں کروا رہیں۔“

☆☆☆

وہ صبح جاگنگ کے بعد، رحمان بابا سے کہہ کے صدیقی ولا کی طرف روانہ ہوگیا۔

”دیر مت کرنا یار، آج آفس میں کوئی آئے گا۔“ رحمان بابا کو سب کی خبر تھی۔

”پورے 8:am پر بیل کردینا، dont worry“ اسے رحمان بابا سے بھی انگلش بولنے کی عادت تھی۔

”اوکے، اوکے!“ رحمان بابا نے گیٹ بند کیا۔

اس نے بائیک کی اسپیڈ بڑھادی۔ ایمن کو بھی مارننگ واک کی عادت تھی۔

پھر اس نے منا ہی لیا...... محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

”تم بہت برے ہو۔“ وہ بائیک پر اسے دیکھ کر حیران تھی۔

”یہ تھی تمہاری پہلی محبت......؟“ ایمن کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”جی جناب!“ پرنس ثوبان احمد فاروقی کی جان میں جان آئی۔ بائیک اس کی محبت ہی تھی پھر وہ حسبِ عادت مسکراتی رہی...... اور وہ اسے دیکھتا رہا۔ اور ایک دم ہی وہ پلٹی۔

”تمہاری محبت میری بھی دوست ہے...... اب میں بھی تمہاری بائیک چلاؤں گی ٹھیک ہے؟ اور...... ہاں ثوبان مجھے بائیک چلانا سیکھنی ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”نہیں یار، لڑکیاں، بائیک نہیں چلاتیں۔“ ثوبان نے روک دیا۔

”آج تو کہہ دیا، آئندہ نہیں کہنا...... لڑکیاں بہت بہادر ہوتی ہیں، سب کام کرسکتی ہیں، مجھے سائیکل چلانی آتی ہے، گاڑی چلانی آتی ہے تو بائیک

بھلا کیوں نہیں چلا سکتی؟ ورنہ پھر تم بھی نہیں چلاؤ گے، کبھی بھی نہیں۔‘‘ اس نے فیصلہ دے دیا۔

’’آج نہیں، پھر کبھی۔‘‘ ثوبان کو پسند نہیں تھا۔

’’تم میری بات نہیں مان رہے ہو ناں...... میں......‘‘ وہ ناراض ہو رہی تھی۔

’’دیکھو ضد مت کرو......‘‘ ثوبان زچ ہو رہا تھا۔

’’اچھا صرف آج...... اور ابھی......‘‘ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خواہش تھی۔

خواہش...... ضد بن گئی تھی پھر وہ منع نہیں کر پایا لیکن امتحان باقی تھا۔ ثوبان کے دیکھتے ہی دیکھتے...... اچانک ہی ایمن نے بائیک کو گیئر میں ڈالا...... اور پھر ایمن اس کے سامنے ہوا میں اچھلی اور پھر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب ایمبولینس تھی...... ثوبان کے پاس سیل فون تھا...... لیکن ایسا لگ رہا تھا، وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے...... اور پھر لوگوں کا ہجوم...... اسپتال سڑک پر چلتے ہوئے ہارن کی آوازیں...... سب گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ صرف ایک لمحہ اور زندگی بدل رہی تھی۔ وقت اس کے ہاتھ میں نہیں تھا...... بے بسی تھی، ایسی بے بسی......؟

’’اف میرے خدایا۔‘‘

ایمن کی دادو سجدے میں تھیں...... اور ایمن آئی سی یو میں...... وہ سر جھکائے خاموش تھا...... اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کسی میں ہمت نہیں تھی، سوال جواب کی...... سب بے خبر تھے۔ 8:am کا وعدہ تھا...... رحمان بابا سے...... وہ لوٹ بھی آیا تھا لیکن گھر نہیں اسپتال کے یخ بستہ ماحول میں۔

’’دماغ پر چوٹ ہے، دعا کریں......‘‘ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے۔ ’’ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔‘‘ ڈاکٹر، سرجن خاموشی سے آئی سی یو کی طرف جا رہے تھے۔ چاروں طرف شور تھا...... لیکن کچھ تھا جو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

’’دعا کی ضرورت ہے، آپ دعا کریں۔‘‘

ثوبان احمد فاروقی کو بہ مشکل گھر لے کر آنے کے بعد سب ہی گھر سے اسپتال واپس لوٹ گئے تھے۔

شوبی نے لاؤنج میں خاموش بیٹھے ثوبان احمد فاروقی کے ہاتھ تھام لیے۔

’’بھائی...... چائے پی لیں...... یا کافی لاؤں......؟‘‘ شوبی رو رہی تھی۔

وہ خاموش ہارا ہوا بیٹھا تھا۔ شوبی بھی اس کے کندھے پر سر رکھے...... نیند کی آغوش میں تھی۔

رات کے بھیگتے ہوئے لمحے میں، ثوبان احمد فاروقی نے اپنے گھومتے ہوئے سر کو تھاما...... اور باہر کی جانب قدم اٹھتے چلے گئے۔ بے بسی سے آگہی کا سفر شروع ہو چکا تھا...... رات کے سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں تھیں...... شاید کہیں بارش برس رہی تھی۔ دور کہیں مینڈک کی ٹرٹراہٹ بھی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن ثوبان احمد فاروقی کے چاروں طرف...... کچھ تھا...... کوئی تھا...... رحمان بابا کو...... قدموں کی آہٹ کی پہچان تھی۔

وہ تہجد پڑھ کر تسبیح پڑھتے ہوئے اپنی چوکی سے گیٹ کو آہستہ سے کھولتے ہوئے اندر آئے تو سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھے ثوبان احمد فاروقی نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے رحمان بابا کے سرد ہوتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ وہ خاموشی کی زبان سمجھ رہے تھے۔

’’رحمان بابا! آپ تو اللہ میاں کے بہت قریب ہیں، مجھے دعا مانگنی ہی نہیں آتی، کبھی سیکھی ہی نہیں...... ضرورت ہی نہیں پڑی۔ دعا ہاں دعا...... مجھے سکھا دیں...... مجھے دعا مانگنا سکھا دیں، دعا مانگنا سکھا دیں۔‘‘

وہ جوان، ہینڈسم، مغرور اپنے انداز میں، زندگی کو دیکھنے والا ثوبان احمد فاروقی...... رو رہا تھا، سسک رہا تھا، مانگ رہا تھا اور وہ دینے والا، جو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے، وہ کسی معصوم کی محبت کو کیسے جدا کرتا...... نہیں کرتا...... ہرگز نہیں کرتا...... کبھی نہیں کرتا۔ ثوبان کا رُواں رُواں دعا بن گیا تھا۔



دلہن وہی جو سیّاں من بھائے

شیریں حیدر

پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوں تو معلوم ہوا ہے......کئی دن سے تو یہ تھکاوٹ محسوس ہی نہیں ہوئی تھی، اب سب کاموں سے فارغ ہوئی ہوں تو ابھی احساس ہوا ہے کہ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے......محسن ایک گھنٹا قبل مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں گیا ہے......یہ اس کا ہر رات کا معمول ہے، اس کے جانے کے بعد میں دل ہی دل میں اسے لاکھوں دعائیں دیتی ہوں، تسبیح پڑھتے،

پڑھتے...... اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ایک اور دن خیریت سے گزر گیا، جانے کب نیند کی وادیوں میں اتر جاتی ہوں مگر آج اس کے جانے کے بعد میرا معمول وہ نہ رہا، میں تسبیح پڑھنا اور اسے دعائیں دینا بھی بھول گئی ہوں۔ ایسا نہیں کہ اس نے میرے ساتھ کوئی گستاخی کی ہے یا اس سے کوئی غلطی سرزرد ہوئی ہے۔

اصل میں آج اس کی شادی ہوئی ہے اور وہ مجھے شب بخیر کہہ کر معمول کے مطابق اپنے کمرے میں گیا ہے تو میں اس لڑکی سے انجانا سا حسد محسوس کرنے لگی ہوں جو مجھ سے آدھی سے بھی کم عمر کی ہے...... مجھے لگا کہ وہ آج مجھے شب بخیر کہتے وقت ذرا جلدی میں تھا، میرے پاس بیٹھ کر میرے پاؤں دابتا تھا کبھی کبھار، آج وہ بھی بھول گیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج ماں کو کتنی تھکاوٹ ہوگی...... ممکن ہے کہ نہ بھی ہوا ایسا مگر مجھے ایک پھانس کی طرح یہ بات چبھ گئی اور اس کی نو بیاہتا بیوی کی طرف سے پہلا تیر دل میں گڑ گیا۔ یہ بھی نہیں کہ محسن اسے میری مرضی کے خلاف بیاہ لایا تھا، میں نے اسے خود پسند کیا تھا، بڑے ارمانوں سے اس کا رشتہ مانگنے سے لے کر بیاہ کر اپنے گھر لانے تک میرا دل اس کے لیے ارمانوں سے بھرا ہوا تھا مگر یہ کیا کہ جونہی اس کے قدم میری راجدھانی میں پڑے...... میرے دل میں اس کی طرف سے کھٹک سی پڑ گئی۔

رات جانے کس طرح کٹی...... صبح گھر میں اٹھا پٹخ شروع ہوئی تو میں انتظار کرنے لگی کہ کس وقت محسن آ کر مجھے سلام کرتا ہے۔ یوں بھی ہر روز وہ آٹھ بجے اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلتا ہے اور چھٹی کے دن تو اس کی صبح گیارہ بجے تک بھی نہیں ہوتی، وہ ناشتا اور دوپہر کا کھانا ملا کر کھاتا اور پھر دن بھر دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلا جاتا ہے۔ میں نے کلاک پر نگاہ ڈالی سات بج رہے تھے۔

”مردوں کی تو خیر ہے کم از کم عورت کو اتنی دیر تک نہیں سوتے رہنا چاہیے“ میں نے دل میں بہو کے لیے پہلی شکایت محسوس کی۔

میری نند زہرہ چائے بنا کر لے آئی تھی، ایک پلیٹ میں دو پاپے رکھے تھے، ایک اس نے خود اٹھا کر دوسرا میرے سامنے رکھ دیا۔

”بڑی پیاری بہو ہے بھابی آپ کی!“ اس نے تعریف کی تو میں نے دل میں چند لمحوں کے لیے فخر محسوس کیا مگر ساتھ ہی ایک احساس اس بات کا ہُوا کہ اب تک تو نئی بہو کو آ کر مجھے سلام کرنا چاہیے تھا مگر نند کے سامنے بھرم کیونکر گنواتی، مسکرا کر رہ گئی۔

چائے کا کپ آدھا بھی نہ ہوا تھا کہ میری بیٹی ندا میرے کمرے میں آئی، اس کی آنکھیں مندی، مندی تھیں...... نیند سے بھری اور چہرے پر بیزاری۔

”کیا بات ہے بیٹی، کیوں جاگ گئیں چندا؟“ میں نے بیٹی کو پیار سے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”جاگے تو وہ ماما جو سویا ہو...... مجھے تو بچے سونے نہیں دیتے اور اب جو وہ سوئے ہیں تو ان کے باپ کو خیال آ گیا ہے کہ ان کی اماں کو صبح سویرے چائے کی عادت ہے اور مجھے انہیں چائے بنا کر دینی چاہیے......“ اس کے چہرے، لہجے اور الفاظ میں بیزاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

”لے لو......“ میں نے غصے سے کہا۔ ”اس کی اماں کو چائے تو کوئی بھی دے سکتا ہے، صبح سے کام کرنے والیاں سب کو چائے دے رہی ہیں تو وہ مہارانی بھی ان سے چائے مانگ لیتیں...... تمہاری پھوپی ابھی میرے لیے خود چائے بنا کر لائی ہے، ان کو معلوم ہوتا تو ان کو بھی ایک کپ پکڑا دیتی...... تم جاؤ بیٹا، جا کر آرام کرو، تھکی ہوئی ہو...... میں انہیں چائے بھجوا دیتی ہوں...... اے زہرہ ذرا دیکھنا تو......“ میں نے نند کو حکم صادر کیا کہ میری سمدھن کو چائے بھجوا دے...... ”ساتھ

میں پاپے اور کیک بھی بھجوا دینا۔“

”وہ پاپے نہیں لیتیں چائے کے ساتھ، کوئی بسکٹ ہیں تو بھجوا دیں۔“ ندا کہہ کر جمائیاں لیتی ہوئی چلی گئی۔

☆☆☆

دس بج چکے تھے...... آدھا دن چڑھ آیا تھا، جب محسن کے ساتھ اس کی نئی نویلی دلہن کی آمد ہوئی، محسن نے حسبِ معمول مجھے گلے لگا کر پیار کیا اور بہو شرماتے، شرماتے سلام کر کے میرے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

”آپ ٹھیک ہیں اماں؟“ محسن نے پوچھا۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا تمہیں پوچھنے کا میری خیریت کی بابت......“ میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر بیٹھی۔ ”تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ ناشتے کے بعد تمہیں میری دوائیں نکال کر مجھے دینا ہوتی ہیں۔“ میں نے اپنی بات مکمل کر کے دونوں کے شرمندہ چہرے دیکھے تو عجیب نچ سا احساس ہوا...... ایک گھٹیا سی خوشی جو کسی کو پہلے وار میں ہی چت کر کے محسوس ہوتی ہے۔

”وہ اماں......“ محسن جواب دیتے سے ہکلا سا گیا۔ ”رات دیر تک تو سب کے ساتھ بیٹھے گپیں لگاتے رہے، نیند ہی نہ پوری ہوئی...... اور پھر آپ کو تو علم ہے کہ میں چھٹی کے دن کتنی دیر سے جاگتا ہوں‘ دوائیں اسی لیے میں نے رات کو ہی تیار کر دی تھیں، آپ کی دواؤں کے ڈبے میں اوپر ہی تو رکھی تھیں۔“

”بیٹا...... دواؤں کی تیاری تو ایک بہانہ ہوتا ہے، اصل میں تو مجھے عادت ہے صبح سویرے تمہیں دیکھنے کی، اس عادت کو بدلنا ہوگا اب مجھے......“ میں نے لہجے میں دنیا بھر کی مایوسی سمیٹی۔

”ارے نہیں اماں......“ محسن نے فوراً کہا۔ ”اس کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوگا......“ اس کے انداز میں شرمندگی تھی، بہو کا چہرہ بے تاثر لگ رہا تھا، اصل مایوسی اور شرمندگی تو میں اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی، چلو آہستہ ہی سہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی تو ناں۔

☆☆☆

بہو کے انتخاب کے وقت تو میری نظر میں کوئی سماتی ہی نہ تھی، دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کو میں اپنے بیٹے کا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی، کئی رشتے کروانے والیوں کو ناراض کیا کہ ان کا بتایا ہوا کوئی رشتہ میرے معیار پر اترتا ہی نہ تھا۔ دنوں یا مہینوں کی نہیں بلکہ سالوں کی محنت کی جستجو کے بعد میرا دل کہیں ٹھہرا تھا، یہ اور بات کہ تب تک محسن کے بالوں میں چاندی کے کئی تار نمایاں ہو کر چمکنے لگے تھے۔

ماریہ پر پہلی نظر پڑی اور پھر میری نظر اس کے چہرے سے ہٹی ہی نہیں...... میرے محسن کے ساتھ اس سے زیادہ اور کون جچ سکتا تھا۔ میرے ساتھ میری نند زہرہ بھی تھی، وہ ماریہ کی ماں سے بات چیت کر رہی تھی مگر میں اسے سننے یا اس میں دخل دینے کے بجائے اپنی پوری توجہ ماریہ پر دیے ہوئے تھی، اس سے پوچھ رہی تھی کہ کتنا پڑھی ہے اور اسے کن کن باتوں سے دلچسپی ہے...... ماریہ کو لکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے اس کا زیادہ وقت پڑھنے اور لکھنے میں ہی گزرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے گھر کے کام کاج سے کچھ زیادہ شغف نہ تھا، میں نے اس کے مخروطی انگلیوں والے، نفاست سے ترشے ہوئے ناخنوں کو دیکھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ خوب صورت ہاتھ باورچی خانے کے کام کرنے کو تو نہیں بنے...... ان ہاتھوں سے تو وہ...... اور پھر میرے گھر کا پورا نظام چل ہی تو رہا ہے، میں اس گھر میں ملکہ کی طرح رہتی ہوں، اس گھر میں ایک شہزادی کا اضافہ ہو جانے سے کتنا کام بڑھ جائے گا بھلا؟ اس وقت مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ ”مجھے پیاری سی بیٹی چاہیے...... کام کرنے والی نہیں، وہ میرے گھر میں

کافی ہیں۔" اس نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

رشتہ فائنل ہونے سے لے کر شادی کی تاریخ مقرر ہونے تک اور پھر شادی کا دن آ جانے تک میرے دل میں ماریہ کو دیکھنے کی ہڑک اٹھتی اور میں کسی نہ کسی بہانے وہاں جا پہنچتی، دل میں اس کی تصویر بساتی اور خوشی خوشی گھر لوٹتی، اس کی اماں انتہائی تپاک سے میرا استقبال کرتیں اور یوں سلوک روا رکھتیں جیسے کہ بہنوں سے رکھا جاتا ہے۔ میرے دل میں ماریہ کو دیکھ کر انوکھا پیار جاگتا، اسے اپنے ساتھ لگا کر میں اس کا ماتھا چومتی، اس کا قد مجھ سے قدرے لمبا تھا مگر وہ اپنا سر جھکا کر میرے ساتھ لپٹ جاتی، مجھے اس کی شکل میں اپنے گھر کا مستقبل نظر آتا...... ندا اور ماریہ میں بھی یقیناً دوستی ہو جائے گی، اکلوتی نند اور بھابی کے مابین تو بہنوں جیسا پیار ہوگا۔ چھوٹا سا خاندان تھا، وہ اکلوتی بیٹی تھی اور اس کے دو بھائی تھے جو شادی شدہ تھے اور دوسرے شہروں میں رہتے تھے۔

مجھے یہ نکتہ جہاں قابلِ اعتراض لگا کہ بہو کی سسرال اسی شہر میں نہ ہو، وہیں یہ تسلی بھی تھی کہ چلو ماں باپ کا دم ہی ہے، بھائیوں، بھابیوں اور ان کے بچوں کے یہاں ہونے سے وابستہ بکھیڑے تو نہیں ہوں گے ناں۔ یوں بھی میری نند کا کہنا ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی بیاہیں تو گویا خاندان بڑھتا ہے اور سمدھیوں میں بہن بھائیوں کے سے تعلقات بن جاتے ہیں...... خاندان کا ایک گھر بڑھ جاتا ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے تو میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا رشتہ کہیں ایسی جگہ طے ہو کہ اس کی سسرال اسی شہر میں ہو اور میرا اس سے ہر روز کا ملنا جلنا رہے۔

اب جب وہ میرے گھر میں آ گئی تھی تو مجھے اپنا راج پاٹ خطرے میں نظر آنے لگا تھا، میں ہمہ وقت کن انکھیوں سے اس کے اور محسن کے مابین میٹھی نظروں کے تبادلے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ محسن کافی کوشش کرتا کہ وہ مجھے وقت دے مگر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بٹ گیا تھا...... اس کی توجہ ماں اور بیوی کے درمیان تقسیم ہو گئی تھی، میں ہر چیز کی بلا شرکتِ غیرے مالک تھی اور اب مجھے اپنا بیٹا بانٹنا پڑ گیا تھا۔

چند دن گزرے تو مجھے لگا کہ اگر میں نے اسے کہیں مصروف نہ کیا تو ہر وقت محسن کی نظروں کے سامنے رہے گی، میں نے اسے کہا کہ وہ باورچی خانے میں ملازموں کے کام کی نگرانی کیا کرے جو پہلے میں خود کرتی تھی۔ اسے ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تھا، میں اسے میز پر کھانا کھاتے ہوئے بار بار محسن کے سامنے شرمندہ کرتی اور اسے بوکھلایا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی۔ محسن کے ماتھے پر ہلکا سا بل آتا مگر اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا اٹھتا، میں اپنی فتح کو شکست میں بدلتا ہوا محسوس کرتی۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی، اسے لکھنے کا وقت ملتا نہ پڑھنے کا، کئی بار وہ اس بات کو محسن کے سامنے دُہراتی بھی مگر اس کے انداز میں چھپا شکوہ صرف میں سمجھ پاتی تھی، محسن کو اندازہ نہیں تھا کہ میں اسے دن بھر کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی تھی، محسن کے آنے کے بعد اسے اپنی بیوی کی پوری توجہ چاہیے ہوتی تھی۔

میں ہاتھ میں تسبیح گھماتی ہوئی انہیں آپس میں بات چیت کرتے، ہنستے کھیلتے دیکھتی اور آنکھیں موند لیتی، کیسا ہو کہ میرا بیٹا پہلے کی طرح صرف مجھ سے ہی باتیں کرے...... میرے پاس بیٹھے مگر اسے تو بیوی کی صورت گویا ایک نیا کھلونا مل گیا تھا۔

"امی ذرا باہر گھومنے پھرنے جانے کا پروگرام ہے، کھانا باہر کھائیں گے، اس کے بعد ذرا دیر کے لیے اس کے امی ابو کی طرف جائیں گے، ممکن ہے کہ ماریہ وہاں ٹھہر جائے......" محسن میرے پاس لاؤنج میں بیٹھا تھا، ماریہ غالباً کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔

"پہلے بتاتے بیٹا...... اب تو مجھے تیار ہونے میں ذرا وقت لگے گا......" میں نے سستی سے کہا۔

"آپ سے اجازت لے رہا ہوں امی......" اس نے فوراً کہا۔ "صرف میں اور ماریہ جا رہے ہیں۔" محسن نے فوراً وضاحت پیش کی۔

"اجازت لینے اور اطلاع دینے میں کچھ فرق ہوتا ہے بیٹا......" میں نے بددل ہو کر کہا۔ "بہت شکریہ بیٹا کہ تم نے اطلاع دے دی مجھے ورنہ بغیر اطلاع کے بھی چلے جاتے تو میں کیا کر لیتی۔"

"ایسے کیوں کہہ رہی ہیں امی......" محسن نے فوراً میرا ہاتھ تھاما۔ "آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"میرے ٹھیک ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹا......" مجھے فوراً ترکیب سوجھ گئی۔ "تم لوگ جاؤ، میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔"

"کیا بات ہے امی، کیا ہوا ہے آپ کو؟" محسن فکرمندی سے پوچھ رہا تھا، مجھے دل میں ذرا تکلیف بھی ہوئی، ماریہ تیار ہو کر آ گئی تھی اور کھڑی دیکھ رہی تھی کہ محسن کس تشویش سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم جاؤ بیٹا......" میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ "میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"اس طرح خراب طبیعت کے ساتھ آپ کو کس طرح تنہا چھوڑ کر جا سکتے ہیں ہم؟" محسن نے کہا۔

"ارے بیٹا کیوں پریشان ہوتے ہو، ملازم ہیں ناں گھر پر......" میں نے لہجے کو کمزور کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی...... اس طرح ملازموں پر نہیں چھوڑ کر جا سکتا میں آپ کو۔"

"امی کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں......" ماریہ تیار کھڑی تھی اور محسن کے پریشان انداز پر اسے اپنا پروگرام ملتوی ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں ذرا خوش ہوئی کہ چلو، ان کے ساتھ ہی جاؤں گی، دل میں یہ وسوسہ بھی تھا کہ دونوں باہر جائیں گے تو جانے محسن اسے کہاں، کہاں گھمائے پھرائے گا۔ کیا کیا خرید کر

دے گا۔ میں دل میں سوچنے لگی کہ کون سے کپڑے پہن کر جاؤں گی۔

"نہیں...... ہم بھی نہیں جارہے ماریہ...... سوری!" محسن نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "تم تیار ہو تو میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ آئے......" ماریہ کا چہرہ اتر گیا، میری منصوبہ بندی کچھ اور تھی، میں تو چاہ رہی تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے کر جائیں اور محسن نے سرے سے پروگرام ہی بدل دیا تھا۔ ماریہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی، حالانکہ وہ اکیلے جانے پر متذبذب تھی اور چاہ رہی تھی کہ یا محسن اسے چھوڑنے جائے یا پھر وہ بھی اپنا پروگرام تبدیل کردے مگر محسن نے اسے بجھوا کر دم لیا کیونکہ وہ اپنے والدین کو کال کر کے بتا چکی تھی کہ وہ ان کی طرف آرہے ہیں۔

"میری طرف سے معذرت کردینا میری جان!" محسن نے اس کے نکلتے سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا، میں نے نظر چرالی، زمانہ کس قدر بدل گیا ہے۔

ہمارے وقتوں میں تو شوہر تخلیے میں بھی بیویوں کو جان نہیں کہتے تھے اور اب ہمارے بچے...... کوئی بے حیائی سی بے حیائی ہے۔ غضب خدا کا، بیویوں کے ہاتھ بھی تھام لیتے ہیں اب تو ماؤں کے سامنے۔ ماریہ کے جانے کے بعد وہ لوٹ کر واپس میرے پاس آکر نہیں بیٹھا بلکہ اپنے کمرے میں چلا گیا، میں تھوڑی دیر کے بعد دودھ گرم کر کے گلاس میں ڈال کر اس کے کمرے میں لے کر گئی، دروازے کے باہر رکی، وہ فون پر بات کررہا تھا۔

"تنہا کروٹیں بدل رہا ہوں جان...... نیند کہاں آنے والی ہے آج۔" میں واپس مڑنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے چھینک آگئی، میں گھبرا گئی اور فوراً کمرے میں داخل ہوگئی کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں باہر کھڑی سن گن لے رہی ہوں۔

"ارے امی!" وہ فوراً فون چھوڑ کر اٹھا۔

"آپ کیوں لے کر آئیں دودھ، کسی ملازم کو کہہ دیتیں، آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں......" اس نے کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تو طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا تھا۔

"بہتر ہوں بیٹا اب میں......" میں نے دودھ کا گلاس اس کی سائڈ ٹیبل پر رکھا، فون ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا، میں پلٹ کر کمرے سے نکلی تو وہ دوبارہ فون پر بات کررہا تھا اور کیا کہہ رہا تھا وہی اپنی بے تابیوں کی داستانیں۔ میرے دل میں کچھ زور سے چبھا، ذرا سا ترس بھی آیا بیٹے پر اور سوچا کہ اس سے کہوں کہ وہ بھی چلا جائے ورنہ ساری رات جاگتے اور فون پر اسے اپنی بے تابیوں کی داستانیں سناتے گزارے گا مگر میں نے اپنی اس کیفیت کو دل میں ہی دبا لیا۔ ہماری ساسیں کب ہمیں میکے جانے دیتی تھیں، جو عید شب برات بھی ہوتی تو دل میکے جانے کو ہمکتا مگر ان کا فرمان ہوتا کہ ان کی بیٹیاں میکے آرہی ہیں اس لیے بہوؤں میں سے کوئی بھی میکے نہیں جاسکتا۔ دل مچل کر رہ جاتا، ماں باپ کی یاد دل کو تڑپاتی مگر ہمارے دل کا حال کون جانتا تھا، جن کے دم سے اس گھر میں تھے وہ صبح اٹھنے کے بعد یوں منظر سے غائب ہوتے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، دن میں شوہر سے بات کرنے کا تصور ہی محال تھا اور رات جب تک معمولات سے فارغ ہو کر میں بستر پر لوٹتی تو انہیں سوئے ہوئے گھنٹوں بیت چکے ہوتے، ایسے وقت میں کون انہیں جگا کر دل کے دکھڑے روتا، الٹا نیند خراب ہونے پر ڈانٹ ہی پڑ جاتی۔

آج کل کے بیٹے بہویں تو سرِ شام ہی اپنے کمروں میں جا کر اپنی دنیاؤں میں گم ہوجاتے ہیں، یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ اپنے ماں باپ کو وقت دیں، ان سے کوئی دل کی بات کہہ سن لیں، کچھ ان کے مسائل کی بابت بھی پوچھیں۔ میری بہن کلثوم نے مجھے صحیح کہا تھا کہ بیٹوں کو ان کی شادی کے بعد زیادہ قابو میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ زن

مُرید ہوجاتے ہیں۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر میں نے شروع سے ہی ماریہ اور محسن کے درمیان وہ کردار ادا کرنا شروع کردیا تھا، میاں بیوی کے مابین پیار ہو، ٹھیک ہے مگر ایسا بھی نہ ہو کہ انہیں ایک دوسرے کے بغیر سانس لینا بھی محال لگے۔

اگلے روز بعد دوپہر محسن کی کال آگئی کہ وہ دفتر سے واپسی پر اپنی سسرال چلا گیا ہے اور رات کو دیر سے لوٹے گا۔ میرے سینے پر کچھ لوٹنے لگا، میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور خاموش ہوگئی، طبیعت کی خرابی کا بہانہ بھی نہ چل پاتا اب تو۔ رات میں ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی جب وہ دونوں دیر سے لوٹے......

"آپ سو جاتیں امی...... کیوں جاگ رہی ہیں ابھی تک؟" محسن نے آکر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں دیکھے بنا کب مجھے نیند آتی ہے بیٹا؟" میں نے اسے ساتھ لپٹا لیا اور زیرِ لب کچھ بڑبڑانے لگی۔

"بس امی شام کی چائے پی کر میں اور ماریہ نکلے، پہلے فلم دیکھی، پھر اسے ایک اچھے سے ہوٹل سے کھانا کھلا کر لایا ہوں...... راستے سے اسے گجرے بھی لے کر دیے ہیں، آپ یہ نہ کہیں کہ میں آپ کی بہو کا خیال نہیں رکھتا۔"

ماریہ بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھی اپنی کلائیوں میں پڑے گجروں سے کھیل رہی تھی، یہ اسے محسن نے اپنے ہاتھوں سے پہنائے ہوں گے، وہ ذرا سا شرما رہی تھی، میں خاموش رہی، میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

"ایک لمحے کو بھی تمہیں یہ خیال تو نہ آیا ہوگا بیٹا کہ بوڑھی اور بیمار ماں گھر پر انتظار کررہی ہوگی۔ شاید اس نے کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہیں......" میں نے سوچا کہ بیٹے اور بہو کو اس شرمندگی میں مبتلا کردوں گی کہ میں نے ان کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔

"کوئی بوڑھی ووڑھی نہیں ہیں آپ امی۔" محسن نے فوراً کہا۔ "اور ہاں میں نے کال کر کے بختو سے پوچھا تھا، اس نے بتایا کہ دن میں خالہ آگئی تھیں اور آپ ان کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھیں۔ پھر واپس لوٹ کر آپ دونوں بہنوں نے فیملی پزا آرڈر کیا تھا چلیں آپ ہماری غیر موجودگی میں بور نہیں ہوئیں آپ کی بہن جو آگئی تھیں۔ مجھے بھی اطمینان ہوگیا تھا۔ اسی لیے میں تمام وقت آپ کی خیریت پوچھتا رہا تھا، ماریہ بار بار آپ کی طرف سے فکرمند جو ہورہی تھی۔" میری بازی کا پانسہ بیٹے نے مجھ پر پلٹ دیا تھا۔

"بہت شکریہ ماریہ بیٹا......" میں نے دل مسوس کر اوپری دل سے کہا۔ "تم نے میری فکر کی بیٹا، میرے اپنے بیٹے کو تو میری فکر نہ تھی مگر تمہارے کہنے پر وہ میری خیریت اور مصروفیات چیک کرتا رہا۔"

دل ہی دل میں میں بختو کو کوس رہی تھی، اس کم بختو کو ساری رپورٹ دینے کی کیا ضرورت تھی، جھوٹی کہیں کی، پورا فیملی سائز پزا، کہاں کھایا ہم نے، کل آٹھ سلائس تھے جن میں سے دو میری بہن اپنے پوتوں کے لیے لے گئی تھی، باقی ہم نے جیسے تیسے کھائے تھے۔ ایک بار سوچا بھی کہ دو سلائس بچ گئے ہیں تو محسن اور ماریہ کے لیے رکھ دیتی ہوں مگر اس طرح میرا پزا کھانے کا راز افشا ہوجاتا، جو مجھے علم ہوتا کہ میرا بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو میں اپنے بیٹے کے لیے تو رکھ ہی لیتی کہ اسے پزا بہت پسند ہے۔

"جانے کیا کیا کھا کر آئے ہوں گے......" میں نے دل میں پھوٹنے والی ہمدردی کو دل ہی میں دبایا۔

☆☆☆

"لے لو...... تم بچے کے ساتھ اکیلی آگئی ہو، عادل میاں کو بھی ساتھ لے آتیں؟" میں نے ندا کے اکیلے چلے آنے پر اسے گھرکا۔ ایک تو وہ مشکل سے مہینے میں ایک بار ہفتے بھر کے لیے آپاتی تھی اوپر سے عادل میاں ساتھ نہ آتے تو بچوں کے ساتھ نیم پاگل ہوجاتی کہ بچوں کو باوا کا خبط تھا۔

"وہ کیسے آ سکتے ہیں امی!" ندا نے چڑ کر کہا۔ "ان کی امی دل کی مریضہ ہیں اور کسی بھی وقت انہیں کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے...... ویسے بھی میں چند دن سکون سے رہنے کے لیے آئی ہوں۔"

"تو کیا شوہر کی موجودگی میں تم بے سکون ہوتی ہو بیٹا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "شوہر کو یوں بے تھے بیل کی طرح تنہا نہ چھوڑ آیا کرو......"

"تنہا کہاں ہیں امی، گھر پر چوبیس گھنٹے ان کی اماں ہوتی ہیں۔" ندا نے بے پروائی سے کہا۔

"وہی تو اصل مسئلہ ہے بٹیا...... بہو کی عدم موجودگی میں تو اسے بہترین موقع مل جاتا ہے ناں بیٹے کو بہو کے خلاف بھڑکانے کا......اور پھر شوہر کو اپنا عادی بنا کر رکھنا چاہیے میری جان......"

"سونے دیں اماں ......" اس نے بیزاری سے کروٹ بدلی۔ "یہاں میں اپنی نیندیں پوری کرنے آئی ہوں......" وہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی، اس کا فون بجنے لگا، وہ گہری نیند میں تھی، میں نے اس کا فون اٹھا لیا کہ جانے کون کال کر رہا ہوگا۔

"کیا کر رہی ہو میری جان......سو رہی ہوگی، میری نیندیں اڑا کر؟" عادل تھا، میرے کان گرم ہو گئے، مجھے فون نہیں اٹھانا چاہیے تھا، میں نے کچھ بولے بنا فون بند کر دیا، ایک تو آج کل کے سارے لڑکے......دوبارہ کال کر کے ندا سے پوچھے گا کہ فون کس نے اٹھایا تھا، میں دل میں خوش بھی تھی کہ میرا داماد میری بیٹی کے بغیر اداس ہو گیا ہے...... مجھے علم تھا کہ ہر بار کی طرح اگلے ہی دن وہ پہنچ بھی جائے گا۔

وہ جاگی تو فون دیکھ کر اس نے پوچھا کہ عادل نے کیا کہا تھا۔

"وہ......وہ......" میں ہکلا گئی۔

"کیا ہوا امی، سب ٹھیک تو تھا ناں......ان کی امی!" وہ گھبرا گئی۔

"ہاں ہاں......سب ٹھیک ہی ہوگا......" میں نے اسے گویا ڈانٹا۔ "میں نے تو یونہی فون اٹھا لیا کہ جانے کس کا ہوگا، عادل تھا، اس نے سمجھا ہوگا کہ تم نے فون اٹھایا ہے......"

"تو...... ڈانٹ دیا ہوگا کہ فون فوراً کیوں نہیں اٹھایا؟" ندا فوراً بولی۔

"نہیں تو......اس نے تو کہا......" میں نے جھجکتے جھجکتے ندا کو بتایا۔

"تو کیا ہوا امی......اسی طرح بولا جاتا ہے آج کل تو، وہ تو اپنی امی کے سامنے بھی جانے مجھے کیا کیا کہتے ہیں، آپ کو عادت نہیں ہے ناں...اب بھائی کی شادی ہوئی ہے تو آپ بھی عادی ہو جائیں گی۔"

"ہمارے شوہر تو ہماری ساسوں کے سامنے ہم سے پانی کا گلاس تک نہ مانگتے تھے...... بلکہ دن میں تو کبھی آمنا سامنا تک نہ ہوتا اور جو ہوتا تو......یوں منہ موڑ کر جاتے تھے گویا ہمیں جانتے تک نہ ہوں۔"

"ہائیں؟" وہ حیرت سے چلائی۔ "وہ کیوں امی؟ کیا اس میں کوئی گناہ ہے کہ اپنی بیوی سے دن کی روشنی میں بات کر لو، اس کا ہاتھ تھام لو یا اس سے پیار سے بات کر لو؟"

"ارے بیٹا، میری ساس مرحومہ کہتی تھیں کہ دن کی روشنی میں اپنے شوہر کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھو، نہ ہی شوہر بیوی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے...... گناہ نہیں مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کتنا بے حیا ہے......"

"خدا کے لیے امی!" ندا نے میری طرف دیکھا۔ "کیا بات کر رہی ہیں، ہمارا مذہب تو مرد کو بیوی سے بہترین برتاؤ کرنے کو کہتا ہے اور کیا بہترین برتاؤ یہ ہوتا ہے کہ دن بھر بیوی کو پہچانو بھی نہیں اور رات کو...... امی خدا کے لیے اپنی سوچ کو بدلیں، کہیں بھائی اور بھابی کے معاملے میں ایسی تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کیجیے گا، اتنی اچھی، سلجھی اور پڑھی لکھی بھابی ہیں، ان پر اپنی ایسی فرسودہ سوچوں کو

ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔" میں صرف سن کر رہ گئی، اس پر عمل کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا، میری بہن جانتی تھی کہ بہوؤں کو کس طرح قابو میں اور اپنے انگوٹھے تلے رکھا جاتا ہے، یہ کل کی چھوکریاں کیا جانیں...... "میری سسرال میں تو سب اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ماریہ حسن میری بھابی ہیں، وہ سب تو اپنے جاننے والوں کو بتاتے ہیں کہ ماریہ حسن ان کے خاندان میں بیاہی گئی ہیں...... امی بڑا نام ہے بھابی کا۔ ہمارے خاندان کی عورتیں تو ان کی کہانیوں اور ناولوں کی دیوانی ہیں۔ آج کل کے سماجی مسائل اور ان کے حل پر ایسی کہانیاں لکھتی ہیں کہ پڑھ کر میرے جیسی عورتوں کی سوچ کے رخ بدل گئے ہیں، ایسی خداداد صلاحیت ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھنے والا سمجھے کہ جانے کتنی عمر اور کتنا تجربہ ہوگا۔" ندا اس کی تعریف میں قلابے ملا رہی تھی۔

"اس پر جانے ماریہ نے کیا پڑھ کر پھونکا ہے جو اس کی تعریفیں کر رہی ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"امی......" ندا نے مجھے یوں پکارا جیسے میں اس سے کہیں دور بیٹھی ہوئی ہوں۔

"ہوں؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"امی...... ماریہ بھابی بہت اچھی اور اچھے خیالات کی مالک ہیں، ان کی قدر کیجیے گا، تخلیق کار بڑے حساس ہوتے ہیں، ان کے اندر کا تخلیق کار نہ مار دیجیے گا۔ میں اگلے روز ہی ایک رسالے میں پڑھ رہی تھی کہ ان کے چاہنے والے ان کے کچھ عرصے سے کچھ بھی نہ لکھنے کی شکایت کر رہے ہیں اور وہ کچھ عرصہ تبھی سے ہے جب سے ان کی شادی ہوئی ہے، انہیں وقت اور اچھا ماحول دیں تاکہ وہ اچھی، اچھی کہانیاں لکھ سکیں۔"

"تو میں کیا اسے منع کر رہی ہوں؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "ہیر رانجھے کی داستانِ محبت لکھ لے جس کا آج کل وہ خود ایک کردار ہے۔"

"مجھے کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے امی......آپ تو ایسی سوچ والی نہیں لگتی تھیں۔" ندا نے ہنس کر کہا۔

"شرم کرو...... ماں کو کہہ رہی ہے کہ وہ بھابی سے جلتی ہے......"

"مذاق کر رہی ہوں امی۔" اس نے جھٹ سے میرے گال کا بوسہ لیا، ہم کہاں یوں بھی اپنی ماں کا بوسہ لے سکتے تھے، احترام اور خوف سے تو ماؤں سے کتنے ہی فاصلے پر رہتے تھے، اب تو بچے زیادہ ہی فری ہو گئے ہیں ماں باپ سے بھی، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

دن بھر ندا اور ماریہ آپس میں کھلکھلاتی ہنستی رہتیں، ماریہ اس کے بچوں کو نہلاتی دھلاتی، دونوں ٹی وی پر فلمیں، ڈرامے دیکھتیں، کبھی کچھ اور کبھی کچھ بنا کر کھاتیں......شام کو دونوں مل کر بچوں کو پارک لے کر جاتیں، کبھی شاپنگ کے لیے جاتیں، کبھی گھر پر پزا آرڈر کرتیں۔ میں ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی، ہماری نندیں جب آتیں تو ہمارے دلوں پر قیامت گزر جاتی۔ ہم دن گنتے کہ کب وہ لوٹ کر جائیں، اپنی چیزیں ان سے چھپا چھپا کر رکھتے، کبھی سر باندھ کر سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے، سب دیورانیاں، جیٹھانیاں ایک دوسرے پر ذمے داریاں ڈالنے کو کوشاں رہتیں، ان کے بچوں کو کچھ بنا کر کھلانا تو کجا، ہم تو اپنے بچوں کو بھی چھپا، چھپا کر کھلاتے اور بچوں کو سمجھا دیتے کہ کسی کے سامنے ذکر نہ کریں۔

ساس کی اپنی بیٹی کی طرف توجہ اور پیار، اسے اہمیت دینا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتا اور ہم انہیں زچ کرنے کو ہر طریقہ آزماتے، کیوں نہ کرتے، وہ بھی تو ہمیں رتی برابر عزت نہ دیتیں اور اپنے بیٹوں اور

بیٹیوں کے سامنے بے عزت کرتیں۔ ہمارے بچوں کے منہ سے چھین کر بھی نوالہ اپنے نواسوں اور نواسیوں کو دے دیتیں، اسی لیے ہمیں ان کی بیٹیوں کا آنا گراں گزرتا مگر یہ ماریہ کس مٹی کی بنی تھی کہ دن بھر ندا کے ساتھ سر جوڑے ہنستی رہتی۔ جس دن ندا نے جانے کا نام لیا، مجھ سے زیادہ ماریہ پیش پیش تھی ندا کی منتیں کرنے میں کہ وہ چند دن اور ٹھہر جاتی بلکہ اس کی ساس کو فوراً ٹیلی فون کر کے ان سے اجازت بھی لے لی اور اس کے شوہر کو بھی اطلاع کر دی کہ ندا ابھی یہیں رہے گی۔

محسن بارہا میرے سامنے ندا سے کہتا کہ اس نے آ کر اس کی بیوی کو اس سے چھین لیا تھا، جس پر وہ سب قہقہے لگا کر ہنستے، مجھے دل میں غصہ آتا کہ کیسی واہیات بات کر کے وہ فخر سے ہنستے تھے۔

''ابھی تو آپ کے بچوں نے آ کر آپ سے آپ کی بیوی کو چھین لیا ہے بھائی۔'' ندا کہتی تو میں اسے گھوری مار کر رہ جاتی۔ اوپر سے میں جو بھی کہتی، دل میں میں خوش ہوتی کہ نہ صرف یہ کہ میری بیٹی اور بہو کے بیچ بہنوں جیسا پیار اور سلوک تھا بلکہ یہ بھی کہ ندا کے یہاں ہونے سے محسن اور ماریہ کو اکٹھے گزارنے کو کم کم وقت ملتا تھا، محسن اس وقت میرے پاس بیٹھتا تھا جب وہ دونوں بچوں کو پارک لے کر جاتیں یا شاپنگ پر جاتیں تو بچے ہم دونوں کے پاس چھوڑ جاتیں۔

ایک دن اچانک عادل میاں پہنچ گئے، ندا کو لینے...... میں تو اداس کیا ہوتی، ندا کی رخصتی کے وقت ماریہ موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہی تھی، اس نے ندا، اس کے بچوں اور شوہر کے علاوہ اس کی ساس کے لیے بھی قیمتی تحائف ہمراہ کیے تھے، میں دل سے اس کی معترف ہوئی مگر اس کے سامنے اس کا اعتراف کیا نہ ہی بیٹے کے سامنے یہ کہا کہ بہو نے اچھا کیا اور میرا دل خوش ہوا۔ ''بہوؤں کو ایسی بات کہہ کر اسے اپنے سر پر سوار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں'' ...... یہ ایک اہم سبق تھا میری بہن کا۔

☆☆☆

ماریہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی، وہ باورچی خانے میں کھڑے کھڑے قد سے گر گئی، پڑوس میں ہی ڈاکٹر صاحب کا گھر تھا، انہیں بلوایا، انہوں نے ہی چیک کر کے بتایا کہ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا تھا، اسے اسپتال لے کر جانے کی ضرورت تھی، ایمبولینس بلوا کر انہوں نے مجھے کہا کہ میں محسن کو بھی بتا دوں، محسن اسپتال ہی پہنچا تھا، پریشانی اس کے چہرے پر میک اپ کی طرح تھپی ہوئی تھی، لگ رہا تھا کہ وہ مرد ہو کر بھی رو دے گا۔

''کیا ہوا اسے اچانک امی؟'' مجھے مل کر وہ تفکر سے پوچھ رہا تھا۔

''اچانک ہی کھڑے کھڑے گر گئی بیٹا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''مگر یہ اتنی گرمی میں وہاں کر کیا رہی تھی؟'' اس نے ہلکے سے غصے سے پوچھا۔

''کسی کام سے گئی ہو گی۔'' میں نے اسے بتانا ضروری نہ سمجھا کہ میں ہر روز اسے اس وقت وہاں ملازموں کی نگرانی کے فرض پر مامور کر دیتی ہوں۔

''کوئی بھی کام ہوتا تو ملازموں کو بتا کر وہ کروا سکتی ہے...... خود وہاں گرمی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ چڑ رہا تھا۔

''پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا، ابھی ڈاکٹر بتائیں گے کہ اس کا بلڈ پریشر اتنا کم کیوں ہو گیا ہے......'' میں نے اسے تسلی دی۔ اس کے کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے کو خون اور پیشاب کے نمونے بھجوا دیے گئے تھے اور اسے ڈرپ لگا دی گئی تھی، محسن اسے دیکھ رہا تھا مگر کچھ فاصلے سے اور میں اس کی بے چینی دیکھ رہی تھی، دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ اسی طرح پریشان ہوتا جو میں اس بیڈ پر ماریہ کی جگہ

لیٹی ہوتی...... انجانے میں، میں اپنا اور ماریہ کا موازنہ کرنے لگی، ماریہ میری سوچوں سے بے خبر، ہماری وہاں موجودگی سے بے نیاز، دواؤں کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھی۔ ہم وہیں کاریڈور میں بینچوں پر بیٹھ گئے اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے، جانے کون جوس لے آیا تھا، مجھے تو پیاس بھی لگ رہی تھی اور گرمی بھی، میں نے جوس پیا مگر محسن پیکٹ ہاتھ میں پکڑے یونہی بیٹھا تھا۔

''جوس پی لو بیٹا......'' میں نے کہا۔ ''گرمی بہت ہے......''

''جی نہیں چاہ رہا امی!'' اس نے مرے مرے انداز میں کہا۔ ندا کا جانے کتنی بار فون آ چکا تھا۔ پھر اس کا فون آ گیا تو وہ اس سے بات کرنے لگا۔

''بھلا یوں پریشان ہونے سے وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی بیٹا۔'' فون بند ہوا تو جوس کا پیکٹ میں نے پھر اس کی طرف بڑھایا، اس نے خاموشی سے پیکٹ پکڑ کر ایک گھونٹ لیا اور پھر اسے ہاتھ میں تھام لیا۔ کلثوم میری بہن اور اس کے بیٹا اور بہو بھی وہیں آ گئے تھے، جانے کتنے منٹ گزرے ہوں گے مگر لگ رہا تھا کہ صدیوں کا سفر ہم یوں خاموش بیٹھ کر طے کر رہے ہوں۔

''اب وہ ہوش میں ہیں......'' ڈاکٹر نے ہی اس سکوت کو توڑا تھا۔ ''تاہم انہیں سکون سے لیٹا رہنے دیں، ان کے ٹیسٹوں کی رپورٹس کا انتظار ہے، اگر چاہیں تو ان کے شوہر انہیں مل سکتے ہیں۔'' محسن نے اگلا لفظ نہ سنا اور تیز تیز قدموں سے اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں وہ زیرِ نگرانی تھی۔ کلثوم نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور میرے دل میں وہ نظر پھانس کی طرح چبھی، اس کی نظر میں میرے لیے اشارہ تھا کہ حالات میرے قابو میں نہ تھے۔ میں نظر چرا گئی، اس کے سامنے میرے بیٹے کی بے تابی نے دکھا دیا تھا کہ میری بہو نے میرے بیٹے کے دل میں گھر کر لیا تھا، اس کی بتائی ہوئی تراکیب پر عمل کرنے کے باوجود بھی۔

بہن اپنے بیٹے بہو سمیت واپس چلی گئی، مجھے بھی انہوں نے پیشکش کی کہ وہ گھر چھوڑ دیں گے مگر میں نہیں گئی، اس لیے بھی کہ میرا بیٹا یہ نہ سوچے کہ مجھے بہو کی فکر نہیں اور اس سے بڑھ کر اس لیے کہ وہ اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہے گا، گھر لوٹے گا نہ اسے میرا دھیان ہو گا۔ بہن کے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد ہی رپورٹیں آ گئی تھیں، رپورٹ سن کر تو میرا دل بھی خوشی سے اچھلنے لگا...... میں دادی بننے جا رہی تھی۔ محسن کا چہرہ چمک رہا تھا، میں ماریہ کو مبارک باد دینے اور ملنے گئی تو وہ بھی شرمائی سی مسکراہٹ کے ساتھ لیٹی ہوئی اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''لیٹی رہو بیٹا......'' میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''میں ندا کو بتاتا ہوں......'' محسن نے فوراً بہن کا نمبر ملایا اور جوش سے اسے بتانے لگا۔ شام تک ماریہ کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور ہم اسے لے کر گھر آ گئے۔ اب محسن نے اسے مکمل آرام کرنے کی سخت ہدایت کی، مجھے بھی اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں ماریہ کو پلنگ سے پاؤں بھی نیچے نہ رکھنے دوں۔

''واہ بھئی واہ...... ایک انوکھا بچہ پیدا کرنے جا رہی تھی وہ تو، ہم تو آخری وقت تک سارا کام کرتے تھے، وزن بھی ڈھوتے تھے مگر ان لڑکیوں کے نخرے ہی بہت ہیں آج کل......'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

بچے کی پیدائش تک کا سارا وقت محسن نے ماریہ کی دلداری میں اور میں نے پیچ و تاب کھاتے گزارا تھا، وہ مکمل بستر پر رہی، نزاکت کی انتہا ہے...... کبھی ذرا سا کام کر لیتی تو پھر بلڈ پریشر کم ہو جاتا اور چکر آنے لگتے۔ ندا اس دوران کئی بار آئی اور اس نے بھائی کے ساتھ جا جا کر آنے والے بچے کی خریداری

کی کیونکہ ماریہ نہیں جا سکتی تھی، ماریہ بستر پر ہوتی مگر وہ ملازموں پر حکم صادر کر کر کے دن بھر ندا کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بنواتی رہتی اور بچے بھی مامی کے گرد پروانوں کی طرح پھرتے تھے۔ میں نے تو ایسے شاہانہ انداز نہ دیکھے تھے، دل میں یہی سوچتی کہ میں لاکھ جتن کروں کہ بیٹے کا دل بہو کی طرف سے پھر جائے...... کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ آج کل کی لڑکیوں کے چلتر ہم سے کہیں بڑھ کر ہیں، وہ زیادہ تیز اور مردوں کو قابو کرنے کی ماہر ہیں۔

اتنے عرصے سے وہ اپنے میکے بھی نہ گئی تھی، اس کے اماں باوا ہی اسے ملنے کو آ جاتے تھے، ہاں ان دنوں اسے لکھنے پڑھنے کا کافی وقت مل گیا تھا، بستر پر پڑی وہ لکھتی رہتی، کبھی کاپیوں پر اور کبھی کمپیوٹر پر.... ندا خوشی کی انتہا پر تھی کہ وہ پھوپی بننے والی تھی، مجھے بھی خوشی تو تھی کہ میں دادی بنوں گی مگر ساتھ ہی ایک فکر میں مبتلا ہو جاتی کہ پہلے ماریہ نے آ کر میرے بیٹے کو بانٹ لیا تھا، اب اس کا بچہ آ جائے گا تو میں تو بالکل ہی پس منظر میں چلی جاؤں گی۔ ہر ماں اپنے بیٹے کی شادی کے بعد ایسے ہی خوف میں مبتلا ہو جاتی ہے یا یہ سب کچھ صرف میرے ساتھ ہی ہو رہا تھا۔ کلثوم نے بتایا تھا کہ اس نے بہو کے لیے سخت اصول مرتب کر رکھے تھے اور اس کے بیٹے کو سسرال جانے کی اجازت نہ تھی.... مگر اس کا سمدھیانہ تو دوسرے شہر میں تھا اس لیے وہ بیٹے کو کسی نہ کسی بہانے روک ہی لیتی تھی، سب سے آسان نسخہ بھی اس نے بتایا تھا کہ جب بہو میکے کا پروگرام بنائے تو اس وقت ماں کی بیماری ہی بیٹے کے قدم روک سکتی ہے...... میں نے اس ترکیب کو جب بھی آزمایا تھا، مجھ پر الٹی ہی پڑی تھی، اس وقت تو بیٹا رک جاتا مگر اگلے ہی روز وہ ماریہ کے تنہا جانے کی تلافی کر دیتا، سسرال جاتا، وہاں وقت گزارتا، ماریہ کو باہر کھانا کھلاتا، شاپنگ کرواتا اور خوشی، خوشی گھر لوٹتا۔ مائیں اپنے بیٹوں کو خوش دیکھ کر خوش تو ہوتی ہیں مگر اس وقت نہیں جب بیٹا بہو کے ساتھ خوش ہو۔

☆☆☆

اس دن صبح سے ہی من عجیب سا ہو رہا تھا...... نماز کے بعد بے چینی سی تھی، شہر کے خراب حالات کے باعث جب تک بیٹا دفتر سے جا کر خیریت سے لوٹ نہ آتا تھا تب تک میں اس کے لیے دعائیں کرتی رہتی، اس کے آتے ہی سکون کی سانس لیتی، میری تو وہی دولت ہے، اللہ اسے سلامتی دے۔ ناشتے کا وقت ہو رہا تھا مگر ابھی تک محسن کمرے سے نکلا تھا نہ ماریہ...... میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کھل گیا...... کمرے میں دونوں موجود نہ تھے۔

"اتنی صبح سویرے کہاں چلے گئے دونوں۔" میں حیرت میں مبتلا تھی کہ محسن کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک پرچہ نظر آیا، میں نے اسے اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی، عینک لگا کر اسے پڑھا۔

"امی جان! ماریہ کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تو ایمبولینس منگوا کر اسے اسپتال لے کر جانا پڑ رہا ہے، آپ کو جگانے کی کوشش کی مگر آپ نیند کی گولیوں کے باعث گہری نیند میں تھیں، ماریہ کی تکلیف بہت زیادہ ہے، میں فارغ ہوتے ہی آپ کو لینے آ جاؤں گا، آپ ناشتا کر کے تیار رہیں۔" میں نے پرچہ ایک طرف رکھا، عینک اتاری اور مرے مرے قدموں سے ٹیبل کی طرف چلی، تھوڑا سا ناشتا زہر مار کیا اور دوائیں کھا کر نہا کر کپڑے بدل کر تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

ندا کی کال آ گئی...... اس نے بتایا کہ اس کا رابطہ محسن سے تھا، ماریہ کی حالت خطرے میں تھی، اسی لیے غالباً محسن مجھے لینے نہیں آیا تھا، میں نے اپنے بھانجے کو کال کی تو اس نے بتایا کہ وہ پہلے ہی محسن کے ساتھ اسپتال میں تھا اور ماریہ کے

آپریشن کے سلسلے میں وہ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

"خالہ آپ گھر پر ہی رکیں اور بھابی کے لیے دعا کریں، یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں......"

میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

"اسے دیکھ لیتی بیٹا تو تسلی ہو جاتی......" میں نے کہا۔

"بھابی تو آئی سی یو میں ہیں اور ہمیں بھی ان کو دیکھنے یا ملنے کی اجازت نہیں......" اس نے کہا۔ "میں رانی سے کہتا ہوں امی کو آپ کے پاس چھوڑ دیتی ہے۔" اس نے اپنی بیوی کا کہا۔ میں نے فون بند کیا اور کلثوم کا انتظار کرنے لگی، ایک بار سوچا کہ محسن سے کال کر کے پوچھ لوں کہ میں ٹیکسی پر اسپتال پہنچ جاؤں مگر مجھے علم تھا کہ وہ مجھے اس کی اجازت نہ دیتا۔ چلو رانی آتی ہے تو اس سے پوچھتی ہوں اگر وہ فارغ ہو تو ہمیں اسپتال لے جائے، ان کے پہنچتے ہی میں نے رانی سے بات کی اور ہم دونوں بہنیں اس کے ساتھ اسپتال کی طرف چلیں۔ وہاں جا کر علم ہوا کہ ماریہ کو دیکھنے تک کی اجازت نہ تھی، محسن خون کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا، رانی نے کال کر کے اپنے شوہر کو بلوایا تو اس نے الٹا اسے ڈانٹ دیا کہ وہ ہمیں وہاں لے کر کیوں آئی تھی۔

تب ہم دونوں رانی کے ساتھ لوٹ آئے اور گھر آ کر میں نے ملازمہ سے چائے بنانے کا کہا، رانی چائے پی کر چلی گئی تو ہم دونوں بہنیں بیٹھ گئیں...... رانی نے ہی بتایا تھا کہ ڈاکٹروں کے مطابق ماریہ کی جان کو خطرہ تھا، بچے یا ماریہ میں سے کسی ایک کی جان بچانے کا فلمی سین نہ تھا کہ محسن کہتا، میری بیوی کو بچا لو...... دونوں جانوں کو خطرہ تھا۔

"چلو آپا پریشان ہونے کی کیا بات ہے......" کلثوم نے کہا۔ "اللہ کرم کرے گا، جانا تو ہر جان کو ہے ناں، دعا کرو سب اچھا ہو جائے، دونوں خیریت سے رہیں۔"

"میرا تو روم روم دعائیں کر رہا ہے کلثوم۔"
میں نے عادتاً ہی کہا، ورنہ جس طرح میرے دل سے ندا کے لیے دعائیں نکلتی تھیں، اس جذب سے میرے دل سے دعائیں نہیں نکل رہی تھیں، ہونٹوں سے......اوپری دل سے میں دعا کر رہی تھی، اس میں بھی یہی الفاظ تھے کہ اللہ میرے محسن کو ہر دکھ تکلیف سے بچائے۔ "محسن کا سوچتی ہوں تو پریشانی ہوتی ہے کہ وہ اس رنج کو کیسے سہہ پائے گا۔"

"ارے آپا......" کلثوم میرے قریب ہو بیٹھی۔ "بیوی کی موت کہنی کی چوٹ جیسی ہوتی ہے......مرد کا کیا ہے، پیاری سے پیاری بیوی کی موت کے صدمے سے لوٹ پوٹ ہو کر اگلے دن نئے بیاہ کو تیار ہوتا ہے......اور اپنے محسن کو کیا کمی ہے بھلا، ایسا پیارا سجیلا جوان ہے۔"

"خدا کا خوف کرو کلثوم......" میں نے اسے گھرکا۔ "اللہ نہ کرے جہاں تک تم سوچ رہی ہو۔"
مگر میرے دل کو اس کی کہی ہوئی بات کا پورا یقین تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر کلثوم کو سونے کی عادت تھی اس لیے وہ لیٹ گئی، محسن کی کال آئی اور اس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر تک گھر آئے گا، اسے کچھ چیزیں گھر سے لینا تھیں، ماریہ کو آپریشن تھیٹر میں لے گئے تھے اور ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ آپریشن سے پہلے چند گھنٹوں تک اسے کچھ انجکشن لگائے جانے تھے، اسی دوران وہ گھر کا چکر لگا لے گا۔ میں نے سوچا کہ جس طرح وہ کمرے کو چھوڑ کر گئے تھے اسی طرح وہ ہوگا، بختو کو بلایا اور ان کے کمرے کے بستر وغیرہ ٹھیک کرنے کو کہا، خود بھی میں اسی کمرے میں تھی تاکہ کوئی چیز ملازمہ دائیں سے بائیں نہ کر دے۔ میں بستر پر ان کے تکیے ٹھیک کر کے رکھ رہی تھی کہ تکیے تلے کچھ کاغذ نظر آئے، میں نے انہیں نکال کر سائڈ ٹیبل پر رکھا، غالباً رات کو ماریہ کوئی کہانی لکھ رہی تھی۔

بختو ان کا غسل خانہ صاف کر رہی تھی، میں اپنے کمرے سے عینک لے کر آئی کہ وہیں بیٹھ کر سورۂ مریم پڑھ لیتی ہوں، بیڈ کے ایک طرف رکھی کرسی پر میں بیٹھ گئی، یونہی نظر ان کاغذوں کے پلندے پر پڑی تو اوپر لکھا نظر آیا...... "دلہن وہی جو ساسو من بھائے......" میں انسانی فطرت کے عین مطابق تجسس سے مجبور ہو گئی اور بغور دیکھنے لگی......

"میری ساس......اچھا سوال ہے۔" غالباً اس سے کسی نے سوال پوچھا تھا یا کسی خواتین کے رسالے کے سروے کا سوالنامہ تھا۔ "میری ساس مجھے اپنی ماں سے بڑھ کر عزیز ہیں اور وہ بھی مجھے اپنی بیٹی سے بڑھ کر چاہتی ہیں، ان سے مجھے اس لیے پیار ہے کہ وہ انہوں نے اس شخص کو پیدا کیا، پالا پوسا جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے، انہوں نے اپنے بیٹے کو سکھایا کہ بیوی کو کس طرح پیار، محبت اور احترام دینا ہوتا ہے......وہ میری دنیا میں سب سے پیاری سہیلی کی بھی ماں ہیں۔ میرے والدین نے مجھے دنیا کے تمام والدین کی طرح ناز سے پالا تھا اور کئی معاملات میں سختی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے مجھ میں کئی کجیاں رہ گئی تھیں، مجھے کھانا پکانا آتا تھا نہ باورچی خانے میں جانے کا شوق مگر میری ساس نے میری شخصیت کی اس کمی کو دور کیا۔ وہ چاہتی ہوں گی کہ میں نہ صرف پیار سے بلکہ عام بیویوں کی طرح معدے کے راستے بھی ان کے بیٹے کے دل میں اتروں......ان کی طرف سے ہم پر نہ کوئی پابندی ہے نہ روک ٹوک، ہم گھوم پھر کر باہر کھانا کھا کر واپس لوٹتے ہیں تو وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہی ہوتی ہیں، ہمیں دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور منہ ہی منہ میں جانے کتنا کچھ پڑھ کر ہم پر پھونکتی ہیں......" (وہ میری غصے سے کی گئی بڑبڑاہٹوں کو کیا سمجھ بیٹھی تھی......اور میں اسے باورچی خانے میں کیوں بھیجتی تھی......اس کی مثبت سوچ)

"میں اپنے شوہر کو رات کو سوتے سے اٹھا کر ان کی

امی کے کمرے میں بھیجتی ہوں کہ وہ ان کا کمبل وغیرہ ٹھیک کر آئیں کیونکہ وہ نیند کی دوائیں لے کر سوتی ہیں تو کبھی کبھار ان کا کمبل سرک جاتا ہے۔ جب ممکن ہو تو خود میں یہ کام کرتی ہوں، اب میں خود بیڈ ریسٹ پر ہوں تو نہیں کر پاتی۔ میں چند دنوں میں خود ماں کے منصب پر فائز ہو جاؤں گی، میرے دل میں اپنے بچے کے ساتھ ساتھ اپنی ساس کے لیے بھی بچوں جیسی شفقت جاگتی ہے، ہمارے ماں باپ نے اس وقت ہماری دیکھ بھال کی ہوتی ہے جب ہم ناتواں اور وہ توانا ہوتے ہیں، اب وہ ناتواں اور ہم توانا ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی دیکھ بھال کریں۔

"وہ میرے شوہر کی ماں اور میرے بچے کی دادی ماں ہیں، مجھے ان سے بہت پیار ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں جب تک زندہ ہوں انہیں خود سے کوئی شکایت نہ ہونے دوں، اگر کبھی انہیں تکلیف ہو تو میں ان کی تکلیف بھی خود پر جھیل لوں......اللہ انہیں طویل عمر دے اور ہمارے سروں پر ان کا سایۂ شفقت قائم رکھے......ساس کو ماں یا نند کو بہن کہنے کی ضرورت کیوں ہو......ان رشتوں کو انہی ناموں سے رہنے دیں مگر ان رشتوں میں چھپی خوب صورتیوں کو تلاش کریں، ہم نئی نسل جہاں زندگی میں ہر نئے تجربے سے مستفید ہو رہے ہیں، وہاں ہم رشتوں اور رویوں کو نئی جہتیں کیوں نہ دیں؟ ایک ان پڑھ بہو یا ساس ہونے اور ایک پڑھی لکھی اور باشعور ساس یا بہو ہونے میں فرق تو نظر آنا چاہیے ناں۔

"بہوؤں کو نئی جگہ اپنے پیر جمانے کے لیے نرم مٹی جیسی فضا گھر میں دیں اور ساسوں کے لہجے کی سختی کا موازنہ اپنی ماؤں کے لہجے سے کریں تو بہت کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے۔ میری امی کہتی ہیں کہ شوہر سے محبت کا تقاضا ہے کہ اس سے وابستہ ہر شے سے محبت کی جائے، اسے اس کی ہر خوبی اور خامی سمیت چاہا جائے، اس کے ہر رشتے کا احترام کریں، جسم کا کوئی عضو درد میں ہو تو اس پر مرہم لگایا جاتا ہے، سوچا جاتا ہے کہ اس کا علاج کیسے ہو، بہو اچھی نہ ہو تو اسے اپنے پیار سے بدلنے کی کوشش کریں، ساس اچھی نہ ہو تو سوچیں کہ کل کو آپ نے بھی ساس بننا ہے، آج آپ ان کی ڈانٹ یا سختی کو برداشت کریں گی تو کل کو بہوؤں سے اس کی توقع کریں گی ناں......" اس کے لکھے گئے ان الفاظ کو پڑھتے، پڑھتے میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ بختو غسل خانہ صاف کر کے نکلی تو میں چونکی جیسے میں گہری نیند سے جاگی ہوں...... ہاں میں اب تک غفلت کی نیند ہی تو سو رہی تھی۔

کافی دیر ہو گئی تھی، ابھی تک محسن نہیں آیا تھا، میرا بچہ اکیلا ہی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے...... میں نے اسے کال کی تو وہ ابھی تک اسپتال ہی میں تھا...... "تم آئے نہیں بیٹا؟"

"امی......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" میرا لہجہ بھی بھرا گیا، میں خود کو کسی بری ترین خبر کے سننے کے لیے تیار نہیں پا رہی تھی۔

"ماریہ کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی...... اسے فوراً آپریشن کے لیے لے گئے ہیں......آپ دعا کریں امی، اسے آپ کی دعاؤں پر بہت اعتماد ہے، وہ ہمیشہ کہتی ہے کہ آپ اسے اس کی اپنی امی سے بڑھ کر پیار کرتی ہیں......آپ اپنی بیٹی کے لیے دعا کریں امی......" محسن رونے لگا تھا، میرا جوان بیٹا کمزور پڑ گیا تھا، اکیلا تھا، کوئی اور بھائی نہ تھا، بہن دوسرے شہر میں تھی، وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا، میں رونے لگی۔ کلثوم جاگ گئی، مجھے دلاسہ دینے لگی۔

"پریشان نہ ہو......کہا ہے ناں کہ ہمارے محسن کو بہت......"

"بس کرو کلثوم......" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے

روکا۔ ”حیا کر...... شرم کر، کیسے کیسے کلمے منہ سے نکال رہی ہے، میری بیٹی سے بڑھ کر پیاری ہے وہ مجھے...... اللہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرے اور خبردار جو اس کے بعد تم نے ایک بھی فضول بات کی...... ہو تو مجھ سے چھوٹی مگر فتنے کی جڑ ہو پوری......“ میں نے اپنا غصہ اس پر نکالا، اس نے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور اپنی بہو کو کال کر کے آنے کو کہا...... ”ہو سکے تو رانی کو اپنی بیٹی سمجھو، اتنی عزت کرتی ہے تمہاری، تمہارا حکم چلتا ہے ابھی تک گھر پر ورنہ تمہاری حرکتوں اور زبان کے آگے تو کوئی نہ ٹھہرے......“

”تمہیں لگتا ہے آپا......“ اس نے فوراً کہا۔ ”جو میں انگوٹھے تلے دبا کر نہ رکھوں تو یہ فتنی بہویں تو مجھے چین نہ لینے دیں۔“

”پیار سے زیر کرنا سیکھ کلثوم...... پیار کی زبان میں پتھر چیرنے کی صلاحیت ہوتی ہے......“ کلثوم کچھ سمجھ کر اور کچھ نہ سمجھتے ہوئی چلی گئی تو میں نے مصلیٰ بچھا لیا اور اللہ تعالیٰ سے اب تک کی گئی کوتاہیوں اور ناانصافیوں کی معافی مانگنے لگی، اپنے ذہن میں آنے والے شیطانی خیالات اور منصوبوں سے توبہ کی اور گڑگڑا گڑگڑا کر اس سے ماریہ کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

”میرے اللہ...... میرے بیٹے کا ساتھی سلامت رکھنا، اس کا گھر آباد رکھنا، میرے گھر کی رونق کو قائم رکھنا، میری بیٹی کی سہیلی کو نئی زندگی عطا فرما، اسے اس مشکل وقت میں تیرے سوا کسی کی مدد نہیں چاہیے...... میرے بیٹے کی زندگی کی بہار نہ چھیننا میرے مولا......“ جانے میں کتنی دیر اس جائے نماز پر بیٹھی اس کی زندگی کے سوا اور کچھ نہ مانگ رہی تھی، ٹیلی فون کی گھنٹی سے میں چونکی تو میرا گریبان تر تھا، آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں...... محسن کا فون تھا۔

”امی جان......“ اس کی آواز میں جوش تھا۔ ”مجھے پورا یقین ہے امی کہ سوائے آپ کے ماریہ کے لیے اور کوئی اتنے خشوع سے دعا نہیں کر سکتا کہ اس کی اس طرح شنوائی ہو، آپ کی دعائیں اللہ نے سن لی ہیں امی...... ماریہ اور آپ کا پوتا دونوں خیریت سے ہیں امی! میں آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہوں۔“

...... میں سجدے میں گر گئی، باقی کے آنسو بہا ڈالے، پھر دو نفل شکرانے کے پڑھے، تیار ہوئی اور محسن کے آتے ہی میں اس کے ساتھ چلی گئی راستے میں رک کر حاجت مندوں کو صدقہ دیا اور ماریہ کے لیے پھولوں کا گلدستہ لیا، آج مجھے پھولوں کی زبان میں اسے بتانا تھا کہ مجھے اس سے کتنا پیار ہے...... میں ڈر گئی تھی کہ وہ مجھ سے میرا بیٹا نہ چھین لے، اس کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نہ بھی ہوئی تو میرے دل سے اندیشہ نہ جاتا تھا کیونکہ ہمارے اردگرد کلثوم جیسے کئی لوگ ہوتے ہیں جو پیارے پیارے رشتوں میں دراڑیں ڈالتے ہیں...... راستے میں تھے کہ ندا کی کال آئی وہ مبارک باد دے رہی تھی اور جلد آنے کا کہہ رہی تھی۔

”میں آپ کو بتا نہیں سکتی امی کہ میں نے اس کے لیے کتنی دعائیں مانگی ہیں، کتنی منتیں، روزوں اور نفلوں کی مانی ہیں...... میری جان اس میں اٹکی ہوئی تھی......“ وہ کہہ رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ میری بیٹی اس کے پیار کو سمجھ گئی تھی، میں کیوں نہ سمجھی تھی، شاید اسی لیے کہ اب نئی نسل رشتوں اور رویّوں کو نئے ڈھنگ دینا چاہتی ہے...... ندا کہتی ہے کہ وہ بہت خوب صورت کہانیاں لکھتی ہے...... یقیناً وہ اپنی کہانیوں میں ایسے ہی اچھے پیغامات نئی نسل کو دیتی ہو گی، اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے، وہ اپنے پیار کی لو کو اپنی تحریروں سے چہار اطراف پھیلا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے طویل عمر دے...... میری عمر بھی اسے لگ جائے، میں نے دل سے اسے دعا دی، آج سے وہ میری من چاہی بہو بن گئی ہے!



آسیب

دلشاد نسیم

میں آپا سے پورے دس سال چھوٹی ہوں۔ اماں بتاتی ہیں ان دس سالوں میں ہمارے دو بھائی ہوئے مگر قسمت کی خرابی دونوں ہی کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اماں اب بھی کبھی کبھی ہاتھ مل کے ان کی یاد کو آنکھوں کے نمکین پانی سے تازہ کرتی رہتی ہیں۔ اماں یہ بھی کہتی ہیں یہ نمکین پانی ان دونوں کی یاد کو ہرا کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ ہرا رنگ زہر بن کر ان کو بے جان بھی کر دیتا ہے۔



''ہائے اماں......!'' مجھے ان پر ترس آنے لگتا لیکن میرے ننھے ذہن میں ایک اور بات کُلبلاتی اگر وہ زندہ رہتے تو اماں مجھے اور آپا کو تکے بھاؤ نہ پوچھتیں۔ اب بھی کون سا پوچھتی ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور جب سے ابا نے ان کا ساتھ چھوڑا ہم دونوں بہنیں اماں کو کانٹے کی طرح لگنے لگی تھیں جیسے انہوں نے اماں کو ہماری وجہ سے چھوڑا ہو۔ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ بات بڑوں میں ہو رہی تھی لیکن میں نے اتفاقاً ساری سن لی۔

''میرا کوئی وارث ہونا چاہیے۔'' ابا کہہ رہے تھے۔

''اللہ نے دو دیے تو تھے اس کی منظوری ہوتی تو رہتے۔'' اماں نے جواباً کہا۔

مگر ابا کو اللہ کی یہ منظوری نامنظور تھی تبھی کہنے لگے۔

''شرع کی اجازت ہے، میں دوسری شادی کرسکتا ہوں اور دونوں بیویوں کے برابر حقوق ادا کرسکتا ہوں تو......'' اماں نے پوری بات نہ سنی فوراً چیخ کر بولیں۔

''میری خدمت کا حق کیسے ادا کرو گے اور وہ ساری راتیں جو میں تمہارے بغیر گزاروں گی اور تم اس کے ساتھ......'' شدتِ غم سے ان کی سانس پھول رہی تھی لیکن وہ بولے گئیں۔ ''سلیم احمد یہ میرا حق ہے کاغذ کے پُرزے پر لکھا حق مہر نہیں کہ جس کو تم نے پہلی رات ادا کر کے مجھے خریدا تھا۔''

''نکاح تو میں کر چکا ہوں، تم قبول کرلو اور ساتھ رہ لو...... نہ رہنا چاہو تو تمہاری مرضی۔'' ابا تلملا کر بولے۔ میں نے اماں کو اس دن سے زیادہ بے کل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ساری رات اماں نے کروٹیں بدل بدل کر آنسو پونچھ پونچھ کر گزاری۔

''اماں، بھائی یاد آرہا ہے۔'' ایک بار میں نے اماں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی۔

اماں نے مجھے غصے سے گھورا۔ اماں ڈراؤنی لگ رہی تھیں، ان کی آنکھیں سرخ اور چہرہ دہشت ہو رہا تھا۔ میں نے ڈر کے آپا کو دیکھا ان کو تو خیر بالکل نیند نہیں آتی تھی۔ سب کہتے تھے ان کو اثر ہوگیا ہے۔ جوان اور خوب صورت بھی تو بہت تھیں۔ یہ لمبے بال اور آنکھیں...... ہائے اللہ ان کی آنکھیں جو ایک بار دیکھ لے تو...... پتا نہیں شہاب بھائی کیسے ان کی آنکھوں میں جھانک لیتے تھے اور بالکل نہیں گھبراتے۔ آپا کو بھی شرم آجاتی تھی۔ ابھی ایک ہفتے پہلے کی بات تھی، آپا نے چھت پر رکھے لکڑی کے جھولے پر جھولتے، جھولتے غالب کا کوئی شعر پڑھا۔ اس وقت شہاب بھائی مجھے انگریزی کے ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ سمجھا رہے تھے۔

کتاب پر نظر جمائے، جمائے بولے۔

''تم تو خود کسی شاعر کا خواب ہو۔ تم شعر نہ پڑھا کرو۔'' آپا اسی طرح آنکھیں موندے، موندے بولی۔

''توبہ...... میں کیوں ہوتی کسی شاعر کا خواب۔''

''نہیں یقین آتا تو آئینہ دیکھ لو۔ زلف گھٹا، آنکھیں پیمانہ، ہونٹ گلاب، گردن صراحی......'' آپا کھلکھلا کے ہنسیں۔

''اور دانت......؟'' میں نے معصومیت سے کہا۔ آپا نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

''یہ چھوٹی ساری باتیں سمجھتی ہے۔'' سمجھتی تو نہیں تھی خیر لیکن سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''اور دانت...... ناریل کی کچی گری جیسے چمکتے دمکتے اجلے گلابوں کی قید سے آزاد ہوں تو

اندھیرے میں روشنی ہوجائے۔''

''شہاب رضا شاعر جھوٹے ہوتے ہیں تم ایسا نہ کرنا۔'' آپا کے آخری جملے میں کچھ تھا شہاب بھائی کو چپ لگ گئی۔ آپا کی آنکھوں کے پیمانے چھلک گئے۔

اب سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ شہاب بھائی اور آپا گھنٹوں ساتھ ساتھ ہنستے کبھی چپ نہ ہوتے۔ نہ آپا کی آنکھوں میں آنسو آتے۔

گھر کا ماحول ویسے ہی کچھ کھنچا، کھنچا سا تھا۔ اس شام گڑ کے ساتھ بُھنے چنے کھاتے، کھاتے میں نے اماں سے کہہ دیا۔

''اماں، آپا خود سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔''

اماں نے ''آئے ہائے'' کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں...... روز کرتی ہیں۔''

''تو کہاں ہوتی ہے اس وقت؟''

''میں...... میں وہیں شہاب بھائی مجھے پڑھا رہے ہوتے ہیں اور آپا جھولے پر جھولتی...... آنکھیں بند کر کے کبھی شعر پڑھتی ہیں اور کبھی باتیں کرتی ہیں۔'' اماں کی بے قراری میں دو سو فیصد اضافہ ہوگیا تھا۔

''شہاب باتیں نہیں کرتا اس کے ساتھ؟'' سوال میں گہرا سوال تھا۔

''نہیں...... وہ تو مجھے پڑھا رہے ہوتے ہیں۔'' اماں پریشان ہوگئیں۔

''ہونہہ ہوا اس پر سایہ ہوگیا ہے۔''

''سایہ تو زمین پر ہوتا ہے اماں کسی کے اوپر کیسے ہوسکتا ہے؟''

''تم نہیں سمجھو گی۔''

پتا نہیں سب لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میں نہیں سمجھوں گی۔ آج نہیں تو کل میں ان ساری باتوں کو سمجھنے لگوں گی۔

جس دن ماموں یہاں آئے اس شام ابا کے ساتھ جو عورت آئی اسے تو ہم سب جانتے تھے۔ پتا نہیں اماں نے اتنا شور کیوں مچایا۔ اس سے پہلے جب بھی شہاب بھائی کی بہن شاہانہ ان کے ساتھ آئیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتیں۔ اماں نے رات ہی بیگ تیار کر کے رکھ دیے تھے۔ آپا نے پوچھا تو کہنے لگیں کل تمہارے ماموں آرہے ہیں ہمیں لینے۔

''مگر کیوں؟ میں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''مجھے ان کا گھر اچھا نہیں لگتا۔'' اماں نے زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر مارا۔ آپا نے مجھے اپنی گرم آغوش میں بھرلیا۔

''اماں شادی ابا نے کی ہے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہمیں کیوں بے گھر کررہی ہیں؟''

''تم دونوں ہی کا تو قصور ہے۔ آج اگر تم دونوں کی جگہ میرے بیٹے ہوتے تو سلیم کیوں دوسری شادی کرتا۔''

''اماں دوسری شادی کے لیے جواز جھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر ہماری جگہ بیٹے ہوتے تو ابا کسی اور بہانے شاہانہ خالہ کو گھر لے آتے۔''

''دیکھو ہم نے جانا تو ہے مجھ سے سوت کا دکھ سہا نہیں جائے گا۔'' اماں نے سخت لہجے میں فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

''طلاق کے ساتھ رہنے سے تو بہتر ہے عورت سوت کے ساتھ رہ لے۔'' میں پتا نہیں کیسے بول اٹھی۔

''بہت زبان چلتی ہے تیری۔'' اماں نے آپا کی محبت بھری آغوش سے نکال کر مجھے ایک طرف کیا اور آپا کی نشیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''شہاب کے ساتھ کیا معاملہ ہے تیرا؟''

''میرا......؟'' وہ گھبرا گئیں۔

''ہاں تیرا؟'' اماں کا تو بہ اتنا ڈراؤنا انداز تھا بولنے کا۔ ''مجھے چھوٹی نے سب بتادیا ہے۔''

"نہیں آپا...... میں نے اماں کو کچھ نہیں بتایا۔" مجھے آپا کی گود چھن جانے کا خوف لاحق ہوگیا۔ "میں نے کہا تھا آپا خود سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اماں قسم سے یہی کہا تھا۔"

"ہاں یہی کہا تھا۔" اماں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ آپا کے دل میں کوئی بات نہیں آئے گی اور ایسا ہی ہوا آپا جب کمرے سے نکلیں تو چپ تھیں اور شام کو ہم ابا کا بڑا سا سرکاری گھر اور بڑی سی کار چھوڑ کر ماموں میاں کی چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر ان کے گھر دوسرے شہر جا رہے تھے۔ آپا نے مجھے گود میں بٹھا رکھا تھا۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھیں اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی جا رہی تھیں مگر ان کی انگلیوں کی حرکت میں بے چینی تھی۔ میرا چھوٹا سا ذہن پریشان تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ آج آپا کے بال سہلانے سے مجھے مزہ کیوں نہیں آ رہا۔ نیند کیوں نہیں آ رہی۔ الجھن سی کیوں ہو رہی ہے۔

وہ رات بہت بھیانک تھی۔ کالی سیاہ رات جب ہم ماموں میاں کے گھر پہنچے۔ اسلام آباد خاموش شہر جہاں بڑے، بڑے درخت رات کی تاریکی میں پہاڑوں جیسے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ کمرے میں موت جیسی خاموشی تھی۔ ہم جس کمرے میں تھے وہاں کھڑکیوں پر پردے نہیں تھے ورنہ میں کب کا ان پہاڑوں کو پردوں کے پیچھے گم کر چکی ہوتی۔ آپا جاگ رہی تھیں۔

"آپا!" میں نے سرگوشی کی۔

"ہوں۔" وہ بولیں۔

"آپا ہم اپنے گھر کب جائیں گے؟"

"پتا نہیں۔"

"کیوں پتا نہیں؟"

"بس پتا نہیں۔"

"اماں کو کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں۔" انہوں نے کروٹ لے لی۔

"آپا......!" میں پھر بولی۔

"سو جاؤ اب، دیکھو کتنی رات ہو چکی ہے۔"

"آپا!" میں نے ان کی طرف رخ کیا۔ آپا نے مجھے دیکھا۔ مجھے اتنے اندھیرے میں بھی ان کی آنکھوں کے جگنو دکھائی دے گئے۔

"آپا طلاق کیا ہوتی ہے؟"

"ضروری نہیں ہے سارے سوالوں کو جواب مل جائیں۔"

"سوت......؟ اماں کہہ رہی تھیں کہ......"

"چھوٹی میں دوسرے کمرے میں چلی جاؤں گی اگر تنگ کیا تو۔" میں نے ان کے گرد بازو ڈال دیے۔ مجھے لگا وہ رو رہی ہیں۔ میرے اندر کتنے سوال ہلچل مچا رہے تھے مگر کیسے پوچھتی۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی جاتیں تو؟

ہمیں آئے تین ماہ اور بیس دن ہو گئے تھے۔ اماں بتا رہی تھیں کہ ابھی وہ کہیں نہیں جا سکتیں اور ساتھ رو پڑیں۔ بھلا اس میں رونے والی کیا بات تھی... بعد میں چلی جائیں گی۔ اس رات اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر جب میں چاند کو دیکھ رہی تھی تو مجھے لگا اس کے اندر کوئی رہتا ہے۔ کون رہتا ہوگا اور ایک دو نہیں کئی لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے شاید بڑھیا ہی رہتی ہو جو...... آپا سے ڈرتے، ڈرتے میں نے پوچھا تو کہنے لگیں۔

"چاند میں وہ لوگ رہتے ہیں جو محبت میں جان دے دیتے ہیں۔" آپا کی باتیں آج کل مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہاب بھائی اچانک ہمارے گھر آ گئے۔ اماں نے ان کو دیکھ کر وہ واویلا مچایا کہ توبہ ہی بھلی۔ آپا کو لے کر کمرے میں بند ہو گئیں۔

"یہ کیا لینے آیا ہے یہاں؟" جانے آپا نے کیا کہا اماں پھر چیخیں۔

"اسے کہو یہاں سے چلا جائے...... نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"صبح چلا جائے گا۔" آپا منمنائیں۔

اور ایسا ہی ہوا وہ صبح سویرے ہی چلے گئے لیکن مجھے آج تک یاد ہے رات جانے کس پہر اماں سوئی ہوں گی وہ دبے قدموں آئے، آپا جاگ رہی تھیں۔ میرا تو جیسے ان کے ساتھ تار جڑا ہوا تھا وہ اٹھیں تو میں بھی اٹھ گئی۔ شہاب بھائی کو کمرے میں دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری مندی آنکھوں نے دیکھا شہاب بھائی باہر لان کی طرف کھلنے والی لکڑی کے پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہیں اور آپا ان کے کندھے سے لگی رو رہی ہیں۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"مجبور ہو گیا تھا، تمہاری یاد میرے سینے میں پھانس کی طرح چبھ رہی تھی۔ تمہیں بھلا نہیں پا رہا تھا، لگتا تھا نہ دیکھا تو دم گھٹ جائے گا۔" شاید آپا رو رہی تھیں۔

"تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے؟ تمہیں دیکھ کر میں ڈر گیا ہوں ہنستی ہو نہ بولتی ہو۔"

"محبت کا آسیب جان نہیں چھوڑتا۔" آپا نے آہ بھری اور کہا۔

"سنو اب جاؤ...... چھوٹی جاگ جائے گی، بچی ہے جانے کیا سوچے۔"

"کیا تم میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

"چل سکتی ہوں مگر اماں کا رشتوں پر سے اعتبار اٹھ جائے گا پہلے ابا...... اور اب میں...... وہ تو بن موت مر جائیں گی۔"

"مجھے بتا دو میں اتنا بہادر کیسے ہو جاؤں کیسے تمہیں بھولوں؟"

"زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے کو بھولنا ضروری نہیں...... شاید کبھی اماں کا غصہ ختم ہو جائے، ان کو ترس آ جائے پھر شاید ہم مل سکیں۔"

رات آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ میں جاگ کر بھی سوتی رہی۔ کروٹ بھی نہیں لی شہاب بھائی چلے گئے۔ آپا نے وہ رات کھڑکی سے لگے لگے گزار دی۔

صبح ان کو بہت تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ ممانی کہنے لگیں ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ ماموں میاں نے ڈاکٹر بدل، بدل کر دیکھا بخار چلا گیا مگر آپا کو کھنڈر کر گیا۔

میں اس ایک رات میں سیانی ہو گئی۔ آپا کا شہاب بھائی کے گلے لگ کر رونا اور ان کا التجا کرنا کہ ساتھ چلو میں نے کئی بار آپا کی حالت دیکھ کر ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے تھے۔

ماموں میاں نے اپنے تئیں ایک دانشمندی کا فیصلہ کیا۔ اماں اور ماموں میاں ایک بند کمرے میں جانے کیا میٹنگ کرتے رہے۔ باہر آئے تو اماں نے خوشی سے آپا کو گلے لگایا اور بولیں۔

"مبارک ہو، یوسف نے اپنے حامد کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔"

"حامد بھائی؟" آپا کے بجائے میں بولی۔ "وہ ہیں میری آپا کے قابل...؟ چھی اماں!"

"کیوں، کیا برائی ہے اس میں؟"

"آپا سے چار سال بڑے ہیں، یہ بڑی توند ہے ان کی اور...... دانت دیکھے ہیں ان کے پان کھا کھا کر......"

اماں کا زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر پڑا۔

"تیری حسین آپا جیسوں کی شادی نہیں ہوا کرتی سمجھی تو۔ شکر کر یوسف نے ترس کھا لیا ہے۔"

مجھے بہت رونا آ رہا تھا۔

"آپا آپ انکار کر دیں...... آپ کو میری قسم۔"

سسرال اک عذاب ....؟

ہمارے ہاں نوجوان نسل میں پسند کی شادی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے لیکن لڑکے پر جان دینے والی لڑکی جو سارے زمانے کو ٹھکرا کے لڑکے کو اپناتی ہے وہی اپنی سسرال کو اتنے پیار سے کیوں نہیں اپناتی۔ اصل میں ہمارے معاشرے میں سسرال اِک خوفناک جہنم کا نام ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کی ماں کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکی الگ ہوجائے اور لڑکا پوری طرح بیٹی کے قبضے میں آجائے اور غلطی یہی ہوتی ہے بیٹی کو سبق دینے والی ماں کی بہو یہ حرکت کرے تو اسے بہت برا لگتا ہے اور وہ یہ سوچ کر کہ بہو اس کا بیٹا الگ کررہی ہے تڑپ جاتی ہے لیکن بیٹی یہ حرکت کرے تو ٹھیک اور بہو کرے تو غلط...... کیوں؟ سسرال تو لڑکی کا نیا گھر نئی منزل نئی زندگی کی طرف پہلا قدم ہے یہاں آکے تو وہ بہت سے نئے رشتوں کو سمجھتی ہے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہی وہ پل ہے جس میں لڑکی کو مثبت رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے آنے والے کل کو اچھا بنا سکے اور یہ رہنمائی سسرال اور میکے دونوں کی طرف سے ملنی چاہیے۔

بہت ضروری ہے لڑکی کے لیے کہ وہ گھر کے ماحول کو جلد سمجھ جائے۔ وہ شادی کے بعد نئے گھر میں آچکی ہے اور زندگی بدلنے لگی ہے پہلی بات لڑکی کے لئے وہ سسرال کو سسرال نہیں بلکہ اپنا گھر سمجھے، ساس کو

آپا نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”آپا وہ بالکل اچھے نہیں ہیں، بالکل نہیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے چھوٹی؟“

شادی طے ہوگئی۔ ممانی خوش تھیں۔ حامد بھائی کی تو باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ ماموں میاں بھی خوش تھے ان کے بیٹے کا گھر بسنے والا تھا اور لڑکی بھی کیا ملی تھی شہزادی اور خود شہزادی...... روز بروز کنیز ہوتی جارہی تھی۔ چلتیں تو ایسا لگتا پاؤں زمین پر نہیں کہیں فضا میں پڑ رہے ہیں۔ بات کرتیں تو لگتا سسکیاں لے رہی ہوں۔ اماں کہتی تھیں آسیب ہے آسیب۔

”حامد بھائی کی ڈراؤنی شکل دیکھ کر ہی مرجائے گا شاید۔“ میں سوچتی۔

مایوں والے دن آپا بہت حسین لگ رہی تھیں چہرے کا رنگ کپڑوں جیسا ہو رہا تھا۔ سرخ پھولوں کا گہنا، ابٹن لگائے، نازک گلابی ہاتھوں پر مہندی ایسی بچ رہی تھی جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھتی جاؤں۔

آپا نے بہت لجاجت سے مجھ سے پہلی بار ایک فرمائش کی۔

”چھوٹی فون کرنا ہے ذرا بات کرادے میری۔“ میں پھلانگتی ہوئی گئی اور درمیانے گول کمرے سے تار کھینچتی فون آپا کے ہاتھ میں لاکر دیا تو لگا دنیا میں اس سے بڑی سعادت مندی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

”اب تو جا۔“ انہوں نے کہا اور میں باہر آگئی۔

جانے کیسے اماں کی نظر پڑگئی تار کو دیکھتی، دیکھتی کمرے میں آگئیں میں ان کے پیچھے تھی۔

”خدا حافظ۔“ آپا نے کہا اور فون بند کردیا۔ پتا نہیں کس سے بات کی تھی۔ اماں نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے۔ وہ آپا کو فون کرتا دیکھ چکی تھیں۔ میں بہت حیران ہوئی کہ انہوں نے آپا سے کوئی سوال

ماں جیسی عزت دے اور نندوں کو چھوٹی بہن سمجھے۔ گھریلو امور میں پہلے دن سے دلچسپی ظاہر کرے کیونکہ آگے جاکے گھریلو ذمے داریاں اس نے ہی تو سنبھالنی ہیں۔ شوہر کی آمدنی کو فضول ضائع نہ کرے جب بھی شوہر کے ہمراہ باہر جانے کا ارادہ ہو تو ساس کو ضرور بتائے۔

دوسری طرف ساس کو چاہیے کہ وہ بہو کو بیٹی کی نظر سے دیکھے۔ شروع میں اسے گھر کا ماحول سمجھنے کا وقت دے اگر بہو شروع کے دنوں میں دیر تک سو بھی رہی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں پر اگر آپ کو یہ بات ناپسند ہے تو بڑے پیار سے اسے سمجھادیں اور ساتھ ٹائم بھی دیں کہ وہ اپنی عادت ٹھیک کرے۔ اک دم سے بہت ساری ذمے داریاں بہو پر مت ڈالیں اگر آپ کا بیٹا بیوی کے لیے کچھ لاتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ حسد کرنے کے بجائے خوش رہیں۔ آگے جاکے تو مصروفیات اور ذمے داریاں ہی رہ جاتی ہیں اس لیے آپ اپنے بیٹے اور بہو کو خوب گھومنے پھرنے کی اجازت دیں۔ جب آپ یہ چاہتی ہیں کہ بہو آپ کو ماں جیسا مقام وعزت دے تو آپ بھی بہو کو بیٹی کی جگہ دیکھیں۔ بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کریں اور اپنے گھر کو جنت بنائیں۔

مرسلہ: انعم وقار حیدر، لاہور

کیوں نہیں کیا۔

اگلی صبح نکاح تھا۔ آپا آنکھیں کھولے چھت کو تک رہی تھیں کہ اماں کمرے میں آگئیں ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میں نے سوچا شکر ہے اماں کو آپا پر پیار تو آیا۔

”مہرو...... جاگ رہی ہو؟“ انہوں نے کہا۔

”جی!“ آپا اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کل تمہارا نکاح ہے۔“

”جی۔“ وہ ہی سسکی گونجی۔

”میں چاہتی ہوں تم جب یہاں سے رخصت ہوکر سسرال جاؤ تو تمہارے دماغ کے کسی کونے میں شہاب بدذات کا سایہ نہ ہو۔“

”یہ میرے اختیار میں نہیں۔“ انہوں نے بےبس سے لہجے میں کہا۔

”تم میری ناک کٹوانا چاہتی ہو؟“

”اماں سوچ پر پہرہ کیسے لگ سکتا ہے، نہیں لگتا اماں۔“

”تمہارے سامنے دو راستے ہیں شہاب کا آسیب اتار کر یوسف کی ہوجاؤ یا یہ پی لو۔“

”یہ کیا ہے؟“

”دودھ...... زہر ہے اس میں۔“

اور شاید اماں کو شک بھی نہ ہوگا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ آپا ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں پورے کا پورا دودھ پی جائیں گی۔ ایک لمحے میں...... ایک سانس میں اور پھر اگلی سانس بے قابو ہوگئی۔ وہ تو پہلے دعاؤں کے سہارے جی رہی تھیں ایسی دوا ملی کہ سہارے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اماں نے سینے پر دو ہتڑ مارے، چیخنا چاہتی تھیں مگر جگ ہنسائی کے ڈر سے انہوں نے آپا کو چپ چاپ مرنے دیا۔

گھر میں ممانی کے میکے والے بھی تھے اور

اماں کے بھی، وہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ آپا کے منہ سے جھاگ نکلے، چہرے کا رنگ بدلنے لگا تو اماں نے ماموں میاں کو ایک بار پھر ہمراز بنایا اور آپا کی موت کا باضابطہ اعلان کردیا گیا۔

آپا کا چہرہ سفید کفن میں پُرسکون ہوگیا۔ ہاتھوں کی مہندی اور ابٹن کی خوشبو کافور کی خوشبو کے ساتھ مل کر ایسے مہک رہی تھی کہ پھر ایسی خوشبو نہ سونگھی۔

''ہائے، ہائے...... مہرو کا آسیب اس کو لے کر ہی ٹلا۔ آسیب گھر بنالیتا ہے جاتا نہیں اور جس پر عاشق ہوجائے اس کو پھلنے بھی نہیں دیتا...... بسنے نہیں دیتا، مہرو کی طرح جان لے کر ٹلتا ہے۔'' اماں آپا کے بعد اکثر مجھے سمجھایا کرتیں اور میں سمجھ بھی جاتی لیکن کچھ باتیں اختیار میں نہیں ہوتیں۔ جیسے آپا نے کہا تھا سوچ پر پہرہ کون لگائے۔

آپا کے مرنے کے...... بارہ سال بعد میری زندگی میں طوفان آگیا۔ ویسے تو ان بارہ سالوں میں بھی کوئی کم طوفان نہ آئے تھے۔ ابا چل بسے، اماں کی آنکھوں میں ایک قطرہ آنسو کا نہ دیکھا مگر جب شاہانہ خالہ آئیں اور انہوں نے مجرمانہ اقرار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے معاف کردینا آپا...... بہت بھول ہوئی مجھ سے۔ آپ کی قسم میں بھی تہی دامن ہی رہی ہوں۔ سلیم نے مہرو کے جانے کا بڑا صدمہ لیا اس کی موت کا ذمے دار خود کو سمجھتے رہے، گھلتے رہے۔''

''جیتے جی تو بچی، باپ کے سینے سے لگنے کو ترستی رہی۔'' اماں نے اپنے جی کے پھپھولے پھوڑے۔

''بس آپ انہیں معاف کردیجیے اور مجھے بھی۔'' اماں نے اس دن ابا کے مرنے کا ماتم کیا۔ بہت روئیں کہنے لگیں۔

''بھروسے کی مار لگی ہے مجھے تو...... شاہانہ تجھے بہن سمجھا، میاں کو دیوتا، دونوں نے میری پیٹھ پر چھرا گھونپ دیا رہی سہی کسر مہرو نے پوری کردی۔''

شاہانہ آنٹی چلی گئیں اب اماں کو چپ لگ گئی۔ ان کو ابا کی موت نے احساس دلایا کہ وہ تو ان کو بہت چاہتی تھیں۔ اتنا زیادہ کہ شراکت برداشت نہ کرپائیں اور...... اور پھر آپا...... آپا کا سوچ کر تو وہ ہاتھ ایسے ملتیں جیسے کوئی اپنی بے بسی کا ماتم کرتا ہے۔ ان کو بھائیوں کا غم کرتے نہ دیکھا۔ آپا کے بعد میری زندگی بہت پھیکی تھی۔ میں اب کسی کا دامن پکڑ کر نہیں سوتی تھی چونک، چونک کر میری آنکھ کھلتی رہتی۔ لگتا آپا کی سسکیاں گونج رہی ہیں۔ کبھی کھڑکی پر وہ شہاب بھائی کے کندھے سے لگی دکھائی دیتیں اور کبھی میرے بال سہلا رہی ہوتیں لیکن وہ کہیں نہیں تھیں ہاں کبھی کبھی چاند میں ان کا عکس دکھائی دیتا۔ وہ کہتی تھیں جو محبت میں جان دیتے ہیں وہ چاند پر رہتے ہیں۔ ہائے اللہ پتا نہیں وہ وہاں اتنی دور میرے بغیر...... شہاب بھائی کے بغیر کیسے رہتی ہوں گی۔

☆☆☆

عالی چچا کامران کا بیٹا تھا۔ اماں کو عالی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن چچا ابا کے بھائی...... دنیا داری، جگ ہنسائی، لوگ کیا کہیں گے ایسے شخص کو لڑکی دے دی جس کے بھائی نے ڈھلتی عمر میں سوت ہی نہیں طلاق کا ٹیکا بھی ماتھے پر دھبے کی طرح لگا کر میکے روانہ کردیا۔

اماں کا حکم نامہ جاری ہوا تب مجھے یاد آیا آپا نے اپنی مایوں کی رات فون پر کسے خدا حافظ کہا تھا۔ انہوں نے ایک سانس میں زہر سے بھرا دودھ کا گلاس کیوں پیا۔ محبت کا آسیب سر چڑھ کر بولتا ہے تو

سُدھ بُدھ کہاں رہتی ہے۔

شہاب بھائی تو بہت کم گو تھے کبھی اماں کے سامنے بات نہ کی۔ عالی نے شور مچادیا۔

''اماں سے بولو اگر آپ کو تایا ابا نے طلاق دی تھی تو اس میں ہمارا کیا قصور؟'' مگر اماں سزا سناتے ہوئے قصور کہاں گنواتی تھیں کہہ دیا سو کہہ دیا۔

میری بات طے کردی گئی۔ میں بہت روئی پیٹی۔ عالی نے مجھے ورغلانے کی پوری کوشش کی مگر جانے کیوں مجھے آپا کی وہ بات یاد آگئی جب وہ شہاب بھائی کے کندھے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''نہیں جاسکتی...... اماں کا رشتوں سے اعتبار اٹھ جائے گا۔'' اور اماں کہتی ہیں ان کو بھروسے کی مار پڑی ہے۔

''ہائے اللہ...... کروں تو کیا کروں۔'' میرے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اماں میرے لیے پریشان تھیں لیکن ان کی انا ان کی دنیاداری میری آنکھوں میں جھانکنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

عالی نے مجھے میسج میں لکھا اگر میں نے شادی سے انکار نہ کیا تو وہ مرجائے گا۔ اماں سچ کہتی ہیں عاشقوں نے موت کو کھیل سمجھ لیا ہے۔ عالی بھی یہی کہہ رہا تھا۔

''میں شہاب بھائی کی طرح بزدل نہیں ہوں۔ چوڑیاں نہیں پہنی میں نے۔'' اور مجھے یہ خوف کہ وہ جو کہتا ہے کر دکھاتا ہے بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا۔

''ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔'' میں نے دودھ میں چوہے مار گولیاں ڈالیں اور اماں کے پاس چلی گئی۔

اماں فجر کی نماز کے بعد تسبیح کررہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں شیشے کا گلاس دیکھا تو گھبرا گئیں۔ اس میں دودھ تھا وہ بھی بارہ برس پیچھے چلی گئیں میری طرح۔

''یہ کیا ہے؟''

''دودھ...... زہر سے بھرا۔''

''لیکن؟'' وہ میرے سرد لہجے سے خوف زدہ ہوگئیں۔

''اماں...... محبت وہ واحد جذبہ ہے جس کی تاریخ نہیں بدلتی۔ آپ سچ کہتی ہیں یہ آسیب گھر بنالیتا ہے۔ میری محبت کے سامنے بھی دو راستے ہیں رہائی یا جدائی۔'' رہائی کہتے، کہتے میں نے گلاس آگے بڑھایا کہ اماں کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔

''آپا کا فیصلہ آپ نے آپا پر چھوڑا تھا، میرا آپ کریں گی۔''

''پاگل ہوئی ہو کیا؟''

''ابھی میں نے مہندی نہیں لگائی، مہمان بھی گھر پر نہیں ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔'' میری بات ادھوری تھی کہ اماں نے گلاس کو اپنے ہاتھ سے پرے پھینک دیا۔ مجھے گلے لگا کر رونے لگیں اور اتنا روئیں کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہ روئی ہوں گی اور نہ اب کبھی رونے جیسی حالت رہ گئی تھی۔

''اس منحوس آسیب نے تو لگتا ہے میرے گھر کا راستہ ہی دیکھ لیا ہے...... جا، جا کے کہہ دے کم بخت سے اس بار وہ جیت جائے۔'' میں اور اماں دونوں گلے لگ کر زاروقطار رو رہی تھیں...... جانے کیوں...... شاید محبت کے آسیب کی جیت ہوئی تھی۔

اعتبارِ وفا

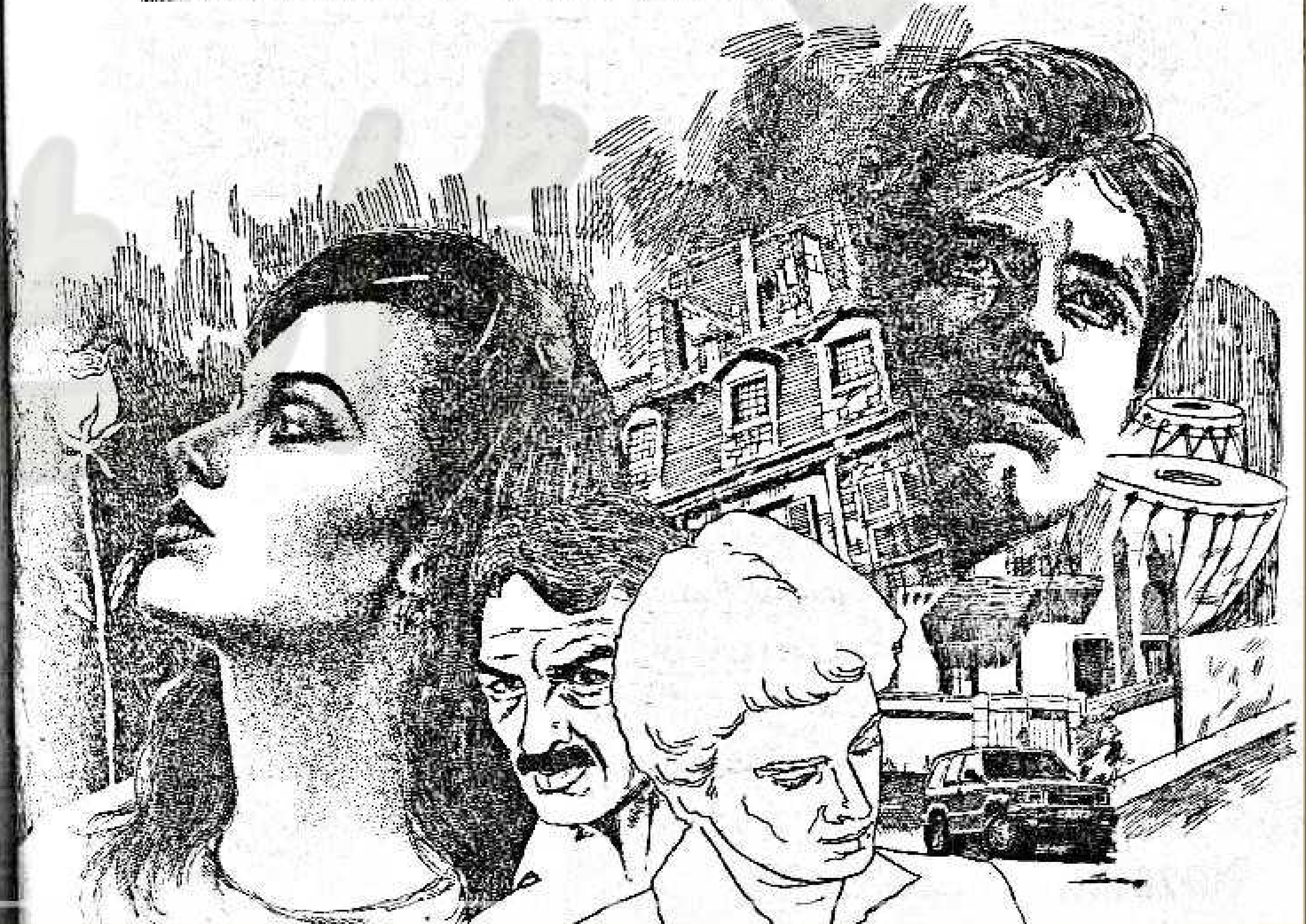
نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا۔۔۔ گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے۔۔۔ کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے۔۔۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے۔۔۔ اور مان لیا جائے۔۔۔ کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے۔۔۔ اور وفا کے غُنچے وہیں کِھلتے ہیں۔۔۔ جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں



وہ پتا نہیں کب سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے بال اور پاؤں دھول سے اَٹے ہوئے تھے۔ پاؤں سے خون رس رہا تھا۔ لیکن وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے، بھاگتے وہ بے دم ہو کر گر گیا تھا۔ پھر دو ہاتھوں نے اسے تھام کر اٹھایا۔ ان دو ہاتھوں کی گرفت بڑی مہربان تھی۔ اس نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے میلے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے اور اس کی گھنی سیاہ پلکیں بھی دھول میں اَٹی ہوئی تھیں ان ہاتھوں کی گرفت میں سختی نہ تھی۔ اپنائیت تھی، شفقت تھی پھر بھی اس نے اپنے بازو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' اسے بازو جھٹکتے دیکھ کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں بابا۔ کرسی پر بیٹھے، بیٹھے ہی سو گیا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا۔''

''کیا بات ہے میری جان، آج کل جاگتے میں خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں۔''

''نہیں بابا۔'' وہ جھینپ گیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''چلو جب ایسی کوئی بات ہوئی تو پہلے اپنے بابا کو بتانا...... ظالم سماج بننے کی کوشش ہرگز نہیں کروں گا۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اپنے بے حد سنجیدہ سے باپ کو آج اس طرح شوخی سے بات کرتے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''کیا بات ہے بابا آج کچھ بدلے، بدلے سے لگ رہے ہیں۔ کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں؟'' اس نے انہی کی بات دُہرائی تو وہ زور سے ہنسے۔

''ارے نہیں، کالا نہ پیلا یہاں تو سرے سے دال ہی نہیں ہے میری جان۔''

''بابا!'' رواحہ نے شرارت سے انہیں دیکھا۔

''کیا آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟''

''کسی سے محبت......؟'' دل میں ٹیس سی اٹھی تھی لیکن انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ ''کوئی ایک...... مجھے تو ہر تیسرے چوتھے دن محبت کا بخار چڑھ جاتا تھا لیکن جتنی تیزی سے چڑھتا تھا...... اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا تھا۔''

''نہیں بابا......'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ''آپ ایسے لگتے تو نہیں، ہر تیسرے چوتھے دن محبت کرنے والے۔''

''بھئی کیوں نہیں کر سکتا...... خوب صورت تھا، اسمارٹ تھا، خوبرو جوان تھا۔''

''خیر اسمارٹ تو آپ اب بھی بہت ہیں، ایک چھوڑ دس محبتیں کر سکتے ہیں۔'' رواحہ نے فخر سے اپنے بابا کی طرف دیکھا۔ ''لیکن آپ نے تو ماما کے بعد پھر کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں۔''

''یار محبت...... بلکہ خالص محبت تو زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوئے تھے۔

''خیر یہ مقولہ اب فرسودہ ہو چکا ہے بابا، ایک مختصر سی زندگی میں لوگ دس بار محبتیں کر سکتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بار...... آپ بھی ٹرائی کریں بابا...... میرا دل بھی چاہتا ہے کسی کو ماما کہنے کا۔'' شرارت سے اس کی خوب صورت آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔

''اور میرا دل پوتے، پوتیوں سے کھیلنے کو چاہتا ہے، اب ماما تلاش کرنے کے بجائے میرے لیے بہو

تلاش کرو۔''

''وہ تو کر چکا بابا۔'' بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ان کا منہ تھوڑا سا کھلا اور پھر مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا۔

''سنو...... مجھے کب ملوا رہے ہو بہو سے؟''

''پہلے خود تو ٹھیک طرح سے مل لوں......'' اس نے دروازہ کھول کر تھوڑا سا سر اندر کیا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

رواحہ نے کیسے ان کی روکھی پھیکی زندگی میں رنگ بھر دیے تھے اور اگر رواحہ بھی نہ ہوتا تو......

''تم بن جینا کتنا مشکل تھا...... کتنا چاہا تھا میں نے تمہیں...... لیکن تم میری زندگی سے یوں نکل گئیں جیسے کبھی تھی ہی نہیں...... رواحہ جب سے جوان ہوا ہے...... اکثر کہتا ہے...

''آپ نے ماما کے بعد زندگی کے دروازے خود پر بند کیوں کر لیے...... زندگی ختم نہیں ہوتی بابا رواں دواں رہتی ہے...... آپ نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا بابا۔''

''اور دیکھو میں اسے سمجھا نہیں پاتا کہ تمہارے بعد زندگی واقعی میرے لیے ختم ہو گئی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید میں جی نہ پاتا...... تم تو میرے دل کے اندر اس طرح سما گئی تھیں کہ کسی اور کی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔

ماضی کے واقعات یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا کہ وہ بھول نہیں پاتے تھے اس اذیت کو جو انہوں نے اٹھائی تھی...... اور وہ گھاؤ جو اس کی جدائی سے انہیں ملا تھا۔ آج بھی روزِ اول کی طرح رستا تھا۔

''پتا نہیں کب بھرے گا یہ گھاؤ، کب بھول پاؤں گا میں اسے...... آج جب رواحہ بھی جوان ہو گیا ہے اور کل کو اس کے بیوی بچے اس گھر میں آ جائیں گے شاید تب بھی میں تمہیں نہ بھول پاؤں۔''

''بابا......'' رواحہ نے پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں عظام کی طرف جا رہا ہوں۔''

''عظام گھر آیا ہوا ہے کیا۔ یا ہاسٹل جا رہے ہو؟'' وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''جی بابا گھر...... ابھی اس کا فون آیا تھا، ویسے آپ کیا سوچ رہے تھے؟''

''میں تمہاری آفر پر غور کر رہا تھا جانو......''

''کون سی آفر بابا......؟'' وہ وقتی طور پر بھول سا گیا۔

''یہی کہ تمہارے لیے ماما لانے کی آفر......''

''ہیں؟'' وہ حیرت زدہ تھا جھٹ اندر کمرے میں آ گیا۔

''اس عمر میں بابا؟'' اس نے مصنوعی حیرت سے انہیں دیکھا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا بیٹا جی کہ تمہارا جی کسی کو 'ماما' کہنے کو چاہتا ہے۔'' انہوں نے دبی، دبی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں خیر...... آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کی بہو کا بندوبست کرتا ہوں۔ اپنے بچوں کو انہیں ماما کہتا دیکھ کر خوش ہو لیا کروں گا۔'' وہ مڑا۔

''لیکن بہت دیر نہ کرنا بیٹا اپنے بچوں کی ماما ڈھونڈنے میں۔ ایسا نہ ہو ہم یہ حسرت لیے ہی دنیا سے چلے جائیں۔''

''بابا......!'' وہ بچوں کی طرح بسورا۔ ''یہ فاؤل ہے، اس طرح کی باتیں نہیں کریں گے آپ معاہدہ ہو چکا ہے۔''

''او کے سوری لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں بابا، ابھی مجھے اپنی ایجوکیشن مکمل کرنے دیں پھر سوچیں گے اس... بارے میں' او کے میں چلتا ہوں۔''

''احتیاط سے ڈرائیو کرنا بیٹا اور عظام کو میرا پیار دینا۔''

''جی بابا...... ہو سکتا ہے مجھے دیر ہو جائے۔'' وہ مڑا۔

''یعنی ڈنر تم عظام کے ساتھ کرو گے؟''

''May be!''

''اللہ حافظ......'' وہ اس وقت تک کھلے دروازے سے اسے جاتا دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا...... اور پھر آنکھیں موندتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔

☆☆☆

ثمر حیات کھڑکی کی طرف رخ کیے کھڑے تھے جب دستک دے کر ممتاز خان اندر داخل ہوا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

''کیا بات ہے ممتاز خان؟''

''باس وہ مراد آیا ہے، کہہ رہا ہے مال پکڑا گیا ہے۔''

''عظام آ گیا ہے کیا؟''

''جی ابھی دس منٹ پہلے پہنچے ہیں۔''

''کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں گئے ہیں۔''

''ممتاز خان تمہاری یادداشت کمزور ہو گئی ہے کیا؟''

''جی......؟'' ممتاز خان نے نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے تم بوڑھے ہو گئے ہو آرام کرو اب۔'' لہجہ بے حد سرد تھا۔

''جی......!'' وہ ہکلایا۔

''تم لوگوں سے کیا کہا ہوا ہے میں نے کہ عظام کی موجودگی میں کوئی بزنس کی بات نہ ہو، کسی قسم کی کوئی بات نہیں۔''

''لیکن سر وہ مال......؟''

''جہنم میں جائے مال اور تم سب بھی...... جب تک عظام یہاں ہے کوئی نظر نہ آئے مجھے یہاں...... سمجھے؟''

''جی باس لیکن مراد سے کیا کہوں؟''

''اس وقت دفع کرواسے یہاں سے اور تین دن تک وہ مجھے یہاں نظر نہیں آئے سن لیا؟''

''جی باس۔'' وہ الٹے قدموں واپس مڑا تھا اور وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے تھے.... آج ستمبر کی تین تاریخ تھی اور آج کے دن ہی فرحی ان سے بچھڑی تھی...... اور اگر عظام نہ ہوتا تو فرحی کے بعد زندگی کا مقصد ختم ہو جاتا...... فرحی نے جب...... آخری سانس لی تھی تو وعدہ لیا تھا۔

''میرے بیٹے کا خیال رکھنا ثمر...... اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا فرحی، دیکھنا تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ خود اپنے بیٹے کا خیال رکھو گی...... میرا تو تمہیں پتا ہے ناں کتنا بے پروا ہوں...... اپنا خیال نہیں رکھ پاتا تو اپنے بیٹے کا خیال کیسے رکھوں گا۔ ہم دونوں باپ، بیٹے کو تمہاری بہت ضرورت ہے فرحی...... تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں......'' لیکن وہ چلی گئی تھی اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔

''پاپا......!'' عظام نے اندر قدم رکھا۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا اور دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ بھاگ کر ان کے گلے لگا تھا۔

''پاپا میں نے آپ کو بہت مس کیا۔''

''میں نے بھی میری جان۔'' انہوں نے نم پلکوں کو ہاتھوں کی پشت سے پونچھا۔

''آج امی کی برسی ہے ناں......؟'' عظام نے الگ ہوتے ہوئے بغور انہیں دیکھا تو ثمر حیات نے سر ہلا دیا۔

''تو آپ امی کی برسی کے لیے آئے ہیں ہانگ کانگ سے۔''

''یہ بات بھی ہے اور تم سے بھی ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا...... بہت اداس ہو گیا تھا۔'' وہ اسے لیے، لیے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا ایک بازو ابھی تک عظام کے گرد حمائل تھا۔

''پاپا آپ نے مجھے ہمیشہ خود سے دور رکھا، ہاسٹلوں میں۔''

''مجبوری تھی جانِ پدر...... میں ہر وقت گھر میں نہیں رہ سکتا تھا...... تمہاری ماما کے بعد تم اکیلے کیسے رہتے بیٹا اس لیے...... مجھے تو ہر روز کہیں نہ کہیں جانا ہوتا ہے۔''

''لیکن پاپا جب آپ یہاں ہوتے ہیں تب بھی تو میں ہاسٹل میں رہتا ہوں۔'' آج پہلی بار وہ گلہ کر رہا تھا۔

''میں جب ہوتا تھا تو آپ کو ہر ویک اینڈ پر لے آتا تھا ناں...... اور اب بھی۔''

''لیکن میں تو ہر لحہ آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا ناں۔'' عظام کے شکوے جاری تھے۔

''میں بھی تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا بیٹا لیکن مجبوری تھی ناں...... میرا بزنس بہت پھیلا ہوا ہے۔''

''اتنا بزنس پھیلا کر کیا کریں گے پاپا...... اتنی دولت کس لیے جمع کر رہے ہیں...... ہم دو ہی تو ہیں۔''

''ہمیشہ دو تو نہیں رہیں گے ناں......؟'' ثمر حیات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ہاں...... لیکن وہ بھی میرے جیسی ہوگی...... فقیر منش سی...... پاپا آپ کا بیٹا بہت سادہ سا ہے...... مجھے چنوں سے بھی پیٹ بھر کر اللہ کا شکر ادا کرنے والا۔ آپ بھی یہ بزنس وغیرہ سمیٹ دیں پاپا...... دے دیں سارا پیسہ رفاہی اداروں کو اور ہم دونوں ایک چھوٹے سے گھر میں سکون سے رہیں اکھٹے...... ایک

ساتھ۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب سی حسرت تھی اور ایک عجیب سی بے بسی نے ثمر حیات کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

''بہت سی باتیں اتنی آسان نہیں ہوتیں میری جان جتنی نظر آتی ہیں۔''

''اس میں مشکل کیا ہے پاپا؟''

''تم نہیں سمجھو گے میری جان۔''

''آپ سمجھائیں ناں...... اچھا چلیں یہ ہی بتا دیں کہ اب جب میں شیر جوان ہوں تو ہاسٹل میں کیوں رہ رہا ہوں...... یہاں گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا؟''

''رہ سکتے ہو...... کیوں نہیں رہ سکتے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اکیلے اس گھر میں رہو...... میرے بہت دشمن ہیں...... میں رسک نہیں لے سکتا۔''

''یہاں ملازم ہیں...... دو گارڈ ہیں پھر بھی......؟''

''ہاں پھر بھی......'' ثمر حیات نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

اسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے کھو سے گئے تھے۔

''میں نے فرحی سے وعدہ کیا تھا اس کے بیٹے کا خیال رکھوں گا، اس کی حفاظت کروں گا تو کیا روزِ حشر میں اس کے سامنے شرمندہ......''

''او کے پاپا......'' عظام نے پاپا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''سوری، میں نے آپ کو اداس کر دیا۔''

''نہیں کوئی بات نہیں بیٹا...... تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔'' انہوں نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

''ایک سال بعد میرا ایم بی اے ہو جائے گا پھر آپ کیا کریں گے۔ باہر بھیج دیں گے کیا؟'' اس نے بے حد خوشگوار انداز میں پاپا کی طرف دیکھا۔

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہولے، ہولے سارا بزنس سمیٹ دوں...... نکل آؤں اس مایا جال سے باہر۔''

''رئیلی پاپا......؟'' عظام بے حد خوش ہو گیا۔ ''پھر ہم دونوں خوب گھومیں گے، خوب سیر کریں گے۔ ہے ناں پاپا؟''

''ہوں......'' ثمر حیات مسکرائے تھے لیکن ان کی آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

''تمہارا دوست رواحہ کیسا ہے؟''

''ایک دم فٹ...... آ رہا ہے ابھی...... میں نے آتے ہی فون کیا تھا اسے۔''

''بندہ حاضر ہو چکا ہے جناب۔'' رواحہ نے اسی وقت اندر قدم رکھا۔

''کیسے ہو بیٹا؟'' ثمر حیات نے محبت سے اسے گلے لگایا۔

''ٹھیک ہوں انکل بس آج کل ذرا......'' اس کی زبان کو کھجلی ہوئی تھی۔

''کیا آج کل...... کچھ پریشانی ہے کیا؟'' ثمر حیات ابھی تک کھڑے تھے۔

''دراصل وہ آج کل میں اور عظام دونوں مل کر اپنے، اپنے لیے ایک عدد ''ماما'' کی تلاش کر رہے ہیں۔''

”تو ملی کوئی ؟“ ثمر حیات کو اس کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی تھی اور پھر سمجھتے ہی زور سے ہنس دیے۔

”نہیں......“ رواحہ نے برا سا منہ بنایا۔

”جو بھی ملتی ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا پتا صاف کردیں پہلے......“

ثمر حیات پھر ہنسے...... عظام کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

”اور یہ آپ کو اور میرے بابا کو ہرگز منظور نہیں ہوگا۔“

”بالکل...... ہمیں اپنے بیٹوں کے لیے ایسی ماں ہرگز نہیں چاہیے جو انہیں ہی ہم سے جدا کردے۔“

”بالکل میرے بابا کا بھی یہی خیال ہے۔“ رواحہ، عظام کے پاس بیٹھ چکا تھا۔

”یار کسی روز اپنے بابا سے ملواؤ...... عظمی بہت تعریف کرتا ہے تمہارے بابا کی۔“

”بالکل یہی بات پچھلے ہفتے میرے بابا نے اس سے کہی تھی۔“

”تو پھر مل بیٹھتے ہیں کسی روز......“ ثمر حیات نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ عظام سمجھ گیا کہ پاپا کو اس وقت کسی کام سے جانا ہے۔ یوں تو عظام جب آتا تو وہ زیادہ وقت گھر پر ہی اس کے ساتھ گزارتے تھے لیکن کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے انہیں جانا بھی پڑتا تھا اور آج تو امی کی برسی تھی اور ہر برسی پر وہ یتیم خانوں میں مدرسوں میں اور ایسے ہی اداروں میں دیگیں بھجواتے تھے، قرآن خوانی وغیرہ کرواتے تھے۔ اس نے رواحہ کو کہنی ماری تو رواحہ کھنکھارا۔

”وہ انکل دراصل میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ میں چاہ رہا تھا کہ عظام ہاسٹل کے بجائے ہمارے گھر آجائے۔ آخری سال ہے مل کر پڑھائی کریں گے پھر ہمارے گھر کوئی ڈر والی بات بھی نہیں ہے۔“

”تم بھی یہی چاہتے ہو ناں عظمی؟“ ثمر حیات نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو...... وہاں ہاسٹل میں آج کل کافی ڈسٹربنس ہے۔“

”بھلا کیسی ڈسٹربنس؟“ ثمر حیات نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دراصل جب اس کا موڈ پڑھنے کا ہوتا ہے تو اس کے روم میٹ کا نہیں ہوتا اور جب اس کا روم میٹ پڑھنا چاہتا ہے تو اس کا دل گانے سننے کو چاہتا ہے۔“ عظام کے بجائے رواحہ نے جواب دیا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں پاپا، اگر آپ نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے جہاں اتنے سال ہاسٹل میں گزارے ہیں وہاں ایک سال اور سہی۔“ پاپا کو خاموش دیکھ کر عظام نے کہا تو رواحہ نے اس کے بازو پر چٹکی بھری۔ وہ تڑپ کر اسے دیکھنے لگا...... تب ہی ثمر حیات نے پھر کلائی پر نظر ڈالی۔

”ٹھیک ہے جیسا تم چاہو...... تم رواحہ کے گھر رہ سکتے ہو...... مجھے ذرا کام ہے، تم لوگ باتیں کرو میں بس ایک گھنٹے تک آرہا ہوں۔“

”تھینک یو پاپا...... دیر مت کیجیے گا...... رواحہ میرے ساتھ ہی ڈنر کرے گا۔“

ثمر حیات سر ہلا کر باہر چلے گئے تو عظام نے رواحہ کی پیٹھ پر مکا مارا۔

”یہ تم نے مجھے چٹکی کیوں کاٹی تھی؟“

”تو تم ہتھیار کیوں پھینک رہے تھے...... جبکہ یہ طے ہوا تھا کہ ہم ہر صورت انکل کو قائل کریں گے۔“ رواحہ نے اسے گھورا۔

”یار میں پاپا کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا...... مجھ سے نہیں ہوتا۔“



"چلواب توانکل خود ہی مان گئے ورنہ تم نے تو معاملہ بگاڑ ہی دیا تھا۔"

"ساری زندگی ہاسٹل میں گزارنا آسان نہیں ہوتا...... میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے ہاسٹل میں ہوں...... اسی شہر میں گھر ہونے کے باوجود تین سال سے ہاسٹل میں ہوں...... کیونکہ پاپا نے کہا تھا کہ تمہیں ابھی ہاسٹل میں ہی رہنا ہے کیونکہ انہیں زیادہ تر ملک سے باہر رہنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جب میں نے اے لیول کیا تھا تو میں بہت خوش تھا کہ اب پاپا کے ساتھ رہوں گا یہیں کراچی میں۔"

"تو، تم اپنا اے لیولز بھی تو کراچی سے کرسکتے تھے ناں؟"

"ہاں لیکن تب پاپا کراچی میں نہیں رہتے تھے تو پاپا نے مجھے لاہور کے اس اسکول میں داخل کروادیا تھا، تب صرف لمبی چھٹیوں میں، میں گھر آتا تھا اور ان چھٹیوں میں بھی اکثر پاپا کو دو، دو ہفتوں کے لیے بزنس کے سلسلے میں جانا پڑتا تھا پھر جب میں اے لیول کررہا تھا تو بابا کراچی سیٹل ہوگئے لیکن انہوں نے کہا کہ میں اپنا اے لیول بھی وہیں سے ہی کروں اور......" اب وہ اداس ہورہا تھا۔

"اچھا اب زیادہ ملکۂ جذبات بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" رواحہ اسے اس کیفیت سے باہر لانا چاہتا تھا۔ تین سال پہلے عظام سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور ان تین سالوں میں دونوں کے درمیان دوستی کا بہت گہرا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ دونوں نے ایک ہی کالج سے گریجویشن کیا تھا اور اب ایم بی اے کررہے تھے۔ اگرچہ رواحہ کا ارادہ نہیں تھا ایم بی اے کرنے کا لیکن پھر عظام کے اصرار پر اس نے بھی ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

"یار تم کو تو اپنے پاپا کا بزنس سنبھالنا ہے، میں کیا کروں گا ایم بی اے کرکے؟"

"تم میرے پاس جاب کرنا۔" وہ ہنسا تھا۔

اور یوں دونوں نے ایم بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔

"تو کب شفٹ ہو رہے ہو میرے گھر؟"

"یار ابھی تو پاپا یہاں ہیں، دو تین روز پھر ان کے جانے کے بعد ہی ظاہر ہے...... یہ بتاؤ تمہاری بات ہوئی ارتقاع سے؟"

"روز ہوتی ہے تقریباً......" رواحہ نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

"میں روز والی بات نہیں کررہا...... میں پوچھ رہا ہوں تم نے اسے بتایا اپنے متعلق......؟"

"جانتی تو ہے وہ میرے متعلق کہ میرا نام رواحہ ہے اور میں......"

"خواہ مخواہ اِدھر اُدھر میں مت اڑاؤ روی، تم جانتے ہو میرا مطلب......؟" عظام نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں...... یار مجھے سمجھ نہیں آتا کیا کہوں اس سے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے...... احمق نہیں لگوں گا یہ کہتے ہوئے۔" وہ ذرا سنجیدہ ہوا تھا۔

"لگنے کی کیا بات ہے وہ تو تم ہو ہی۔" عظام مسکرایا۔ "ویسے......" اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ "جب محبت جیسی حماقت کرہی لی ہے تو پھر احمق بن جاؤ تھوڑی دیر کے لیے یہ نہ ہو کہ تم سوچتے رہو اور دوسرے اپنا کام کر جائیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" رواحہ چونکا۔

"تم نے شاید غور نہیں کیا وہ ظفری ہر وقت اس کے آگے پیچھے رہتا ہے اور میں نے ارتقاع کو بھی دیکھا ہے بہت دفعہ...... اس سے ہنس، ہنس کر باتیں کرتے۔"

"لیکن ظفری......؟" رواحہ پریشان ہوا۔ "اس کی شہرت تو اچھی نہیں ہے تم جانتے ہو ناں...... کالج کے زمانے میں بھی کیا حرکتیں تھیں اس کی۔ وہ بی ایس سی کی منزہ رحیم کیسی سادہ سی تھی...... اور اس نے پٹا لیا تھا بعد میں منزہ نے خودکشی کرلی تھی...... سب کہتے تھے وجہ ظفری ہے۔"

"سب جانتا ہوں لیکن تمہاری یہ ارتقاع اتنی بے وقوف اور سادہ تو نہیں ہے جتنی منزہ رحیم تھی...... پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا...میں اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ظفری سے بات نہ کرے۔" رواحہ حقیقتاً پریشان ہوا تھا...... ارتقاع کو اس نے یونیورسٹی میں ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ صرف سال بھر پہلے... ارتقاع خوب صورت تھی اس میں کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ بلا کی خود اعتماد بھی تھی...... وہ پتا نہیں اس کی ذہانت سے متاثر ہوا تھا یا حسنِ بے نیاز سے لیکن وہ اس سے متاثر تھا...... اور ابھی کچھ دن پہلے اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ ارتقاع بابرسے محبت کرتا ہے...... اور یہ کہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش چپکے سے جانے کب سے اس کے دل میں موجود ہے۔

"میں کب یہ کہہ رہا ہوں روی، بس تم اس سے موقع دیکھ کر اپنے جذبوں کا اظہار کردو...... کئی بار میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے...... لیکن ظاہر ہے وہ پہل تو نہیں کرے گی ناں...... اور پہل تمہیں ہی کرنی ہے۔" رواحہ نے سر ہلادیا۔

"لیکن یار مجھے کوئی ڈائیلاگز وغیرہ نہیں آتے۔" اس نے مسکینیت سے عظام کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو سوچا تھا سیدھے سبھاؤ بابا سے کہہ کر رشتہ بھجوادوں گا...... ماسٹر کے بعد۔"

"تو پھر کرتے رہو انتظار...... اللہ کے بندے رشتہ جب مرضی بھجوادینا پہلے اس کی مرضی تو معلوم کرلو۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے ڈیر جو ماں، باپ کی بات پر سر جھکادے...... چلو اٹھو اچھی سی مووی دیکھتے ہیں دو چار ڈائیلاگ تو وہاں سے مل ہی جائیں گے۔" عظام اٹھ کھڑا ہوا۔

عظام کا کمرا فرسٹ فلور پر تھا...... رواحہ کمرے میں جاتے ہی بیڈ پر گر پڑا...... عظام نے ٹیرس کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور اس کی نظر گیٹ پر پڑی...... ممتاز خان کسی سے جھگڑا کررہا تھا شاید...... وہ جو شخص بھی تھا شاید اندر آنا چاہتا تھا اور ممتاز خان اسے منع کررہا تھا...... گارڈ پتا نہیں کہاں تھا۔

"ایک منٹ روی میں ابھی آتا ہوں تم مووی سلیکٹ کرواتنے میں......" وہ کمرے سے باہر نکلا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

☆☆☆

"ارے تم تیار نہیں ہوئیں ابھی تک؟" بابر نے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر ایمل کی طرف دیکھا جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

"بس تیار ہو رہی ہوں۔" ایمل نے ذرا سا رخ موڑ کر بابر نوید کی طرف دیکھا۔

"ارے آپا کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے اور دیر ہونے پر وہ بہت بولیں گی کہ مہمانوں کی طرح آئے ہو...... رات کتنی تاکید کی تھی انہوں نے کہ جلدی آنا۔"

''بس دس منٹ میں آتی ہوں آپ پلیز بیٹھیں باہر جا کر... رمائی اور افنان تیار ہو گئے کیا......؟''

''افی تو تقریباً تیار ہی تھا البتہ رتی چلی گئی ہے۔''

''کہاں آپا کی طرف؟'' ایمل ساری کی ساری اس کی طرف مڑ گئی تھی۔

''نہیں......'' بابر نوید دروازے کی دہلیز پر ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔

''کیا مطلب...... کہاں گئی ہے وہ...... اسے سمیرا کی مایوں میں شریک نہیں ہونا تھا کیا؟''

''وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گئی ہے، کہہ رہی تھی ظفری کے گھر کوئی پارٹی ہے۔ تو میں نے اجازت دے دی۔''

''لیکن آپ کو اسے اجازت نہیں دینی چاہیے تھی...... اسے بتانا چاہیے تھا کہ دوستوں کی پارٹی سے زیادہ اہم سمیرا کی مہندی میں شرکت کرنا ہے...... پارٹیاں تو روز ہی ہوتی رہتی ہیں...... لیکن شادی......''

''کیا کرتا یار اتنی معصومیت پوچھ رہی تھی پاپا چلی جاؤں تو میں انکار نہیں کر سکا۔''

''آپ نے اسے بہت ڈھیل دے دی ہے بابر...... بگاڑ دیا ہے اپنے لاڈ پیار سے...... میری تو کوئی بات سنتی ہی نہیں ہے جو جی چاہتا ہے کرتی ہے۔'' ایمل کے لہجے میں خفگی تھی۔

''کوئی نہیں بگڑی میری بیٹی، تم ایسے ہی مت کڑھا کرو...... بیٹیاں باپ کو بہت پیاری ہوتی ہیں اور مجھے بھی رتی سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے...... تم میرے اور میری بیٹی کے درمیان مت آیا کرو، بیٹا تمہارا ہے جو مرضی کرو اس کے ساتھ لیکن رتی میری بیٹی ہے صرف میری...... اور میں اس کی کوئی خواہش رد نہیں کر سکتا۔''

''لیکن ہر خواہش پوری کرنے والی نہیں ہوتی بابر۔'' ایمل کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''کل کو وہ کوئی ایسی خواہش کر بیٹھی جسے پورا کرنا ممکن نہ ہو یا جو اس کے لیے نقصان دہ ہو تو......؟''

''مجھے یقین ہے میری بیٹی کبھی کوئی ناجائز خواہش نہیں کرتی...... کل کو اس نے بیاہ کر رخصت ہو جانا ہے...... وہاں اس کے ساتھ کیا حالات ہوں، پتا نہیں کتنی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑے۔ لیکن اس گھر میں جب تک وہ ہے میں اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا...... اس کی ہر وہ خواہش پوری کروں گا جو میرے اختیار میں ہے۔'' بابر کا لہجہ حتمی تھا۔ ''اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی اس نے دوستوں کی پارٹی میں شرکت کی اجازت ہی تو مانگی تھی۔ وہ خوشی جو اسے پارٹی میں جا کر ملتی وہ سمیرا کی مہندی میں شرکت کر کے نہ ملتی...... اور آپا کی فکر مت کرو وہ ناراض نہیں ہوں گی میں بات کر لوں گا ان سے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بابر لیکن پلیز، اتنا لاڈ مت کریں۔ لڑکی ذات ہے اسے......''

''یار فضول وہموں میں مت پڑا کرو۔'' بابر نے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہارے بابا نے بھی تو تمہارے بہت لاڈ اٹھائے تھے...... تم بگڑ گئی ہو کیا......؟''

''بگڑ ہی تو گئی تھی میں......'' اس نے سوچا۔ ''کب مانی تھی اُن کی بات اپنی ہی منوائی تھی...... اور کس بری طرح ان کا مان توڑا تھا میں نے اور خود میرا من کیسے کرچی کرچی ہوا تھا کہ کرچیاں ابھی تک دل و جاں کو زخمی کرتی ہیں...... ایک پرسکون مکمل زندگی گزارتے ہوئے بھی...... ماضی کی غلطیاں کبھی، کبھی کتنا رلاتی ہیں۔''

''ہائیں......'' بابر دروازے سے ہٹ کر اس کے قریب آیا اور ہولے سے اس کا گال تھپتھپایا۔ ''دس منٹ...... صرف دس منٹ میں تیار ہو کر آ جاؤ...... نیچے لاؤنج میں انتظار کر رہا ہوں۔'' ایمل نے سر ہلا دیا اور رخ موڑ کر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہیئر برش اٹھایا...... بابر کمرے سے باہر نکلا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ گہری اور معنی خیز مسکراہٹ......

اور ایمل تیار ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے خود ارتقائی کو سمجھانا چاہیے لیکن ارتقائی اس کی سنتی کب تھی. اسے بابر کی شہ حاصل تھی۔ دو سال پہلے اس نے گاڑی لینے کی ضد کی، وہ منع کرتی رہی لیکن بابر نے اسی روز جا کر اسے زیرو میٹر گاڑی لے دی اور اب وہ بچی نہیں رہی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی لیکن اس کے طور طریقے وہی تھے۔

''میں خود اب دیکھوں گی اسے...... ہر بات میں من مانی کرنے لگی ہے۔ حالانکہ صبح ہی بتا دیا تھا اسے...... کہ پھپھو کے ہاں چلنا ہے، سمیرا کی مایوں کا فنکشن ہے پر ذرا جو اس نے میری بات پر دھیان دیا ہو۔'' اس نے سر جھٹکا۔

اس نے جوڑا بنا کر لائٹ سا نیچرل لک دیتا میک اپ کیا۔

''آج بھی جوان بیٹی اور بیٹے کی ماں بن کر بھی یہ اتنی ہی خوب صورت، اتنی ہی پرکشش ہے......'' لاؤنج میں بیٹھے بابر نے اسے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر سوچا۔ لیکن...... فوراً ہی اس نے ایمل کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ تب ہی افنان بھی اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ کُرتے اور شلوار میں

نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ ایمل نے فوراً اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں......افنان، رتی سے بالکل مختلف مزاج کا تھا......اس نے کبھی ضد نہیں کی تھی، نہ ہی کبھی وہ کام کیا تھا جس سے ایمل نے اسے منع کیا ہو...... وہ اپنے شوق سے انجینئرنگ میں گیا تھا اور لڑکا ہونے کے باوجود مغرب کے بعد گھر سے نہیں نکلتا تھا جبکہ ارتقاع جب سے بابر نے گاڑی خرید کر دی تھی وہ اکثر لیٹ گھر آنے لگی تھی۔ کبھی کسی کے گھر پارٹی کبھی فرینڈز کے ساتھ ہوٹلنگ، ڈنر اور بابر اسے روکتا نہیں تھا۔

"ہماری بیٹی بہت سمجھدار ہے، وہ کبھی کوئی غلط حرکت نہیں کرسکتی ہے...... یہی تو وقت ہے لائف انجوائے کرنے کا اسے...... پڑھائی کے معاملے میں کبھی شکایت ہوئی تمہیں اس سے؟"

وہ واقعی اسٹڈیز میں اچھی تھی لیکن جب سے وہ یونیورسٹی میں آئی تھی ایمل اس کے متعلق پریشان رہنے لگی تھی۔

"چلیں......" بابر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں......"

"رتی کہاں ہے؟" افنان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

وہ ارتقاع سے تقریباً دو سال چھوٹا تھا لیکن نام لے کر ہی بلاتا تھا۔

"کسی دوست کی طرف چلی گئی ہے۔" ایمل نے بتایا۔

"کون دوست؟"

"تمہارے پاپا کو ہی بتایا ہے۔ مجھ سے اجازت نہیں لی۔"

"اس لیے کہ اسے پتا تھا......تم نے اجازت نہیں دینی۔" بابر مسکرایا۔

"لیکن اسے نہیں جانا چاہیے تھا پاپا۔" افنان کو اچھا نہیں لگا تھا۔ "پھوپھو ناراض ہوں گی۔"

"ارے یار نہیں ناراض ہوتیں تیری پھپھو......" بابر نے قدم آگے بڑھایا۔

"پھر بھی پاپا......اس نے بتایا تو ہوگا کہ وہ کس کی طرف گئی ہے۔ میں جا کر اسے لے آتا ہوں......سمیرا آپی نے صبح فون پر بھی تاکید کی تھی کہ رتی کو ضرور لے کر آنا، وہ ناراض ہو رہی تھیں کہ سمیرا کے نکاح کی تقریب میں بھی وہ نہیں آئی تھی۔"

"نکاح کو تو چھ ماہ گزر گئے ابھی تک سمیرا کی ناراضی ختم نہیں ہوئی۔"

"گلے تو اپنوں سے ہی ہوتے ہیں ناں پاپا۔" افنان نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ایمل ان کے پیچھے، پیچھے چلتی ہوئی باپ، بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔

"ہاں، اپنوں سے۔" بابر نے آہستگی سے کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ کس دوست کی طرف گئی ہے۔" وہ گیٹ کھول کر باہر آ چکے تھے اور اب پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"اب رہنے دو یار دیر ہو جائے گی اور وہ آئے گی بھی نہیں......دوستوں کی پارٹی چھوڑ کر۔" بابر گاڑی کی طرف بڑھا۔

"فنکشن میں تو ابھی بہت دیر ہے، میں آپ دونوں کو پھوپھو کی طرف ڈراپ کر کے اسے لے کے

آتا ہوں۔"

"وہ یہاں نہیں ہے بیٹا......فارم ہاؤس گئی ہے......تم وقت پر نہیں پہنچ سکو گے اسے لے کر......اور تم بھی نہ ہوئے تو تب تو تمہاری پھوپھو ضرور خفا ہوں گی۔"

"فارم ہاؤس میں؟" گاڑی کا دروازہ کھولتے، کھولتے وہ رکا۔ "اور آپ نے اسے اجازت دے دی؟" افنان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں اسے انکار کر ہی نہیں سکتا افی۔"

"کون ہے، کس کے فارم ہاؤس میں پارٹی ہے۔ کب تک واپس آنے کو کہا تھا اس نے؟"

"وہ اکیلی تو نہیں گئی ہے بیٹا اس کی اور بھی فرینڈز ہیں......اور فارم ہاؤس اس کے کلاس فیلو کا ہے......ظفری نام ہے اس کا، سب پوچھ کر تسلی کر کے ہی اجازت دی ہے میں نے اسے۔ اور وہ دو تین دن وہاں رہیں گے۔ فارم ہاؤس کافی دور ہے۔" بابر جھنجلایا تھا۔

"ظفری......" افنان چونکا...... "آپ جانتے ہیں ظفری کو......؟"

"نہیں رتی نے ہی بتایا تھا۔ اس کا کلاس فیلو ہے......اچھا لڑکا ہے، بہت تعریف کر رہی تھی اس کی، کسی صنعت کار کا بیٹا ہے۔"

"اور آپ نے پاپا اسے جانے دیا......ظفری کو جانتے نہیں آپ پھر بھی......؟"

"کمال کرتے ہو یار، میں کیا اب اس کے دوستوں اور کلاس فیلوز سے ملتا رہوں، تحقیق کرتا رہوں ان کے متعلق وہ کیسے ہیں؟" بابر مزید جھنجلایا تھا۔

"ظفری کی شہرت اچھی نہیں ہے پاپا......عیاش لڑکا ہے وہ......بہت ہی کرپٹ قسم کا اور اس کے فارم ہاؤس پر جو پارٹیاں ہوتی ہیں ناں...... اوہ مائی گاڈ۔" اس نے مکا بنا کر دوسرے ہاتھ پر مارا۔ ایمل نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"یار مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے کلاس فیلو ایسے بھی ہوں گے۔" بابر نے شرمندگی سے کہا۔

"میرے دوست کا ایک کزن وہاں ہی پڑھتا ہے۔ اس کے ساتھ......اسی نے ایک دن ذکر کیا تھا۔"

"افی پلیز......" ایمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ماما......" افنان نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر تسلی دی اور پاکٹ سے اپنا سیل فون نکال کر ارتقاع کا نمبر ملانے لگا......دوسری طرف بیل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"صاحب چائے لاؤں؟" خدا بخش نے کھلے دروازے سے جھانکتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ہاں لے آؤ۔"

رواحہ کو گئے کافی دیر ہوگئی تھی اور وہ یونہی آنکھیں موندے کرسی کی پشت پر سر ٹکائے یادوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ یادیں جو خوشگوار بھی تھیں اور تکلیف دہ بھی۔ انہوں نے کتنا چاہا تھا کہ وہ سب کچھ بھول جائیں۔ اچھا، برا سب......لیکن کبھی بھول نہیں پاتے تھے۔ یادیں جیسے قدم، قدم پر بکھری تھیں۔ وہ جتنا ان سے دامن بچاتے وہ اتنا ہی تنگ کرتیں......وہ جب، جب رواحہ کو دیکھتے انہیں اپنا

آپ یاد آجاتا...... رواحہ بالکل ان کی کاپی تھا...... جس طرح وہ اپنے بابا جان کے دیوانے تھے اسی طرح وہ بھی ان کا دیوانہ تھا۔ غیر ارادی طور پر رواحہ کے ساتھ ان کا رویہ بھی ویسا ہی دوستانہ تھا جیسے بابا جان کا خود ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے رواحہ کو بالکل ایسے ہی پالا تھا جیسے بابا جان ... انہیں پالا تھا...... وہ تین سال کی عمر میں ماں کی گود سے محروم ہو گئے تھے تو بابا جان نے انہیں ماں کی محبت بھی دی تھی اور باپ کی شفقت بھی...... اور رواحہ چار سال کا تھا جب وہ اس کی ماں بھی بن گئے تھے اور باپ بھی...... پھر تو جیسے انہیں رواحہ کے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ رواحہ کا لباس، اس کی پڑھائی، رواحہ کا اسکول، اس کی دلچسپیاں، اس کے کھانے پینے کی فکر میں وہ جیسے اپنے آپ کو بھی بھول جاتے تھے بالکل اپنے بابا کی طرح...... وہ کالج میں آگئے تھے پھر بھی بابا جان ان کی ایسے ہی فکر کرتے تھے جیسے وہ چھوٹے بچے ہوں...... وہ خود ایک کالج میں فزکس کے لیکچرار تھے...... جبکہ انہوں نے میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کرنے کے بعد ان کی خواہش کے مطابق گورنمنٹ کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ کبھی، کبھار انہیں دیر ہو جاتی تو وہ انتظار میں بیٹھے ہوتے۔

''بابا جان آپ نے کھانا نہیں کھایا؟'' وہ ناراض ہوتے۔

''آپ کھا لیا کریں...... کبھی، کبھار بس نکل جاتی ہے۔ وین بھی نہیں ملتی، لیٹ ہو جاتا ہوں اور آپ اتنی دیر تک بھوکے بیٹھے رہتے ہیں۔''

''مجھے بھوک نہیں تھی بیٹا۔'' وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے...... اور وہ جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہے، وہ صرف اس لیے کھانا نہیں کھاتے کہ انہوں نے ان کے ساتھ کھانا ہوتا تھا۔ وہ کتنا بھی لیٹ ہو جاتے تھے بابا ان کے آنے تک کھانا نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر سسکی روکی۔

''یہ محبتیں کتنی انمول ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی بدل نہیں ہوتا اور یہ دنیا کے کسی بازار میں نہیں ملتیں...... سارے خزانے لٹا کر بھی نہیں......'' انہوں نے ماں کی گود کی گرمی محسوس نہیں کی تھی...... انہیں ذرا بھی یاد نہیں تھا کہ ان کی ماں کیسی تھی...... لیکن بابا جان نے کبھی انہیں ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ان کو تیار کروانا...... جب وہ چھوٹے تھے ان کے کپڑے استری کرنا...... ا[illegible] اسکول چھوڑنے جانا اور لانا ا[illegible] کھانا کھلانا، خود اپنے ہاتھوں سے پکانا۔

وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی بابا جان کو نہیں بھولے تھے...... ان کی خوشیوں پر خوش ہونے والے ان کی ذرا سی پریشانی پر پریشان ہو جانے والے...... آج بھی جب وہ خود بوڑھے ہو رہے تھے انہیں بابا جان بہت شدت سے یاد آجاتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہیں سے وہ آجائیں اور وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر خوب سارا رو لیں...... اتنے سالوں کا جو غبار دل پر جما ہے وہ غبار دھل جائے۔ آج بھی انہیں بابا جان کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی پہلے تھی لیکن بابا جان نے تو اس وقت ساتھ چھوڑ دیا تھا جب انہیں ان کی بے حد ضرورت تھی۔ جب وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتے تھے جب وہ بالکل تہی داماں ہو گئے تھے۔ خالی ہاتھ، خالی جھولی لیے وہ بابا جان سے لپٹ، لپٹ کر روئے تھے اور بابا جان ان کا اتنا بڑا دکھ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ ان کی آنکھیں جوان بیٹے کا ایک آنسو تک نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ان کی آنکھوں نے کیا، کیا دیکھا اور دل نے کیسے برداشت کی منزلیں طے کیں۔ پھر انہوں نے بھی چپکے سے آنکھیں موند لی تھیں...... اور اگر جو رواحہ نہ ہوتا تو شاید وہ بھی جی نہ پاتے۔ اللہ بھی اپنے بندوں پر

کیسے، کیسے مہربان ہوتا ہے۔ اللہ نے بھی انہیں رواحہ دے کر جینے کا، زندہ رہنے کا جواز دے دیا تھا۔
''سر چائے......'' خدا بخش نے چائے ٹیبل پر لا کر رکھ دی۔
''تھینک یو، خدا بخش......''
''رات کے کھانے کے لیے کیا پکاؤں صاحب......''
''جو دل چاہے پکالو...... رواحہ تو شاید عظام کے ساتھ ڈنر کرے گا۔'' انہوں نے آہستگی سے کہہ کر کپ اٹھالیا۔ اندر بے حد گھٹن تھی...... یا انہیں محسوس ہو رہی تھی وہ کپ ہاتھ میں لیے ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر آگئے...... اور کچھ دیر یونہی سڑک کی طرف دیکھتے رہے...... یہ رہائشی علاقہ تھا۔ ٹریفک نہیں تھا پھر بھی وقفے، وقفے سے گاڑیاں گزر جاتیں پھر ایک گاڑی آہستہ ہوتے، ہوتے بالکل ان کے گیٹ کے پاس آرکی تھی۔ یہ انوکھے سے گرین کلر کی گاڑی...... ان کا دل اتنی تیز رفتاری سے دھڑکا تھا جیسے ابھی دھڑک کر بند ہو جائے گا...... کپ ٹیرس پر پڑی ٹیبل پر رکھ کر وہ بے اختیار ریلنگ پر تھوڑا سا جھکے تھے۔ جیسے اسے آواز دینے لگے ہوں
''ہے...... یہ کیا رنگ پسند کیا ہے تم نے...... انوکھا، عجیب سا میں نے اس سے پہلے یہ رنگ کبھی نہیں دیکھا، کسی گاڑی کا۔'' ان کی اپنی ہی آواز ان کے کانوں میں آئی تھی۔
''ہاں تو جیسے انوکھے اور منفرد ہم، ویسے ہی ہماری گاڑی کا رنگ بھی انوکھا اور منفرد......'' وہ اٹھلائی تھی۔
بے اختیار ہی ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ منتظر نظروں سے گاڑی کی طرف دیکھنے لگے جیسے ابھی گاڑی سے وہ اتر کر خراماں، خراماں چلتی ہوئی گیٹ کی طرف آئے گی...... لیکن یہ کیا گاڑی تو چند منٹ رکنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی...... یہ گرین سینٹرو تھی...... لیکن اس کی گاڑی تو......
اور چوبیس سال بعد بھلا...... پتا نہیں کیوں کبھی، کبھی درمیان میں سے سارے ماہ و سال غائب ہو جاتے تھے اور انہیں لگتا تھا جیسے ابھی کل کی ہی تو بات تھی جب وہ ان کے سنگ تھی۔ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی۔
ایک گہری سانس لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔ زندگی کی آخری سانس تک نہیں...... یادیں تھیں کہ دل و دماغ میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی کوئی یاد کونے کھدروں سے جھانکتی...... دیکھو میں یہاں ہوں، تو کبھی کوئی...... تو یہ طے تھا کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے، کم از کم ان جیسا بندہ زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کرتا ہے اور پھر ایک خزانے کی طرح اس کی حفاظت کرتا ہے...... اور یہ کہ وہ اسے کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ بھلے رواحہ چوتیس سال کا ہو جائے اور اس کے بچے بھی جوان ہو جائیں، وہ ان کے دل میں اسی طرح براجمان رہے گی...... اتنا ہی ٹوٹ کر چاہا تھا انہوں نے اسے...... پہلی بار وہ انہیں مونا کی برتھ ڈے پر ملی تھی...... ہمیشہ کی طرح وہ لیٹ ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ ہمیشہ ہی لیٹ ہو جاتے تھے۔ کبھی انہیں یاد نہیں رہتا تھا کہ آج مونا کا برتھ ڈے ہے اور کبھی وہ کسی مصروفیت میں پڑ کر لیٹ ہو جاتے تھے...... مونا انہیں بہنوں کی طرح عزیز تھی اور مونا بھی انہیں سگے بھائیوں کی طرح سمجھتی تھی وہ ابھی اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا۔ جب وہ گوجر خان سے لاہور شفٹ ہوئے تھے۔ گوجر خان میں ان کا آبائی گھر تھا اور لاہور میں بابا جان

کو لیکچرر شپ ملی تھی۔ سو انہوں نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا...... اس گھر کی اوپر والی منزل پر مونا کی فیملی رہتی تھی۔ مونا اس کی ہم عمر تھی اور اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا...... مونا کی امی اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بابا جان کو اگر کہیں ضروری جانا ہوتا تو وہ ہمیشہ اسے مونا کی امی کے پاس چھوڑ جاتے تھے چونکہ ان کا بیٹا نہیں تھا اس لیے اسے وہاں بہت توجہ ملتی تھی۔ یوں اس کا بچپن مونا کے گھر میں ہی گزرا تھا تو اس روز بھی وہ مونا کی برتھ ڈے پارٹی میں وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ سو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ اس سے ٹکرا گیا...... وہ بھی شاید تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی...... سوری دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا...... اور پھر دونوں ہی مسکرا دیے تھے...... اور وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی عجلت سے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ اس نے آخری سیڑھی پر جا کر مڑ کر اسے دیکھا تھا، وہ گیٹ کے باہر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس لڑکی کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... شاید مونا کی کوئی دوست تھی۔ وہ سر جھٹک کر اندر لاؤنج میں چلا گیا۔ چونکہ یہ گھر کرائے پر دینے کی نیت سے ہی بنوایا گیا تھا اس لیے فرسٹ فلور کی سیڑھیاں مین گیٹ کے اندر اندرونی گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھیں۔
''آپ ہمیشہ کی طرح لیٹ ہیں بھائی۔'' مونا نے گلہ کیا تھا۔
''ایکسٹریملی سوری مونا...... آج تو صبح سے لے کر اب تک میں نے کوئی پچاس دفعہ خود کو بتایا تھا کہ آج تمہاری برتھ ڈے پارٹی میں لیٹ نہیں ہونا مجھے...... اور میرا تو ارادہ بھی نہیں تھا گھر سے جانے کا لیکن پھر بس گھنٹا بھر پہلے ایک دوست کا فون آگیا...... اس کے فادر کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا...... میرا خیال تھا کہ بس تھوڑی دیر کے لیے اسپتال جا کر مزاج پرسی کر آؤں گا...... لیکن بس پھر نہ چاہتے ہوئے بھی دیر ہو گئی...... ٹریفک میں پھنس گیا تھا اس لیے بھاگم بھاگ سیدھا اوپر آیا ہوں...... اور تمہارا گفٹ بھی نیچے پڑا ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا تھا اور اس کی وضاحت پر مونا کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا لیکن اس نے معذرت کی۔
''سوری بھائی، آج آپ کا انتظار نہیں کر سکے۔ چندا کو جانا تھا۔''
''اب تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو مونا۔'' اس کی بہن نے کیک اس کی طرف بڑھایا تھا۔
''بھائی کیک لیں۔''
''مینا چینا کی بچی صرف کیک پر ٹرخاؤ گی۔''
''نہیں بھائی اور بھی سب لیں ناں...... وہ میں نے تو کیک پہلے دیا ہے۔'' وہ گھبرا کر بولی تھی۔ مینا ایسی ہی تھی جلد گھبرا جاتی تھی اور چھوٹی، چھوٹی باتوں پر پزل ہو جاتی تھی حالانکہ میٹرک میں تھی۔
''بھائی صاحب نہیں آئے کیا؟'' مونا کی امی اندر آئی تھیں۔
''بابا تو نیچے ہی ہیں، میں تو باہر سے ہی آگیا ہوں۔''
''میں گئی تھی انہیں بلانے...... انہوں نے معذرت کر لی تھی۔'' مینا نے بتایا تھا۔
''میں ابھی انہیں کیک اور دوسری چیزیں دے کر آتی ہوں۔''
مونا کی برتھ ڈے پارٹی میں گھر کے افراد کے علاوہ وہ، بابا جان اور ایک دو سہیلیاں ہوتی تھیں۔
''آج تمہاری سہیلیاں نہیں آئیں مونا......؟'' اس نے کبابوں سے انصاف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں، مہر اور افروز کو کوئی کام تھا۔ صرف چندا آئی تھی۔"

"یہ غالباً نئی دوست ہے تمہاری۔" اس نے کیچپ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بظاہر بے پروائی سے پوچھا تھا لیکن آنکھوں کے سامنے اس کا سراپا لہرا گیا تھا۔

"نئی تو نہیں تھرڈ ایئر سے ہم ساتھ ہیں لیکن ہمارے گھر پہلی دفعہ آئی ہے...... اور وہ بھی اسے جانا پڑا اس کی پھپو کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ گھر سے فون آگیا۔ دراصل اس کی پھپو بیوہ ہیں اور ان کے گھر میں ہی رہتی ہیں۔ چندا کو بہت پیار ہے اپنی پھپو سے۔"

"تب ہی وہ پریشان لگ رہی تھی۔" اس نے سوچا تھا۔ کسی نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام رکھا ہے۔ "چندا" اس رات جب وہ بیڈ پر لیٹا تو اس کے دل میں خیال آیا تھا حالانکہ اس نے بہت دھیان سے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ پہلی نظر میں ہی جیسے دل میں اتر گئی تھی۔ جی سی میں اس کی کلاس میں کئی لڑکیاں پڑھتی تھیں جن میں خوب صورت بھی تھیں...... لیکن کبھی اس نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ نہ کسی کو دھیان سے دیکھا تھا...... اگر کوئی لڑکی کالج کے علاوہ کہیں مل جاتی تو شاید وہ پہچان بھی نہ پاتا لیکن یہ لڑکی بہت خاص ہے۔ سونے سے پہلے نہ جانے کتنی بار اس نے اسے سوچا تھا۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی لیکن اس میں عجب طرح کا وقار اور بے نیازی تھی...... میک اپ سے بے نیاز، صاف ستھرا، چہرہ اور میک اپ کی بھلا اسے ضرورت بھی کیا تھی۔

"کوئی خاص بات ہے کیا......؟" صبح وہ ناشتے کی میز پر آیا تو بابا جان نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"نہیں تو......" وہ سٹپٹایا تھا۔

"شیور......؟"

"یس بابا جان"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے کوئی خاص بات ہو۔" انہوں نے آملیٹ کی پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔ بابا جان بھی جیسے اس کے دل کے اندر اتر جاتے تھے۔

"نہیں بابا جان کل پورے دن میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ شکیل کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا، وہ اسپتال میں ایڈمٹ تھے اور مونا کی برتھ ڈے پارٹی میں حسب معمول لیٹ ہوگیا اور سیڑھیوں پر ایک لڑکی سے ٹکرا گیا جو مونا کی کوئی دوست تھی۔"

"تو اس میں خاص بات تو لڑکی سے ٹکرانا ہوئی ناں چلو سچ بتانا کیسی تھی وہ......؟"

"پتا نہیں بابا جان......" وہ جھینپ گیا تھا۔ "میں نے دھیان سے نہیں دیکھا۔"

"دھیان سے نہیں دیکھا تو پھر یہ حال ہے کہ کل سے کھوئے، کھوئے ہو...... دھیان سے دیکھ لیتے تو پھر کیا حال ہوتا میری جان۔" بابا جان مسکرا رہے تھے...... اور وہ سوچ رہا تھا کہ بابا جان بھی کیا غضب کے قیافہ شناس تھے۔

ضروری تو نہیں تھا کہ وہ لڑکی دوبارہ اسے ملتی یا پھر...... یہ بابا بھی ناں بس......

وہ سر جھٹک کر سلائس پر مکھن لگانے لگا تھا۔

"سنو صاحبزادے!" بابا جان کے چہرے پر سنجیدگی نظر آئی تھی۔ "صرف دو سال ہیں تمہارے پاس، تمہارا ماسٹر کمپلیٹ ہوتے ہی میں تمہاری شادی کر دوں گا...... ان دو سالوں میں اگر کوئی لڑکی تمہیں پسند آگئی

تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنی پسند سے کروں گا تمہاری شادی۔"

"کیا مطلب......؟" وہ تو جیسے اچھل ہی پڑا تھا۔

"یعنی کہ اڑنے سے پہلے ہی گرفتار کرنے کے ارادے ہیں۔ میں پہلے اپنا کیریئر بناؤں گا اور پھر شادی۔"

"اس گھر کو ایک عورت کی سخت ضرورت ہے میری جان...... کتنے سالوں سے مجھے اس دن کا انتظار ہے جب تمہاری ایجوکیشن کمپلیٹ ہو...... اور میں تمہارے سر پر سہرا سجاؤں۔"

"ہرگز نہیں...... میں سہرا ہرگز نہیں باندھوں گا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور بابا جان ہنس پڑے تھے۔

"یار محاورتاً کہہ رہا ہوں۔ تمہاری ماں کے بعد اس گھر میں کبھی وہ حسن نظر نہیں آیا جو عورت کے دم سے ہوتا ہے۔ یہ گھر عورت کے وجود کی خوشیوں سے خالی ہوگیا ہے۔"

"تو بابا جان......" اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔ "آپ اس گھر کو کیوں عورت کی خوشبو سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ مس خان آپ کی کولیگ کتنی آس سے آپ کو دیکھتی ہیں...... اور مجھے بھی وہ بطور ماما دل و جان سے قبول ہیں...... اور وہ میڈم صمدانی...... وہی گوجر خان والی جن کی اپنی اکیڈمی تھی۔ کتنی خواہش تھی ان کی کہ وہ میری ماما بن کر میرے سارے دکھ سمیٹ لیں۔"

"مذاق نہیں یار میں سنجیدہ ہوں...... دو سال بعد تمہاری شادی...... ہاں......" بابا جان سچ مچ سیریس لگ رہے تھے۔

"اور غیر سنجیدہ تو میں بھی نہیں ہوں بابا جان مجھے سچ مچ مس خان اچھی لگتی ہیں اگر آپ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرلیں تو رئیلی مجھے بے حد خوشی ہوگی۔" وہ واقعی سنجیدہ ہوگیا تھا۔ بابا جان نے اس کے لیے صرف اس کے لیے دوسری شادی نہیں کی تھی اور تنہا زندگی گزار دی تھی...... پتا نہیں کتنے ایسے مواقع آئے ہوں گے جب انہیں رفیق زندگی کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

"میں اب بڑا ہوگیا ہوں بابا جان اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں...... آپ مس خان......" اور انہوں نے ذرا سا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔

"نہیں میری جان، تمہاری ماما کے بعد اس دل کو کوئی جچا ہی نہیں...... بھلے وہ میڈم صمدانی ہوں یا مس خان...... ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو دل کے دروازے ایک بار ہی کھولتے ہیں بار بار نہیں......"

اور اب وہ خود بھی تو اپنے بابا جان کی طرح ہی تھے جنہوں نے دل کے دروازے صرف ایک بار ہی کھولے تھے اور پھر بند کرلیے تھے ہمیشہ کے لیے...... شروع، شروع میں جب رواحہ ان کے پاس آیا تھا تو کتنا تنگ کرتا تھا...... ہر وقت ماما، ماما کی رٹ لگائے رکھتا تھا...... رات کو کسی وقت اٹھ جاتا تو اسے بہلانا بہت مشکل ہوجاتا تھا تب دوستوں نے کتنی بار ہی دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا لیکن دل کے دروازے تو بند ہوچکے تھے اور وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔

لیکن اس روز ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کرتے ہوئے وہ بابا جان کا نقطہ نظر سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا [illegible]...... یک دم ہی اس کے دل میں بابا جان کی ویران اور تنہا زندگی کا خیال ٹھہر سا گیا تھا اور وہ ان سے بحث کر رہا تھا

"بابا جان دل کے دروازے بھلے نہ کھولیں گھر کے دروازے کھول دیں، آنے والی محترمہ خود ہی دل کے دروازے کھلوا لیں گی۔"

"یار تم لاحاصل بحث کیوں کرتے ہو...... جب جانتے ہو یہ ممکن نہیں......"

"آپ کو ماما سے بہت محبت تھی؟" وہ متاثر ہوا تھا۔

"ہاں بہت...... میں نے شادی سے پہلے تمہاری ماما کو نہیں دیکھا تھا۔ اور پہلی بار جب دیکھا نکاح کے بعد تو وہ جیسے دل میں آ کر دھرنا جما کر بیٹھ گئیں۔"

"اور اب تک دھرنا جمائے بیٹھی ہیں۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"ہاں......" وہ مسکرائے تھے۔ "مجھے تمہاری ماما سے اسی لمحے محبت ہو گئی تھی اور آج تک وہ محبت میرے دل کو روشن رکھے ہوئے ہے۔"

اور اسے لگا تھا دل میں موجود محبت نے ان کا چہرہ روشن کر دیا ہے۔

"لیکن میں تو پہلے محبت کروں گا پھر شادی۔" وہ شوخ ہوا تھا۔ "خوب سمجھ کر پرکھ کر محبت کروں گا۔"

"جو بھی کرو لیکن صرف دو سال......" انہوں نے تنبیہہ کی تھی۔

"صرف دو سال بہت تھوڑے ہیں بابا جان...... محبت کرنے کے لیے...... کچھ رعایت ہونی چاہیے۔"

"محبت کے لیے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے میری جان...... جب محبت ہوتی ہے تو ایک لمحے میں ہو جاتی ہے اور جب نہیں ہونا ہوتی تو صدیوں ساتھ رہنے پر بھی نہیں ہوتی۔"

"حالانکہ میں نے سنا ہے کہ ایک ساتھ رہنے سے دیواروں اور جانوروں سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔"

"تم اسے اُنس کہہ سکتے ہو، لگاؤ کہہ سکتے ہو شاید محبت بھی...... لیکن جس محبت کی بات میں کر رہا ہوں وہ ایک لمحے میں ہو جاتی ہے اور کبھی صدیوں ساتھ رہنے سے بھی نہیں ہوتی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبت کوئی متوازن عمل نہیں ہے۔" اس نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ بابا جان سے کسی موضوع پر بات کرنا، بحث کرنا اسے ہمیشہ ہی اچھا لگتا تھا۔

"یہ تم سے کس نے کہا میری جان کہ محبت ایک متوازن عمل ہے...... اس سے زیادہ الجھا ہوا اور غیر متوازن عمل پوری کائنات میں نہیں...... اور۔" انہوں نے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکایا تھا۔

"محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا...... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف بے وزنی ہی بے وزنی رہتی ہے...... بے وزنی کی کیفیت میں انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ خود کو اس بے وزنی میں سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو محسوس کر لیا جائے۔ پتا نہیں ہر بندہ یہ کیوں سوچتا ہے کہ محبت ایک متوازن عمل ہے۔"

"محبت متوازن عمل ہے یا غیر متوازن...... لیکن بابا جان صبح صبح آپ نے اتنی ثقیل گفتگو کر کے ہاضمہ ضرور خراب کر دیا ہے۔ بخدا مجھے آپ کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا...... لیکن میں اب محبت کرنے سے پہلے سوچوں گا ضرور......"

"برخوردار جب محبت تم پر حملہ آور ہو گی تو یہ تمہیں سوچنے کا موقع تک نہیں دے گی...... بس اچانک حملہ

کرے گی اور تم اس کے مفتوح ہو جاؤ گے اور وہ ایک فاتح کی طرح غرور سے سر اٹھا کر تمہیں دیکھے گی اور تم ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح اپنے ہتھیار اس کے قدموں میں ڈال دو گے۔"

"بابا جان پلیز...... آپ خلیل جبران بننے کی کوشش مت کریں...... مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے جو میرے سارے اختیار مجھ سے چھین لے اور میں کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دوں...... نو، نیور...... بس آپ خود ہی کر دیجیے گا میری شادی کسی بھی لڑکی سے۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا تھا اور بابا جان چائے کے سپ لیتے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے...... اور پھر وہی ہوا جو بابا جان نے کہا تھا جب محبت اس پر حملہ آور ہوئی تو اسے پتا ہی نہیں چلا بس ایک لمحے کا کھیل تھا اور وہ اسیر ہو چکا تھا۔

اس روز وہ بابا جان کے بار بار یاد دلانے پر اوپر آیا تھا مونا کے والد سے ملنے جو شارجہ میں جاب کرتے تھے اور سال میں ایک بار ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر آتے تھے...... وہ آئے ہوئے تھے اور بقول بابا جان کئی دفعہ اس کے متعلق پوچھ چکے تھے تو اس روز وہ نصر صاحب سے ملنے اوپر آیا تھا لیکن نصر صاحب تو گھر پر نہیں تھے، ہاں لاؤنج میں مونا کے ساتھ وہی بیٹھی تھی...... اس دن والی لڑکی۔ اس کے ہاتھ میں چپس کا پیکٹ تھا اور وہ ایک، ایک چپس نہایت نفاست سے دو انگلیوں سے پکڑ کر دانتوں سے کترتی تھی۔

"ماما، پاپا تو کسی دوست کی طرف گئے ہوئے ہیں آپ بیٹھیں گے بھائی؟"

"نہیں چلوں گا...... ویسے تم یہ فارمیلٹی نبھانے کے بجائے صاف، صاف بھی کہہ سکتی تھیں کہ "بھائی جائیں اس وقت میں اپنی سہیلی کے ساتھ مصروف ہوں۔"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا آپ بیٹھیں پلیز، یہ میری دوست ہے چندا۔" مونا ذرا سا شرمندہ ہوئی تھی۔

"اور میں چاند......" وہ تھوڑا سا جھکا تھا۔

بچپن میں ماما نے اسے چاند کہہ کر پکارا تھا اور پھر تو اسے آس پاس اِدھر اُدھر عزیز رشتے دار سب ہی چاند کہہ کر بلانے لگے تھے اور اس کا اصل نام تو جیسے سب بھول ہی گئے تھے۔ بابا جان ابھی تک اسے چاند کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ خیر بابا جان کسی ایک نام سے تو بلاتے نہیں تھے...... ان کے پاس تو ناموں کا ذخیرہ تھا۔

"ویسے مونا تمہاری دوست کا نام چاندنی ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا......" باقی کا جملہ اس نے دل میں کہا تھا۔

"چاند کی چاندنی......" لیکن اس کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

تھینک گاڈ کہ اس نے پورا جملہ بلند آواز میں نہیں کہا تھا...... وہ ایسا نہیں تھا لیکن خود بخود ہی منہ سے پھسل گیا تھا اور اب وہ شرمندہ ہو رہا تھا اور وہ آنکھوں میں ناراضی لیے اسے تک رہی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔

"سوری مس...... میں مذاق کر رہا تھا، آپ کو برا لگا ہو تو......" اس نے کندھے اچکائے تھے اور بڑی

-نیازی سے مڑ کر مونا سے کوئی بات کرنے لگی تھی اور اسے اس وقت وہاں کھڑے رہنا بڑا آکورڈ لگا تھا......
یعنی وہ...... اسے اس لڑکی نے اس طرح نظرانداز کیا تھا جیسے وہ کچھ بھی نہیں تھا...... اس نے تو ہمیشہ لڑکیوں کی نظروں میں اپنے لیے ستائش ہی دیکھی تھی......اور یہ لڑکی......

''اوکے مونا، میں چلتا ہوں۔'' وہ مڑا تھا۔

''نہیں بھائی پلیز بیٹھیں ناں...... مینا چائے لا رہی ہے۔ چائے پی کر جایئے گا۔'' اس بار مونا نے دل سے اصرار کیا تھا......شاید اس نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

''نہیں...... پھر آؤں گا...... تمہاری دوست کو ناگوار گزر رہا ہے۔'' وہ یک دم ہی بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اور تب ہی اس نے نظریں اٹھائی تھیں۔ اور وہی بے نیازی نظر...... وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں ۔اور یہی وہ لمحہ تھا جب محبت نے اس پر شب خون مارا تھا...... اور وہ بے بس سا اپنی محبت کے سامنے ہتھیار پھینک رہا تھا۔

''یہ میرا گھر نہیں ہے جو مجھے ناگوار گزرے گا...... آپ شوق سے بیٹھیں میں تو یوں بھی جا ہی رہی تھی۔'' اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

لیکن وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے واپس مڑا تھا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔

''تو یہ محبت ہے......یعنی محبت......'' گھر آ کر اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

یعنی اسے اس لڑکی چندا سے محبت ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کی بات تھی اور محبت اس کے دل کے دروازے کھلے دیکھ کر مسند نشین ہو گئی تھی۔

اس لڑکی سے محبت جو بلاشبہ بہت خوب صورت تھی جس کے میک اپ سے بے نیاز چہرے پر بلا کی ملاحت اور کشش تھی، نہ اس نے بھویں بنائی ہوئی تھیں اور نہ آنکھوں میں کاجل تھا اور نہ ہی مسکارے سے پلکوں کو بوجھل کر رکھا تھا...... نہ ہونٹوں کو لپ اسٹک سے رنگا ہوا تھا۔ سب کچھ بہت نیچرل تھا۔

''واٹ آ نان سینس......'' یعنی وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنی ناراضی اور غصہ تھا اور جو ماتھے پر بل ڈالے اس طرح اسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت ہی غلط آدمی ہو۔ اس نے اپنے آپ کو جھٹلایا تھا۔

''اور یہ محبت ہرگز نہیں ہے...... اور میں بالکل بھی اس لڑکی سے محبت نہیں کرتا...... کس قدر احمقانہ سی بات ہے ناں کہ ایک نظر دیکھ کر آپ کسی سے محبت کرنے لگیں...... جس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہو۔ ...اور میں اتنا احمق ہرگز نہیں ہوں......'' اس نے خود کو یقین دلایا تھا...... لیکن رات کو کھانے کی ٹیبل پر وہ بابا جان سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ یک طرفہ محبت کیا ہوتی ہے بابا جان ۔ اگر دوسرا شخص آپ سے محبت نہ کرتا ہو...... اگر اس کے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہ ہو جو آپ کے دل میں اس کے لیے پیدا ہوا ہو تو کیا پھر بھی وہ محبت ہی ہے؟''

''ہاں پھر بھی وہ محبت ہے لیکن جان عزیز یہ یک طرفہ محبت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بہت اذیت ناک......'' انہوں نے بغور اسے دیکھا تھا۔

''یہ بہت گہرے زخم دیتی ہے جو کبھی بھر نہیں پاتے...... یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی غیر زمینوں کی

محبت دل میں بسا بیٹھے جو اس کی اپنی نہ ہوں...... اس شے کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرے اس کے پیچھے بھاگے جس کا مالک کوئی اور ہو۔''

''بابا جان کیا ایسا ہوتا ہے کبھی کہ آپ کسی سے محبت کرنے لگیں لیکن وہ آپ سے محبت نہ کرتا ہو...... آپ اپنے ہتھیار اس کے قدموں میں ڈال دیں مگر اسے فاتح بننے کا شوق نہ ہو...... آپ محبت کے سامنے بے بس ہو جائیں اور اسے آپ کی بے بسی سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔'' اس کا دل بری طرح کانپا تھا لیکن بظاہر اس نے بڑے نارمل انداز میں ڈونگے سے سالن اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہوتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے میرے چاند...... اللہ نہ کرے کہ تمہارا دل کبھی ایسی محبت سے آشنا ہو...... یہ یک طرفہ محبت بہت ظالم ہوتی ہے۔ جان و دل کو تباہ کر ڈالتی ہے۔'' اور اس نے سوچا تھا کہ وہ یک طرفہ محبت کا روگ ہرگز نہیں پالے گا۔

''محبت کا مزہ تو تب ہی ہے ناں کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ یہ کیا کہ آدمی محبت کرتا رہے اور اس محبت میں مٹ کر فنا ہو جائے اور اگلے بندے کے دل پر رتی بھر اثر نہ ہو۔ تو یہ طے ہے کہ اسے اس لڑکی چندا سے محبت نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا دل اتنا کمزور ہے کہ ایک لمحے کا اسیر ہو جائے۔'' وہ بے حد مطمئن سا ہو کر اور خود کو یقین دلا کر بہت شوق سے کھانا کھانے لگا تھا لیکن اس کے جھٹلانے اور خود کو یقین دلانے سے کیا ہوتا...... محبت تو پوری شدت سے حملہ آور ہو چکی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوچتا رہتا اور تب ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ مونا کے پاس آیا تھا۔

''سنو مونا وہ تمہاری دوست چندا......''

''سوری بھائی، وہ اس روز اس کا موڈ بہت خراب تھا...... ورنہ وہ اتنی روڈ ہرگز نہیں ہے، بہت خوش اخلاق ہے۔''

''لیکن مجھے تو نہیں لگا تھا کہ وہ روڈ ہے، دراصل غلطی میری تھی، مجھے یوں ایک اجنبی لڑکی سے بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا...... بس بے اختیار ہی لبوں سے نکل گیا تھا۔''

''دراصل وہ سمجھی کہ آپ نے جان بوجھ کر اپنا نام چاند بتایا ہے...... لیکن میں نے بعد میں بتا دیا تھا اور ہم اس اتفاق پر بہت ہنسے تھے۔''

''اچھا......'' وہ خوش ہو گیا تھا۔

''وہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہے ناں......؟''

''وہ بھلا آپ سے کیوں ناراض ہو گی؟'' مونا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اور اپنے اس احمقانہ سوال پر وہ خود ہی شرمندہ ہوا تھا۔ یعنی محبت آدمی کو احمق بھی بنا دیتی ہے اور یہ بات بابا جان نے اسے نہیں بتائی تھی...... اب بھلا اس کے ساتھ اس کا ایسا کیا رشتہ تھا کہ وہ اس سے ناراض ہوتی۔

''سوری...... میرا مطلب تھا وہ تم سے ناراض تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں...... وہ میری بہت اچھی دوست ہے...... لیکن کیا بات ہے بھائی آپ نے پہلے تو میری کسی دوست میں دلچسپی نہیں لی...... خیر ہے ناں......؟'' اب کے مونا سچ مچ چونکی تھی اور اس کی آنکھیں

شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''ہاں خیر ہی ہے۔''

اس نے نظریں چرائی تھیں۔

''بھائی......'' مونا کو وہ سگے بھائیوں کی طرح ہی عزیز تھا۔ ''چندا اگرچہ دیکھنے میں نہیں لگتی لیکن بہت دولت مند لڑکی ہے...... اس کی اپنی ذاتی گاڑی ہی لاکھوں کی ہے اور میں ایک بار ان کے گھر گئی تھی چار گاڑیاں تو ان کے ڈرائیو وے پر کھڑی تھیں۔ اس میں امیر لڑکیوں والا نخرہ نہیں ہے۔ وہ بہت سادہ مزاج ہے اور اگر وہ یہاں بیٹھ کر آپ سے گپ بھی لگا لیتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا...... اس کے گھر کا ماحول ہمارے متوسط گھرانوں جیسا نہیں ہے۔''

''لیکن یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو مونا؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''بس یونہی...... اور ایک بار میں اس کے گھر گئی تھی تو اس کی ممی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بات بچپن سے اپنے کسی کزن سے طے ہے۔''

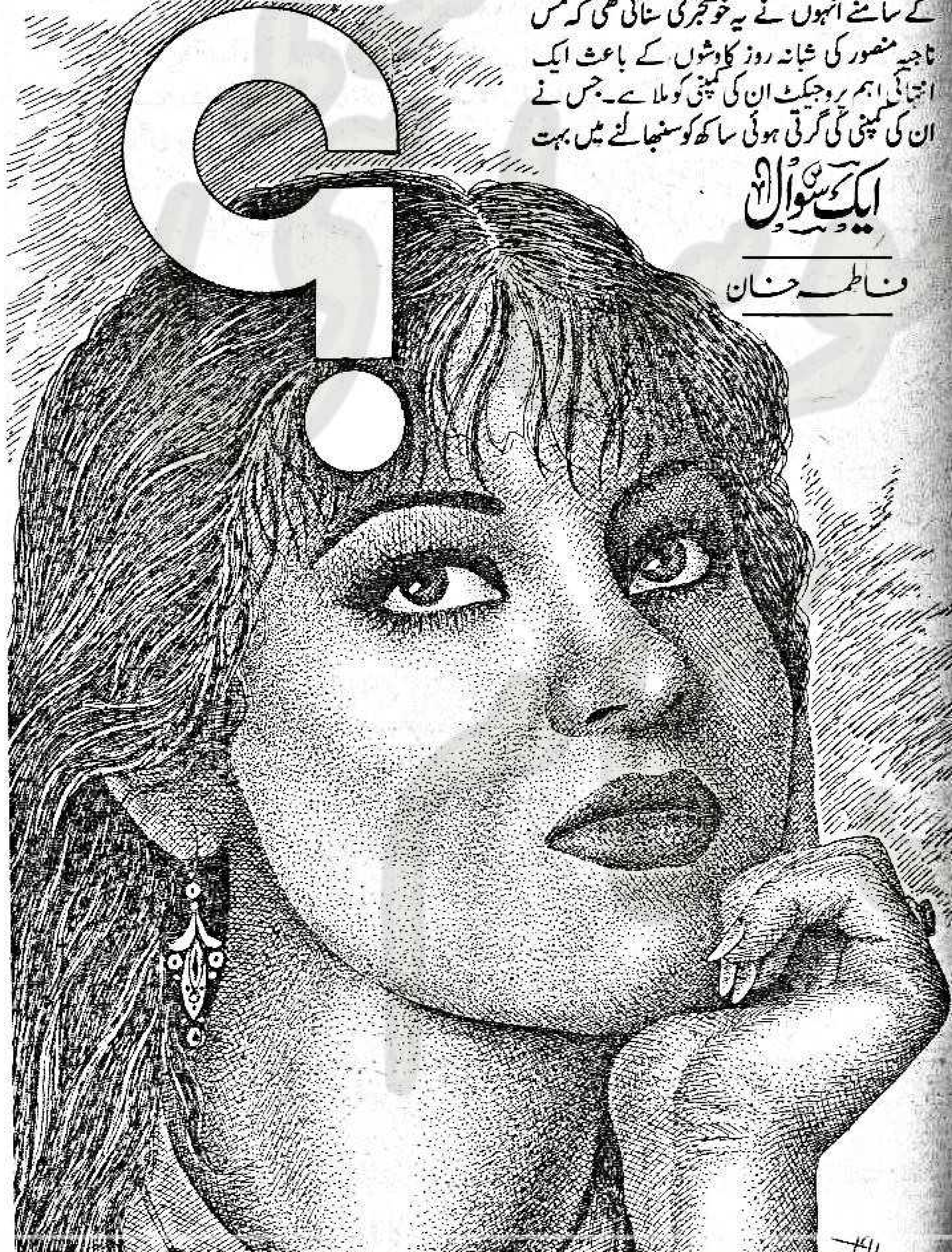
اور اسے لگا تھا جیسے وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اوندھے منہ گر گیا ہے...... یک طرفہ محبت کی آنچ سے اس کا دل جیسے جل جل کر راکھ ہو رہا تھا اور اسے اپنے دل میں ان زخموں کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں جو کبھی نہیں بھرتے اور جو یک طرفہ محبت کی دین ہوتے ہیں۔ اس نے ممنون نظروں سے مونا کی طرف دیکھا تھا...... وہ سمجھ گیا تھا کہ مونا یہ سب کچھ اسے کیوں بتا رہی ہے...... اس کا دل سچ مچ جان نثار کرنے والی بہن کا دل تھا اور وہ جیسے اسے روک رہی تھی منع کر رہی تھی کہ وہ اپنے قدموں کو وہاں ہی روک لے کہ یہ راستے منزل کی طرف نہیں جاتے اور جن راستوں کے اختتام پر منزل نہ ہو وہ سفر آبلہ پائی کے سوا کچھ نہیں دیتا...... لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش بیکار ہے اور وہ اس راستے پر قدم رکھ چکا ہے۔

ٹیرس کی ریلنگ پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پڑی تھیں اور گیٹ کے پاس کسی گاڑی کے رکنے کی اور پھر ہارن کی آواز آئی تھی......

''ارے یہ تو رواحہ کی گاڑی کا ہارن ہے۔''

وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا...... گیٹ کی اور پورچ کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ وہ اتنی دیر سے ماضی میں کھوئے ہوئے تھے اور انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا...... جب، جب انہیں ماضی کی یادیں بے قرار کرتیں وہ یونہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ انہوں نے اندھیرے میں ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کی طرف دیکھا جو یونہی پڑا ہوا تھا...... اور پھر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ خدا بخش گیٹ کھول رہا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تھی اور اس کے پیچھے ہی دوسری گاڑی آ کر رکی تھی جس سے دو مسلح شخص کود کر باہر آئے تھے۔ خدا بخش نے گیٹ بند کر دیا تھا اور ہاتھ میں گنیں اٹھائے وہ دونوں شخص گیٹ کے باہر کھڑے تھے...... اور ان کا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔

جاری ہے



ایک سوال

فاطمہ حنان

وہ دن عام دنوں جیسا ہی کوئی دن تھا مگر ناجیہ منصور کے لیے وہ بہت خاص دن تھا۔ اس کی تین ماہ کی ان تھک محنت کا صلہ اس روز میٹنگ میں ایم ڈی صاحب نے اسے دے ہی دیا تھا۔ تمام آفس ورکرز کے سامنے انہوں نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ مس ناجیہ منصور کی شبانہ روز کاوشوں کے باعث ایک انتہائی اہم پروجیکٹ ان کی کمپنی کو ملا ہے۔ جس نے ان کی کمپنی کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایم ڈی صاحب نے نہ صرف ناجیہ کی سیلری میں اضافہ کیا تھا بلکہ اس کی پروموشن بھی کر دی گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ناجیہ کو ایک برانڈ نیو کار بھی ملی تھی۔ ناجیہ کو یہ سب خواب سا لگ

رہا تھا۔ اپنے آپ میں مگن رہنے والی ناجیہ اس روز باقاعدہ طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کے تمام کولیگز اسے سراہ رہے تھے اور اس کی محنت سے ملی کامیابی پر اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

وہ اس دن بہت معتبر ہو گئی تھی، میٹنگ کا اختتام ہو چکا تھا۔ تمام آفس کولیگز اسے مبارک باد بھی دے رہے تھے اور ساتھ ہی اس سے ٹریٹ کا مطالبہ بھی جاری تھا۔ ناجیہ مسکرا، مسکرا کر سب کی مبارک بادیں وصول کر رہی تھی۔ ابھی چھ ماہ پہلے ہی تو اس نے یہ آفس جوائن کیا تھا اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابی ملنے پر سب اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اس کے خیر خواہ تھے اور کچھ حاسدین بھی تھے جس کا اندازہ ناجیہ کو چند دنوں میں ہی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ اپنی نئی سیٹ سنبھال چکی تھی اور اس نے اپنے کام کا آغاز بھی کر دیا تھا وہ بہت پُرجوش تھی۔ اس نے اپنی اس خوشی کو ابھی تک اپنی ماں کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا حالانکہ باس نے دو دن پہلے ہی اسے پروموشن لیٹر دے دیا تھا مگر آج وہ اپنی نئی گاڑی میں اپنے گھر جا کر ماں کو سرپرائز دینا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی کامیابیوں پر ماں سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہو گا۔ اس پوری دنیا میں ایک اس کی ماں ہی تو اس کا واحد سہارا تھی۔

جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو وہ صرف پانچ برس کی ہی تو تھی۔ اس کی ماں نے جن حالات میں اس کی پرورش کی تھی وہ اس سب سے آگاہ تھی بلکہ ماں کے ساتھ، ساتھ وہ بھی ان مشکلات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ مگر اب وقت آ گیا تھا کہ اس کی ماں اپنی محنت کا پھل اپنی بیٹی کی کامیابیوں کی صورت میں وصول کرے۔

آفس میں کام کرتے، کرتے اسے گزرتے وقت کا احساس نہ رہا۔ جب اس کا کام ختم ہوا تو آفس ٹائمنگ ختم ہوئے بھی دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اکثر لوگ جا چکے تھے۔ اب صرف وہی ملازمین باقی رہ گئے تھے جو اُدھر ہی نائٹ شفٹ میں کام کرتے تھے۔ اس نے جلدی، جلدی اپنی ضروری چیزیں اٹھائیں اور نیچے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے ہی لگی تھی کہ آفس کے اسٹور روم سے اٹھتی کچھ آوازوں نے اس کے بڑھتے قدم روک لیے۔

”سراج، میڈم ناجیہ کی تو آج لاٹری نکل آئی ہے، کیسے مسکرا، مسکرا کر وہ ایم ڈی صاحب کے ہاتھوں سے گاڑی کی چابیاں پکڑ رہی تھیں۔“

”مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔“ ایک اور آواز ابھری۔

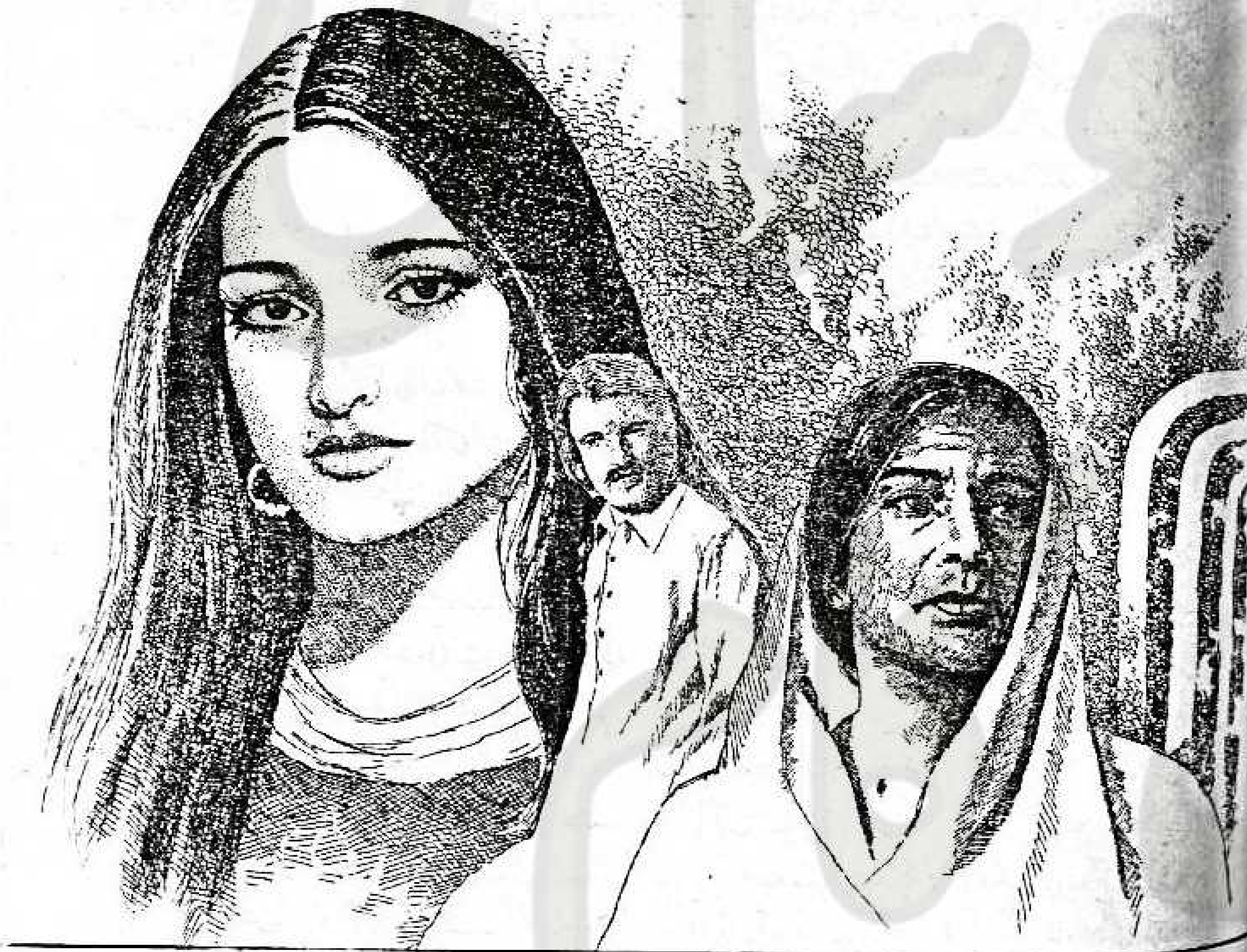
”سنا ہے میڈم اکیلی رہتی ہے۔ صرف اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ...... ایک دو بار رات کو آفس کے کچھ لوگوں نے ایم ڈی صاحب کی گاڑی میڈم ناجیہ کے گھر کے باہر کھڑی دیکھی ہے...... آگے تم خود سمجھدار ہو۔“ اتنا کہہ کر وہ آواز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی پھر کچھ دبے، دبے قہقہے ناجیہ نے سنے مگر اب مزید کچھ سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ اس لیے تھکے، تھکے قدموں سے وہ سیڑھیوں سے نیچے اتری اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ صبح جتنی خوش تھی اب اتنی ہی افسردہ تھی۔ لوئر اسٹاف کے وہ جملے ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برس رہے تھے۔ اس کا پورا وجود چیخ، چیخ کر لوگوں سے مسلسل ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

”کیا ایک اکیلی لڑکی کا کردار اتنا سستا ہوتا ہے کہ اسے سر بازار رُسوا کیا جائے۔“

مگر وہ جانتی تھی کہ اس سوال کا جواب اسے کبھی نہیں مل سکے گا۔ کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟

دلدل

نگہت اعظمی



شایان اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا اماں سے باتوں میں مصروف تھا۔ نئی، نئی زندگی کا خمار دونوں کے چہروں پر خوشی بن کر جھلملا رہا تھا۔ شایان کی باتوں پر عائلہ مسلسل مسکرا رہی تھی اور اماں نظروں ہی نظروں میں دونوں کے کھلتے ہوئے چہروں کی بلائیں لے رہی تھیں اور وہ ہمیشہ کی طرح کچن میں سب کے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی...... لیکن کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود اس کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔

”تم آملیٹ کے لیے پیاز کاٹ تو میں آتی

ہوں......'' عالیہ پیاز اور چھری شہناز کے ہاتھوں میں تھما کر کچن سے لاؤنج میں آئی تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے شایان کا وہ جملہ سنا جو وہ اپنی بیوی سے اماں کے بارے میں کہہ رہا تھا اور ان الفاظ کو سن کر اماں کے چہرے پر جو کیفیت رقم ہو رہی تھی اس نے ایک پل میں اسے زندگی سے موت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر دوبارہ کچن میں آ گئی۔

''تم نے کتنی موٹی پیاز کاٹی ہے، سو دفعہ سمجھایا ہے کہ آملیٹ کے لیے پیاز بہت باریک کٹتی ہے۔'' اس نے شہناز کو جھڑک کر اس کے ہاتھ سے چھری اور پیاز لی اور دوبارہ اسے کاٹنے لگی۔

شہناز نے حیرانی سے اسے دیکھا، عالیہ کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

''باجی آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے، آپ جائیں میں ناشتا تیار کرلوں گی......'' وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عالیہ بہت صابر اور شاکر عورت ہے وہ کبھی کسی پر بلاوجہ غصہ نہیں کرتی۔

''تم اکیلے کتنا کام کرو گی...... میں آملیٹ بنا لیتی ہوں، تم پراٹھے بنانا شروع کردو۔'' عالیہ کو اپنی غلطی کا فوری احساس ہو گیا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

''باجی آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ اب آپ کی بہو آ گئی ہے، چند دن بعد وہ گھر سنبھالے گی اور آپ آرام کیجیے گا۔'' شہناز اس گھر میں بہت عرصے سے کام کر رہی تھی۔ وہ گھر کی اندرونی باتوں سے کسی حد تک واقف تھی۔ اس نے اپنے حساب سے اسے تسلی دی۔

''انشاء اللہ۔'' وہ اس کی بات کا مختصر جواب دے کر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

لاؤنج سے شایان کے قہقہے کی آواز آئی تو پھر اس کا دل بے اختیار اس کے پاس بیٹھنے کو ہمکنے لگا لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ شایان اس کی زندگی تھا، اس کی محبت تھا، اس کا عشق تھا، اس کی دیوانگی تھا۔ اس کی زندگی شایان کے گرد گھومتی تھی۔ وہ شایان کی صورت دیکھ کر جیتی تھی۔ وہ اس کی شادی کے پانچ سال بعد اس دنیا میں آیا تھا اور اسے خوب یاد تھا کہ اس نے اس کے لیے کس، کس طرح خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگی تھیں۔ اسے بچوں سے بے پناہ عشق تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بہت سارے بچے ہوں لیکن شادی کے بعد ایک بچے کے لیے اسے پورے پانچ سال انتظار کرنا پڑا اور جب شایان اس کی گود میں آیا تو اسے احساس ہوا کہ اس قیمتی اور انمول تحفے کے لیے پانچ سال کا انتظار اور اس کی آہ زاری، اس کی دعائیں، منتیں تو کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کی آغوش میں تو وہ نعمت آ گئی تھی کہ جس کے لیے وہ تاقیامت دینے والے کے سامنے سربسجود رہتی تب بھی کم تھا۔ اس کی ایک، ایک سانس اپنے مالک کا شکر ادا کر رہی تھی۔ جس نے اسے یہ منصب عطا کیا تھا اور اس کی خالی جھولی کو اس گوہرِ بے بہا سے بھر دیا تھا۔ اس کے سارے وجود سے جیسے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وہ اس سارے کرب اور اذیت کو بھول گئی تھی جو وہ گزشتہ دو دن سے برداشت کر رہی تھی۔ وہ پورے دو دن اور دو راتیں درد سے تڑپتی رہی اور اس وقت جب وہ بالکل نیم جان ہو چکی تھی اور زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی تھی اس وقت اس نے اس بچے کی آواز سنی وہ آواز جو پکار کر اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ خدا ابھی انسانوں سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

جب نرس نے بچے کو کمبل میں لپیٹ کر اس کی گود میں دیا تو اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ شاید اس دنیا میں نہیں تھی۔ وہ کسی اور دنیا میں کھوئی ہوئی تھی جہاں ہر طرف رنگوں اور روشنیوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ ساس نے بچہ اس کی گود سے لے لیا۔

''میرا بچہ...... میرا چاند، میرا شہزادہ، میرا پوتا۔'' اماں (ساس) نے بچے کو سینے سے لپٹا کر بے دریغ

محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے دل میں عجیب سی کھٹک ہونے لگی اور آنکھیں بے اختیار بھیگنے لگیں۔

''کیا ہوا...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......''

امی جو دو دن اور دو راتوں سے مستقل اس کے ساتھ تھیں جیسے تڑپ اٹھیں۔

''کچھ نہیں...... میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''کامران تھرماس سے یخنی نکال کر عالیہ کو دو، کچھ کھاؤ، پیو جبھی تو طاقت آئے گی۔'' اماں نے پوتے کو سینے سے لگائے لگائے ہدایت جاری کی تو کامران کا دل اماں کی بہو اور پوتے سے محبت دیکھ کر کھل اٹھا۔

''اماں تو پوتے کی خبر سن کر اپنی بیماری بھول گئیں۔ جیسے ہی پتا چلا فوراً بستر سے کھڑی ہو گئیں۔ اتنی جلدی یخنی تیار کی اور خود تیار ہوئیں کہ میں تو حیران ہی رہ گیا......'' کامران تھرماس سے یخنی نکالتے ہوئے ماں کا کارنامہ بیان کر رہا تھا اور وہ... سوچ رہی تھی کہ اس ساری کہانی میں ... صرف اماں ہی اماں تھیں اس کی امی کا کوئی ذکر نہیں جو دو دن سے مسلسل اس کے ساتھ تھیں اور اب کرسی پر خاموش بیٹھی تھیں... تھکی ہوئی...... نڈھال، مسلے ہوئے کپڑوں میں ملبوس جبکہ اماں نہائی دھوئی، نیا جوڑا پہنے کس قدر تر و تازہ اور چمکدار لگ رہی تھیں۔ پھر سارا دن لوگ آتے رہے اماں کو مبارک بادیں دیتے رہے۔ اور اماں انتہائی گرم جوشی سے مبارک بادیں وصول کرتی رہیں اور سارا وقت اسی طرح آنے والوں سے اس کی تکالیف اور دردوں کو اس طرح بیان کرتی رہیں جیسے وہ ساری تکلیفیں اس نے نہیں بلکہ انہوں نے خود جھیلی ہوں۔

اماں کے پانچ بچے تھے۔ تین بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ بڑا بیٹا اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا۔ اس کے بھی تین بچے تھے لیکن پانچ سال تک جس طرح انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنی تنہائی، گھر کی ویرانی کے رونے روئے تھے، اس نے عالیہ کے اندر سے زندگی کی امنگ چھین لی تھی وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی اور جب کامران بھی بچے کے نہ ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی آہیں بھرتا اور دوسروں کے بچوں کو حسرت سے دیکھتا تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا۔

''اللہ سے امید رکھیں، جب ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں تو اللہ ہمیں ضرور اولاد سے نوازے گا۔'' وہ کامران کو جب بہت مایوس دیکھتی تو سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''پتا نہیں کب دے گا اور کیا پتا دے بھی یا نہیں دے۔ مجھے تو لگتا ہے میں یہ حسرت لے کر دنیا سے چلا جاؤں گا۔''

''ایسی باتیں نہ کیا کریں...... یہ تو سراسر ناامیدی ہے اور ناامیدی کفر ہے۔''

''میرے تو ہر کام میں ہی دیر ہوتی ہے، پتا نہیں اللہ میری دعا کیوں نہیں سنتا۔'' کامران کی طبیعت میں بہت جلد بازی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر چیز اسے فوراً مل جائے اور جب کسی چیز کے ملنے میں دیر ہوتی تو وہ اسی طرح کی مایوسی کی باتیں کرنے لگتا جبکہ اس کے برعکس عالیہ بہت صبر اور شکر کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے خدا پر بہت زیادہ یقین تھا اور اسی یقین کے سہارے وہ کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی تھی۔

''خدا نے وعدہ کیا ہے، وہ اپنے بندوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ لیکن اگر دعا کی قبولیت میں دیر ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کے صبر اور اس کے یقین کو آزما رہا ہے یا پھر قبولیتِ دعا میں تاخیر کر کے اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کر رہا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے ''اگر تمہاری دعا قبول ہو جائے تو خوش ہو کہ تمہاری مرضی پوری ہوئی اور اگر قبول نہ ہو تو اور زیادہ خوش ہو کہ اللہ کی مرضی پوری ہوئی۔'' اللہ نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، اگر ایک نعمت نہ بھی دے تب بھی ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ نہ جانے اس میں پروردگار کی کیا مصلحت تھی۔'' وہ اپنے مخصوص نرم

لہجے میں اسے سمجھاتی تو وہ اور زیادہ بھڑک اٹھتا۔

"مجھے پتا ہے سب...... ہر وقت یہ باتیں نہ کیا کرو......" وہ جھنجلا کر بات ختم کر دیتا۔

اور اب پانچ سال بعد جب خدا نے اس کے الفاظ کو سچ کر دکھایا تو اماں اور کامران دونوں بھول گئے کہ انہوں نے ان پانچ سالوں کے دوران کیسے، کیسے کفر اور مایوسی کے کلمات ادا کیے تھے۔

"وہ بڑا مہربان ہے، اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا، مجھے تو اپنے رب سے پوری امید تھی کہ وہ میری دعا کو ضرور قبول کرے گا۔" اماں ہر آنے جانے والے سے یہ جملہ کہہ رہی تھیں۔ وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ ہی عرصہ پہلے ہر آئے گئے کے سامنے ٹھنڈی، ٹھنڈی آہیں بھر کر کہا کرتی تھیں۔

"کیا کریں گھر کی ویرانی دیکھ کر ہول آتا ہے، لگتا ہے ہماری دعاؤں میں اثر ہی نہیں رہا۔ کامران کو دیکھتی ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ اسے بچوں کا کتنا شوق ہے، کیسا بجھا، بجھا رہنے لگا ہے۔"

حقیقت تو یہی ہے کہ جب تک انسان کو نعمتیں ملتی رہتی ہیں وہ اللہ، اللہ کرتا رہتا ہے اور جب کسی نعمت کے ملنے میں دیر ہو جائے تو وہ فوراً اللہ سے بدظن ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ نعمتیں اس کا حق ہیں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت بھی اس کا حق نہیں ہے۔ نعمت تو انعام ہے، رب کا کرم ہے، اس کی عطا ہے، اس کی بخشش ہے۔ جو اگر مل جائے تو شکر کرلے اور نہ ملے تب بھی شکر کرلے۔ نہ ملنے پر شکوہ کرنا کیسا...... ناراض ہونا کیسا...... یہی تو انسان کی شرافت کی دلیل ہے کہ وہ ہر حالت میں مالک کا شکر ادا کرے۔ مگر انسان بہت ناشکرا اور جلد باز ہوتا ہے۔ اماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ایک دم وہ رونے لگا۔

"یہ بھوکا ہے، اسے فیڈ کرا دو......" اماں نے بچے کو اس کی گود میں دیا۔

وہ بہت تکلیف میں تھی اس نے بڑی مشکل سے بیٹھ کر بچے کو لینے کی کوشش کی۔

"ارے......ارے...... یہ کس طرح لے رہی ہو...... اتنے چھوٹے بچے کو، ایسے نہیں لیتے۔" اماں نے اس طرح سے ٹوکا کہ وہ شرمندہ ہوگئی اس کا دل بجھ سا گیا۔ درد اور اذیت کے سمندر کو پار...کرنے کے بعد اب وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

پھر سارا دن لوگ آتے رہے، اماں کو مبارک بادیں دیتے رہے۔ شایان میجر آپریشن سے ہوا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس کی چھٹی ہوئی۔ امی اسپتال سے اسے اپنے گھر لے آئیں تاکہ گھر میں اس کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو سکے لیکن گھر آنے کے دو دن بعد ہی کامران اسے لینے آگیا۔

"اماں کا اب پوتے کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔ پھر لوگ بھی مبارک بادیں دینے آرہے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو۔" کامران کے یہ سب کہنے کے بعد امی کی کیا مجال تھی کہ وہ کچھ کہہ سکتیں۔ وہ تو یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ابھی وہ بہت کمزور ہوگئی ہے۔ گھر کو نہیں سنبھال سکتی۔ البتہ دبے لفظوں میں انہوں نے اتنا ضرور کہا۔

"بیٹا یہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت بے پرواہ ہے، تم خود اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔" اور یہ جملہ بھی کامران کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا وہ فوراً بولا۔

"امی آپ اس سے پوچھ لیں۔ میں اور اماں اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے بستر سے پاؤں نہ اتارنے دیں۔ میری اماں جیسی ساس تو شاید ہی کوئی ہو۔ جتنا خیال اماں اس کا رکھتی ہیں شاید ہی کوئی ساس اپنی بہو کا رکھتی ہو۔" امی کے ایک جملے کے عوض کامران کو اپنی ماں کا قصیدہ پڑھنے کا موقع مل گیا تھا۔

"ہاں، ہاں میں جانتی ہوں تمہاری ماں، عالیہ کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میں نے تو اس لیے کہہ دیا تھا کہ چھوٹے بچے کے ساتھ ماؤں کو اپنا دھیان نہیں رہتا۔" امی نے فوراً صفائی پیش کر دی کہ کہیں داماد صاحب کا موڈ نہ آف ہو جائے۔

وہ گھر آئی تو گھر کا سارا نظام الٹا پڑا تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ اماں کو گھر کی صفائی ستھرائی کا کوئی شوق نہیں تھا اور اس کی طبیعت میں قیامت کی نفاست تھی۔ اس سے بے ترتیبی اور گندگی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اسے مجبوراً گھر کو سنبھالنا پڑا۔ اماں نے پوتے پر مکمل قبضہ جما لیا۔ اس کے پاس صرف ڈھائی مہینے کی چھٹیاں تھیں پھر اسے آفس جوائن کرنا تھا۔ اسے یہ سوچ، سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے کہ وہ اتنے چھوٹے بچے کو چھوڑ کر کیسے جائے گی۔ اب بھی اسے بچے کو زیادہ گود میں لینے کا موقع نہیں ملتا کہ اماں کا حکم تھا کہ بچے کو کم سے کم گود میں لو ورنہ اسے گود کی عادت ہو جائے گی۔ اس کا دل چاہتا وہ بچے کو لپٹا کر خوب پیار کرے...... لیکن اماں کو یہ بھی پسند نہیں تھا۔ عام ساسوں کے برعکس انہوں نے فوراً ہی بچے کو ڈبے کا دودھ لگوا دیا تھا کہ اس کے آفس جانے کے بعد بچہ بھڑک نہ جائے اور اسے بچے کی وجہ سے نوکری نہ چھوڑنی پڑے پھر جیسے ہی بچے کو ڈبے کا دودھ دیا گیا۔ اس نے اس کی فیڈ لینا ہی چھوڑ دی اس کا دل جیسے رو اٹھا۔ لیکن مجبوری تھی کیونکہ نوکری بھی اس کی مجبوری تھی۔ ان کا گھر اس کی نوکری کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ کامران کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ ایسی آرام دہ زندگی گزارتے جیسی اب گزر رہے تھے۔

اماں بہت سمجھدار تھیں۔ وہ جانتی تھیں کامران بہت سست اور کاہل ہے۔ وہ اس سرکاری نوکری میں ہی پوری زندگی گزار دے گا اور ترقی کرتے، کرتے ریٹائرمنٹ کے وقت تک بہ مشکل سولہ گریڈ تک پہنچ پائے گا۔ اسی لیے انہوں نے عالیہ کا انتخاب کیا تھا جو صورت شکل کی بہت عام سی تھی لیکن ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھی۔ کامران اس کے مقابلے میں بہت خوبرو تھا۔ عالیہ کو کمپنی کی طرف سے خاصی مراعات حاصل تھیں پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھی۔ میڈیکل فری تھا پھر ہفتے میں دو چھٹیاں بھی ہوتی تھیں لیکن روانہ کے اوقات کار بہت زیادہ تھے۔ صبح آٹھ بجے فرم کی گاڑی اسے لینے آتی اور شام سات بجے وہ پہنچ پاتی کبھی کام زیادہ ہوتا تو دیر بھی ہو جاتی۔

گھر کے کاموں کے لیے اس نے فل ٹائم عورت رکھی تھی جس کی تنخواہ وہ خود دیتی تھی اس کے باوجود اس کی ساس ہر آئے گئے کے سامنے اپنی بیماری اور گھر کے کاموں کا رونا روتی رہتیں۔ ہفتے کے دو دن خواب کی طرح گزر جاتے۔ ان دو دنوں میں وہ گھر کے کام بھی کرتی اور ملنے جلنے بھی جاتی۔

اب تک سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اب کیا ہوگا۔ بچے کو چھوڑ کر جانے کے خیال سے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ جاب چھوڑ دوں۔" اس نے ڈرتے، ڈرتے بڑی مشکل سے کامران سے یہ بات کی۔ اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ اگلے ہفتے اسے آفس جوائن کرنا تھا۔ اور وہ سوچ، سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ شایان کو چھوڑ کر کیسے جائے گی۔

"کیوں بھئی...... ایسی کیا افتاد آپڑی جو تم نے ایسی احمقانہ بات سوچی؟"

"آپ خود سوچیں... شایان اتنی دیر میرے بغیر کیسے رہے گا۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

"تمہارے بغیر......" کامران زور سے ہنسا...... "وہ اب کون سا تمہارے پاس رہتا ہے...... اب بھی سارا وقت اماں کے پاس ہی رہتا ہے۔" کامران صحیح کہہ رہا تھا اماں سارا وقت اسے اپنے سے چمٹائے رکھتی تھیں۔

"وہ لاکھ اماں کے پاس رہے، میں اس کی ماں ہوں اور وہ میرے بغیر بے چین ہوتا ہے۔"

"کوئی بے چین وچین نہیں ہوتا۔ اماں تم سے زیادہ تجربے کار ہیں۔ تم سے زیادہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں تم سے زیادہ وہ اماں کے

پاس خوش رہتا ہے۔'' کامران واقعی بہت بے حس تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے الفاظ سے عالیہ کو کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے۔

''میں فیروز صاحب سے بات کروں گی ہو سکتا ہے مجھے اور چھٹیاں مل جائیں۔''

''ہرگز نہیں تم ان سے ایسی کوئی بات نہیں کرو گی .. سوچو ذرا آج کل جاب کی اتنی پرابلمز ہیں تمہیں قسمت سے اتنی اچھی نوکری مل گئی ہے، تم اسے چھوڑنے کا سوچ رہی ہو۔''

''لیکن......''

''تم سوچو ذرا یہ تمہاری کیریئر جاب ہے تم کتنی ترقی کروں گی۔ آج تم اس عہدے پر ہو، چند سال بعد تم کہاں ہو گی۔ کیوں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگا رہی ہو۔'' کامران اسے سمجھا رہا تھا اور اسے شایان کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''یہ بھی تو سوچو تمہاری اس جاب کی وجہ سے آئندہ شایان کے لیے کتنی آسانیاں پیدا ہوں گی اس کا مستقبل کتنا روشن ہو گا۔ آج تم تکلیف اٹھاؤ گی تو اس کا فائدہ تمہارے بیٹے کو ہی پہنچے گا۔'' کامران کہتا رہا، وہ سنتی رہی۔ وہ دلدل میں پھنس چکی تھی۔ اماں کو پتا چلا وہ بھی اٹھتے بیٹھتے اسے سمجھاتی رہیں اور وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی رہی کہ اس کے پاس اب کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ دلدل میں گرنے والوں کو باہر آنے کے لیے بہت مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں تو کوئی سہارا ہی نہیں تھا۔ جن کو وہ سہارا سمجھ رہی تھی۔ وہ تو خود اسے دلدل میں دھکیل رہے تھے۔

شایان صرف ڈھائی ماہ کا تھا تب اسے آفس جوائن کرنا پڑا اب وہ صبح سے گھر سے نکلتی تو وہ سو رہا ہوتا اور شام کو سات بجے گھر آتی تو اماں کی گود میں ہوتا۔ صاف ستھرا بنا سنورا شایان اس کی گود میں آتے ہی منہ بسورنے لگتا۔ اس کا دل کٹ کر رہ جاتا اور اماں خوشی سے باغ، باغ ہو جاتیں۔

''مجھ سے تو ایسا ہل گیا ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تو رونے لگتا ہے۔''

وہ ہر آنے والے کے سامنے یہی راگ الاپا کرتیں۔ ''ماں کو تو پہچانتا ہی نہیں اور کیسے پہچانے، ماں تو صبح سے شام تک آفس میں ہوتی ہے۔ میں ہی سارا دن اسے سنبھالتی ہوں۔ حالانکہ اب میری ہڈیوں میں بھی دم نہیں رہا...... لیکن کیا کروں......''

اور ایسے وقت میں عالیہ بڑی امید سے کامران کی طرف دیکھتی کہ کامران شاید کچھ ایسا کہہ دے جس سے اس کے زخموں پر مرہم لگ جائے لیکن کامران تو اماں کے احسانوں کے تلے اتنا دبا ہوا تھا کہ ان کی ہر جائز اور ناجائز بات پر آمنا و صدقنا کہتا۔

شایان بڑا ہوتا گیا۔ اماں کا حق ملکیت بھی بڑھتا گیا۔ وہ گود میں لیتی تو انہیں ہول اٹھنے لگتے کہ اسے گود کی عادت پڑ جائے گی اس کا دل چاہتا ہے کہ بھی اسے گود میں لے کر ٹہلے تو وہ فوراً ٹوک دیتیں کہ کہیں وہ اس طرح ٹہلنے کا عادی نہ ہو جائے۔ اسے کچھ کھلا دیتی تو شور مچا دیتیں کہ اسے تجربہ نہیں ہے۔ بچے کا پیٹ خراب ہو جائے گا اسے رات کو اپنے پاس سلانے کی کوشش کرتی تو رات میں کئی بار اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹاتیں کہ کہیں وہ بے چین تو نہیں ہو رہا۔

اس کی ممتا ترستی رہ جاتی۔ آفس میں بھی وہ اس کے لیے بے چین رہتی اور گھر آ کر تو اور زیادہ ہی بے قرار ہو جاتی۔ شایان اماں سے اتنا زیادہ مانوس ہو گیا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کو کہیں چلی جاتیں تو وہ رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتا اور پھر ان کی گود میں جا کر ہی خاموش ہوتا۔ ایسے موقع پر اسے اماں سے شدت کی رقابت محسوس ہوتی۔ جب شایان اسکول جانے لگا تو اس نے سوچا اب شایان کو پڑھانے کی ڈیوٹی وہ لے لے گی اس طرح وہ اس کے قریب آ جائے گا...... لیکن اس کا یہ خواب بھی ادھورا رہ گیا۔

اوراماں نے یہ شعبہ بھی سنبھال لیا۔ وہ بی اے پاس تھیں۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی اسے ہوم ورک کروادیا کرتی تھیں۔

شایان کے بعداس کے یہاں اورکوئی بچہ نہیں ہوااس لیے وہ سب کی آنکھوں کا تارابنارہا۔

کامران تین بجے آفس سے آجاتا تھا پھر سارا دن شایان کی معصوم حرکتوں اور شرارتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اماں کے لیے اکیلے شایان کو سنبھالنا مشکل ہوتا تھا۔ اس نے فل ٹائم ایک عورت رکھی تھی جو گھر کے سارے کام بھی کرتی تھی اور شایان کو بھی سنبھالتی تھی۔ اماں مزے سے اپنی حکمرانی کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ عورت کو تنخواہ بھی وہی دیتی تھی اور گھر کے بیشتر اخراجات بھی وہی پورے کرتی۔ پھر بھی کامران ہر وقت اماں ہی کے گُن گایا کرتا۔ اور صرف کامران ہی نہیں...... کامران کی بہنیں بھی اس کی قسمت پر رشک کرتیں۔

''ہماری بھابی کے کس قدر عیش ہیں۔ صبح کی گئی شام کو آتی ہیں۔ گھر کو بھی ہماری اماں دیکھتی ہیں اور پوتے کو بھی اس عمر میں اماں پال رہی ہیں۔ بھابی کو تو نہ گھر کے کاموں سے مطلب ہے اور نہ اپنے بیٹے سے۔''

وہ یہ سب سن کر کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی...... لیکن صرف گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے خاموش ہوجاتی۔ وہ کیسے اپنا دل چیر کر دکھاتی۔ ملازمت اس کا شوق نہیں تھا۔ اس کی مجبوری تھی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی اپنے گھر اور بچے سے محبت تھی بلکہ عشق تھا وہ بھی اپنے گھر کو سجانا' سنوارنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اپنے بچے کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اپنے بچے کی معصوم باتوں اور شرارتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ بچے کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرے اسے اسکول بھیجے، اس کے آنے کے وقت اس کی پسند کی چیزیں بنا کر اس کا انتظار کرے...... دوپہر میں آرام سے اسے سینے سے لگا کر سوئے۔ شام میں اسے پڑھائے۔ اس کے ساتھ ٹی وی دیکھے۔ اس کے ساتھ باتیں کرے لیکن اس کی یہ خواہش اس کی ملازمت کی وجہ سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ جب کبھی اس کی چھٹیاں ہوتیں تو صحرا کے پیاسے کی طرح وہ جلدی، جلدی ان خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس میں بھی اماں حائل ہوجاتیں۔

''تم نے اسے صبح، صبح کیوں نہلا دیا۔ شایان کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

''تم نے لنچ میں برگر کیوں دے دیا۔ اس کا معدہ خراب ہوجائے گا۔''

''وہ تم سے نہیں پڑھے گا، تمہیں نہیں پتا، بچوں کو کیسے پڑھاتے ہیں۔''

''شام کو لان میں مت کھیلو۔''

''رات کو دیر تک مت جاگو۔''

''اسے زیادہ ٹی وی کے آگے نہ بیٹھنے دو، بچہ بگڑ جائے گا۔''

جب بہت زیادہ دلبرداشتہ ہوجاتی تو کامران کے سامنے دل کے پھپولے پھوڑتی۔

''آپ کی اماں کا بس چلے تو وہ شایان کو مجھ سے بات بھی نہ کرنے دیں...... اگر آپ کی اماں کا یہی طریقہ رہا تو مجھے لگتا ہے کہ کچھ دنوں بعد شایان مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے...... وہ سارا دن اماں کے پاس رہتا ہے اس لیے اماں، اماں کرتا ہے۔''

کامران اسے سمجھاتے تو اسے اور غصہ آتا۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ ملازمت چھوڑ دوں اور میں بھی سارا دن اپنے بچے کے پاس رہوں۔''

اور یہ جملہ سن کر تو کامران جیسے سکتے میں آجاتا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی۔ اور پھر گھنٹوں اسے ملازمت کے حق میں ایسے، ایسے دلائل سننا پڑتے کہ اسے لگتا کہ اگر وہ نوکری چھوڑ

دے گی تو اس سے زیادہ احمق اور بے وقوف عورت اور کوئی نہیں ہوگی اور بالآخر وہ ہار مان جاتی۔

کیونکہ اسے احمق اور بے وقوف عورت بننے کا شوق نہیں تھا، وہ بہت سمجھدار اور زمانے کے ساتھ چلنے والی عورت بننا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ نوکری کی بھٹی میں سلگتی رہی۔ شایان کو اس کی دادی اور آیا پالتی رہیں۔ وہ بہت اچھے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوگئی۔ اس کا بہت اچھا سا گھر بن گیا۔ گھر کے پورچ میں چمچماتی ہوئی گاڑی آگئی۔ شایان بہت نیک اور مہذب لڑکا تھا۔ اس نے ایم بی اے کیا تو اماں نے اس کی شادی اپنی نواسی سے طے کردی۔ حرا بہت خوب صورت اور پیاری تھی۔ اسے بھی پسند تھی۔ عالیہ سے بھی پوچھا گیا لیکن سرسری طور پر ساری بات پہلے سے طے ہوچکی تھی۔ اسے یہی بتایا گیا کہ شایان کی مرضی بھی یہی ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش ہوگئی کہ اتنے عرصے خاموش رہنے کے بعد خاموش رہنا اس کی عادت بن چکا تھا۔

لیکن آج جب اس نے شایان کی زبان سے یہ جملے سنے تو اسے لگا جیسے سب کچھ ختم ہوگیا۔ اس کی ساری محنت، ساری مشقت ایک لمحے میں چند جملوں نے حرفِ غلط کی طرح مٹادی۔ واقعی لفظ کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ان سے کس کا دل لہو ہوگیا ہے، کس کے دل پر زخم لگا ہے۔

شایان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

''میں تو اپنی ساری کامیابیوں کا کریڈٹ اماں کو دیتا ہوں کیونکہ مجھے تو اماں ہی نے پالا ہے۔ مما تو جاب پر چلی جاتی تھیں۔ اماں ہی میری ہر بات کا خیال رکھتی تھیں۔''

شایان کے ان جملوں پر حرا بھی بہت محبت اور عقیدت سے نانی کو دیکھ رہی تھی۔ اور شایان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی کیونکہ وہ بھی اپنے گھر میں یہی باتیں سنتی رہتی تھی۔

''مما اتنی دیر ہوگئی ابھی تک ناشتا تیار نہیں ہوا۔ ہمیں ناشتے کے بعد پھپو کے گھر بھی جانا ہے۔''

شایان کچن کے دروازے پر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا یا اسے اس کی حیثیت کا احساس دلا رہا تھا۔

اس نے پراٹھے ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے اس کی طرف شاکی نظروں سے دیکھا۔ اس کا دل پگھل کر پانی، پانی ہونے لگا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ وہ چیخ، چیخ کر روئے چلا، چلا کر شایان کو بتائے۔ اسے اپنے سارے زخم دکھائے، اسے بتائے کہ اس نے صرف اس کی خاطر، اس گھر کے افراد کے آرام کی خاطر، اس گھر کی آسائشوں کی خاطر کتنی قربانیاں دی ہیں۔ کتنی مشقت کی ہے۔ کتنے دکھ سہے ہیں۔ کس طرح اپنے آرام کو تج دیا...... سردیوں کی کڑکڑاتی صبحوں اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں وہ گھر کے پرسکون ماحول کو چھوڑ کر آفس کے تھکا دینے والے پیچیدہ مسئلوں میں الجھی رہتی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اپنے چند ماہ کے بچے کو صبح، صبح چھوڑ کر جانا ایک ماں کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ جب اس کا بچہ اپنی ماں کی طرف سے رخ پھیر کر دوسرے کی گود میں جائے تو ماں صبر و ضبط کی کن منزلوں سے گزرتی ہے۔ اس کا بچہ جب اس کی گود میں آکر روئے تو ماں کو کیسا دکھ پہنچتا ہے...اور دادی اور پھوپیاں جب اس کے بچے پر اپنا حق جتائیں اور سگی ماں کی حیثیت کو صفر کرنے کی کوشش کریں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب یہی اولاد بڑی ہوکر اپنی ماں کی محنت اور مشقت کا اعتراف نہ کرے اور دوسروں کو اس کا کریڈٹ دے تو اس ماں پر کیا گزرتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور وہ کیا کہہ سکتی تھی کہ عورت کو گھر بنانے کے لیے اپنے آپ کو مٹانا تو پڑتا ہی ہے جبھی تو گھر محبتوں اور خوشیوں کے پھولوں سے مہکتے ہیں۔



منی ناول

جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

جاتے ہوئے اساڑھ کی ایک سہانی صبح ہے۔

جنگل کے سناٹے میں دور کہیں رہ رہ کر فاختائیں بول رہی ہیں۔ آتی ہوئی نئی رُت نے پتے پتے، ذرے ذرے پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا ہے۔ اساڑھ کی سنسان، اجاڑ اور لمبی، لمبی دوپہریں سمٹنے لگی ہیں۔ شام ڈھلتے، ڈھلتے فضاؤں میں تن من کو بھلی سی لگنے والی ٹھنڈک در آتی ہے۔ سرِشام چلنے والے چنچل جھونکے اپنے شانوں پر جانے کن کن دیسوں کی

خوشبوئیں اٹھائے سرسراتے پھرتے ہیں۔ پر رات گزرتی ہے تو آتے ساون کے سندیسے لیے اکا دکا بادلوں کے ٹکڑے آکاش گھیر لیتے ہیں اور پھر جوں جوں رات ڈھلتی ہوتی ہے ماحول میں تراوٹ بڑھتی جاتی ہے۔ ہوائیں بھیگی، بھیگی سی ہو جاتی ہیں۔

صبح کے کوئی دس بجے کا عمل تھا۔ ریشم اپنے جھونپڑے سے باہر بندھی بھینس کا گوبر اکٹھا کر کے بڑی مہارت سے اپلے تھاپ رہی تھی۔ معاً کسی نے ہلکے سے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا۔

''اے...... بات سننا ذرا......'' جونہی ریشم نے چونک کر سر اٹھایا وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بالکل شہری وضع قطع لیے کوئی آدمی تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

''تمہارے پاس...... کچھ مکھن مل جائے گا، اور ایک دو انڈے بھی؟'' سامنے والے نے کچھ اس طرح جھجک کر دریافت کیا جیسے اسے ڈر ہو کہ مبادا وہ برا مان کر کوئی سخت جواب دے دے مگر جواب میں ریشم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے جھونپڑے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''ہاں، کیوں نہیں، میں ابھی لاتی ہوں۔'' اندر آکر اس نے طاق سے مٹی کا پیالہ اٹھایا اور ڈھابلی سے دو انڈے اٹھا کر اسے لا کر پیش کیے۔

''کتنے پیسے دوں؟''

''پیسے؟'' ریشم کی آنکھوں میں منوں حیرت اتر آئی پھر اس نے انکار میں زور، زور سے اپنی گردن ہلائی اور بڑی صفائی سے بولی۔ ''نہیں...... پیسوں سے نہیں دیتے۔''

''تو پھر کیا فری...... میرا مطلب ہے کہ مفت میں دے دیتے ہو؟'' اجنبی کے لہجے اور انداز میں حیرت ہی حیرت بھری تھی۔

ریشم نے لحہ بھر صورت حال پر غور کیا پھر اس کی فطری دانش مندی نے رہنمائی کی اور اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''نہ...... مفت دیتے ہیں، نہ پیسوں سے۔''

''تو پھر مجھے کس کھاتے میں دے دیا؟''

''آپ نے پوچھا میں نے لا کر دے دیا۔''

''اچھا۔'' اجنبی بحث پر اتر آیا۔ ''اس طرح جو بھی پوچھے گا، اسے دے دوگی؟''

''واہ کیوں لا کر دے دوں گی؟ خوامخواہ دے دوں گی۔ ویسے یہاں آتا ہی کون ہے مکھن لینے کے لیے۔ سب کی اپنی ایک گائے تو ضرور ہی ہے۔ اسی طرح مرغیاں بھی ہر کسی نے پال رکھی ہیں کسی کو کسی سے یہ سب لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''پھر تو مجھے بھی گائے اور مرغیاں پالنی پڑیں گی۔'' اجنبی نے دھیرے سے بڑبڑاتے ہوئے مکھن کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''لو...... یہ تم واپس لے لو۔''

ریشم کو جیسے کسی نے چابک مار دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا۔

''کیوں، واپس کیوں لے لوں؟ کم ہے تو اور لا دوں؟ انڈے بھی اور ہوں گے۔''

''یا خدا......'' اجنبی نے بے اختیار اپنی کھوپڑی سہلائی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا مگر اس دفعہ وہ بولا تو انداز میں شوخی تھی، شرارت چھپی تھی۔ یوں گویا اس کی سادہ لوحی سے لطف لے رہا ہو۔

''کم تو خیر نہیں ہے...... پورا ہے بلکہ کافی سے زیادہ ہی ہوگا۔'' وہ لبالب بھرے ہوئے پیالے کو تاڑتے ہوئے روانی سے بولتا چلا گیا۔ ''بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے لگ رہا ہے جیسے تم نے باسی مکھن دے دیا ہے یعنی کل کا پرانا مکھن۔'' ریشم نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ دیوانہ ہو گیا ہو۔

''بھلا...... کل کا مکھن کہاں سے آیا؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں قدرے مسکرانے لگی پھر کچھ سوچ

کر اس کی ناقص معلومات میں اضافہ کرنے کے خیال سے سمجھانے لگی۔ ''اصل میں آج کل ہماری بھینس کم، کم دودھ دینے لگی ہے اس لیے میں ایک دن بیچ کر کے مکھن نکالتی ہوں کل تو ناغے کا دن تھا اور آج سویرے سویرے سب سے پہلے اٹھ کر دودھ بلویا ہے میں نے، اب یقین آیا؟''

''نہ...... نہ......'' وہ زور شور سے گردن انکار میں ہلانے لگا۔ ''میں یقین ہی نہیں کر سکتا۔ اس میں سے صاف باسی مکھن کی مہک آ رہی ہے۔ میں نے کھا لیا تو ضرور پیٹ میں درد ہو جائے گا۔''

''رب کی قسم ایسی بات بالکل نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ قسم کھا کر ایک قدم آگے بڑھ آئی اور اسے اپنی قسم کا یقین دلانے کے لیے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اجنبی کو اس کے نرم گرم ہاتھ نے جیسے کرنٹ مار دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر مکھن کا پیالہ اسی کو تھما دیا اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ریشم کچھ اور سمجھی۔ اس نے پیالہ زمین پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر تڑپ کر بولی۔

''یہ...... یہ دیکھو میرے ہاتھ خراب نہیں ہیں۔ میں اپنے دونوں ہاتھ دھو کر مکھن لائی ہوں۔''

یکبارگی اجنبی کو اپنا صبر و قرار لٹتا نظر آیا۔ مگر کچھ اخلاق کا تقاضا تھا، تہذیب تھی، انسانیت کا وقار سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ بہ مشکل تمام اس نے خود پر ضبط کا پہرہ لگایا۔ اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے نگاہ اس کے مرمریں ہاتھوں سے ہٹا کر دور کے ایک پیڑ پر جمائی اور سنجیدگی سے بولا۔

''تمہارے ہاتھ...... یقیناً بہت صاف ستھرے ہیں اور بقول تمہارے مکھن بھی تازہ ہوگا، تم سچ کہہ رہی ہو لیکن نیت میری بھی سچی ہے۔ ہاں مجھے بھی انہی سب چیزوں کی ضرورت ہے لیکن یہ سب تب ہی ممکن ہے جب تم مجھ سے قیمت لے لو۔''

''نہ...... قیمت نہیں لینی۔''

''کیوں؟ آخر کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟'' اجنبی نے زور دے کر دریافت کیا۔ وہ ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ اسی وقت جنگل کی طرف سے ایک بڑے میاں لاٹھی ٹیکتے ہوئے نمودار ہوئے اور قریب پہنچ کر بولے۔

''کس بات کی تکرار ہو رہی ہے؟ کیا بات ہے؟'' ریشم نے مکھن کے پیالے کی طرف اشارہ کر کے شکایتی لہجے میں بتایا۔

''بابا انہوں نے مجھ سے مکھن کا پوچھا میں نے لا کر دے دیا مگر یہ اب خود ہی لے نہیں رہے ہیں۔'' اجنبی نے جلدی سے مداخلت کی اور اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''بات...... یہ ہے جناب کہ یہ مکھن کی قیمت نہیں بتا رہی ہیں۔'' ریشم نے فوراً اس کی بات کاٹ دی اور چمک کر بولی۔

''تو میں نے کون سا غلط کیا۔ کیوں بابا ٹھیک ہے ناں ہم بھلا مکھن کبھی بیچتے ہیں، نہیں ناں؟''

''ہاں یہ سچ ہے بیچتے تو نہیں ہیں......'' انہوں نے بھی داڑھی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر نووارد کو بغور دیکھ کر پوچھا۔

''مگر تم کون ہو بیٹا مجھے تو پردیسی معلوم ہوتے ہو۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے بابا جان۔'' اجنبی نے احترام سے جھک کر جواب دیا۔ ''میں اس آس پاس کے سارے جنگل کا فاریسٹ آفیسر مقرر ہو کر کل ہی آیا ہوں۔''

بابا رحمت ایک دم ہی بہت مرعوب ہو گئے۔ اس کا ہاتھ تھام کر جھونپڑے کی طرف لے جاتے ہوئے کہنے لگے۔

''تب تو ریشم نے مکھن کی قیمت نہ لے کر بہت خوب کیا۔ یہاں کی چیزوں پر تم سے زیادہ کس کا حق ہے۔ آخر ہم سب اور ہمارے ڈھور ڈنگر اسی جنگل کا دیا کھاتے ہیں چلو، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' پھر ریشم سے پکار کر بولے۔

''ریشم! خوب بڑھیا سی چائے پکا لے بیٹی پھر ذرا بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کو چلی جانا۔ سکھ نالے کے ساتھ' ساتھ ترائی میں چھوڑ آیا ہوں مویشی اور دیکھ' خوب چوکنی رہنا آج کل ایک ریچھ لاگو ہو رہا ہے جانوروں پر۔'' بابا نے ایک ہی سانس میں بہت ساری ہدایات اور تاکیدیں جاری کیں اور نِدارو کو ساتھ لے کر جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔ ریشم اثبات میں سر ہلا کر جلدی' جلدی چولھا جلانے لگی۔

سورج اس وقت عین جنگل کے اوپر تھا اور اس کی چمکیلی کرنوں سے سرسبز پہاڑی علاقے میں ہر طرف ایک اجلا' اجلا سا نکھار آیا ہوا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے، جانور اور پرندے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دانے دُنکے اور خوراک کی تلاش میں سبزے پر گھوم رہے تھے۔ ہر طرف ایک کیف آور سی تنہائی کا راج تھا۔

نِدارو نے بابا کی بات کو بغور کو سنا اور جھونپڑی میں داخل ہوتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

''ریچھ لاگو ہو رہا ہے کیا مطلب بابا؟'' بابا رحمت نے بے پروائی کے انداز میں جواب دیا۔

''جنگل ہے ناں بیٹا' یہاں کے ماحول میں تو یہی ہوتا رہتا ہے۔ انسانوں سے کہیں زیادہ جانوروں سے واسطہ رہتا ہے۔ بستی کے سب لوگ عادی ہیں۔''

''آپ کا گھر...... بستی سے قدرے ہٹ کر ہے ناں۔'' اُس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا تو ہے۔'' انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

''مجھے شروع سے ہی جنگل کا یہ والا گوشہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے پُرکھے بھی اسی جگہ رہتے تھے۔ بس میں کبھی یہاں سے ہلا ہی نہیں۔'' حالانکہ بات معمولی سی تھی مگر اس کو ان کے انداز میں ایک غیر معمولی سی افسردگی کا رچاؤ محسوس ہوا۔ وہ ان کے جھریوں زدہ ... چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

☆☆☆

مہین' مہین پھوار ان کے بالوں، کالر اور شرٹ پر ننھے، ننھے موتیوں کی طرح اٹک گئی تھی مگر انہیں اپنی حالت کا مطلق احساس نہ تھا۔ ذہن کے دریچوں پر ایک بھولی بسری یاد رہ' رہ کر دستک دے رہی تھی۔ یادوں کے قافلے دبی، دبی آہٹ اور چاپ لیے ان کے آس پاس اتر آئے تھے لیکن نہ معلوم کیوں حافظہ ساتھ دیتے دیتے دفعتاً ٹھٹک کر تھم جاتا تھا۔

درمیان میں حائل شدہ لمحوں، گھڑیوں بلکہ کئی سال پر محیط وسیع خلیج ایک ناقابلِ عبور کھائی کی طرح منہ پھاڑ دیتی اور ان کی سوچیں گڈمڈ ہو کر رہ جاتیں۔ ڈاکٹر خاور کی آج ان لمحات میں کچھ عجیب ہی حالت تھی۔

ڈاکٹر شاکرہ کے بنگلے سے نکل کر اپنے بنگلے تک آنے میں وہ برستی بارش میں اچھا خاصا بھیگ چکے تھے۔ سامنے سے گزرنے والی سڑک کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی میں کھڑے ہو کر انہوں نے الجھن ہی الجھن میں سگریٹ سلگا لیا لیکن پہلا کش لیتے ہوئے چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔

ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ پر اپنا گھسا گھسایا بادامی کوٹ اچھی طرح پہنے وہ تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہلکی' ہلکی برستی پھوار اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کا سفید رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا سا بنا رکھا تھا۔ گلے میں دوپٹا مفلر کی طرح لپٹا تھا اور وہ اپنی دُھن میں مگن لمبے لمبے ڈگ بھر رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر قبل یہ دونوں آمنے سامنے تو بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر شاکرہ نے دونوں کا تعارف کروایا تھا لیکن اس پر پہلی نگاہ پڑتے ہی ڈاکٹر خاور کے دل و دماغ ٹھٹکے تھے پھر وہ جتنی دیر اس کے روبرو رہے' بظاہر ڈاکٹر شاکرہ کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش

کرتے رہے مگر ساتھ ہی کسی گتھی کو سلجھانے میں بھی مصروف رہے حالانکہ یہ ملاقات ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوئی تھی مگر جانے کیوں وہ وہاں پہنچتے ہی کنفیوژن کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ ڈاکٹر شاکرہ بنیادی طور سے خود ہی بہت باتونی واقع ہوئی تھیں۔ آج وہ گھر سے نکلے تو موسم کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ آسمان یہاں سے وہاں تک گھرے، گھرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہواؤں میں تیزی اور ناخوشگوار سی ٹھنڈک رچ گئی تھی۔ بارش کے برس جانے کا امکان سو فی صد تھا۔

آج ہی ڈاکٹر شاکرہ نے سہ پہر میں انہیں اپنے ہاں مدعو کر رکھا تھا۔ ایک ہی اسپتال سے تعلق رکھنے کی وجہ سے سبھی ڈاکٹرز ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہ تھے لہٰذا شاکرہ کو جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خاور کے تین عدد شرارتی بہن بھائی آج کل ٹیوٹر کے چلے جانے کی وجہ سے بے نکیل ہوئے جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنے بچوں کی ٹیوٹر کا تذکرہ کر کے ڈاکٹر خاور سے آج ہی اس کی ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔

ڈاکٹر شاکرہ اپنی فیملی کے ساتھ اسپتال ایریا میں ہی ڈاکٹروں کے لیے بنائے گئے بنگلوں میں سے ایک بنگلے میں رہائش پزیر تھیں جبکہ ڈاکٹر خاور اپنی رہائش گاہ کا کم ہی استعمال کرتے تھے اور وہ بھی جب کسی ایمرجنسی ڈیوٹی کا مسئلہ ہوتا تو ورنہ ان کی اصلی رہائش اپنی فیملی کے ساتھ کسی دوسری جگہ تھی۔

دوپہر میں ڈاکٹر شاکرہ انہیں اپنے ہاں لے گئی تھیں۔ یہ انتہائی شفیق اور ہنس مکھ و ملنسار خاتون تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر خاور کچھ دیر آرام کی غرض سے اپنی طرف آ گئے۔ جب وہ دوبارہ ڈاکٹر شاکرہ کے ہاں گئے تو بادل تُلے ہوئے ضرور تھے مگر برسے نہیں تھے۔ ہاں، جب وہاں سے واپس لوٹے تو پھوار گرنے لگی تھی۔

ڈاکٹر شاکرہ انہیں سیدھا بچوں کے اسٹڈی روم میں لے گئی تھیں اور تعارف کرواتے ہوئے انہوں نے خاور سے کہا تھا۔

''ڈاکٹر ان سے ملو یہ ہیں شرمین اسداللہ۔ ماشاءاللہ -- پڑھتی بھی ہیں اور پڑھاتی بھی ہیں۔ بہت ذہین اور باصلاحیت ہیں گو کہ اس سال بی اے کر رہی ہیں مگر شام کے فارغ اوقات میں ہائی کلاسز کو ٹیوشن بھی دیتی ہیں۔ میں ان سے تقریباً ڈیڑھ دو برس سے واقف ہوں اور اتنا ہی عرصہ ہوا ہے انہیں میرے بچوں کی استاد بنے ہوئے مگر اب حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتی ہوں اور یہ مجھے اپنے بچوں کے مانند عزیز ہو چکی ہیں۔ میں یہ پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ شرمین کی سی محنتی اور ہوشیار ٹیوٹر بہت کم ہوں گی۔ کم از کم مجھے تو مکمل بھروسا ہے ان پر...... آپ نے چونکہ مجھ سے اپنے ہاں کے بچوں کا تذکرہ کیا تھا سو میں نے آپ کو ان سے ملوا دیا۔ گو کہ ان کے پاس وقت کی تو بہت کمی ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔''

ڈاکٹر خاور نے ان کی فراہم کردہ معلومات اور تفصیل سنی ضرور تھی مگر سامنے بیٹھی ہوئی شرمین کو دیکھ کر ان کے ذہن کو ایک ایسا شدید دھچکا لگا تھا کہ بہت دیر تک وہ کچھ بھی نہ بول پائے۔

شرمین کی آنکھوں میں لحظہ بھر کو چمک کر معدوم ہو جانے والی شناسائی کی ہلکی سی لہر نے انہیں مزید الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر دل از خود دھڑکا تھا اور یہ دھڑکن بے ترتیب تھی گو کہ ان لمحات میں خاور اپنے محسوسات اور سوچ کا صحیح طور سے تجزیہ کرنے سے قاصر تھے لیکن اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ یہ کیفیت قطعی نئی تھی۔

ان کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اس معصوم صورت اور دل میں ترازو ہو جانے والی کشش کو بوجھے بغیر وہاں سے چلے آئیں مگر پھر انہوں نے کسی

نہ کسی صورت اپنے احساسات پر ضبط کے پہرے لگائے۔ اس کے سامنے نہایت مناسب الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا اور بتایا کہ انہیں اپنے ہاں کے بچوں کے لیے اس کی مدد درکار ہے۔

”شرمین بیٹی، ڈاکٹر خاور ایک بہت ہی شریف فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے آپس میں دیرینہ تعلقات ہیں۔ بچوں کا بہت زیادہ تعلیمی حرج ہو رہا ہے۔ ان کا ٹیوٹر دوسرے شہر شفٹ ہو چکا ہے۔ دیکھو پلیز اب میرے کہنے کی لاج رکھنا تمہارے ہاتھ ہے۔“ شرمین اسداللہ کو خاموش دیکھ کر ڈاکٹر شاکرہ نے بھرپور سفارش کی۔

بالآخر شرمین کو ہامی بھرتے ہی بنی پھر وہ فوراً ہی بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کا رویہ بے حد محتاط اور سنجیدہ تھا۔ خاور کا اس کے روبرو بیٹھ کر دماغ پر زور دینے کا چانس ختم ہوگیا مجبوراً انہیں واپس آنا پڑا۔

اب وہ بہت دیر سے ٹہل ٹہل کر آج کی حیرت انگیز صورتِ حال پر غور کر رہے تھے مگر الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ نہ لگ سکا۔ حتیٰ کہ سہ پہر ڈھل گئی۔ باہر پھوار نے تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ انہیں معلوم تھا گھر پر ان کا انتظار ہو رہا ہوگا مگر اب ان کا دوبارہ بھیگنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ سگریٹ کے کش لیتے، لیتے وہ صوفے پر نیم دراز ہوگئے۔ اس وقت مسلسل سوچنے سے انہیں الجھن ہونے لگی تھی ساتھ ہی یادداشت پر بھی غصہ آنے لگا جس کی کمزوری نے آج کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک کچھ سوچنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

سوچتے، سوچتے اپنے آپ سے الجھتے، الجھتے انہیں اونگھ آگئی۔ اسی نیم دراز کیفیت میں ان کا سر کشن سے کھسک کر صوفے کے بازو پر آٹکا اور حواس پر ایک بے قراری نیند طاری ہوگئی۔

اللہ کی شان...... جس واقعے کی کرید میں وہ کتنی دیر سے بے چین تھے وہ ان کے سوئے ہوئے دماغ میں یکلخت انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔ اوکھتی سوچوں اور ماضی کے درمیان حائل نقاب دھیرے، دھیرے سرکنے لگا اور بالآخر وہ کئی سال قبل پیش آنے والے قصے کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگے۔

☆☆☆

1971ء جنگ کا زمانہ تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی سے دن رات گرما گرم خبریں نشر ہوا کرتیں۔ بازاروں، ہوٹلوں اور گھروں میں خبروں کے اوقات میں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جایا کرتے۔ ملک کا عام ماحول انتہائی سرگرم، پُرجوش اور بے پناہ ولولہ انگیز ہو رہا تھا۔ چھوٹے بڑے سب ایک نئی امنگ، نئے ولولے اور مضبوط حوصلے سے پُر ہو رہے تھے۔ اپنے اپنے مقام پر ہر کوئی وطن کی بقا اور سلامتی کے لیے کوشاں اور سچے دل سے دعا گو تھا۔

عام عوام دفاعی فنڈ کے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ جو جس قابل تھا کھلے دل اور بڑی پُرخلوص سچائی کے ساتھ اپنا حصہ ڈال رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسکولوں، مدرسوں میں زیرِ تعلیم بچے تک اپنی ضروریات زندگی کی اشیا سے دفاعی فنڈ کے سینٹروں میں پہنچ کر حاضری دے رہے تھے غرضیکہ پوری قوم حرکت میں آئی ہوئی تھی۔

خاور نے اسی زمانے میں ایم بی بی ایس کی نئی ڈگری حاصل کی تھی۔ فوراً ہی قریبی شہر کے ایک سول اسپتال میں جاب آفر ہوگئی۔ ان دنوں وہ اپنی ذاتی گاڑی کی سہولت سے محروم تھے۔ سب کے مشورے سے آفر تو جوائن کر لی مگر والدین سے دور اسی شہر میں رہنا پڑا ہر روز کا آنا جانا انہیں خود بھی سخت گراں گزرتا۔

شہر میں ان کا ایک پرانا اور سینئر ساتھی خاصے عرصے سے ذاتی پریکٹس کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان گہری دوستی کا تعلق کافی پہلے کا تھا لہٰذا رہائش کا مسئلہ، مسئلہ نہ رہا۔

سوئے اتفاق ان کا یہ ڈاکٹر دوست اپنی بے پناہ قابلیت، ایمان داری اور جذبۂ ایثار کی بنا پر سرکاری ٹیسٹ میں منتخب ہو کر محاذِ جنگ پر جنگی کیمپ میں زخمیوں کے علاج معالجے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کا اسپتال جو وسیع پیمانے پر ایک کشادہ عمارت میں قائم تھا اسے سوائے کچھ کمپاؤنڈروں اور نرسوں کے کوئی سنبھالنے والا نہ رہا چنانچہ اس موقع پر خاور نے دیرینہ دوستی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے دوست کے اسپتال کا انتظام بھی اپنے ذمے لے لیا۔

ڈاکٹر خاور سول اسپتال سے ڈیوٹی آف کر کے آتے تو بلاتردد شام سے رات گئے تک یہاں بیٹھنے لگے حالانکہ انہیں شدید ترین مصروفیت کا سامنا کرنا پڑتا۔ آرام کم سے کم میسر آتا تاہم وہ یہ سب کچھ بخوشی کر رہے تھے اور اپنے فیصلے سے ازخود مطمئن اور خوش تھے۔ نئے نئے ڈاکٹر بن کر نکلے تھے اس لیے دل یونہی جذبۂ خدمتِ خلق اور انسانی ہمدردی سے مالا مال تھا دوسرے وطن کے لیے اپنے ڈاکٹر دوست کی خدمات اور اس کا جذبہ بھی ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

وہ ایک حد درجہ تاریک اور سرد رات تھی جس میں بلیک آؤٹ نے مزید سیاہی کا اضافہ کیا تھا۔ رات کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ خاور اسی وقت کلینک سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئے تھے کہ چوکیدار کسی مریض کی آمد کی اطلاع دینے پیچھے، پیچھے چلا آیا۔ یہ الٹے قدموں باہر آگئے۔

گیٹ سے باہر ایک خالی تانگا کھڑا تھا جس کے قریب ایک ہیولا کھڑا مضطربانہ انداز میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی لپک کر آیا اب انہوں نے بغور دیکھا۔ ایک نوعمر لڑکا تھا اور بڑی لجاجت سے انہیں لے جانے کا اصرار کر رہا تھا۔ خبر نہیں بلیک آؤٹ کی اس سرد اور ٹھٹھری رات میں کون بیمار تھا اور کس حال میں تھا۔

سن ذرا

اے بادل سن ذرا
مجھے اتنا بتا
کیا تو نے بھی کسی کو چاہا تھا
اور اس نے تیرا دل توڑا ہے
کیا اس کے لیے اتنا تڑپا ہے
جو ٹوٹ کہ اتنا برسا ہے

☆☆☆

قوسِ قزح بہار خوشبو
اور وہ راج کمار مرے
خوابوں کا
تتلی، گلشن، جگنو، بارش
ہو گئے گم
اب سلسلہ ہے
عذابوں کا

شاعرہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

سخت تھکاوٹ کے باوجود ڈاکٹر خاور کے دردمند دل سے انکار ممکن نہ ہوا اور وہ بیگ منگوا کر بلا حجت اس کے ہمراہ تانگے میں سوار ہوگئے۔ کئی سڑکوں سے ہوتا ہوا تانگا ایک اندھیری گلی میں آرکا۔ خاور اس لڑکے کی رہنمائی میں اندر آئے۔

یہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے ایک پختہ مکان کا کمرا تھا۔ اندر کا ماحول دیکھ کر خاور کا دل ہمدردی اور غمگساری کے جذبات سے لبریز ہوگیا۔ کمرے میں کئی ایک مومی شمعیں روشن تھیں۔ ایک اونچی سی مسہری پر دراز مریضہ کراہ رہی تھی۔ سرہانے والی لڑکی غالباً اس کی بیٹی تھی جو مسلسل آنسو پونچھے جا رہی تھی۔

کمرے کے مغربی گوشے میں ایک ضعیف

خاتون مصلّے پر بیٹھی تھیں۔ خاور نے جھک کر مریضہ پر ایک نظر ڈالی تو گنگ رہ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اس درجہ حسین اور پُرکشش چہرہ شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ پری چہرہ لڑکی ہو بہو ماں کی تصویر نظر آرہی تھی۔ کانپتی ہوئی متورم پلکوں اور لرزاں، لرزاں گلابی ہونٹوں والی وہ کمسن لڑکی ان کے دل و دماغ پر ایک انمٹ نقش کی طرح چپک سی گئی۔

بخار کی شدت اور کمزوری کی زیادتی سے مریضہ کے اعصاب پر غفلت طاری تھی مگر نیم غنودگی کے باوجود ہاتھ پیر جنچ رہی تھی۔ خاور ابھی نبض دیکھ رہے تھے کہ لڑکی بول پڑی۔

''ڈاکٹر صاحب! خدا کے لیے امی جان کو جلدی ٹھیک کردیجیے مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اب تو کئی دنوں سے بولنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ان کا بخار کیوں نہیں ٹوٹتا آخر؟'' بات کرتے، کرتے وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے ضعیف خاتون مصلے سے اٹھ کر آگئیں اور آہستہ سے ڈانٹنے کے انداز میں بولیں۔

''تمہارا یوں رونا دھونا مجھے پسند نہیں ہے شرمین۔ جانتی نہیں ہو اس طرح ماں کو زیادہ تکلیف ہوگی۔'' لڑکی خاموشی سے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر خاور مریضہ کا معائنہ کررہے تھے۔ خاتون ازخود بتانے لگیں۔

''میرا بیٹا تو محاذِ جنگ پر بلوالیا گیا ہے ڈاکٹر صاحب، یہ میری بہو ہے اس تنہائی اور مصیبت کے عالم میں ہم دُہری پریشانی میں مبتلا ہیں۔ آج میرے جڑواں پوتے چودہ دن کے ہوگئے ہیں ماشاءاللہ مگر افسوس کہ بہو کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا۔ یہاں ہمارا تو کوئی پرسانِ حال بھی نہیں ہے۔ پڑوس کا یہ بچہ ہے جو آپ کو بلا لایا ورنہ کون کسی کا......'' ان کے اشارے پر خاور نے پالنے میں دیکھا جہاں دو نوزائیدہ مگر صحت مند بچے آرام سے سو رہے تھے۔

مریضہ کو بخار تیز ہونے کی وجہ سے انجکشن لگانا مناسب نہ تھا تاہم خاور نے غیر معمولی توجہ اور یکسوئی کے ساتھ تفصیلی معائنہ کیا۔ کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں، نسخہ لکھا اور ضروری ہدایات کے ساتھ رخصت ہوئے۔ جاتے سمے اس خوب صورت چہرے والی لڑکی نے جس کے غیر معمولی خدوخال اور نام ان کے دماغ پر نقش ہوچکے تھے انہیں کمرے کے بیرونی دروزے پر روک لیا اور التجا آمیز لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میری امی جان ٹھیک ہوجائیں گی ناں' جانے کیوں مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ ایسی خاموش تو وہ کبھی نہیں ہوئیں۔'' لمحے بھر کو ڈاکٹر خاور کچھ نہ بول پائے۔ بحیثیت معالج وہ خوب جان گئے تھے کہ مریضہ شدید تشویشناک کیفیت میں ہے تاہم انسانیت کے ناتے کچھ فرائض بھی تھے سنبھل کر پُراعتماد لہجے میں بولے۔

''نہیں...... پریشانی کی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی بہت کمزوری کی وجہ سے ایسا لگتا ہے...... رونے کے بجائے آپ اللہ سے دعا کریں۔'' اس نے بے اختیار بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر اپنے دونوں یخ بستہ ہاتھ رکھ دیے اور رو کر بولی۔

''دادی اماں بھی یہی کہتی ہیں مگر...... پتا نہیں کیوں میری تسلی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا کہنا درست ہے تو پھر امی جان بات کیوں نہیں کرتیں، غفلت کیوں طاری ہے؟ ابو جی محاذ پر ہیں اُدھر بھی جان اٹکی رہتی ہے...... میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔'' اس کے نرم ہاتھوں کا لمس ڈاکٹر خاور کے رگ و پے میں ایک برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ وہ مرد ہو کر گھبرا گئے مگر اس کے لہجے کی بے پناہ معصومیت، سادگی اور لڑکپن کا سا انجان لہجہ پل بھر میں ان کی بدگمانی کا خاتمہ کرگیا۔

وہ سمجھ گئے پے در پے گھریلو مسائل کے پریشان کُن انبار میں دبی ہوئی یہ ایک معصوم لڑکی کے سوا کچھ

نہیں ہے۔ ہلکے ہلکے مدھم اندھیاروں میں اس کے شفاف چمکتے ہوئے رخساروں پر آنسوؤں کی لمبی، لمبی لکیریں چمک رہی تھیں۔ وہ آشیانے سے بچھڑی اس ننھی سی چڑیا سے مشابہ تھی جس کے سر پر اچانک تنہائی کی اجاڑ اور سنسان رات آن پڑی ہو۔ بے اختیار ڈاکٹر خاور کا جی چاہا کہ کوئی ایسی میٹھی ٹھنڈی سی بات کہہ گزریں کہ اس کا خوف ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجائے مگر...... وائے افسوس کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ الفاظ نے جیسے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

معلوم نہیں وہ کیا کہہ کر وہاں سے چلے آئے تھے مگر بلیک آؤٹ کی اس تاریک رات کے لمحات ہمیشہ کے لیے ان کے ذہن سے چپک گئے تھے۔ یہ یادگار لمحے فلم کے سین کی طرح ان پر سے گزر گئے۔

آنکھ مسلسل بجنے والی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا ابھرا تھا۔ باہر شاید بارش تھم گئی تھی اور شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ انہوں نے کاہلی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر فون اٹھالیا۔ دوسری طرف ان کی پھوپی زاد بہن روبینہ تھی۔ اس کی کھنکتی ہوئی آواز خاور کے قریب ہی سرسرائی۔

''ہیلو خاور، آج چائے پر کیوں نہیں پہنچے۔ ہم لوگ انتظار کرتے رہے۔''

''کیا یہی پوچھنے کے لیے فون کیا ہے؟'' انہوں نے بوجھل آواز میں دریافت کیا اصل جواب گول کرگئے۔

''ارے واہ، میرا کیا مطلب ہوتا بھلا۔'' وہ برا مان گئی۔

''ارے...... ارے خفا ہوگئیں۔'' وہ ایک دم ہنس پڑے۔ ''میں سمجھا بھائی جان بھی آج لیٹ ہوگئے ہیں ورنہ ان کے سامنے بھلا ہماری کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔'' خفگی بھول کر وہ ہنس دی اور چہک کر جواب دیا۔

''دریں چہ شک' یہ تو اپنا، اپنا رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ ان جیسا بھلا کون ہوسکتا ہے؟ خواہ چھوٹا بھائی ہی کیوں نہ ہو......''

''اوہو...... کیا کہنے۔'' وہ سچ مچ چلاّ اٹھے۔ ''ابھی تو فقط منگنی ہی ہوئی ہے، آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ حواسوں میں رہیے ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔''

''ہاں، ہاں معلوم ہے۔'' وہ شرارت سے بولی۔ ''مگر اب بہتر یہی ہے کہ گھر کا راستہ پکڑلو ورنہ سمجھ لو خیر نہیں ہے۔ ممانی جان سخت خفا ہورہی ہیں تم سے۔'' روبی نے مزید کچھ سنے کہے بغیر فون بند کردیا۔

ڈاکٹر خاور نے ریسیور رکھ کر ایک طویل انگڑائی لی۔ سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا اٹھا کر دراز کی نذر کی کیونکہ سگریٹ نوشی کا شوق فقط یہاں تک ہی محدود تھا۔ جلدی جلدی انہوں نے لاک لگائے اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتے اسپتال ایریا سے نکل آئے۔ اپنی اماں کی سخت گیری اور پوچھ گچھ سے وہ بہت گھبراتے تھے۔

گھر میں داخل ہوئے تو پہلا ٹکراؤ انہی سے ہوا۔ نظر پڑتے ہی ملامت بھرے لہجے میں بولیں۔

''صد رحمت ہے بیٹا تم پر۔ منہ اندھیرے کے سدھارے اب گھر لوٹے ہو۔ اتنی بھی خبر نہیں کہ ماں کا مارے ہولوں حال برا ہوگا۔ آج کو بادا حیات ہوتے تو ان بے پروائیوں کی جواب طلبی کرتے۔''

''اماں جان، آپ تو وجہ جانے بغیر ہی بدگمان ہونے لگتی ہیں۔ پہلے پوری بات تو سن لیا کیجیے۔'' خاور جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئے اور محبت سے ان کے شانے سے لگ کر بولے۔

''ارے جاؤ بہت سی ہیں وجوہات۔ آگیا ہوگا کوئی سیریس کیس۔'' وہ بگڑ کر بولیں۔ خاور کو.... بے ساختہ ہنسی آگئی بہ مشکل انہیں ٹھنڈا کیا پھر بہن کو آوازیں دیتے ہوئے اندر چل دیے۔

اس کا کمرا خالی پا کر درمیانی دروازے سے گزر

کر کوٹھی کے دوسرے حصے کی طرف آ گئے۔ اس طرف ان کی پھوپی شمسہ بیگم رہتی تھیں۔ اُدھر برآمدے میں خاور کی بہن معصومہ اور پھوپی زاد روبینہ بیٹھی گپ شپ میں مصروف تھیں۔ خاور ان دونوں کو اشارے سے بلا کر کمرے میں جا گھسے۔ روبینہ ان کے پیچھے، پیچھے آتے ہوئے بولی۔

"خدا خیر کرے، یہ آج اشارے کنایے کیوں ہو رہے ہیں؟"

"میں سمجھا آج برسات کی گھڑی ہے کوئی پکوان وکوان تل تلا کر کمرے میں سجا کر رکھے ہوں گے۔ مارفون کر کر کے بلا رہی تھیں دوپہر سے۔"

"توبہ، توبہ!" روبینہ نے دونوں گال پیٹ کر دہل دیا۔ "بولے ہیں تو بغیر رکے، تھمے بولے جا رہے ہیں اور میں کیوں فون کر کر کے بلاتی وہ تو ممانی جان کا پارہ آسمانوں کو چھو رہا تھا اس کی اطلاع دی تھی۔ باقی رہے پکوان تو ظاہر ہے چائے پر سب موجود تھے سوائے تمہارے۔" خاور نے بناوٹی حیرت سے کہا۔

"تو کیا...... سارے پکوان اپنے ان کی نذر کر دیے؟" روبی ابھی جواب نہ دینے پائی تھی کہ معصومہ لوازمات کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ خاور نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

"ہُرا...... اسے کہتے ہیں ہمشیرہ، ہمشیرہ ہوتی ہے۔ بھاوج، بھاوج۔"

"شرم تو نہیں آتی الٹی سیدھی ہانکتے۔ یاد رکھنا میں بھی تمہاری بہن ہی ہوں۔ سگی پھوپی زاد بہن ابھی سے بھاوج واوج کہنے کی ضرورت نہیں ہے، شکایت کر دوں گی۔" روبی نے قدرے خجل ہو کر کہا۔

"کیوں؟ کیا بھائی جان سے دستبردار ہونے کا ارادہ ہے؟" خاور نے دہی پھلکی کھاتے ہوئے پھر چٹکی لی۔

"اللہ بھائی ایسا مذاق مت کیا کیجیے، جی ڈر جاتا ہے۔" معصومہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"اچھا چلو جانے دو، یہ بتاؤ وہ تینوں آفتیں کہاں ہیں؟"

"وہ آفتیں کون بھلا؟" روبینہ نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"نومی، شامی اور افشاں سے بڑھ کر آفتیں کون سی ہوں گی بھلا؟" خاور کے کہتے ہی معصومہ تڑپ کر بولی۔

"ان پاجیوں کی شرارتیں مجھ سے سنیے۔ ناک میں دم کر ڈالا ہے۔ روبی آپا بھلا کیا بتائیں گی ان کے کارنامے، یہ دیکھیے آج ہی دوپہر کا قصہ۔" اس نے خالی کلائی دکھا کر رونا رویا۔ "بدتمیزوں نے میری ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں لے کے۔"

"ارے۔" خاور کو اس کی کلائی میں دو عدد اداس سی چوڑیاں دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"صبح تک تو چوڑیوں کی دکان کھلی ہوئی تھی یہاں، کیا ہوئیں سب؟"

"ہونا کیا تھا بے چارے تینوں دودھ پیتے بچے اندر کے کمروں میں فٹ بال کی مشق فرما رہے تھے......" اس نے روہانسی ہو کر جواب دیا۔

"اور زد میں آ گئی بے چاری ہماری بہنا۔" خاور نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے لقمہ دیا مگر وہ بولتی چلی گئی۔

"قسم سے بھائی مجال ہے جو سارا دن یہ لوگ ایک لفظ بھی پڑھ لیں۔" روبینہ اس کی سنجیدہ اور رنجیدہ صورت دیکھ کر ہنسنے لگی مگر خاور اس دفعہ ہنسنے کے بجائے سر ہلا کر گویا ہوئے۔

"بس جانو کہ کل سے ہی ان آفت کے پرکالوں کا یوم آزادی ختم ہو چکا ہے۔ جتنی اودھم بازی کر چکے بس بہت ہے۔ ایسی زبردست ٹیوشن کا انتظام کیا ہے کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہ مل پائے گی ان نالائقوں کو۔"

"ہائے اللہ سچ!" وہ دونوں اچھل پڑیں۔

"جی بالکل سچ۔" انہوں نے مسکرا کر تائید کی۔ "مگر اب اماں جان کو رضامند کرنا آپ دونوں کی ذمے داری......"

"ارے واہ...... ممانی جان نے کس دن ٹیوشن کی مخالفت کی ہے؟ وہ تو دل سے چاہتی ہیں کہ ٹیوٹر ملے تو ان شرارتیوں سے نجات ملے۔" خاور نے روبینہ کی پوری بات سنی پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولے۔

"بھئی مان لیا کہ آپ کی ممانی جان کو ایک عدد ٹیوٹر کی اشد ضرورت ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اصل بات سن کر آپ کے بھی دیوتا کوچ کر جائیں گے کیونکہ اگر آپ ان کی چہیتی بھانجی اور مستقبل کی ہونے والی بہو ہیں تو یہ خاکسار بھی انہی کا بیٹا ہے اور ان کا مزاج آشنا ہے۔"

"اللہ بھائی آپ تو پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ جلدی سے ساری بات کیوں نہیں بتا دیتے ہمیں تو الجھن ہونے لگی۔" اب معصومہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور بے صبری سے بولی۔

خاور نے بھی دل میں خیال کیا کہ اب مزید تاخیر مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو اماں جان ادھر آ نکلیں وہ گہری سانس بھر کر بولے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وہ ٹیوٹر پہلے والے کی طرح مرد نہیں ہے بلکہ ایک عدد محترمہ ہیں۔"

"یعنی...... کوئی لڑکی؟" وہ دونوں بھونچکی سی رہ گئیں اور ایک دوسرے کی صورت تکنے لگیں۔ خاور کو توقع بھی یہی تھی وہ لاتعلقی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"اور...... غالباً دریافت بھی تمہاری ہیں اس لیے گھبرا رہے ہو؟" بالآخر روبینہ نے سنبھالا لیا اور مسکرا کر پوچھا۔

"خیر گھبراہٹ کی تو کوئی بات نہیں، بس ذرا اماں کے مزاج کا خیال ہے۔ بے سبب بتنگڑ بنا سکتی ہیں۔ ورنہ میں تو تم سب کی آسانی کے لیے ہی سب کر رہا ہوں۔ ان تینوں کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا اور......" معصومہ نے پُراشتیاق انداز میں خاور کی بات میں دخل دیا۔

"یہ تو بتایئے بھائی وہ کیسی ہیں؟ بے چاری بہت ہی ضرورت مند ہوں گی اس لیے ٹیوشن پڑھاتی ہوں گی ناں۔" خاور نے غور سے اس کی صورت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے تو ایسا کچھ غور سے دیکھا نہیں نہ ہی واقفیت ہے۔ ایک بار اپنی ایک کولیگ سے ٹیوٹر کا ذکر کیا تھا انہوں نے ہی انتظام کیا ہے۔ ان کے بچوں کو ڈیڑھ دو سال سے پڑھا رہی ہیں۔"

"اچھا نام تو معلوم ہو گا؟" معصومہ کے سوال پر خاور پر نامعلوم سی گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

"یہ سب مجھے نہیں معلوم......" ٹالنے کو جواب دیا۔

"خیر...... تم کتنا ہی چھپاؤ مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے۔" روبینہ چبھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔

"ہاں آپ کی نظر بہت تیز ہے ناں مگر یہ عنایت آپ میرے بجائے اپنے ان پر رکھیے تو بہتر ہے۔ ٹیوٹر آپ کو نہیں چاہیے، بات ختم میں خود ہی اپنی کولیگ کو منع کر دوں گا۔" انہوں نے بالآخر چڑ کر جواب دیا تھا۔

"ارے...... ارے...... تم تو سچ مچ روٹھ گئے۔" روبینہ ہنستی ہوئی ان کے قریب آ بیٹھی اور ان کی پیٹھ تھپک کر بولی۔ "بھئی وہ ٹیوٹر رکھی جائیں گی اور ضرور رکھی جائیں گی خواہ یہ سر رہے یا نہ رہے۔ ہمارا جی داروں والا پکا وعدہ ہے، بس اب خوش۔"

"ہاں دیکھیے اب کی ہے آپ نے کام کی بات...... آپ کے تعاون کا شکریہ دراصل وہ لڑکی میرا مطلب ہے وہ ٹیوٹر چونکہ میرے توسط سے آئیں گی اس لیے اماں کچھ بھی سوچ سکتی ہیں۔" ڈاکٹر خاور انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔

"ہاں جی ہاں، ہم بالکل سمجھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ بے فکر رہیں۔" روبینہ کی آنکھوں میں اب تک شرارت آمیز چمک تھی۔ معصومہ بھی زیر لب مسکرا رہی تھی۔ خاور نے مزید بحث کرنے سے گریز کیا اور دانستہ خاموشی اختیار کر لی۔ ان دونوں کے درمیان سے جان بچا کر اٹھ گئے۔

"خاور بھیا نے بہت اچھی خبر سنائی کہ ان تینوں کی ٹیوٹرل گئیں اب کم از کم یہ شیطانوں کی ٹولی کسی کھونٹے سے تو بندھے گی۔ لے کے ناک میں دم کر ڈالا تھا مجھے تو بڑی خوشی ہو رہی ہے۔" ان کے جانے کے بعد معصومہ مطمئن ہو کر کہنے لگی۔

"خوشی تو مجھے بھی ہوئی ہے مگر ساتھ ہی پریشانی سی بھی ہے۔" روبینہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں، ایسی کیا فکر مندی کی بات ہو گئی؟" معصومہ نے اسے بغور دیکھ کر پوچھا۔

"خاور خود ہی تو کہہ گئے، تم نے نہیں سنا کیا؟"

"ارے، آپ بھی بس یونہی ہیں۔" معصومہ نے بے پروائی سے کہا۔ "اگر خاور بھیا کی معرفت بھی ٹیوٹر آ گئی تو اس میں کیا قباحت ہے؟ آخر کوئی تو ایسی کوشش کرتا ناں۔ اماں کیوں برا مانیں گی آپ بلاوجہ کا تردد مت کیجیے، کچھ نہیں ہوگا۔"

"خدا کرے تمہاری زبان مبارک ہو۔" روبی منہ ہی میں بڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

☆☆☆

اساڑھ کا مہینہ ختم ہو چکا تھا اور ساون بھادوں نے قدم جما لیے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیچڑ، پانی، تند و تیز ہواؤں اور مینہ کی بوچھاڑوں سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ خرم کا زیادہ وقت ریسٹ ہاؤس میں گزر رہا تھا۔

اس دفعہ وہ شہر سے اپنی پسندیدہ کتابیں اٹھا لایا تھا... ساون کے بھیگے بھیگے جھونکوں اور سیلی سیلی فضاؤں والے ریسٹ ہاؤس میں وہ بعض دن تمام وقت مطالعے میں مصروف رہتا۔ باہر نکلنے کا موقع کم کم ہی ملتا۔ کبھی کبھار کوئی ملنے خود ہی آ جاتا۔ کچھ دن اسی صورت بیت گئے۔

چھاجوں مینہ برس گیا۔ آس پاس کا جنگل جل تھل ہو گیا۔ بالآخر مون سون کا زور ٹوٹ گیا تو خرم ایک روز ایک فاریسٹ گارڈ کو لے کر قریبی جنگل کے دورے پر نکلا۔ ساون بھادوں کی طویل بارشوں کے بعد لوگوں کے لیے ایندھن کا حصول ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس مسئلے کے علاوہ برسات کے تند و تیز جھکڑوں اور پانی کی برستی بوچھاڑوں نے ان کی رہائشی جھونپڑیوں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ خرم کے پاس ان مسائل کا حل یہ تھا کہ وہ ایسے مصیبت زدہ لوگوں کو سرکاری جنگل سے لکڑی کاٹنے کی خود ہی اجازت دے دیتا تاکہ وہ اپنی جھونپڑیوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر سکیں اور سکون کی سانس لیں لہٰذا خرم جنگل میں گھوم پھر کر گرے پڑے اور ناکارہ درختوں پر نشان لگا دیا کرتا تھا اور لوگ باگ خوشی، خوشی اپنی ضرورت کے مطابق لکڑی حاصل کر کے اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے۔

اس کا اس روز کا دورہ اسی مقصد کے لیے تھا۔ فاریسٹ گارڈ ساتھ تھا اور ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی جب دونوں جنگل کے ایک ایسے گوشے میں پہنچے جہاں گھنے جامن کے چند درخت ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ کچھ بکریاں ان کے ہریالے پتوں پر منہ مارتی پھر رہی تھیں۔ عین اس وقت جب وہ ایک درخت پر نشان لگانے کے لیے جھکا تو ایک سُریلی چیخ نے انہیں متوجہ کیا۔

"خبردار صاحب جی ...... خبردار۔" خرم نے غور سے تنے کی طرف دیکھا۔

"اُف خدایا۔" وہاں ایک سیاہ رنگ کا زہریلا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا۔ بکریاں بھی میں میں کرتی اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ فاریسٹ گارڈ

کمال جرأت سے آگے بڑھا اور اس نے گولی مار کر ناگ کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ سب کچھ گویا پلک جھپکتے میں وقوع پزیر ہو گیا۔

خرم نے فاریسٹ گارڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اب جو صورت حال پر غور کیا تو بکریوں کے ریوڑ کے درمیان ریشم کو کھڑے پایا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں شبنمیں آنسوؤں کے شفاف قطرے سہمے ہوئے تھرتھرا رہے تھے اور اس کا دھانی دوپٹا برساتی ہوائیں اڑائے لیے جا رہی تھیں۔ دراصل وہ سُریلی چیخ اسی کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔

"بہت بہت شکریہ...... ریشم۔" خرم نے اسے پہچان کر مخاطب کیا مگر وہ جواب میں خاموش رہی شاید اب تک سہمی ہوئی تھی۔

"تم...... اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں؟" خرم نے معلوم ہونے کے باوجود اس کا خوف زائل کرنے کے لیے دوبارہ پوچھا۔

"وہ...... بابا کے گھٹنوں میں درد ہے ناں اس لیے ان بکریوں کو چرانے کے لیے آئی تھی۔" اس نے دھیرے دھیرے رک، رک کر بتایا۔

"اوہ اچھا، اچھا۔" خرم نے گردن ہلا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بابا بیمار ہیں آج کل اور تم لوگوں کا نقصان تو نہیں ہوا ان بارشوں میں؟"

"ہاں ہوا ہے۔" ریشم نے اثبات میں جواب دیا۔ "رسوئی گر چکی ہے۔ صرف بابا والی چھت سلامت ہے۔ ایندھن، چولہا چکی سب تباہ ہو گیا۔ گائے والا چھپر بھی اُڑ گیا ہے۔" آج وہ پہلے دن والی تیز طرار ریشم سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ خرم کے دل پر چوٹ لگی۔

"بہت دکھ ہوا، اچھا آؤں گا کسی وقت بابا کو دیکھنے کے لیے۔" وہ افسوس کے لہجے میں گویا ہوا۔ ریشم اپنی بکریوں کی طرف متوجہ ہو گئی اور خرم دوبارہ درختوں پر نشان لگانے لگا مگر اس وقت اس کی توجہ اور کام کی یکسوئی میں واضح فرق آ گیا تھا۔ اس کا دھیان بار بار ریشم کی طرف جا رہا تھا۔

ایسا تو نہیں تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد وہ ریشم اور اس کے بابا کو بھول گیا ہو مگر دانستہ جنگل کے اس کونے کی طرف وہ کبھی گیا بھی نہیں تھا۔

جنگل میں مستقل رہائش کی بنا پر اسے انڈے مرغی یا مکھن کی ضرورت تو تقریباً روز ہی پڑتی تھی مگر اسے ایک عدد خانساماں مل گیا تھا اور روزمرہ ضروریات کی اشیا وہ بہ آسانی دستیاب کر لیا کرتا تھا چنانچہ خرم اس طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔

جنگل کے دورے کے دوران انہیں رحمت بابا بہت دفعہ کہیں نہ کہیں جنگل کے کسی نہ کسی گوشے میں بکریاں چراتے مل جاتے تھے یا کبھی کبھار ریشم بھی دکھائی دے جاتی تھی مگر خرم طرح دے جاتا ـــ اس کی فطری شرافت اور کم آمیزی راہ میں آ کھڑی ہوتی مگر آج کی شام وہ خود کو روک نہ پایا ـــ ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر غسل سے فارغ ہو کر سیدھا رحمت بابا کی کٹیا کی طرف چل دیا... وہ سادہ دل بابا واقعی باہر بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑاتے ہوئے جنگل کی سمت سے آنے والی پگڈنڈی پر نگاہ جمائے مصروف انتظار تھے۔

"واہ میاں جیتے رہو۔ تم نے تو دوبارہ پلٹ کر ہماری خیر خبر نہ لی۔" انہوں نے چھوٹتے ہی گلہ کر ڈالا۔

"کچھ دنوں کے لیے تو میں گھر چلا گیا تھا اُدھر سے لوٹا تو بارشوں نے آ لیا۔ ایسے میں باہر نکلنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔" خرم نے ندامت سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہاں میاں، سچ کہتے ہو اس برس تو برساتیں کچھ زیادہ برس گئی ہیں۔ گھانس پھونس اور سبزہ تو خوب پھل پھول گیا ہے مگر لوگ باگ بے چارے پریشان ہو اٹھے ہیں۔ کسی کی چھت اڑ گئی تو کسی کی دیوار بیٹھ گئی۔"

خرم نے دیکھا ان کا باڑا ابھی تقریباً ختم ہو چکا

تھا۔ وہ جھونپڑی جسے ریشم باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتی تھی اوندھی پڑی تھی۔ پہلے جیسی رونق تھی نہ خوشحالی ایک مضمحل سا سناٹا طاری تھا جسے قریبی درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی آوازیں مجروح کررہی تھیں۔ خرم نے رنجیدگی سے کہا۔

”بابا! آپ نے بھی غیریت کی حد کردی۔ ریسٹ ہاؤس زیادہ دور تو نہیں ہے۔ کم ازکم خبر ہی کردیتے اپنے حالات کی۔“

”جیتی زندگی میں سب چلتا ہے بیٹا اور پھر برسات ہر برس ایسی ہی زیادتیاں کرجاتی ہے۔ یہ تو موسمی تبدیلیاں ہیں، ہوتی رہتی ہیں۔“ بابا نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر جواب دیا۔

”لیکن جب تک میں اس جنگل میں تعینات ہوں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ خرم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”ریشم......ریشم بیٹی مہمان آئے ہیں۔ کیا پکایا ہے تو نے۔“ بابا نے وہیں بیٹھے بیٹھے پکارنا شروع کردیا۔ وہ سامنے ہی کھلے آسمان کے نیچے چولھا جلائے گیہوں کی گرم گرم روٹیاں سینک رہی تھی۔ لال، لال انگاروں کی تپش سے لب ورخسار تپ کر انگارہ لگ رہے تھے۔

ذرا ہی دیر میں ریشم نے بھیڑ کا بُھنا ہوا گوشت اور روٹی سامنے لاسجائی۔ بابا کے بے پناہ خلوص کے سامنے خرم انکار بھی نہ کرسکا اور چپ چاپ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ یوں جیسے یہاں تک کھانا کھانے آیا ہو۔ کھانا بھی عام دنوں سے زیادہ بھایا بعدازاں بابا نے الائچی والی چائے سے بھی تواضع کی۔ اس رات کا پہلا پہر خرم نے ان کی جھونپڑی میں باتوں میں ہی گزار دیا۔

جنگل کے کنارے، کنارے کئی ایک چھوٹی، چھوٹی بستیاں ایک کے بعد ایک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آباد تھیں۔ دنیا کے مکروفریب سے اور زندگی کی دیگر جعل سازیوں سے کوسوں دور یہاں کے باشندے ایک دوجے میں خوب شیروشکر تھے گوکہ آبادی بہت زیادہ نہ تھی مگر کسی نوعیت کا ڈر خوف بھی نہ تھا۔ لوگوں کی گزراوقات کا ذریعہ ان کے مویشی تھے جنہیں وہ نہایت محبت اور محنت سے پالتے، پرورش کرتے اور قریبی قصبے کی منڈی میں فروخت کرکے اپنے کنبوں کے لیے دال دلیہ مہیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ سیزن پر جنگل کے اندر طرح طرح کی محنت مزدوری کرکے روزی کمالیتے۔

اگرچہ روزگار کے ذرائع وسیع نہ تھے لیکن یہاں کے باسیوں کی ضروریاتِ زندگی بہت محدود تھیں۔ یہ لوگ قناعت پسند، صابر اور صلح جُو تھے۔ سادگی اور سادہ لوحی ان کی میراث تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کا ماحول سکون اور آشتی سے مالا مال تھا۔ کبھی کبھار کی بیماری آزاری یا کسی بڑی تکلیف کے سوا کبھی بڑے قصبے کا رخ نہ کرتے۔

ریشم اور رحمت بابا اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ برسوں پہلے، ریشم کے والدین ایک وبائی مرض میں مبتلا ہوکر چل بسے تھے تب سے بابا رحمت نے ہی اس کی پرورش اور نگہداشت کی تھی۔ یوں تو بستی میں ان کے کئی قریبی رشتے دار موجود تھے مگر اب تو بہت عرصے سے ریشم نے خود ہی گھرداری کا تمام بوجھ اٹھانا شروع کردیا تھا۔ وہ گھرداری کے سارے کام خوش اسلوبی سے کرلیتی تھی۔ اس لیے تایا بھتیجی کو کسی طرح کی تنگی ترشی کا احساس بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔

شروع سے صحت کمزور ہونے کی وجہ سے بابا رحمت پر بڑھاپے نے بہت جلد قبضہ جمالیا تھا۔ اس لیے ان کا زیادہ وقت جھونپڑے کے اندر یا پھر باہر بڑ کے بلندوبالا پیڑ تلے چارپائی پر لیٹے حقے کو گڑگڑاتے گزرتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے انہوں نے آج تک شادی بھی نہیں کی تھی بس اپنی زندگی سے اسی طرح مطمئن تھے سوگزار رہے تھے۔

مرحوم بھائی کی آخری نشانی ریشم تھی جو بابا رحمت کو جان سے زیادہ عزیز تھی بلکہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ریشم کو انہوں نے اپنی سگی اولاد سمجھ کر پرورش کیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس نے کبھی بھی ان کا مان ٹوٹنے نہ دیا تھا۔ وہ انہیں اپنا باپ بھی سمجھتی تھی اور ماں بھی بلکہ بسااوقات تو وہ ان کی سہیلی بھی بن جاتی تھی۔ دونوں اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن اور خوش باش تھے۔

رحمت بابا نے بہت سی بھیڑ بکریاں، مرغیاں اور ایک گائے بھی پال رکھی تھی۔ یہی سب کچھ ان کی کائنات تھی کیونکہ ان کی گزراوقات انہی نعمتوں کی مرہونِ منت تھی۔

جب ان کی طبیعت بہتر ہوتی وہ اپنے ڈھورڈنگر خود ہی جنگل کی طرف ہنکالے جاتے اور کسی گھاس پھونس سے لبریز سرسبز گوشے میں چرنے کے لیے چھوڑ کر خود کسی پیڑ کی چھاؤں میں پیر پسار کر لیٹ رہتے۔ کبھی کبھار طبیعت بہت ہی اچھی ہوتی تو جھیل کنارے جانکلتے مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ جھیل ان کی جھونپڑی سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ بہت زیادہ تھکاوٹ کا شکار ہوجایا کرتے تھے۔ اس لیے ان اطراف میں جانے سے گریز کرتے۔ جنگل سے وہ شام ڈھلے واپس بہ آسانی لوٹ آتے۔ جہاں ریشم دن بھر کے کام دھندے سے فراغت پاکر گرم گرم کھانا پکائے اپنے پیارے بابا کا انتظار کررہی ہوتی لیکن مہینے میں بہت مرتبہ یہ معمولات بدل کر رہ جاتے اور یہ تب ہوتا جب رحمت بابا کچھ زیادہ ہی چلنے پھرنے سے معذور ہوجاتے۔ ہاتھ پیر بالکل جواب دے جاتے تو پھر یہ کام بھی ریشم کے ذمے آپڑتا۔ ایسے میں وہ کھانا وغیرہ جلدی بنالیا کرتی تھی۔

جھونپڑی کو اندر باہر سے صاف ستھرا رکھنا، کبھی کبھی اس کی لپائی پُتائی کرنا، کھانا پکانے اور گائے کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ فارغ اوقات میں وہ جنگل کے قریبی حصوں سے سوکھی لکڑیاں چن چن کر جمع کرتی رہتی بعد میں اس سوکھے ایندھن کو علیحدہ بنی ہوئی چھوٹی سی کٹیا میں ذخیرہ کردیتی کیونکہ ان اطراف میں غیر متوقع بارشوں کا کچھ بھروسا نہ تھا۔ جانے کب بادلوں کے دَل کے دَل آموجود ہوجاتے اور جل تھل ہوجاتا۔

ایسے بھیگے سیلے موسموں میں سوکھی لکڑیاں بہت بڑا سہارا ثابت ہوتی تھیں۔ بابا کے بیمار ہوجانے کی صورت میں جھونپڑے کو گرم رکھنے کا اہتمام بے حد ضروری ہوجاتا۔ اندر کی فضا گرم ہوتی تو انہیں سانس لینے میں سہولت ہوتی۔ بابا اس کی دوراندیشیوں کے

سنہری معلومات

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلواروں میں سے ایک تلوار کا نام ضرب عضب (تیز دھار یا تیز چلنے والی) تھا۔ یہ تلوار صحابی رسولؐ حضرت سعد بن عبادہ الانصاریؓ نے غزوہ احد میں حضور اکرم کو پیش کی۔ غزوہ احد کے بعد یہ تلوار صحابی ابودجانہ الانصاریؓ کو دی گئی۔ اب یہ تلوار قاہرہ، مصر کی مسجد الحسین ابن علیؓ میں محفوظ ہے۔ دیگر آٹھ تلواروں کے نام

عمل الشور، الرسوب، السطار، الحتف، الاقالی، المخزم، القضب اور الذوالفقار۔

یہ آٹھ تلواریں استنبول، ترکی کے عجائب گھر Thopkapi میں محفوظ ہیں، سبحان اللہ۔

مرسلہ: عینی عرفان، کراچی

گن گاتے نہ تھکتے۔

جنگل کے کنارے قدرے فاصلوں پر بنے ہوئے جھونپڑوں میں دن کے اوقات میں اکثر خاموشیوں کا راج رہتا مگر شام ڈھلے، چراغ جلے زندگی اپنی توانائیوں اور رعنائیوں سمیت جاگ اٹھتی۔ خاص طور پر گرمی کی رُت میں تو رات گئے تک جگار رہتی۔ بڑوں اور بچوں کے بولنے چالنے اور ہنسنے رونے کی آوازیں ابھرتی رہتیں۔

گھر کی عورتیں اکثر رات کا کھانا باہر ہی پکانے کی عادی تھیں۔ چولھوں میں جلنے والی لال نارنجی آگ کے عکس سے اندھیرے چمک چمک اٹھتے۔ لوگوں کی آوازوں سے جنگل کی فضائیں معمور رہتیں۔ گھروں کے مردوں میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو دن کے وقت جنگل کے اندر ہی کسی نہ کسی محنت مزدوری میں مصروف رہتی۔ کوئی لکڑیاں کاٹ رہا ہوتا تو کہیں درختوں سے پھل، بیج، شہد یا لاکھ وغیرہ اتار رہے ہوتے۔ یہ جنگل ان کے پیٹوں کے لیے ایندھن مہیا کرتا تو ان کی دیگر ضروریاتِ زندگی مکمل کرنے میں سب سے بڑا مددگار تھا۔

جنگل کے ایک بلند اور صاف ستھرے حصے میں لوگوں نے مل کر گارے اور کچی مٹی سے ایک خوب صورت مسجد تعمیر کر رکھی تھی۔ یہ ان کے باشعور اور دین دار ہونے کی علامت تھی۔ خدا کی مہربانی سے اس مسجد کو ایک عدد نیک سیرت مولوی صاحب بھی میسر تھے جو پانچوں اوقات کی اذان اور نماز کے علاوہ صبح شام بچوں کو درس بھی دیا کرتے تھے۔ عصر سے فارغ ہو کر وہ بھی بستی کے لوگوں کے درمیان آ بیٹھتے۔ خاص طور پر وہ بڑے بوڑھوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ یہ لوگ ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے یا کوئی نہ کوئی مسئلہ پوچھتے رہتے۔ یوں یہاں کی چہل پہل اور آوازوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

ہم عمر لڑکیاں بالیاں، جن کے لیے شام کی یہ گھڑیاں بالکل فارغ ہوتی تھیں اپنا پسندیدہ کھیل آنکھ مچولی یا پہل دوج کھیلتیں اور بعض اوقات ایسی مگن ہوتیں کہ ہر لمحہ کالی پڑتی رات بھی انہیں خوف زدہ کاہے کو کر سکتی۔ ایسے میں ماؤں کی ڈانٹ پھٹکار انہیں واپس بلاتی مگر ماں نہ ہونے کے باوجود ریشم نے بابا رحمت کو کبھی پریشان نہیں کیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ ہوشمند اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ بابا تو بابا تھے، بستی کے دیگر لوگ باگ اس کی بہت سی خوبیوں کے معترف تھے۔

بستی میں ریشم کی بہت سی ہمجولیاں تھیں۔ بچپن کی ساتھ کھیلی سہیلیاں تھیں مگر وہ ہر کام اور کھیل سے زیادہ فوقیت بابا کی خدمت کو دیتی تھی بعد میں اپنے مشاغل کی طرف متوجہ ہوتی۔ گویا وہ ایک ذمے دار قسم کی لڑکی تھی۔ یہ کام اسے کسی نے سکھائے تھے نہ بتائے تھے مگر کہنا چاہیے کہ وہ فطری طور سے ہی بہت حساس اور خود آگاہ لڑکی تھی۔ خود بھی مطمئن رہتی اور اپنے بابا کو بھی پُرسکون رکھتی تھی اس کی سب میں اچھی سہیلی بنتی تھی۔

☆☆☆

اگلی سویر بڑی مُدھ بھری اور چمکیلی تھی یوں جیسے نارنجی ٹیلوں کے بیچ بہتی سرسراتی جھیل کے ساکن پانیوں پر کوکا بیلی کے لاکھوں پھول کھلے ہوں۔ چودھویں رات کی چاندنی میں راج ہنس کے۔۔۔ بے داغ پروں کے مانند شفاف دکھائی دینے والے کوکا بیلی کے پھول۔ ایسی اجلی صبحوں پر جھیل کے کناروں پر جھکے ہوئے بانس کے کنجوں پر پھیلا خوابوں کے سے جال کا گمان گزرتا۔۔۔۔ جس رات کے پہلے پہر تک خرم، ریشم کے جھونپڑے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا اس رات کی صبح ایسی ہی حسین اور دلربا تھی جی کو بھلی لگنے والی مدھری صبح۔

بابا اصرار کر کے خود ہی بکریوں کو لے کر جنگل

کی سمت نکل گئے تو وہ کام دھندے میں مصروف ہو گئی مگر یہ کیا ابھی ریشم نے رات والے برتن باسن ہی دھوئے تھے کہ کھڑ پڑ کھڑ پڑ کرتی ایک گدھا گاڑی سامنے آ رکی۔ کود کے دو تین آدمی نیچے اترے اور بابا کا نام لے کر ہانک لگائی۔

”کیا بات ہے بھائی؟“ ریشم نے باہر نکل کر حیرت سے دریافت کیا۔ ”میرے بابا سے کیا کام ہے تمہیں؟“

”کیا رحمت بابا یہیں رہتے ہیں بیٹا؟“ ان میں سے ایک چھدری داڑھی والے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”ہاں، رہتے تو یہیں ہیں مگر اس وقت جنگل گئے ہوئے ہیں۔“ ریشم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا تو بیٹا ایک طرف کو ہٹ جاؤ۔“ چھدری داڑھی والے نے کہا۔

”ہمیں ہمارے آفیسر صاحب نے یہاں کام کے لیے بھجوایا ہے۔ یہ سارا سامان بھی ہمیں یہیں اتارنا ہے۔“ ریشم نے دیکھا بیل گاڑی پر لمبی لمبی لکڑیاں لدی تھیں مگر وہ تب بھی نہ سمجھ سکی۔ احمقانہ انداز میں پوچھا۔

”ان کا کیا کریں گے ہم؟ اور پھر بابا بھی نہیں ہیں، جاؤ تم لوگ۔“

”جائیں کیسے؟“ اب دوسرے آدمی نے دخل دیا۔ ”ہمارے آفیسر صاحب تو ناپ ڈالیں گے ہمیں۔ آپ ہمارے کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں بس ایک طرف ہو جائیں۔ ہم جانیں ہمارا کام جانے۔“

”واہ، اس طرح کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ وہ چمک کر بولی۔ ”ہمارا گھر بار ہے، ہم کیسے نہ دخل دیں یہ کیا اندھیر ہے بھلا۔“ وہ تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے پھر پہلے آدمی نے سمجھا بجھا کر کہنا شروع کیا۔

”بٹیا! ہمارا وخت خراب مت کرو۔ تمہارے بھلے کا کام ہے۔ جنگل کے آفیسر صاحب نے حکم بھجوایا ہے کہ ہم یہاں دو بہترین جھونپڑے تیار کریں اور اس احاطے کی چوندی (چہار دیواری) بھی لگائیں۔ اگر تم نے یونہی ضد لگائے رکھی تو ہماری دیہاڑی تو گئی ناں ملیامیٹ۔“ ریشم جواب میں کچھ بول نہ پائی معاً جنگل کی سمت سے خرم نمودار ہوا اور وہیں رک کر ان لوگوں کو ہدایات دینے لگا۔ ریشم چپ کی چپ رہ گئی۔ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ بول پائی بلکہ اندر جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جوتوں کی آہٹ ہوئی۔ ریشم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ خرم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے پر آ رکا۔ یہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا خرم کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی چھڑی تھی جسے وہ دھیرے دھیرے دہلیز پر مار رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔ چند لمحے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”ان بے چارے مزدوروں سے جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ لڑنا ہے تو مجھ سے لڑو۔ انہیں تو میں نے بھیجا تھا ناں۔“

وہ کیا کہتی خاموش کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر گہرا سکوت طاری رہا پھر وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”ریشم میرا ایک کام کرو گی؟“

”کیا؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”کام یہ ہے کہ...... ایک دو دن تک ان تینوں بندوں کو ایک وقت کا کھانا پکا کر کھلا دیا کرو گی؟“ ریشم نے جھٹ اثبات میں گردن ہلا دی۔

”کیوں نہیں کھلاؤں گی، آپ کہیں گے تو روزانہ پکا دیا کروں گی۔“

”بہت شکریہ!“ خرم نے خوش ہو کر کہا۔ ”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ پھر چھڑی کو ہلکے سے انداز میں اس کے سر سے چھو کر بولا۔ ”ان مزدوروں کو ان کا کام کرنے دو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں پھر چکر

لگاؤں گا۔ کل سے بابا کو جنگل جانے سے روک لینا۔ وہ یہاں رک کر اپنی مرضی سے سب کام کروالیں گے، ٹھیک ہے؟" ریشم کافی دیر اس کے جاتے قدموں کی چاپ سنتی رہی اور پھر جیسا اس نے کہا ویسا ہی ہوا۔

چند دنوں کے اندر، اندر بابا رحمت کے ہاں دو عدد مضبوط اور صاف ستھری جھونپڑیاں تیار ہو چکی تھیں۔ بابا کے منع کرنے کے باوجود خرم نے ان جھونپڑیوں کے اردگرد لکڑیوں کی مضبوط بلیاں گڑوا کر چہار دیواری کھنچوادی تھی۔ ایک طرف مویشیوں کے لیے گھاس پھونس کا باڑا بھی تعمیر ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے دل خرم کے لیے نیک جذبات سے لبریز ہو چکے تھے۔

مزدوروں کا کام ختم ہونے کے بعد ریشم نے اپنی محنت مشقت کا آغاز کردیا اور کچی چکنی مٹی گوندھ گوندھ کر باڑے کے قریب ایک اونچی جگہ پر اپنی مرغیوں کے دڑبے بنانا شروع کردیئے ۔۔ اس کام میں اس کی ایک ہندو ہمجولی بسنتی نے بھی بڑھ چڑھ کر اس کا ہاتھ بٹایا گو کہ رحمت بابا عام بستی سے قدرے ہٹ کر رہائش پزیر تھے مگر ان سے قریب ترین گھر بسنتی کا بھی تھا۔ ان دونوں ہمجولیوں کی دوستی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ بسنتی عید کے دن ریشم جیسا جوڑا پہنتی تو ریشم بھی ہولی، دیوالی اس کے ہمراہ منانے سے نہ چوکتی تھی۔

دسہرے کی راتوں میں جب اندھیرا ہوتے ہی گلیاں سنسان پڑ جاتیں۔ مائیں سرِ شام ہی اپنے ننھے منے بچوں کو گرم بستروں میں گھسا دیتیں اور باہر جنگل کے بلندو بالا درختوں میں باؤلی ہوائیں چیختی پھرتیں بستی کے گھروں پر گہرا سناٹا طاری ہو جاتا۔ ریشم نہایت اطمینان سے بابا کی اجازت سے بسنتی کے گھر چلی آتی۔ ہوا کے تیز جھکڑ پیڑوں کی شاخوں سے گزرتے ہوئے چیخ رہے ہوتے۔ بعض موسموں میں اچانک ہی گرجتے برستے بادل امڈ آتے، پانی کی ننھی ننھی بوندیں پتوں سے ٹکرا ٹکرا کر جلترنگ بجا رہی ہوتیں مگر وہ دونوں ہولی کی چنریا رنگ رہی ہوتیں۔

بسنتی کے پتا جی من موہن داس کے پاس دو کھیت تھے۔ جن کو گاہنا کوڈی کرنا، بیج ڈالنا پھر جو کچھ بھی وہ اگاتے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال میں دن رات ایک کردینا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ان دونوں کھیتوں کے کسی نہ کسی حصے میں ہر موسم کی سبزی ترکاری اور تھوڑے سے ٹماٹر اور مٹر ضرور اگاتے تھے۔ یہ چیزیں ان کے کنبے کی اہم ترین ضرورت تھیں۔ جو چیز ان کی ضرورت سے بڑھ کر پیدا ہو جاتی، وہ بہ آسانی اسے فروخت کر کے پیسے بنالیتے تھے۔

گیہوں کے بجائے چاول کی روٹی یہ لوگ بہت شوق اور رغبت سے کھاتے تھے لہٰذا کاتک کے مہینے میں ان کھیتوں میں دھان کے ہریالے پودے لہلہا اٹھتے۔ تیز ہواؤں سے دھان کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ لمبی لمبی پتیوں کے بیچ بیچ دھیمی دھیمی سیٹیاں سی بجنے لگتیں جیسے دیوالی کی چراغوں بھری رات میں کنواریاں جھانجھنیں پہنے رقص کر رہی ہوں۔

من موہن داس کے مختصر سے دھان کے کھیتوں پر جیسے بہار کی پریاں اتر آتیں۔ ہلکی ہلکی مہک فضا میں رچ جاتی۔ کاتک کی سنہری، سنہری دھوپ میں دھان کی بالیوں کا رنگ روز بروز نکھرتا جاتا۔ ہوا کے جھونکے مدھر مدھر چلتے، جنگلی پھولوں سے لدی شاخیں جھومتیں تیز خوشبوئیں ہر طرف بکھرنے لگتیں۔

دھان کے پودوں کا رنگ سنہری پڑتے ہی بسنتی کے گھر کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور سب ایک دوجے کو بدھائی دینے لگتے لیکن اس برس..... انہونی ہوگئی۔ ایک صبح دھان کے کھیت کنارے موہن داس کی گائے اُدھڑی پڑی تھی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

(باقی آئندہ)



آئندہ نہیں ہوگا

ثریا انجم

چائے کی پیالی کے ٹکڑے کمرے سے لے کر برآمدے تک چلے گئے تھے اور چائے کے چھینٹے دیوار پر نقش ونگار بنا کر فرش پر ٹھہر گئے تھے۔

"منحوس عورت، ایک کپ چائے بھی ڈھنگ سے نہیں بنا سکتی۔" میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے جھنجوڑ کر رکھ دوں اور میں ایسا ہی کرتا مگر وہ میری پہنچ سے خاصی دور جا چکی تھی، دھیمی آواز میں "آئندہ نہیں ہوگا" کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی

اور منٹوں کے فرق سے تازہ چائے کا کپ لے کر واپس آگئی۔ میں نے ایک قہر آلود نظر سے اس کا سراپا دیکھا جو دھیرے، دھیرے لرز رہا تھا اور ایک جھٹکے سے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ گرم، گرم چائے چھلک کر اس کے ہاتھ پر گری اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی جسے وہ بہ مشکل روک پائی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ وہ جتنا زیادہ خوفزدہ ہوتی تھی۔ اتنا ہی زیادہ میرے اندر طمانیت کا احساس بڑھتا تھا۔

مرد حاکمیت کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے یہ احساس شاید مجھے پالنے میں ہی ہوگیا تھا کیونکہ اُس وقت بھی ماں کی لوریوں کے بجائے مجھے ابا کی چنگھاڑتی آواز زیادہ سنائی دیتی تھی۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، قدرے سانولی رنگت اور آنکھوں میں ہر دم رہنے والی سرخی ابا کی شخصیت کو رعب دار بنانے کے لیے کافی تھی اس پر اُن کی آواز اور لہجہ کسی کو ان کے سامنے ٹھہرنے نہیں دیتا۔ اماں تو یوں بھی بہت دبلی پتلی جسمانی طور پر کمزور سی عورت تھیں، ابا کی ڈانٹ سن کر تھر تھر کانپنے لگتیں۔

میں پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے دادی اور ابا کا چہیتا تھا۔ دادی بھی ابا ہی کی طرح لمبی چوڑی دبنگ قسم کی خاتون تھیں۔ جس انداز سے انہوں نے ابا کی پرورش کی تھی اسی ڈھنگ سے مجھے بھی پروان چڑھا رہی تھیں۔ اماں کو میرے معاملے میں بولنے کی ہمت تھی نہ ہی اجازت...... میرے منہ سے نکلی ہر بات اگر فوری طور پر پوری نہ کی جاتی تو میں رو، رو کر زمین آسمان ایک کر دیتا اور نتیجتاً اماں کو دادی اور ابا کے عتاب کا نشانہ بننا پڑتا۔

اماں سے کبھی ماں بیٹے والا رشتہ قائم ہی نہیں ہوسکا کیونکہ دادی شروع ہی سے مجھے اپنے پاس سلاتی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں، اماں کی حیثیت میرے نزدیک گھر میں کام کرنے والے کسی ملازم جیسی تھی وہ اگر کبھی موقع پا کر مجھے اپنے پاس بلاتیں تو میں انتہائی بے نیازی سے سنی ان سنی کر کے اپنے کھیل میں لگا رہتا، نہ ان کا محبت بھرا لہجہ مجھ پر اثر کرتا نہ آنکھوں سے چھلکتی ممتا نظر آتی۔

دادی یوں تو ڈیل ڈول اور عادت و اطوار میں بالکل ابا جیسی تھیں مگر ابا کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی اور وہ ساری کسر اماں پر نکالتیں۔ سب کہتے تھے کہ دادا بھی غصے کے بہت تیز تھے گویا بات، بات پر آپے سے باہر ہو جانا ہمارا خاندانی وتیرہ تھا جس پر ہم بڑے فخریہ انداز میں نسل در نسل عمل کر رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا عملی نشانہ زیادہ تر ہمارے گھر کی عورتیں بنتی تھیں۔ باہر کے لوگ تو ہمارے مزاج اور طنطنے کو دیکھ کر ہم سے دور، دور ہی رہتے۔ ابا کی شہر کے بہترین کاروباری علاقے میں کپڑے کی دکان تھی جہاں تین لڑکے ملازم تھے۔ آمدنی بہت اچھی تھی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ میرے بعد دو چھوٹے بھائی اور تھے جن کی پرورش بھی میرے ہی انداز میں ہوئی مگر اتنا فرق ضرور ہوا کہ ابا اپنی مصروفیت اور دادی بڑھاپے کی نقاہت کی وجہ سے ان پر اس طرح توجہ نہیں دے سکے جس انداز میں وہ دونوں میری ناز برداری کیا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کسی حد تک اماں کے نزدیک ہوگئے اور اماں کے مرجھائے ہوئے چہرے پر بھی کبھی، کبھی تازگی کی رمق نظر آنے لگی مگر ابا کے عتاب اور دادی کی جھڑکیوں سے وہ اب بھی محفوظ نہیں تھیں اور موقع ملنے پر میں بھی اپنے مزاج کی شعلہ فشانی کا مظاہرہ کرنے میں ان دونوں سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

”رفیق تمہیں پتا ہے ناں آج تمہارا نتیجہ آنے والا ہے۔“ ابا نے ناشتا ختم کر کے چائے کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تو میں نے بے پروائی سے گردن ہلادی۔

”بس اب تم دکان پر بیٹھنا شروع کردو بہت پڑھائی کرلی۔“

”مگر کالج میں داخلہ......“ اماں نے میرے سامنے گرم پراٹھا رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور دوسرے ہی لمحے ابا نے ہاتھ مار کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹیں گرادیں۔

”تم کون ہوتی ہو رفیق کے بارے میں فیصلہ کرنے والی۔ جب میں نے کہہ دیا اب یہ دکان پر بیٹھے گا تو کہہ دیا۔“ وہ جھٹکے سے اٹھے تو کچھ چیزیں بھی زمین پر آگریں۔ میں اسی اطمینان سے انڈے پراٹھے کے بڑے، بڑے نوالے حلق سے نیچے اتارتا رہا کیونکہ یہ تو روز کا معمول تھا۔ ابا اسی طرح چیخ چلا کر باہر چلے جاتے اور اماں آنسو پی کر گھر کے کاموں میں جُت جاتیں۔

میٹرک کا رزلٹ آگیا۔ میں پاس بھی ہوگیا کیونکہ میں بہر حال کند ذہن نہیں تھا، اسکول میں جو کچھ پڑھایا جاتا وہ اتنا تو دماغ میں رہ ہی جاتا تھا کہ بغیر محنت کیے بھی پاس ہوگیا۔ ابا کے ساتھ دکان جانا شروع کیا تو وہاں بھی اپنی عادت کے مطابق کام کرنے والے لڑکوں پر رعب جمانا چاہا مگر تیسرے دن ابا نے میری کلاس لے ڈالی اور یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ ابا نے سخت لہجے میں بات کی تھی مگر بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

چند مہینے ہی گزرے تھے کہ میں نے کاروبار کو اچھی طرح سے سمجھ لیا۔ کپڑے کی دکان چلانا کوئی آسان کام نہیں، یہاں سارا دن بے وقوف اور تنگ چڑھی عورتوں سے واسطہ پڑتا تھا جو مہنگے، مہنگے کپڑے میں سو، سو نقص نکالتیں، درجنوں تھان کھلوا کر بغیر کچھ خریدے بڑی شانِ بے نیازی سے اٹھ کر چلی جاتیں۔ فکسڈ پرائس کا بورڈ لگا ہونے کے باوجود قیمت پر جھگڑا کر کے وقت ضائع کرتیں مگر ابا کا پہلا لیکچر ہی اس قدر کارگر ثابت ہوا کہ میں سارا دن بڑے تحمل سے گزار لیتا۔

☆☆☆

ہم دونوں باپ، بیٹا دن رات کاروبار کو ترقی دینے کی فکر میں رہتے اور چھوٹے بھائیوں، شفیق اور عتیق کا سارا دھیان پڑھائی پر رہتا۔ اماں کو اپنے خواب پورے ہوتے نظر آرہے تھے اسی لیے اب ابا کی جھڑکیاں اور میری خود سری ان کی آنکھیں نم نہیں کرتی تھی بلکہ وہ ایک خود فراموشی کے سے عالم میں اپنے کاموں میں مگن رہتیں۔ حالانکہ دادی سے ان کا یہ انداز برداشت نہیں ہوتا اور وہ کسی نہ کسی بہانے سے انہیں پریشان کرنے سے باز نہیں آتی تھیں مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے تو اچانک ہی وہ وقت آگیا۔ اچھی بھلی صحت مند دادی کو نمونیہ ہوگیا اور وہ ایک ہفتے کے اندر، اندر اپنے تمام تر رعب اور طنطنے کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی کے حضور حاضری دینے کے لیے چل دیں۔

ابا کو میں نے زندگی میں پہلی بار بجھا، بجھا سا دیکھا۔

”اپنے ابا کا خیال رکھا کرو انہوں نے اپنی ماں کے مرنے کا بہت صدمہ لیا ہے۔“ دادی کے سوئم کے بعد جب ایک، ایک کر کے سارے رشتے دار چلے گئے تو اماں میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ مجھے بہت عجیب سا لگا جیسے دادی کے جانے کے بعد وہ ان کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

”مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے حسب عادت درشت لہجے میں کہا اور ان پر نظر ڈالے بغیر کمرے سے باہر آگیا۔

کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کم از کم ان لوگوں کے لیے تو بالکل بھی نہیں جو صرف اپنے آپ میں جیتے ہیں۔ ہم دونوں باپ بیٹا ان ہی لوگوں میں سے تھے، دادی کے جانے

سے ہمیں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا سوائے اس کے کہ اب جب ہم رات کو دکان سے واپس آتے تو کھانے کے ہر لقمے کے ساتھ اب ہمیں اماں کی شکایتیں سننے کو نہیں ملتیں اور ہم سکون سے کھانا کھا کر ٹی وی دیکھتے' اوولٹین ملا ہوا گرم دودھ پیتے اور پھر گہری نیند سو جاتے۔ گویا زندگی کو ہم اپنی مرضی سے جی رہے تھے۔ شفیق مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا اور عتیق اس سے ڈیڑھ سال مگر دیکھنے میں وہ دونوں برابر کے لگتے تھے کیونکہ بچپن میں شفیق بہت بیمار رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اسکول بھی دیر سے جانا شروع کیا۔ دونوں بھائی شروع سے ایک ہی کلاس میں تھے، دونوں پڑھنے کے شوقین تھے اور ہمیشہ کلاس میں ابتدائی پوزیشن لے کر کامیاب ہوتے آئے تھے۔ جب دادی کا انتقال ہوا تو وہ دونوں میٹرک کر چکے تھے اور اپنی شاندار کامیابی کی وجہ سے انہیں شہر کے بہترین کالج میں بہ آسانی داخلہ مل گیا تھا۔ اماں کو خوشی کا اظہار کرنے کا وقت تھا نہ ہی اجازت مگر پھر بھی وہ جس انداز سے گھر میں چلتی پھرتیں، کام کاج نمٹاتیں اس سے یوں لگتا تھا جیسے ان کا وجود روئی جیسی ہلکی اور نرم چیز سے بنا ہوا ہو اور وہ چلنے کے بجائے فضا میں تیر رہی ہوں۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے اب انہیں کسی بات کی فکر نہیں رہی تھی۔ ان کی شخصیت کی تبدیلی اس قدر واضح تھی کہ اپنی تمام تر بے حسی کے باوجود میں نے محسوس کر لی تھی اور شاید ابا نے بھی۔

☆☆☆

ابا نے برابر والی دکان خرید کر اپنی دکان میں شامل کر لی تھی، اب ہمارے یہاں تین کے بجائے پانچ سیلز مین کاروبار کو چلانے میں ہماری مدد کرتے تھے۔ ابا کا تجربہ اور میری جوانی کا جوش و خروش ہمیں ترقی کی نئی سے نئی راہیں ڈھونڈنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ویسے بھی ابا چاہتے تھے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں ہم تینوں بھائیوں کو الگ، الگ روزگار کا مالک بنا دیں تاکہ ان کے بعد ہم بھائیوں میں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، میرے دل میں بھی کچھ عرصے سے یہ خواہش پل رہی تھی کہ موجودہ دکان کی ملکیت صرف میرے نام ہو، لہٰذا ابا نے شہر کے دوسرے علاقے میں دکان خرید کر اس مرتبہ ریڈی میڈ گارمنٹ کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے دل و جان سے ان کا ساتھ دیا۔ ابا دکان کی تلاش میں لگ گئے اور میں مارکیٹ میں گھوم پھر کر ریڈی میڈ گارمنٹس کے بارے میں...... معلومات اکٹھی کرنے میں چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ہم نے سب تیاری مکمل کر لی۔ ہم دونوں باپ' بیٹے بہت خوش تھے...... بہت زیادہ خوش۔

☆☆☆

''شفیق اور عتیق ابھی تک سو رہے ہیں؟'' اماں نے حسب معمول ہمارے سامنے گھی میں تر بتر پراٹھے' بھنا ہوا قیمہ اور انڈوں کے آملیٹ کا ناشتا لا کر رکھا تو ابا نے سوال کیا۔

''وہ دونوں تو کب کے چلے گئے، آج ان کا آخری پرچہ ہے ناں......؟'' اماں کے لہجے میں کھنک تھی اور کسی اندرونی جذبے کی وجہ سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ابا نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔

''اچھا، اچھا رات کو میں واپس آؤں تو انہیں میرے پاس بھیجنا، یہ نہیں کہ کہیں سیر سپاٹے کو نکل جائیں۔'' ابا نے حسب عادت حکم صادر کیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شفیق اور عتیق کو باہر گھومنے پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ رات کو صرف ضرورت کے تحت گھر سے نکلتے تھے۔

اس رات لوگوں سے ملنے ملانے میں ہمیں خاصا وقت لگ گیا۔ ہم گھر پہنچے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اماں اور دونوں بھائی کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کھانا ہم نے خاموشی سے کھا لیا حالانکہ اماں کی منتظر نظریں بار، بار ابا کی طرف

اٹھ رہی تھیں مگر وہ کسی گہری سوچ میں تھے، شاید دن بھر کی بھاگ دوڑ نے انہیں تھکا دیا تھا۔ اماں .... دسترخوان سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں تو ابا نے ٹانگیں سیدھی کیں اور دانتوں میں خلال کرتے ہوئے شفیق اور عتیق کی طرف متوجہ ہوئے جو سر جھکائے ان کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''ہاں بھئی، امتحان ختم ہو گئے تم لوگوں کے......؟'' ابا نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''جی ابا جی......'' دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

''بس پھر ٹھیک ہے اب یہ پڑھائی وڑھائی کا چکر ختم کرو اور دکان پر بیٹھنے کی تیاری پکڑو۔'' ابا نے بالکل وہی جملہ دُہرایا جو وہ آج سے کئی سال پہلے مجھ سے کہہ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میں اٹھارہ برس کا تھا اور میٹرک پاس کیا تھا اور اس وقت شفیق بیس اور عتیق اٹھارہ سال کے تھے اور انہوں نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ میں خوشی، خوشی پڑھائی چھوڑنے پر راضی ہو گیا تھا لیکن مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ دونوں اتنی آسانی سے ابا کی بات مانیں گے۔ وہی ہوا، اماں جو چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں چوکھٹ پر ہی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ شفیق اور عتیق نے ایک جھٹکے سے اپنے جھکے ہوئے سر اٹھائے۔

''مگر ابا ابھی تو ہم کو آگے پڑھنا ہے۔'' میری توقع کے عین مطابق شفیق نے مضبوط لہجے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا جو ابا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آنکھیں قہر برسانے لگیں۔

''ابھی تو صرف انٹر کیا ہے ہمارا تو گریجویشن کرنے کے بعد بھی آگے پڑھنے کا ارادہ ہے۔'' عتیق نے قدرے نرم لہجہ اختیار کیا مگر ابا کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو ورنہ اپنا بوریا بستر سمیٹو اور میرے گھر سے نکل جاؤ۔'' اماں نے کانپتے ہاتھوں سے ٹرے نیچے رکھی اور خوف زدہ نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔

''یہ دونوں تو پڑھنے میں اتنے تیز ہیں۔'' اماں نے اپنی طرف سے ایک مضبوط جواز پیش کیا۔

''اگر تیز ہیں تو اپنی تیزی کاروبار میں لگائیں' بیکار کی کتابوں میں سر مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' ابا کا انداز ہمیشہ کی طرح فیصلہ کن تھا مگر وہ دونوں بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے اماں بھی اپنے کمزور وجود کے ساتھ مدد کے لیے آمادہ تھیں۔

''جب آپ کے بیٹے پڑھ لکھ جائیں گے تو آپ کی ہی عزت ہوگی۔''

''مجھے ضرورت نہیں ایسی عزت کی اور تم جیسی کوڑھ مغز عورت کو یہ پتا نہیں کہ عزت پیسے سے ہوتی ہے۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے نہیں جو ردی میں ٹکے سے بک جاتی ہیں۔'' ان کی شعلہ برساتی آنکھوں سے سہم کر اماں کو خاموش ہی ہونا تھا مگر شفیق ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

''ابا، دنیا میں بے شمار لوگ پڑھ لکھ کر پیسہ کما رہے ہیں اور ساتھ میں نام اور عزت بھی۔''

''بس......!'' ابا ہاتھ اٹھا کر پوری طاقت سے چلائے۔ ''میں تم لوگوں کی بک، بک سننے کے لیے اپنی رات کالی نہیں کروں گا۔ دفع ہو جاؤ مگر یاد رکھو ہوگا وہی جو میں نے کہا ہے۔'' ابا اٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو ایک طنزیہ مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر آ گئی۔ کیونکہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ چاہے وہ دونوں کچھ بھی کر لیں انہیں ابا کی بات ماننا ہی ہوگی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ کسی نے آہستہ

سے میرا کندھا ہلایا۔ میں نے گہری نیند سے چونک کر آنکھیں کھولیں تو اماں میرے سرہانے کھڑی تھیں۔

”رفیق، وہ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے۔“

”افوہ اماں آجائیں گے، وہ کوئی بچے تھوڑی ہیں۔“ میں اس طرح جگانے پر جھنجلا گیا۔

”کب آئیں گے؟ فجر کی اذانیں ہوگئیں۔“ وہ رونے والی ہورہی تھیں۔ میں نے چونک کر آس پاس نظر ڈالی۔ صبح کا ملگجا اجالا کمرے میں پھیل چکا تھا۔

”تو کیا ہوا، کسی دوست کے گھر چلے گئے ہوں گے، صبح ہونے دیں آجائیں گے۔“ میں نے دوبارہ لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں، اماں کچھ دیر کھڑی رہیں پھر ان کے دور ہوتے قدموں کی آہٹ پر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ”لگتا ہے آج ابا بھی سوتے رہ گئے تبھی نماز کے لیے نہیں اٹھایا۔“ دوبارہ غنودگی طاری ہونے سے پہلے میں نے کسی قدر حیرت سے سوچا کیونکہ ابا نماز چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھے۔

صبح بڑی قیامت خیز تھی۔ شفیق اور عتیق گھر واپس آئے تو اس حالت میں کہ پہچانے نہیں جارہے تھے واٹر ٹینکر نے انہیں اس بری طرح روندا تھا کہ وہ وہیں ختم ہوگئے۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر وہیں پڑے رہے۔ جس کے بعد کسی راہ گیر نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس ان کے کچلے ہوئے جسم اسپتال لے گئی تاکہ قانونی کارروائی کی جاسکے۔ دوپہر کے بعد جب وہ گھر لائے گئے تو سارا محلہ ہمارے گھر پر جمع تھا۔ ابا بالکل خاموش تھے اور اماں بے ہوش...... لاکھ کوشش کے باوجود ہوش میں نہیں آئیں۔ مغرب سے ذرا پہلے دو جنازے ہمارے گھر سے اٹھے تو ہر آنکھ اشکبار تھی صرف اماں تھیں جو اَب تک ہوش میں نہیں آئی تھیں۔

رات ڈھلے ہم انہیں دفنا کر واپس آئے تو پتا چلا اماں اسپتال میں ہیں۔ جب انہیں کسی طرح ہوش نہیں آیا تو محلے کے لوگ ڈاکٹر کو بلا لائے جس نے انہیں دیکھنے کے بعد بتایا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے، انہیں فوری طور پر اسپتال لے جایا جائے۔

کہاں تو مستقبل کی منصوبہ بندی اور کاروبار کی ترقی کے خیال میں ہم دونوں باپ بیٹے اس قدر خوش تھے کہ ہر فکر سے آزاد اپنے آپ میں مگن اور کہاں اب یہ حال تھا کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے گھر سے اٹھنے والی دو جوان میتوں کا غم منائیں یا زندہ رہ جانے والی اس ہستی کی فکر کریں جس کا شمار پہلے ہی زندہ میں تھا نہ مُردوں میں۔ فالج کی وجہ سے اماں کا سارا جسم مکمل طور پر بے حس و حرکت ہوچکا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو حسرت و یاس سے ہر آنے جانے والے کو دیکھتیں۔ حلق سے لایعنی سی آوازیں نکلتیں اور آنسو تکیے کو بھگونے لگتے۔

رشتے دار خواتین گھر میں رکی ہوئی تھیں اور جیسے تیسے گھر کا نظام بھی چل رہا تھا مگر ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اماں کو کون سنبھالے گا۔ گھر کی دیکھ بھال کیسے ہوگی اور آخر میں ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔ میری شادی......

مگر اس قدر ایمرجنسی میں میری شادی ہونا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا، کسی کا بھی ان حالات میں اپنی لڑکی دینے پر آمادہ ہونا مشکل تھا۔ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی بیٹی شادی کے نام پر ایک معذور عورت کی خدمت گار بن کر رہ جائے مگر جب سب سر جوڑ کر بیٹھے تو ایک آسان حل مل ہی گیا۔

زاہدہ تین سال کی عمر میں یتیم ہوئی تو ننھیال والوں نے ماں کی دوسری شادی کردی اور وہ دادا، دادی کے پاس بھیج دی گئی جو خود جوان بیٹے کے غم سے نڈھال تھے۔ گزرتے وقت نے انہیں مزید کمزور اور بوڑھا کردیا تو جوان ہوتی پوتی کی فکر نے ان کی راتوں کی نیندیں بھی اُڑادیں۔ ایسے میں خاندان کی خواتین کو ہمارے اور ان کے مسئلے کا بہترین حل یہی نظر آیا کہ میری شادی زاہدہ سے کردی جائے، خیال آنے کی دیر تھی کہ فوری طور پر اس پر عمل بھی ہوگیا۔

زاہدہ دلہن بن کر ہمارے گھر آئی تو اس کے دادا، دادی کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا اور اماں کو بہترین تیمار دار مل گیا۔ مگر میری زندگی کا سکون غارت ہوگیا...... گھر میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہر وقت نظروں کے سامنے ہو اور وہ آپ کی نئی نویلی دلہن بھی ہو تو دل کیا چاہے گا...... مگر دل جس کی چاہ کرتا تھا اس کے لیے شاید میرا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک تو گھر کا کام اور اماں کی خدمت گزاری زیادہ اہم تھی۔ گھر شیشے کی طرح چمکتا، کھانا وقت پر اور بہت ذائقے دار ملتا، اماں کو صاف ستھرے بستر پر دوا اور غذا ڈاکٹر کے بتائے ہوئے وقت اور طریقے سے مل جاتی اور یہ سارا کام زاہدہ اکیلی کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس میں کوئی جن سما گیا ہو مگر یہ جن جب میرے پاس آتا تو اس حال میں جیسے اس کی روح نکال لی گئی ہو، وہ ایسی بے سُدھ ہوکر سوتی جیسے اب کبھی نہیں اٹھے گی۔ میرا دل چاہتا اسے جھنجوڑ ڈالوں ایسے کہ وہ پھر کبھی نہ سو سکے اور میں نے یہی کیا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نیند نے نہ آنے کی قسم کھائی تھی، جھنجلاہٹ کی انتہا پر پہنچ کر میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا اور اس کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ کو اپنی ہتھیلی کے نیچے دبا دیا مگر حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں کے سوال کا جواب تو دینا ہی تھا۔

”شوہر جاگ رہا ہے اور تم بے خبر سو رہی ہو؟“

”آئندہ نہیں ہوگا۔“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور ایک فاتحانہ مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ فاتح اور مفتوح کے درمیان کیسا تعلق ہوتا ہے ویسا ہی رشتہ میرے اور زاہدہ کے بیچ بن گیا۔ اب جتنی دیر میں گھر میں رہتا، وہ پورے تن من سے میرے احکامات پر عمل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی اور ظاہر ہے یہ کوشش چونکہ خوف کے زیرِ اثر ہوتی تو بار، بار اس سے غلطیاں ہوتیں اور ہر بار اسے میرے عتاب کا سامنا پہلے سے بڑھ کر کرنا پڑتا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ شادی سے پہلے وہ کس قسم کی زندگی گزار کر آئی تھی مگر میرے جابرانہ سلوک کے جواب میں وہ جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتی تھی اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی شادی سے پہلے کی زندگی بھی کچھ خاص خوشگوار نہیں تھی اور وہ سختیوں کی عادی تھی۔

☆☆☆

دکان سے واپسی پر جب تک ہم دونوں باپ بیٹے منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوتے تب تک زاہدہ ... دسترخوان لگا دیتی تھی یوں ہمیں کھانے کے لیے ذرا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا مگر اس روز دسترخوان بچھا نہ کوئی کھانے کی خوشبو محسوس ہوئی، تھوڑی دیر ہم نے صبر کیا پھر میں طیش کے عالم میں باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ جہاں جا کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں کیونکہ باورچی خانے میں تو کھانے کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔

”زاہدہ......“ میں حلق کے بل چیخا مگر جواب میں گھر میں مکمل خاموشی رہی تو میں نے اماں کے کمرے کا رخ کیا کیونکہ اپنے کمرے سے تو میں ابھی ہوکر آیا تھا۔ اماں کے کمرے میں مجھے ایک بار پھر حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ اماں کے بستر کے سامنے جو صوفہ پڑا تھا اس پر زاہدہ بے خبر سو رہی تھی، میں نے ایک نظر اماں پر ڈالی جن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پھر آگے بڑھ کر زاہدہ کو جھنجوڑ ڈالا۔

”یہ تمہارے سونے کا وقت ہے، تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔“

میرے اس طرح جھنجوڑنے کے باوجود اس نے بڑی سستی سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی، اماں نے بے بسی کے عالم میں کچھ

کہنے کی کوشش کی تب تک ابا بھی کمرے میں آچکے تھے انہوں نے ایک نظر زاہدہ پر ڈالی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں ناسمجھی میں گردن جھٹکتا ان کے ساتھ باہر آیا تو وہ آہستہ سے ''اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔'' کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

جو بات دس ماہ کی شادی شدہ زندگی میں ایک بار بھی میرے ذہن میں نہیں آئی وہ جب میں نے ڈاکٹر کی زبانی سنی تو عجیب سے احساس میں گھر کر رہ گیا۔ زاہدہ محض ایک ضرورت کے تحت گھر میں لائی گئی تھی اور اس ضرورت کو رشتے کا نام دینا بھی مجبوری تھی مگر جب ایک رشتہ بنا تو دوسرے رشتے بھی بننے لگے۔ دادا، دادی اور باپ، زاہدہ نے ہم سب کو ایک نئے رشتے کی نوید دی تھی۔

☆☆☆

شفیق اور عتیق کے یوں اچانک دنیا سے چلے جانے اور اماں کی معذوری کے بعد ابا بالکل خاموش رہنے لگے تھے۔ گھر سے دکان اور دکان سے واپس گھر آنے کے بعد وہ کبھی کبھی نماز کے لیے مسجد چلے جاتے ورنہ عموماً نماز بھی گھر پر ہی پڑھ لیتے تھے اس کے علاوہ ہفتے دس دن بعد کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اماں کے پاس بیٹھ جاتے۔ آدھا پون گھنٹے خاموشی سے بیٹھے رہتے پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے مگر جب سے گھر میں ہونے والے ایک نئے اضافے کی خبر ملی تھی ان کی خاموشی ٹوٹنے لگی تھی۔

''رفیق میں سوچ رہا ہوں ہماری خریدی ہوئی دکان جو ڈیڑھ سال سے یونہی بیکار پڑی ہے اس کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔'' رات کے کھانے کے بعد حسب معمول ہم دونوں چائے کا انتظار کر رہے تھے جب ابا نے اس دکان کا ذکر چھیڑ دیا جو ہم نے شفیق اور عتیق کے لیے خریدی تھی اور اس وقت سے اسی طرح بند پڑی تھی۔ میں تو اس کے بارے میں تقریباً بھول ہی چکا تھا۔

''ابا اب اس دکان کا کیا جا سکتا ہے، سوائے اس کے کہ ہم اسے بیچ دیں بلکہ آج کل تو قیمتیں بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ اچھے خاصے منافع کے ساتھ بک جائے گی۔'' میں نے گہری نظروں سے زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں جواب دیا۔ زاہدہ کے وجود میں ہونے والی تبدیلیاں اب خاصی نمایاں ہوگئی تھیں اور وہ بہت سست بھی ہوتی جا رہی تھی، ہر کام میں اتنی دیر لگاتی کہ غصہ آنا لازمی ہو جاتا۔ ابا نے کھنکھار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، ورنہ میں اسے ہی دیکھتا رہتا۔

''جی ابا آپ کہیں تو میں مارکیٹ میں بات کروں دکان بیچنے کی۔''

''کوئی ضرورت نہیں کسی سے کچھ کہنے کی۔''

بہت دنوں بعد میں نے ان کی آواز میں پرانی گھن گرج محسوس کی اور حیرت سے ان کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

''اب تمہاری اولاد ہو جائے گی تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔''

''میری اولاد......؟'' میں ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ جو اولاد ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا میرے نزدیک تو غیر ضروری تھا۔

''ہاں انشاء اللہ بیٹا ہوگا تو ہم اس کا نام سبحان رکھیں گے اور سبحان ریڈی میڈ گارمنٹس کے نام سے اس دکان کا افتتاح اور اس کا عقیقہ ایک ہی دن کریں گے، وہ بڑا ہوگا تو جما جمایا کاروبار اسے مل جائے گا۔'' ابا کتنی دور تک سوچ رہے تھے، زندگی میں پہلی بار میں نے ان کا یہ انداز دیکھا تھا، وہ ایسے بات کر رہے تھے جیسے آنے والے دنوں کا ہر منظر ان کی نگاہوں کے سامنے ہو، ان کی ہمیشہ سرخ رہنے والی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، پل بھر کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے میں بھی ان کے ساتھ ایک نئے ماحول میں پہنچ گیا ہوں۔

میرا بیٹا...... ہر اچھے برے وقت میں میرا سہارا...... جیسے میں نے ہمیشہ ابا کا ساتھ دیا تھا، ان کی ہر امید پر پورا اترا تھا بالکل اسی طرح کا میرا بھی بیٹا ہوگا، میرے جسم میں بے اختیار ایک جھرجھری سی آگئی، میں نے ابا کی طرف دیکھا وہ بھی میری طرف دیکھ رہے تھے ہم دونوں کی نظریں ملیں تو ابا کھل کر مسکرائے اور میں جھینپ کر......

☆☆☆

گھر کے کاموں میں زاہدہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک عورت رکھ لی گئی۔

تھوڑی سی سہولت ملی تو زاہدہ ایسی نکھری کہ آتے جاتے اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ میرے اس خواب کی امین تھی جو میں آج کل سوتے جاگتے دیکھ رہا تھا۔ ابا نے تو صرف ایک جھلک ہی دکھائی تھی اور میں نے اس جھلک سے آگے ایک پوری دنیا آباد کر لی تھی۔

محمد سبحان کی انگلی تھام کر اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک چلا جاتا، ایک ایسے گھر میں جہاں تعلیم کو ہمیشہ غیر اہم سمجھا گیا ہو وہاں اپنے بیٹے کے حوالے سے اگر میں کچھ سوچ رہا تھا تو وہ صرف اعلیٰ تعلیم تھی، ابا کے ارادے وہی پہلے والے تھے شاید وہ اس سلسلے کو وہیں سے جوڑنا چاہ رہے تھے جہاں سے یہ شفیق اور عتیق کی دردناک موت کی وجہ سے ٹوٹا تھا اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں ابا کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا میں اماں جیسا کمزور تو نہیں تھا کہ ان کے چیخنے چلانے سے ڈر کر خاموش ہو جاؤں۔

خواب دیکھنا، ارادے باندھنا تو ہمارے بس میں ہوتا ہے مگر ان خوابوں کی تعبیر حاصل کرنا، ان ارادوں کو تکمیل تک پہنچانا ہمارے اختیار میں قطعی نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ ہمیں اگلے چند ہفتوں بعد ہی ہو گیا۔

ہمارے گھر بیٹا نہیں بیٹی آئی تھی۔ اسپتال کے برآمدے کے چکر لگاتے ہمارے قدم اچانک تھم گئے، ابا کی گردن جھک گئی اور میری مٹھیاں بھینچ گئیں میرا دل چاہا ابھی اسی وقت زاہدہ کا گلا گھونٹ دوں، میں بغیر اس سے ملے گھر لوٹ آیا۔

دو دن بعد زاہدہ بچی کو گود میں لیے گھر واپس آگئی اور باقی کا سب کچھ پہلے کی طرح کا ہو گیا۔

میرا دل جو پہلے زاہدہ کے لیے ہر جذبے سے خالی تھا اب اس میں نفرت جگہ بنانے لگی۔ بیٹی پیدا کر کے اس نے میرے خوابوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ انتقاماً اسے پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، کام والی عورت کو بھی فارغ کر دیا جس کی وجہ سے گھر کی ساری ذمے داری ایک بار پھر اکیلے اس کے کندھوں پر آگئی، فائزہ کی وجہ سے یہ ذمے داری کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شاید اماں کو اس کا احساس ہو گیا تب ہی تو انہوں نے ایک روز بڑی خاموشی سے اپنی بے مصرف زندگی سے نجات حاصل کر لی۔

اماں کیا گئیں ابا نے تو دنیا تیاگ دی۔ انہوں نے دکان جانا بالکل چھوڑ دیا، صرف مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلتے باقی وقت اماں کے کمرے میں خاموشی سے لیٹے رہتے، اپنے کمرے میں بھی بہت کم جاتے اکثر رات کو بھی اماں کے کمرے میں ہی سو جاتے۔

ابا نے تو اپنی دنیا الگ کر لی مگر مجھے تو اسی دنیا میں رہنا پڑ رہا تھا۔ سارا دن دکان پر رہتا، گھر آتا تو زاہدہ اور فائزہ کو دیکھ کر خون میں ابال اٹھنے لگتا۔ زاہدہ جانتی تھی کہ فائزہ کا وجود میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے وہ اسے میرے گھر آنے سے پہلے ہی سلا دیتی اور اگر وہ رات میں کسی وقت اٹھ کر روتی تو زاہدہ اسے لے کر کمرے سے باہر چلی جاتی۔ کئی بار دل میں آیا کہ اپنا کمرا الگ کر لوں مگر امید کی کرن ایسا کرنے سے روکے ہوئے تھی۔

☆☆☆

فائزہ کے بعد لائبہ ہوئی تو ایک بار پھر میرا دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔ پھر کسی نے بتایا کہ اگر اب بیٹی ہو تو اس کا نام بشریٰ رکھنا تو اس کے بعد بیٹا ضرور ہوگا۔ تیسری بھی بیٹی ہوئی مگر اب بشریٰ نام رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

تیسری بیٹی کی پیدائش سے پہلے ہی زاہدہ سیڑھیوں سے گر گئی۔ بشریٰ وقت سے پہلے دنیا میں آگئی اور زاہدہ پھر کبھی ماں بننے کے قابل نہیں رہی۔

بیٹا ہونے کی امید ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی مگر پھر بھی میں نے تیسری بیٹی کا نام بشریٰ ہی رکھا۔ پتا نہیں کیوں...... شاید اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے۔ وقت اور حالات انسان کو توڑ دیتے ہیں اور وہ بڑھاپے کی عمر آنے سے پہلے ہی بوڑھا ہو جاتا ہے۔

میں بھی اپنی ایک ناکام رہ جانے والی خواہش کے جال میں الجھ کر ایسا ہی ہوگیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں کہیں زیادہ بوڑھا نظر آنے والا مرد جو اپنے گھر کا دروازہ پار کرتا تو اس کی بیوی اور بیٹیاں سہم کر کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتی تھیں کیونکہ اس ٹوٹ پھوٹ کے باوجود میرے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی طرح گرجنا، برسنا، چیزیں اٹھا کر پھینکنا اور بچیوں پر تو میرا ہاتھ بھی اٹھ جاتا تھا۔

فائزہ تیرہ سال کی ہوگئی تھی، گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ میرا اور ابا کا ہر کام بھاگ، بھاگ کر کرتی، ابا بھی، کبھی اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے مگر میرے دل میں تو صرف ایک ہستی...... کے لیے محبت جاگتی تھی جو نہ اس دنیا میں آئی نہ ہی آسکتی تھی۔ ساری زندگی میں نے محبت لی تھی کسی کو دی نہیں تھی اور اب تو لگتا تھا جیسے دل خالی ہوگیا ہو۔

☆☆☆

رات سے جھڑی لگی ہوئی تھی، ابا فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آئے تو ان کے کپڑے خاصے حد تک بھیگ چکے تھے۔ فائزہ نے لپک کر تولیا ان کے ہاتھ میں دیا اور فوراً ان کے لیے کپڑے نکالنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں عموماً صبح دس بجے کے بعد دکان جانے کے لیے گھر سے نکلتا تھا مگر اس روز مجھے کسی سے ملنا تھا تو ذرا جلدی نکلنے کے ارادے سے سویرے اٹھ گیا۔ مگر باتھ روم میں قدم رکھتے ہی دماغ گھوم گیا۔ نلکے میں پانی نہیں آرہا تھا۔

''زاہدہ......'' میں وہیں کھڑے، کھڑے چلایا۔ وہ اسی وقت نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی، چہرے کے گرد ابھی تک سفید دوپٹا لپٹا ہوا تھا۔

''جی......'' حسب عادت وہ بہت آہستگی سے بولی۔

''کیا جی، جی لگا رکھی ہے، کچھ گھر کا ہوش رہتا ہے تمہیں، کوئی کام وقت پر ہوتا ہے تم سے۔'' وہ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''اب کہاں بھاگی جا رہی ہو۔'' میں اس کا بازو دبوچ کر غرایا۔

''کہیں نہیں، میں تو پوچھ رہی تھی۔''

''پوچھ رہی تھی۔'' میں نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے اس کے بازو کو زور کا جھٹکا دیا۔ ''ہر کام تو تم مجھ سے پوچھ کر ہی کرتی ہو۔ رات کو ہی بتا دیا تھا مجھے سویرے جانا ہے مگر جاہل عورت جان بوجھ کر وہی کام کرتی ہے جس سے میرا دماغ خراب ہو اور میں پاگل ہو کر سڑکوں پر نکل جاؤں۔''

''اللہ نہ کرے......'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

''زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں، جا کر پانی کی موٹر چلاؤ، مجھے نہانا ہے اور نل میں ایک قطرہ پانی نہیں آرہا، اب مرے، مرے قدموں سے نہ جانا۔'' میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گرتے، گرتے بچی پھر سنبھل کر تیز قدموں سے صحن کی طرف بڑھی جہاں ایک کونے میں پانی اوپر چڑھانے کی موٹر لگی ہوئی تھی۔ میں دانت پیستے ہوئے وہیں کھڑے ہو کر پانی آنے کا انتظار کرنے لگا۔

بہت ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور دھڑام سے گرنے کی آواز آئی۔

فائزہ ابا کے کپڑے چھوڑ کر صحن کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا فائزہ......؟'' ابا اس کے پیچھے لپکے، میں وہیں کھڑا رہا۔

رات سے ہونے والی بارش کا پانی صحن میں جگہ جگہ کھڑا تھا۔ زاہدہ یقیناً اسی پر پھسل گئی ہوگی۔

''رفیق جلدی آؤ۔'' ابا کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ میں بے ساختہ صحن کی طرف دوڑا۔

زاہدہ موٹر کے پاس چاروں خانے چت پڑی ہوئی تھی اور ابا مین سوئچ کے پاس ساکت کھڑے تھے۔ زاہدہ کو موٹر چلاتے ہوئے کرنٹ لگ گیا تھا۔

☆☆☆

بادل چھٹ گئے تھے، دھوپ نکل آئی تھی، صحن کا پانی بھی خشک ہوگیا تھا۔

زاہدہ کی میت اسی صحن میں اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے تیار رکھی تھی۔ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

''کیسی جوان موت ہے یقین ہی نہیں ہو رہا۔''

''ہاں بھئی کیسے یقین آئے، ایسے اچانک خبر سن کر تو بندہ حیران ہی ہوگا۔''

''بھئی ان کے گھر تو لگتا ہے کسی کی بددعا ہے، یاد نہیں ان کے دونوں بیٹے بھی ایسی ہی حادثاتی موت مرے تھے۔''

''ارے بددعا کیا دینی ہے کسی نے، یہ تو اپنے ہی اعمال ہوتے ہیں۔''

''اب یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کرنٹ لگا ہے یا لگایا گیا ہے۔'' چہروں پر افسردگی کے خول چڑھے ہوئے تھے مگر زبانیں آگ اگل رہی تھیں۔

مگر آج مجھ پر کسی بھی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے بس ایک ہی خیال تھا کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے زاہدہ کو اس کی آخری منزل تک پہنچادوں تاکہ وہ سکون پا جائے۔ پندرہ سال بعد وہ میرے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ وہ آئی تو بڑی خاموشی سے تھی، دو چار لوگ ہماری طرف کے اور دو چار اس کے دادا کی طرف کے مگر اب اس کے جانے کے وقت ہمارا پورا گھر بھرا ہوا تھا۔ گھر کے باہر گلی میں بھی لوگ جمع تھے، کسی نے اس کے تابوت پر لال دوپٹا ڈال دیا تھا، سہاگن تھی ''بڑی خوش قسمت ہوتی ہے وہ عورت جسے اس کا خاوند کندھا دے۔'' اندر کوئی عورت بڑی دلسوزی سے اپنی رائے دے رہی تھی۔

میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا مگر میرے ہونٹوں سے کوئی آواز نکل رہی تھی نہ میرے جسم میں کوئی حرکت تھی۔ صبح سے ابا نے ہی سب کچھ سنبھالا ہوا تھا۔ وہ کئی بار میرے پاس آئے مگر میں نے ان کی کسی بات پر توجہ نہیں دی۔ صبح سے اب تک میں ایسے ہی کھڑا تھا نہ میری ٹانگیں تھکی تھیں، نہ میرا جسم اکڑا تھا۔

''چلو رفیق......'' ابا ایک بار پھر میرے سامنے کھڑے تھے، دن بھر کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے شاید اسی لیے انہوں نے سہارے کے لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا مگر جب انہوں نے آہستہ سے آگے کی طرف دھکیلا تو مجھے لگا کہ وہ مجھے وہاں سے ہٹانا چاہ رہے تھے۔ ''چلو رفیق آخری فرض ادا کرو۔'' وہ پتا نہیں کس فرض کی بات کر رہے تھے اور آہستہ آہستہ مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے تھے، کچھ اور لوگوں نے بھی دائیں یا بائیں آکر میرے بازو تھام لیے تھے تب مجھے یاد آیا کہ وہ کس فرض کی بات کر رہے تھے، میں بھی تو یہی چاہتا تھا جو وہ سب کہہ رہے تھے۔ زاہدہ کو اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانا تھا۔

☆☆☆

اسے مٹی کے سپرد کر کے ہم شام سے پہلے گھر واپس آگئے۔ پتا نہیں کس نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہمارے گھر پہنچتے ہی دستر خوان لگ گیا۔ ابا

میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے، لوگ اصرار کر کے ہمیں کھانا کھلانے کی کوشش کر رہے تھے مگر پہلا لقمہ ہی حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھانے کے بعد لوگ آہستہ، آہستہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے، اماں کے انتقال کے بعد سے اب تک بہت سا وقت گزر چکا تھا اب رشتے داروں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اسے کسی اور کے لیے برباد کریں۔ بڑے کمرے میں بچھی سفید چاندنی پر صرف ہماری دور پرے کی پھوپی اور ان کی بہو بیٹی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کونے میں فائزہ، لائبہ اور بشریٰ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے اٹھنا چاہا مگر پھر واپس بیٹھ گئی اور دونوں بہنوں کو اپنے اور قریب کر لیا۔ میرے دل کو کچھ ہوا۔ وہ مجھ سے ڈرتی تھیں یہ بات ہمیشہ میرے لیے قابلِ اطمینان رہی تھی مگر آج...... سب کچھ بدل گیا تھا۔

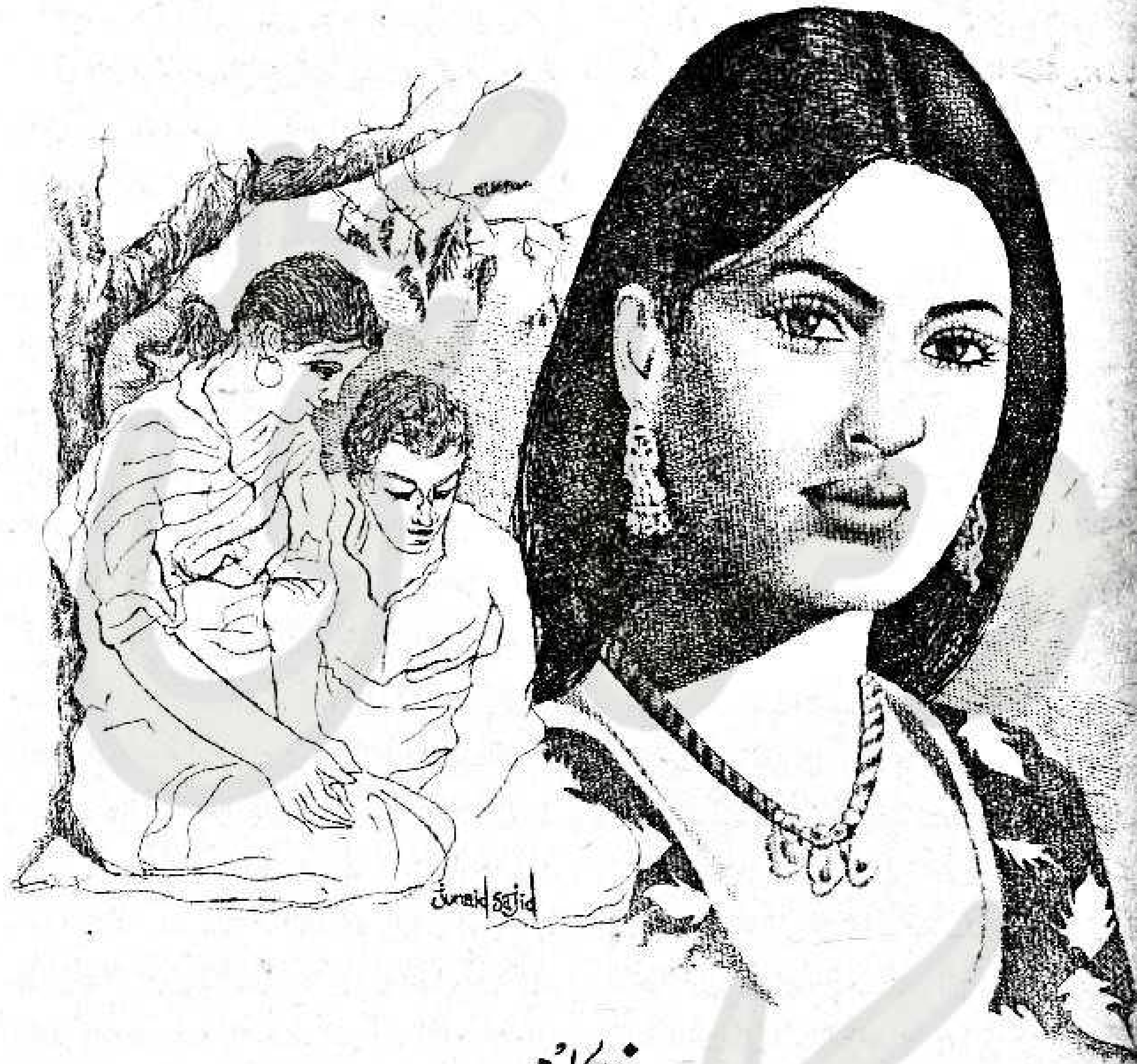
آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان کے سروں پر ہاتھ رکھوں انہیں اپنے سینے سے لگا کر ان کا سارا خوف دور کروں مگر پتا نہیں کیا چیز مجھے روک رہی تھی، میں دل پر جبر کر کے ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا مگر جب پھوپی نے آنے والے دنوں کی مشکلات کا نہ ختم ہونے والا تذکرہ چھیڑا تو تھوڑی دیر برداشت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کہتے ہیں قبر میں پہلی رات مرنے والے کے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔ میں تو اپنے کمرے میں اپنے آرام دہ بستر پر تھا مگر میرے لیے یہ رات بہت سخت تھی۔ زاہدہ کا سفید دوپٹے میں لپٹا چہرہ، اس کی کھلی ہوئی آنکھیں...... سارا دن میری نظروں کے سامنے رہی تھیں مگر اس وقت اپنے کمرے کی تنہائی میں اس کی پھیلی ہوئی وہ آنکھیں خاموش نہیں تھیں، وہ مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ زندگی کو اس کے لیے سزا کیوں بنا دیا گیا، وہ پندرہ سالوں تک ہمارے خاندانی غیظ و غضب کا نشانہ بنتی رہی اور آخر اسی اکھڑ پن اور بے حسی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی اچانک موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے، میرے اندر کا جابر اور حاکم مرد شکست مان چکا تھا، اپنی معصوم بیٹیوں کی آنکھوں میں اپنے لیے خوف دیکھ کر شرمسار ہو رہا تھا اور وہ خواہش جو اتنے سالوں سے مجھے دیوانہ بنائے ہوئے تھی اب میں اس سے دست بردار ہو چکا تھا، آج پہلی بار اس خواہش کے پورا نہ ہونے کا احساس میرے لیے سکون کا باعث بن رہا تھا، اچھا ہوا کہ اللہ نے مجھے بیٹا نہیں دیا ورنہ وہ بھی ابا اور میری طرح اذیت پسند اور ظالم ہوتا اور ہمارا یہ خاندانی غرور اماں اور زاہدہ کی طرح کسی اور کی بیٹی کو ایک مسلسل کرب میں مبتلا کر دیتا جس کا انجام بھی ایک کربناک موت تھی۔

”آئندہ نہیں ہوگا۔“ مجھے لگا جیسے مرتے وقت زاہدہ کی کھلی ہوئی آنکھوں میں یہی التجا تھی۔

”ہاں، آئندہ نہیں ہوگا۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور دبے قدموں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں تینوں بچیاں سو رہی تھیں۔ کمرے میں بہت ہلکی سی روشنی تھی۔ فائزہ کے ایک طرف لائبہ اور دوسری طرف بشریٰ لیٹی ہوئی تھی۔ فائزہ نے ان دونوں پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے انہیں اپنی حفاظت کے حصار میں لیے ہوئے ہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے فائزہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

”بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر سارے دن میں پہلی بار میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”ڈرو نہیں بیٹی، میں تمہارے پاس ہوں۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اس نے اپنی نو عمری کے باوجود مضبوطی سے تھام لیا۔



خسارہ

نظیر فاطمہ

”عفیفہ [illegible] کیونکہ تمہارے بچوں کی تمہارے ساتھ بہت اسٹرانگ بونڈنگ (مضبوط تعلق) ہے۔ ساری عمر اسٹیٹس، جاب اور نام کے پیچھے بھاگتے بھاگتے میں نے اولاد کو خود سے دور کر دیا ہے۔ اب مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی جھولی میں صرف خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔“ آپا نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ میں ساری زندگی ان کے طنز اور تنقید کا نشانہ بنی تھی سوالیہ انداز میں انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔ آج تک میں آپا کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھی کہ انہوں نے زندگی میں جو چاہا وہ پایا۔ عزت، دولت، شہرت سب کچھ...... مگر آج ان کا لہجہ عجیب سی محرومی لیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

آپا پچھلے بیس سال سے ملک کے مشہور اور مہنگے پرائیویٹ اسکول چین سے وابستہ تھیں انہوں نے اس چین کے ایک اسکول کو ٹیچر کی حیثیت سے جوائن کیا تھا اور آج مسلسل محنت اور کوشش سے اب ہیڈ آفس میں بطور ڈائریکٹر ٹیچرز ٹریننگ کام کر رہی تھیں۔ آج تک میں یہی

سمجھتی رہی کہ آپا نے یہ سب کچھ بڑی آسانی سے حاصل کرلیا مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ آپا نے تو اس کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ آپا نے ہمیشہ اپنی پروفیشنل لائف کو اپنی پرسنل لائف پر ترجیح دی تھی۔ پروفیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ گرومنگ کی ایک دوڑ تھی جس میں آپا شامل ہوچکی تھیں۔ وہ دو،دو ہفتوں کے ٹریننگ پروگرامز پر شہر سے باہر رہتیں اوران کے دونوں بچے (بیٹا اور بیٹی) ان کے میاں اور آیا کی زیرنگرانی ہوتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آپا کے بچوں میں سے کوئی شدید بیمار ہوتا اور آپا اسے آیا کے حوالے کرکے کسی آفیشل ڈیوٹی پر روانہ ہوجاتیں۔ آپا کی سسرال میں صرف ان کے میاں ہی تھے جو ہر معاملے میں آپا کے کہے پر سر جھکاتے تھے۔ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو ان حالات میں بیوی کو گھر بٹھا لیتا کہ آرام سے بچوں کی پرورش کرو...... مگر عرفان بھائی کی کیا مجال کہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالیں۔ الٹا بیوی کی تعریفیں کرتے کہ انہوں نے نوکری کے ساتھ گھر بھی اچھے طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔ حالانکہ ہر کام کے لیے نوکر موجود تھے۔ عرفان بھائی کا اپنا بزنس تھا اوران کی زمینوں سے بھی کافی آمدنی آتی تھی۔ بظاہر آپا کو نوکری کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شاید وہ خودنمائی کے جذبے سے مغلوب ہوکر اتنی تگ ودو کررہی تھیں۔

ان کے بچے جب تھوڑا بڑے ہوئے تو آپا نے دس اور مشاغل اپنا لیے جن میں ایکٹنگ سرفہرست تھی۔ وہ اکثر ٹی وی، ڈراموں میں نظر آنے لگیں۔ جس سے ان کی شہرت میں تو اضافہ ہوگیا مگر جو تھوڑا بہت وقت وہ گھر میں گزارتی تھیں وہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ خاندان کا تقریباً ہر فرد آپا کی شہرت اور ترقی پر حسد ورشک کا شکار تھا۔ آپا نے بھی اپنے بچوں کو خود سے زیادہ قریب نہیں آنے دیا کہ کہیں بچے ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ ان کے بچوں نے ماں کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا کہ اب چاہے وہ گھر پر ہوتی یا نہ ہوتیں وہ اپنی دنیا میں مگن رہتے۔

☆☆☆

ایک میں تھی، میں نے اپنی نوکری کا آغاز اسی مشہور اسکول سے کیا تھا جہاں آپا تھیں۔ جب میں نے یہ اسکول جوائن کیا تو آپا کو یہاں کام کرتے دو سال ہوچکے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اگر ان جتنی ترقی نہ بھی کرتی تو آج کسی اسکول کی ہیڈ مسٹریس یا پرنسپل تو ضرور ہی ہوجاتی مگر میں آج تک ایک اسکول ٹیچر ہی رہی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ہمیشہ اپنی گھریلو زندگی اور بچوں کو اپنی نوکری پر ترجیح دی تھی۔ حالانکہ نوکری میری ضرورت رہی تھی کیونکہ میرے میاں ایک پرائیویٹ فرم میں درمیانے درجے کے ملازم تھے۔ خالی ان کی تنخواہ میں گزارہ مشکل تھا سو میں معاشی جدوجہد میں ان کے ساتھ شامل ہوگئی تھی مگر میں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ جب ،جب میرے بچوں کو میری ضرورت ہوئی تب ،تب میں ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مجھے اپنے بچوں کی وجہ سے نوکری چھوڑنا پڑی۔

جب میرے تینوں بچے اسکول جانے لگے تو میں نے بچوں والا اسکول ہی جوائن کرلیا۔ اب میں بچوں کے ساتھ اسکول جاتی اوران کے ساتھ ہی واپس آجاتی۔ باقی کا سارا وقت میں اپنے گھر اور بچوں کو دیتی تھی۔ جس سے میرے بچے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ البتہ میرے میاں صاحب کو مجھ سے شکایت رہتی تھی کہ میں نے آپا جتنی ترقی کیوں نہیں کی...... مگر میں مطمئن تھی کہ میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

اپنے اسی طرزِ عمل کی وجہ سے میں ہمیشہ آپا کے زیرِ عتاب رہتی تھی۔

”بس کرو عفیفہ......! کیا بچوں کو اپنی دُم بنائے رکھتی ہو۔“ میں خاندان کی کسی تقریب میں بچوں سمیت شریک ہوتی تو آپا ٹوک دیتیں۔ میں مسکرا دیتی۔

”ان کو خود مختار ہونے دو، میرے بچوں کو کبھی میرے ساتھ دیکھا ہے؟“ وہ میرے بچوں کو تمسخر سے دیکھتیں۔

”آپا! اپنے ،اپنے مزاج کی بات ہے۔“

میں سنجیدگی سے جواب دیتی تو وہ بڑی نخوت سے ہونہہ کہہ کر آگے بڑھ جاتیں اور میں جان چھوٹ جانے پر گہری سانس لے کر تقریب میں مگن ہوجاتی۔

”عفیفہ! تم تو کنویں کی مینڈک ہی رہنا۔ اتنے سالوں بعد بھی صرف ایک اسکول ٹیچر ہی ہو۔“ آپا اپنی ہر کامیابی اور ترقی پر مٹھائی لے کر آتیں اور طنز کے تیر اچھالتیں۔ میرے میاں ان کا بھرپور ساتھ دیتے۔ میں دُکھی ہوتی مگر میرا دل مطمئن ہوتا کہ میں کچھ غلط نہیں کررہی۔

وقت گزرتا رہا۔ آپا کے بچے بھی جوان ہوگئے اور میرے بھی۔ میرے بچے مجھے اتنی اہمیت دیتے جتنی میں انہیں شروع سے لے کر آج تک دیتی آئی تھی...... اور آپا کے بچے ان کو اتنی اہمیت دیتے جتنی وہ ان کو دیتی آئی تھیں یوں میرے بچے مجھ سے بہت قریب ہیں۔ وہ اپنا ہر مسئلہ ہر بات مجھ سے شیئر کرتے اور میرے ساتھ انجوائے کرتے... جبکہ آپا کے بچے ان سے بہت فاصلے پر ہی ہیں وہ آپا کو اپنے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت تک نہیں دیتے، یہ تو مجھے معلوم تھا مگر حالات اتنے بگڑ چکے ہیں اس بات کا مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے میرا بی پی بہت ہائی رہنے لگا تھا جس سے میری طبیعت اچھی خاصی بگڑ گئی تھی۔ میرے میاں کو تو میری جو فکر تھی سو تھی میرے تینوں بچے تو میری پٹی سے لگ گئے۔ آپا کو میری طبیعت کی ناسازی کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بھی میری خیریت معلوم کرنے چلی آئیں۔ یہ بھی مقامِ حیرت تھا۔ کسی کی عیادت تو دور کی بات، آپا تو سگے رشتے داروں کی موت پر بھی کم ہی کسی کی طرف جاتی تھیں۔ اب وہ میرے پاس بیٹھ کر میرے بچوں کو میری خدمت اور پروا کرتے مسلسل دیکھ رہی تھیں۔ ابھی میری بیٹی مجھے ٹیبلیٹ کھلا کر گئی تھی۔ اب کمرے میں ہم دونوں بہنیں ہی تھیں جب آپا نے میرا ہاتھ تھام کر بچوں کے ساتھ مضبوط تعلق کے حوالے سے مجھ پر رشک کیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی نمی مجھے دکھی کرگئی۔

”آپا! حوصلہ کریں کیا ہوگیا؟ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”میں کانٹے بو کر پھولوں کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ میرا بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ شیشہ پینے لگا ہے، مجھے معلوم ہوا تو میں نے اسے ڈانٹا۔ جانتی ہو اس نے آگے سے کیا کہا۔

”مما! آر یو ان یور سینسز......؟ (آپ اپنے حوش میں تو ہیں) آپ کو ہماری اتنی فکر کب سے ہونے لگی؟ پلیز گو اینڈ مائنڈ یور اون بزنس“ (براہ مہربانی جائیں اور اپنا کام کیجیے) وہ مجھے بدتمیزی سے جواب دے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے عرفان سے شکایت کی تو آج بیس سال بعد انہوں نے کہا کہ یہ سب خود میری اپنی وجہ سے ہوا ہے اگر میں نے بچپن میں انہیں توجہ دی ہوتی تو آج یہ میری بات سنتے۔“

میں نے آپا کا ہاتھ تھپکا۔ آپا آنسو پی کر گویا ہوئیں۔

”کل میں نے ہانی سے کہا کہ عفیفہ کے بچوں کو دیکھو کیسے اس پر جان چھڑکتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ بیٹی ہوکر اپنی ماں سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔ ماں سے زیادہ اپنی دوستوں کو وقت دیتی ہیں۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔“ جب آپ خود عفیفہ خالہ جیسی ماں نہیں ہیں تو پھر ہم سے یہ توقع کیوں کرتی ہیں کہ ہم ان کی اولاد کی طرح ہوں گے۔“ وہ سیکنڈوں میں مجھے آئینہ دکھا گئی اور میں بے دم ہوگئی۔“ آپا کے آنسو بہنے لگے۔

”میری زندگی ان تمام عورتوں کے لیے سبق ہے جو اپنی نوکری، اپنے کیریئر کو اپنی اولاد پر ترجیح دیتی ہیں۔ عورت کی اصل ترجیح اس کا گھر اور اس کے بچے ہیں۔ عورت کی اصل مہارت اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنا ہے۔ کمانا عورت کی ذمے داری نہیں ہے مگر پھر بھی کسی مجبوری یا اپنے شوق کی وجہ سے کام کرنا چاہے تو ضرور کرے مگر اولاد سے دوری کی قیمت پر ملنے والی ترقی اور کامیابی حاصل کرنے سے پہلے سو بار سوچے کہ یہ ترقی نہیں نرا خسارہ ہے۔“ آپا کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے اور میں انہیں شدید دکھ سے دیکھے جارہی تھی۔



شاہ زیب سے میری پہلی ملاقات گھر سے نزدیکی پارک میں صبح کی واک کے دوران ہوئی تھی۔ ٹریک پر جاگنگ کرتا، اچھلتا، کودتا وہ بے دھیانی میں مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔

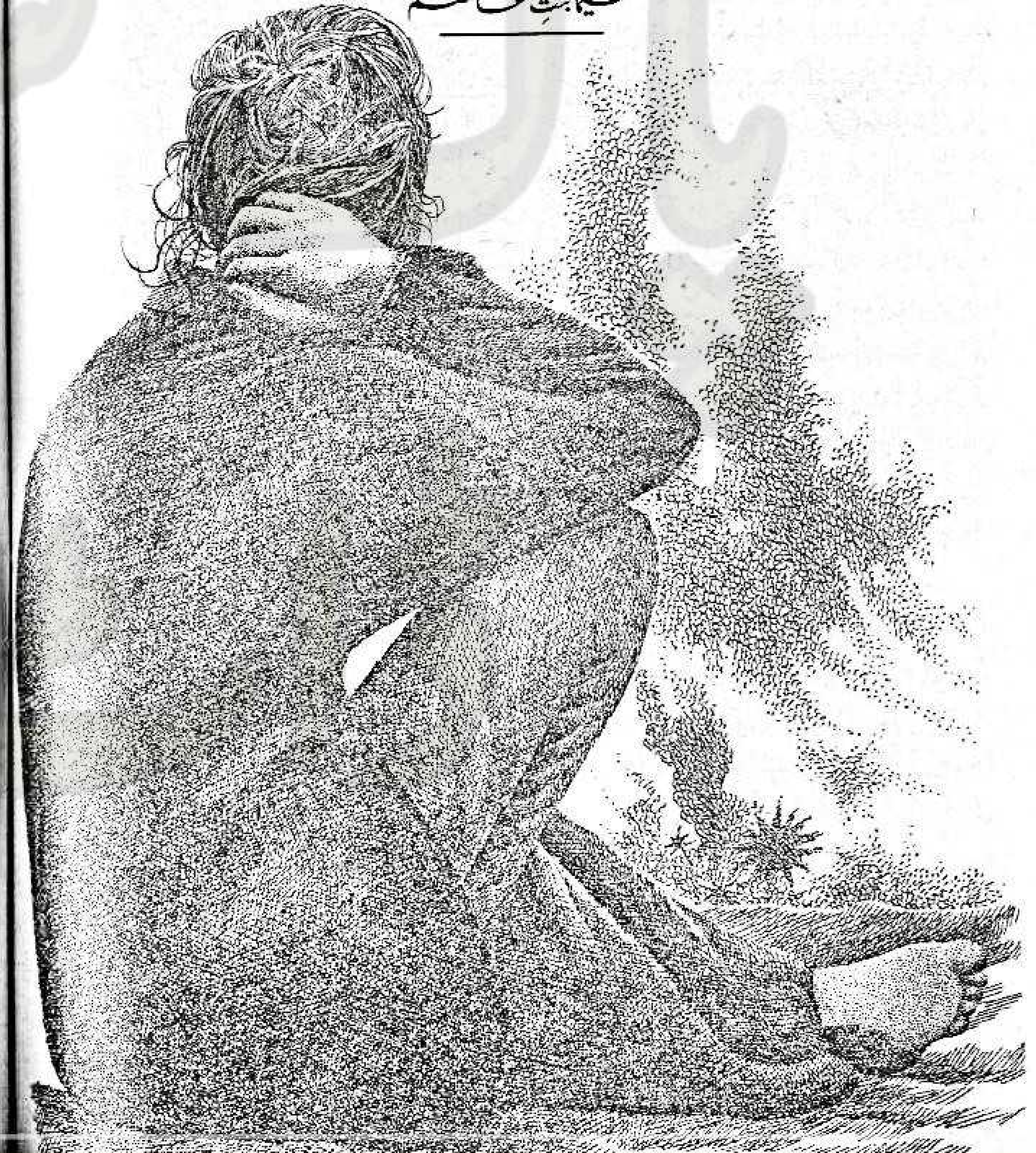
''اوہ! سوری......'' ہم دونوں ہی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور پھر دونوں ہی ہنس دیے۔ میں نے قدم آگے بڑھائے تو وہ میرے ہم قدم تھا۔

''آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

ناولٹ

بس یونہی

سیما بنتِ عاصم



"دیکھتے بھی کیسے......ہم لوگ حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے ہیں اور میں آج پہلی بار واک کے لیے آئی ہوں، وہ بھی ڈاکٹر کے مشورے پر......"

"ہم......م......م...... واکنگ از دا بیسٹ......خصوصاً لڑکیاں ویٹ کے معاملے میں کافی کانشس ہوتی ہیں۔"

"ہاں......مگر لڑکیاں......" میں نے ازخود اپنا مضحکہ اڑایا تو اس نے رخ موڑ کر بڑی بے یقین نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ "تو کیا آپ میرڈ ہیں؟"

میں نے گردن نفی میں ہلا دی۔

"اوہ......سمجھ گیا۔ وہی بڑی عمر کی لڑکیوں کا المیہ......ذرا سی عمر نکل جائے تو ساری دنیا انہیں کچوکے لگا، لگا کر احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جیسے شادی نہ ہوئی تو زندگی بیکار ہے اور لڑکی ناکارہ......" میں نے دل ہی دل میں اس کے شاندار تجزیے کی داد دی اور سر اٹھا کر اس اونچے پورے تنومند لڑکے کو دیکھا۔ تیز دھوپ سے سنولائی رنگت، بلیک ٹریک سوٹ پر کیپ لگائے جاگرز کسے اس کے چہرے پر نوعمری کی چھاپ تھی۔ یقیناً وہ مجھ سے کئی برس چھوٹا تھا۔ اسی حساب سے اسے مخاطب کیا۔

"پھر تمہیں یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ لوگ بہتری کو اچھائی کو ظاہر میں تلاش کرتے ہیں۔" جانے کیسے میرے اندر سسکتا کمپلیکس میرے منہ پر آ گیا۔

"ارے، اتنی اٹریکٹو تو ہیں آپ......" عام سا سادہ سا لہجہ......"خاصی ایجوکیٹڈ بھی لگتی ہیں۔" تعریف ہر عورت کی کمزوری ہوتی ہے اور میں بھی اِک عام سی عورت ہی تو تھی......اگرچہ یہ بات اکثر لوگوں سے سنتی مگر میں اپنے قدم زمین پر رکھتی تھی، کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔ انسان کو اپنی اصلیت سے واقف ہونا چاہیے جو عورت اپنے قدم زمین پر رکھتی ہے ڈگمگاتی نہیں۔

"معلوم نہیں، میں تو گورنمنٹ گرلز کالج میں معمولی سی لیکچرار ہوں، کبھی، کبھار قلم سے کھیل لیتی ہوں تو تم افسانہ نگار بھی کہہ سکتے ہو۔"

"امیزنگ......! آپ جیسے لوگ ہی دنیا کو تسخیر کیا کرتے ہیں جو دیکھنے میں سادہ مگر درحقیقت گہرے اور باکمال ہوتے ہیں۔"

"دیکھو انسان کتنا بھی زور آور اور بااختیار کیوں نہ ہو، ہر روز کا ڈھلتا سورج اس کی زندگی کا ایک دن کم کر جاتا ہے۔"

"مگر زندگی کے لیے میرا فلسفہ ذرا مختلف ہے، میں اس کے روشن رخ پر نظر رکھتا ہوں۔ سورج ہر شام ڈوبتا ضرور ہے مگر ہر روز ابھر کر اِک نئی صبح کی نوید بھی تو لاتا ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

"زندگی! زندگی تو کب کی ختم ہو گئی، اب تو بس وجود کو گھسیٹنا ہے۔" میں نے دل میں کہا۔ اب میں اسے پہلی ملاقات میں بتاتی کیا اچھی لگتی کہ جاب میرا ٹارگٹ کبھی نہ تھی، کبھی میں نے بھی اپنے گھر اور پیار کرنے والے جیون ساتھی کے سپنے بُنے تھے البتہ حصولِ تعلیم کی لگن ضرور تھی۔ اور یہ تب کام آئی جب ابا کے اچانک آنکھیں موند لینے سے گھر کی کفالت کا بار سر پر آ پڑا۔ زندگی چکی کی مشقت میں پس کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ سارے سپنے مدھم پڑ گئے۔ اب تو عرصہ ہوا خود کے لیے کوئی خواب دیکھے، سوچے یا رب سے کچھ مانگے ہوئے۔

میرے قدم پارک سے باہر جانے والے رستے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"بائی داوے آپ کا اسٹار کیا ہے؟" خاموشی گمبھیر ہونے لگی تو اس نے پوچھا۔

"بہت خطرناک......کینسر......"

"اوہ......یہ لوگ تو واقعی کری ایٹو ہوتے ہیں......اور اپنی فیملی کے ساتھ بے حد مخلص بھی آئی ایم اریز اور پتا ہے جب کینسر اور اریز کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو ایک ترقی اور دوسرا تنزلی کی جانب سفر کرتا ہے۔" میں لفظ ٹکراؤ، پر میں دل ہی دل میں ہنسی۔

"ارے میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اگر یہی بات کوئی راہ چلتا مجھ سے پوچھتا تو پتا ہے میں کیا کہتی؟"

"جی کیا کہتیں؟" وہ فوراً بولا۔

"یہی کہ جو تمہاری اماں کا نام ہے، وہی میرا۔"

"کریکٹ......" میں ہنسی۔

"عادینہ منظر......" پھر میں نے اپنا نام اسے بتا دیا۔

"واہ......نام تو اچھا ہے۔"

"صرف نام......؟"

"ہاں نام...... جو آپ کی شخصیت کو مزید چارم دے رہا ہے۔" وہ ہنسا۔ ہم یونہی ٹہلتے، باتیں کرتے پارک سے متصل سڑک پر آئے تو اس نے پیشکش کی۔

"چاکلیٹ کھائیں گی؟"

"پیسے ہیں تمہارے پاس......؟" میں نے بے دھڑک پوچھ لیا تو وہ ہنس دیا۔

"کم......کم......"

"تو پھر اس قلیل رقم کو کسی اچھے کام میں صرف کرو ناں!"

"مجھے پتا ہے، لڑکیاں چاکلیٹ شوق سے کھاتی ہیں۔"

"اور لڑکے منہ پھیر لیتے ہیں کیا؟"

"بس آپ لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے، ہر برا فعل مخالف صنف کے سر دھر کر خود ہاتھ جھاڑ لینے کی......" وہ جھلایا۔

"تو پھر تمہیں ڈبل لانی پڑے گی، میں عاطی کے بغیر کچھ نہیں کھاتی۔ عاطف میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

"نام سے تو لگتا ہے کہ کافی چھوٹا بلکہ بچہ ہے۔"

"ہاں، عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹا مگر ذہنی طور پر بالکل کسی بچے کی طرح معصوم......سو میں اسے بچوں کی طرح ہی ڈیل کرتی ہوں۔" ہم اس دن تو یونہی باتیں کرتے، کرتے اپنی، اپنی راہ ہو لیے۔ دھیرے، دھیرے بہت غیر محسوس انداز میں ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار گر گئی۔ ہر روز صبح کی واک پر شاہ زیب سے ملاقات بھی اِک معمول بن گئی۔ مجھے اس کے ساتھ چلنا، باتیں کرنا اچھا لگنے لگا اور میں نے جانا جس طرح واک سے کیلوریز گھلتی ہیں اسی طرح یوں کسی سے دل کی کہہ لینے سے اندر کا غبار کم ہوتا ہے۔

اور یہ اس سے اگلے ہی دن کی بات تھی، جب میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"لگتا ہے تم اپنے والدین کے اکلوتے ہو؟"

"یس......!ی اونلی سن آف مائی مام، اِک حادثے میں، میں نے اپنے فادر کو کھو دیا تھا۔ اس حادثے کے بعد ہی پریکٹیکل لائف میں قدم رکھا ورنہ ارادے تو کچھ اور ہی تھے۔ جدوجہد ڈاکٹر بننے کے لیے تھی، بن گیا بلڈر......تقدیر نے گڑھے کھودنے میں پھنسا دیا۔" میں دنگ رہ گئی۔ ہمارے کس قدر مشترک حالاتِ زندگی تھے۔

"مگر بہرحال یہ زندگی ہے اور زندگی میں کبھی، کبھی کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جو ہم سے سب کچھ چھین لیتا ہے، ہم خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔"

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا کیا قیامت ڈھاتا ہے، مجھ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا۔ میری زندگی بھی بکھر کر رہ گئی تھی۔ وجود یک دم جیسے کڑی دھوپ

تلے آگیا تھا۔ مگر میں نے اپنے فیوچر کی جانب بڑھتے قدم نہ رکنے دیے۔

''تم سچ کہتے ہو، باپ کا اچانک سر سے اٹھ جانا اولاد کی ترقی کے سفر پر اثر انداز ہوتا ہے...... زندگی تابناک فیوچر کو بھول کر روزی، روٹی کے چکر میں پڑ جاتی ہے۔ میں نے اب تک زندگی کے جتنے رخ دیکھے ان سے یہ جانا کہ یتیمی کے دکھ سے بڑا کوئی دکھ نہیں...... زندگی سے سچا پیار کھو جائے تو ہم سچ مچ پیار کے معنی بھول جاتے ہیں۔'' میرے دل میں ابا کی یاد نے چٹکی لی۔

''مگر سچا پیار کبھی نہیں کھوتا...... ہمیشہ ہمارے اندر زندہ رہتا ہے۔''

''مگر ہم تو محروم رہ جاتے ہیں ناں......''

''اِک بات کہوں...... جن کی مائیں ہوتی ہیں، وہ کبھی یتیم نہیں ہوتے۔ یہ بات میرے فادر کی ڈیتھ پر مجھ سے کسی نے کہی تھی اور میرے دل میں ترازو ہوگئی۔ وقت نے ثابت کردیا کہ کہنے والے نے سچ ہی کہا تھا۔ ماں بڑا سہارا ہوتی ہے۔''

''تم سچ کہتے ہو، میرے ابا گزرے تو واقعی لگتا تھا کہ زندگی ختم ہوگئی ہے مگر گزرتے وقت نے بتایا زندگی کبھی کسی ایک جز پر ختم نہیں ہوتی۔ بعض اوقات زندہ رہنے کے ڈھیروں ڈھیر جواز فراہم کردیتی ہے۔''

''بڑی بدنصیبی ہے کہ جن کی ساری دنیا ایک ہی رشتے کے اردگرد ہو، وہی رشتہ کھو جائے تو لگتا ہے قسمت ہم سے روٹھ گئی ہے۔ کائنات میں کوئی بھی ہمارا اپنا نہیں رہا۔''

''مگر ہم نصیب کو برا کیسے کہیں، نصیب بھی تو رب ہی لکھتا ہے ناں...... شاید ابا نہ گزرتے تو میری زندگی بھی بہت مختلف ہوتی۔''

''ہاں، دو چار چیاؤں، پیاؤں اور اِک عدد کاٹھ کا الو......'' وہ ہنسا۔

''ویسے اب تک چانس کیوں نہیں بنا؟''

''بس دل آمادہ نہیں ہوتا......'' میں نے ٹال دیا۔

''کیوں، دل کو کیا ہوا......؟''

اب میں اسے کیا بتاتی کہ دل کو کچھ نہیں ہوا، بس دل کسی کا ہو چکا تھا۔

''خوش نصیب ہیں آپ کہ دوسروں کی امیدوں کا مرکز ہیں۔''

''ہاں، وہ شجرِ سایہ دار جو خود دھوپ سہہ کر دوسروں کو چھاؤں دیتا ہے مگر خود اس پر سے بادل بن برسے گزر جاتے ہیں۔'' میری آنکھیں چپکے سے بھیگ گئیں۔ اماں کہتی تھیں اور شاید درست ہی کہتی تھیں کہ جیسے ابا نے اچانک آنکھیں موند لیں اگر ان کا بھی بلاوا آگیا تو میرا کیا ہوگا۔ ان کا خدشہ بجا تھا مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی طور نہ مانتا تھا۔ اگر دل کو راہِ راست پر لا کر کسی کے لیے آمادہ کر بھی لیا جائے تو عاطی کا کیا بنے گا...... اگر خدانخواستہ اماں کا خدشہ راست ثابت ہوگیا، عاطی عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹا تھا مگر لوگ کہتے وہ دنیا کو اِک معصوم بچے کی نظر سے دیکھتا ہے اور میں عاطی کو دنیا کی نہیں، دنیا کو عاطی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اماں کے بعد وہی تو میرے لیے زندہ رہنے کا جواز تھا، میں اس کے بغیر خود کو خالی اور ادھورا محسوس کرتی تھی...... اماں میری شادی کے لیے کوشاں رہیں مگر نصیب پر جیسے مہر تھی اور کامیابی و ترقی کے راستے کھلتے رہے...... اگر ایک جانب رکاوٹیں رہیں تو دوسری جانب عنایات کی برسات رہی...... بہت کم وقت میں، میں نے جانچ لیا کہ رب کی اعلیٰ ذات مجھ سے کچھ اور کام لینا چاہتی ہے...... اور پھر میں نے اس کی منشا پر سر جھکا دیا۔ میں خود کے لیے سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر سینے میں مقید دل کسی نادان بچے کی طرح ہمکتا۔

''میں سمجھتا ہوں، اپنی ذات کو کھو دینا کتنا

تکلیف دہ ہوتا ہے۔'' میری خاموشی پر وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔

''ہاں...... زندگی جیسے بیچ منجدھار میں چکر پھیریاں کھا رہی ہے، نہ......''

''پلیز! کوئی برا جملہ نہ بولنا......'' اس نے ٹوک دیا۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تن گئی۔

''اچھا بتائیں، آپ کو کیا کہہ کر پکاروں؟ دیکھنے میں تو آپ اتنی چھوٹی سی لگتی ہیں۔'' اس نے موضوع بدلا۔

''لگتی ہوں پر ہوں تو نہیں......'' بھلے وقتوں میں بیاہی جاتی تو شاید...... یہ بات میں صرف سوچ کر رہ گئی۔

''چلیں تو پھر دوستی۔'' اس نے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایا۔

''بشرطیکہ دوستی کھری ہو، اس میں کھوٹ نہ آنے پائے۔'' وہ فی الفور میری بات کی تہ میں اتر گیا۔

''اوکے......'' اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

پھر ہماری دوستی دھیرے، دھیرے اور نہایت غیر محسوس انداز میں پروان چڑھی۔ صبح کی واک اور اس کے درمیان اس سے دکھ سکھ کہنا، سننا اِک معمول بن گیا۔

اماں نے میرے لیے پھر ایک رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ رنڈوا...... کئی بچوں کا باپ مگر اعلیٰ عہدے پر فائز...... انہوں نے کوائف بتائے تو میں چڑ گئی۔

''یوں کہیں کہ گھر کے لیے ماسی اور بچوں کے لیے آیا کی ضرورت ہے۔''

''عادی! انسان بن جا...... ایک تو تجھے کوئی پوچھتا نہیں اور کہیں جو بھولا بھٹکا رشتہ آ ہی جائے تو، تو ناک چڑھا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں، تیرے لیے کوئی شہزادہ آسمان سے اترے گا کیا؟''

''تو میں نے آپ سے کب کہا کہ مجھے شادی کرنی ہے، ایسے بے ڈھنگے رشتے سے تو میں کنواری بھلی...... بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

''اری تو کیا تیرے جوڑ کا کنوارا بیٹھا ہوگا؟ چالیس کی ہونے کو آئی، دو چار سال اور گزر گئے تو......'' وہ دیر تک بکتی جھکتی رہیں...... انہیں کون سمجھاتا، دل تو بس خسارے کے سودے کرتا ہے، بلاوجہ بے منزل راستے کا راہی بنا ہوا ہے، وہ نہیں تو کوئی نہیں۔ یہیں آکر میں بکھر جاتی۔ احساسِ نارسائی اور بڑھ کر مجھے ڈسنے لگتا...... جب بات ایسے، ایسے رشتوں پر آرکی ہے تو پھر وہ کیوں نہیں جو دل کی طلب ہے۔ میں اپنے کمرے میں آکر اوندھی پڑ گئی۔

''آفتاب جنید انصاری۔'' میں نے شدتِ کرب سے آنکھیں موند لیں۔ ہماری محبت کتابوں میں بسی خوشبو کے مانند ساکن تھی...... مگر سانس کے ساتھ، ساتھ چلتی تھی...... کبھی، کبھی کوئی غیر محسوس اور بے معنی سی چیز ہماری زندگی کا محور و مرکز بن جاتی ہے اور .... حاصلِ زیست ٹھہرتی ہے، بالکل اسی طرح محبت کا یہ ایک احساس تھا جو اَب میرے اندر دور، دور تک جڑیں پھیلا چکا تھا۔ اس حد تک کہ اسے خود سے نکالوں تو مجھ میں کچھ نہ رہے۔ میری ان سے چھ سالہ شناسائی تھی۔ وہ میرے اندر رہتے بستے اور محبت کے اسی احساس کی طرح ہر گزرتے دن کے ساتھ پھلتے پھولتے...... سچ تو یہ تھا کہ کوئی لمحہ ان کی یاد سے خالی نہ تھا یا پھر ان کی یاد ہی ہر سانس کے ساتھ جُڑی تھی۔

ہر روز علی الصباح جب میسج بیپ ہوتی تو جیسے میرے اندر بھی اِک بے چینی پھیل جاتی کہ یہ وہی ہیں اور میں برملا اظہار بھی کردیتی۔

''میں آپ کو یاد ہی کر رہی تھی۔''

"کیوں...... کیوں مجھے یاد کرتی ہو؟" کبھی، کبھی ان کے لفظوں میں ہلکے سے دکھ کی آنچ ہوتی...... مگر محبت کا گہرا احساس بھی۔

"تو کیا آپ مجھے یاد نہیں کرتے...... اور اگر میں کہوں کہ آپ بھی مجھے یاد نہ کیا کریں تو کیا بھول جائیں گے؟"

"تم تو میری زندگی ہو...... جو مجھے زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہے ورنہ شاید اب تک میں بھی پتھرا چکا ہوتا۔"

یہ وہ دکھ تھا جو پندرہ سال سے ان کے حلق میں اٹکا تھا۔ ان کی بیگم کا وجود پندرہ سال سے مفلوج تھا اور وہ کہتے کہ پندرہ سال سے وہ نہیں جانتے کہ ازدواجی سکھ کسے کہتے ہیں۔ بچے اب اتنے بڑے تھے کہ ماں کی جگہ کسی اور وجود کے روا دار نہ تھے۔ یہیں آ کر میں انہیں باعزت بری کر دیتی کہ میرے نزدیک یہ کسی بھی مرد کی عظیم قربانی تھی۔ گویا زمین، آسمان کا فاصلہ تھا ان کے اور میرے مابین...... وہ اکثر کہتے کہ وہ تم جیسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو کسی بھی مرد کی زندگی کو جنت بنا سکتی ہیں...... تب میں سوچتی...... آفتاب جنید جیسے کتنے لوگ ہوتے ہیں جو ہم ایسی لڑکیوں کو سیرت و کردار کے حوالے سے سراہتے ہیں...... اور ان کے اوصاف کو مدِنظر رکھتے ہیں...... اور کیا قیامت تھی کہ اپنے تمام تر اوصاف کے باوجود میں لوگوں کے لیے ناقابلِ قبول ٹھہرتی...... اچھے رشتوں کا یوں کال تھا جیسے بھرے جہان میں کسی کو خوب سیرتی کی طلب ہی نہیں...... اماں مُولار میں ہوں تو کہتیں۔

"میری عادی لاکھوں میں ایک ہے۔" اور میں آئینہ دیکھ کر ہنستی...... سنا تھا کہ وقت اچھا ہو یا برا...... گزر ہی جاتا ہے مگر ایک مقام پر آ کر جیسے زندگی ٹھہر گئی تھی۔ جیسے سال گزرنے پر کوئی ہندسہ بدلتا ہے اور بس...... جانے کتنے ہندسے بدلتا وقت آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میری زندگی وہیں کی وہیں ٹھہری تھی، ساکت و جامد...... جہاں اضطراب تھا...... نارسائی کا دکھ اور بس خواہشیں...... مزے کی بات یہ کہ اپنی زندگی میں، میں خود کہیں نہیں تھی۔ ساری جدوجہد دوسروں کے لیے...... عاجز آ کر ہی تو اماں کہتیں کہ میرے نصیب ہی ٹھنڈے ہیں...... اور مجھے لگتا جیسے کسی نے میرے سکھ کی کتاب مقفل کر کے چابی سمندر میں اچھال دی ہو...... اماں چاہتیں کہ تمام حقائق سے آنکھیں میچ کر شادی کر لوں اور میں تاخیر کی صورت میں رب کی مصلحتیں گنتی۔ رب نے مجھے اوقات سے بڑھ کر نوازا تو شاید اس لیے کہ مجھے نوکری کر کے گھر کا خرچ چلانا تھا۔ عاطی میرے ہاتھ سے کھانا کھاتا، اماں کی طبیعت آئے روز خراب رہتی...... مجھے ان کی اور عاطی کی فکر کھائے جاتی۔ ان حالات میں انہیں بیچ منجدھار میں چھوڑ دینا خود غرضی ہی نہیں...... سفاکی کے زمرے میں آتا، وہ شادی کا مشورہ یوں دیتیں جیسے میرے ہاتھ میں تو ہے اور میں اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی اور کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنائیت کی مہک اور محبت کا لودیتا اِک احساس...... یہ وہ احساس تھا جو میری سانس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ میں اس خیال سے دامن چھڑا لیتی تو میری زندگی میں صرف جدوجہد رہ جاتی۔ کبھی جو اُن لمحات کو سوچتی جب قدرت نے مجھے آفتاب سے نوازا تو لگتا وہ رب کا ودیعت کردہ کوئی انعام ہیں۔ محبت کا دل خوش کُن احساس اور سکھ کہ زندگی میں کچھ تو ایسا ہے جو صرف اپنی ذات کے لیے ہے۔ میں اس احساس سے ہٹ کر اپنے آپ کو خالی اور ادھورا محسوس کرتی، ایسے میں زندگی کا سناٹا اور تنہائی بڑھ، بڑھ کر مجھے ڈستی، کبھی جو گھریلو اور پیشہ ورانہ فرائض نبھاتے تھک جاتی تو ان چک پھیریوں کے دوران دل بار ہا ہمکتا، کوئی تو اپنا ہو کہ یہ تمام تھکن سمیٹ لے، جس سے دل کی ہر بات کہی جا سکے اور جو دکھ، سکھ کے ہر لمحے کا ساتھی ہو...... میں اپنے آس پاس نظر دوڑاتی تو آفتاب جنید کو ہر لحاظ سے پرفیکٹ پاتی۔ بلاشبہ وہ نیک دل انسان تھے مگر......

ملنا جو تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یوں ہے کہ دشوار بہت ہے

☆☆☆

موسم نے رنگ بدلا پھر چھٹیاں بھی آ گئیں تو معمول میں تبدیلی یقینی تھی۔ میں فجر کے بعد مزے سے سوتی، چہل قدمی کا معمول کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ نہ جانے کتنے دن بعد پارک گئی تو وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

"تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
ہاں مگر چین سے گزر نہ ہوئی"

"گزر نہیں بسر...... کبھی تو کوئی شعر ڈھنگ سے پڑھ لیا کرو۔" میں نے اس کے چپت لگائی۔ "بھئی مجھے گرمی بھی غضب کی لگتی ہے اور سردی بھی انتہا کی۔"

"اچھا......! مجھ پر تو کوئی موسم اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ میں تو کہتا ہوں، ہر موسم کا اپنا حسن ہوتا ہے، جس کا لطف لینا ہی چاہیے۔ بہت کمی محسوس کر رہا تھا آپ کی۔" میں نے اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کو محسوس کیا مگر بات اڑا دی۔

"اچھا! اگر مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو کیا تم جاگنگ پر نہ آتے؟"

"شاید اتنی پابندی سے نہ آتا......"

"اسی لیے میں خود کو کسی معمول یا انسان کا عادی بنا لینے کے خلاف ہوں۔"

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ زندگی ہے اور زندگی میں بہت کچھ خود بخود بھی ہوتا ہے، انسان چاہے اسے انہونی کہے یا حادثہ......"

میں کچھ کہنے کو تھی مگر اس نے اچانک پوچھ لیا۔

"محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے، مجھے لگتا ہے آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"ہم......م یعنی تم نے کی ہے؟" میرے اندر دھیرے سے کوئی کلی مسکائی مگر ٹال دیا۔

"ہاں مگر صرف ایک بار...... وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

"تھی......! یعنی ماضی کی کوئی یاد ہے؟"

"ہاں......! مگر تلخ یاد...... بھولی بسری ایک کہانی۔"

"تو کیا وہ بے وفا نکلی، دامن چھڑا لیا یا پھر تم مات کھا گئے، میدان چھوڑ دیا؟" میں سمجھی وہ کوئی روایتی کہانی سنائے گا۔ اسٹیٹس کا فرق...... ظالم سماج، بے وفائی یا ایسی ہی کوئی مجبوری جو ازل سے محبت کے درمیان دیوار بنتی ہے۔

"سمجھیں...... میں نے دامن چُھڑا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزارے...... زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے، مجھے لگا کہ میں اسے زندگی کی خوشیاں نہ دے سکوں گا۔"

"اچھا...... شاید اس وقت تم کیریئر کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے تھے۔"

"نہیں...... مجھے لگا کہ میں زیادہ عرصہ اس کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔ کبھی، کبھی میں خود کو بالکل تنہا...... محسوس کرتا ہوں، یوں جیسے کسی تاریک غار کے دہانے پر کھڑا ہوں، اندر مجھے کوئی پکار رہا ہے۔"

"اچھا! یہ بات امی کے سامنے کہو ذرا......" میں نے چڑایا۔

"یار! یہ امائیں بھی ناں بس......" وہ جھلایا، میں مسکرا دی۔ "بلاوجہ زندہ رہنے کا جواز بنی رہتی ہیں۔ چلتی ہیں میری امی سے ملنے......؟"

"کس خوشی میں......؟"

"بس یونہی...... ان پر ذرا رعب ہی پڑ جائے

گا کہ آپ جیسے انٹلیکچوئل بھی میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔''

''نہ بابا مجھے تو معاف ہی رکھو اور یہ گاڑھے، گاڑھے لفظ نہ بولا کرو...... حلقۂ احباب۔'' میں نے اسے منہ چڑایا۔

''چلیے نہ سہی...... یہ بتایئے آپ کوکنگ کرتی ہیں؟ آلو کا پراٹھا، آئی لائک اِٹ...... سادہ ہرے مسالے والا۔''

''ہم...... م...... م آجاؤ کسی دن ناشتے پر...... مل جائے گا۔''

''مجھے اندازہ ہے آپ کے ہاتھ کے پراٹھے یقیناً لذیذ ہوں گے، بڑی speciality (خصوصیت) ہے آپ کے ہاتھوں میں...... میں نے کہیں پڑھا تھا ماماتا عورت کی فطرت کی پہلی تہ ہوتی ہے۔ آپ کے ہاتھ دیکھتا ہوں تو اک پوئم بیوٹی فل ہینڈز یاد آجاتی ہے جس میں ماں کے ہاتھوں کی خوب صورتی کو اس کی ماماتا سے تشبیہ دی گئی ہے۔''

بات آئی گئی ہوگئی تھی، میں نے شکر کی سانس لی۔

''مگر شاید ہر رشتہ کھو جانے کے لیے بنا ہے، اِک حد تک چل کر سب چھوڑ جاتے ہیں۔''

''ہم...... م...... مگر میں سمجھتا ہوں، جس طرح انسانی زندگی رفتہ، رفتہ رخ بدلتی ہے، اسی طرح گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ انسانی ترجیحات میں بھی تغیر آتا ہے۔ کبھی مجھے کالج کی نادان، الھڑ، نٹ کھٹ سی لڑکیاں بھاتی تھیں۔ اب آپ جیسی سوبر...... ڈیسنٹ، ذمے دار اور سنجیدہ مزاج لڑکیاں میرا آئیڈیل ہیں۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، دل میں آیا کہوں...... یہاں میرا کیا ذکر...... میری عمر اب چوائس سے نکل کر سمجھوتے پر آرکی ہے...... اور یہ کہ اس کی عمر کا کوئی لڑکا اگر مجھے پروپوز کرنے پر تل جائے تو گن کر اسے اتنے ڈنڈے لگاؤں جتنے برس وہ مجھ سے چھوٹا ہے مگر یہ سراسر بدگمانی ہوتی۔ اس نے محض اِک عمومی سی بات کی تھی۔ میرا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ خیر بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ سوٹال دیا۔

''اچھا! تو کہاں درج ہے کہ آج کی سوبر و سنجیدہ مزاج لڑکی ماضی کی الھڑ، نٹ کھٹ لڑکی نہ رہی ہوگی؟''

''اوہو اِک تو یہ بڑی خرابی ہے، اپنی صنف کی چاہت میں آپ خواتین فوراً میدان میں اتر آتی ہیں۔'' وہ جھنجلایا...... بچوں کا سا معصوم انداز...... میں ہنس دی۔

پھر یوں ہوا کہ اس کی نظریں اکثر ہی سراہنے لگیں...... میری شخصیت کی ذرا سی تبدیلی وہ فوراً محسوس کرلیتا، میں ذرا بھی نکھرتی یا معمول سے بڑھ کر سجتی سنورتی وہ فوراً نوٹ کرلیتا...... اور تعریف بھلا کسے بری لگتی ہے، ستائش کسے ناپسند ہوتی ہے، مجھے اعتراف تھا، میں نے خود پر توجہ دینی شروع کردی تھی۔ وہ بھی کھل کے سراہتا۔

''اچھی لگ رہی ہیں بڑی......''

''اچھا! لگ رہی ہوں...... ہوں نہیں؟''

''اچھی ہیں، تبھی تو اچھی لگتی ہیں۔'' عام سادہ سا لہجہ...... اگرچہ میں اکثر اڑا جاتی۔

''جانے بھی دو، میں بہت معمولی عام سی لڑکی ہوں۔''

''ارے! کس نے کہا...... کبھی خود کو عام سی نہ کہنا، نہ سمجھنا، ہارٹ ٹچنگ پرسینلٹی ہے آپ کی۔''

''ارے......'' میں دنگ رہ گئی، کیسے آشنا سے لفظ تھے۔ آفتاب نے جب پہلی بار میری تعریف کی تھی تو یہی کہا تھا۔ ''تمہاری شخصیت دل کو چھو لینے والی ہے۔'' اور مجھ میں جس حد تک چارم تھا میں واقف تھی مگر شاہ زیب کو کون سمجھاتا۔ کبھی، کبھی

وہ کہتا۔

''آپ ایک مکمل لڑکی ہو، ایک مرد جس کے خواب دیکھتا ہے۔''

تب مجھے آفتاب جنید کی بے ساختہ یاد آتی جو اکثر کہتے...... ''تم جیسی ڈیسنٹ اور پازیٹو کردار والی لڑکیاں ہی اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔'' میں جانتی تھی، بیوی کے ادھورے پن کی وجہ سے ان کی زندگی میں خلا ہے...... ان کی زندگی میں مجھ جیسی کسی لڑکی کی کمی تھی...... ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بنا ادھورے تھے مگر اپنے، اپنے مصائب کی بھول بھلیوں میں الجھے ہوئے۔

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

☆☆☆

اور یہ انہی جلتے بلتے دنوں کی بات ہے، یکایک عاطی کی حالت بگڑ اٹھی اور میرا واک کو جانا اِک طویل وقفے کا شکار رہا۔ عاطی یوں تو بچوں کی طرح بے ضرر تھا مگر کبھی، کبھی قابو سے باہر ہوجاتا تو چیختا، روتا چیزیں اٹھا، اٹھا کر پھینکتا...... اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا تو زنجیر ڈالنی پڑتی۔ وہ لمحے میرے لیے تکلیف دہ ہوتے تو اماں بھی چھپ، چھپ کے روتیں...... میں اسی ہڑ بونگ میں لگی رہی...... ایک...... دو...... تین...... پورے پانچ روز گزر گئے۔ سچ تو یہ تھا کہ شاہ زیب کا خیال بھی میرے آس پاس نہ پھٹکا تھا۔ عاطی قدرے بہتری کی جانب مائل ہوا تو میں نے سکھ کی سانس لی۔ تب ایک نئی بات ہوئی...... اسی شام شاہ زیب کا ایس ایم ایس اس کے نام کے ساتھ میرے موبائل پر آیا۔

"best feeling in the world
is, when you think that
your
friend forgot you ,



suddenly you
received a message from
your
friend saying i miss you"

میں بھونچکا رہ گئی۔ اسے میں نے اپنا سیل نمبر کب اور کیونکر دیا تھا...... یاد نہیں پڑتا تھا پھر اس کے کئی میسجز آئے، میں نے بھی ریپلائی کر کے نہ دیا۔ جانے کتنے دن بعد پارک گئی تو وہ سنگی بینچ پر بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی اسی رغبت سے آئس کریم کھاتا رہا تو میں منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

''آپ کے ہاں کیا دوسروں کو پوچھنے کا رواج نہیں ہے؟''

''پوچھتا تو ہوں بلکہ پوچھ رہا ہوں، آئس کریم کھائیں گی؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟'' میں نے خفگی سے کہا تو وہ دوڑ کر قریبی کولڈ کارنر سے کون لے کر آیا تو اس کی اپنی آئس کریم ختم پر تھی۔

''تم نہیں کھاؤ گے؟''

''آپ کھائیے...... ہم تو کھاتے ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں...... ہاں...... ہمیں تو کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی، ہم تو ترستے ہیں، کوئی تو ہو جو ہمیں آئس کریم کھلا دے۔'' میں نے اس انداز سے لہک لہک کر کہا کہ وہ ہنستے، ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

''میں اسی لیے بور ہو رہا تھا۔ آپ کو کتنا پکارا، آوازیں دیں...مگر آپ کے تو جیسے کان ہی بند تھے۔'' اپنائیت میں لپٹا لطیف سا شکوہ......

''تو اور کیا...... ہمارے کان ہیں...... جو مرضی آئی، سنیں گے، جو نہ آئی' نہ سنیں گے۔'' میں نے بات مذاق میں اڑا دی...... پھر کہا......

''میں کچھ بزی رہی......''

''پہلے لوگ جھوٹ بولتے تو مر جاتے تھے، اب تو بخار بھی نہیں چڑھتا۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتی اور مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' میں نے اسے عاطی کے بارے میں بتایا پھر پوچھا۔ ''میرا نمبر تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟''

''اِک روز چپکے سے آپ کا موبائل اڑا کر اپنے نمبر پر بیل دے دی۔'' اس نے مزے لے، لے کر بتایا...... میں نے خفگی سے اسے گھورا۔

''چیٹر، چور......''

''مجھے اندازہ تھا، سیدھے، سبھاؤ تو آپ بتانے سے رہیں۔''

''تو ضرورت بھی کیا ہے، روز ملاقات ہو تو جاتی ہے۔''

''اور جو کھو گئیں تو کہاں ڈھونڈوں گا آپ کو......؟''

''میں تمہارے لیے اتنی اہم ہوں؟'' میں دنگ رہ گئی۔

''جانے دیجیے...... وہ آپ کی لو اسٹوری ادھار ہے اب تک۔ اس دن آپ نے ٹال دیا تھا۔'' گویا وہ ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

''ہاں وہ...... نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم...... سمجھ لو حلق میں پھنسی ہڈی...... نہ اگلتے بنے نہ نگلتے...... ہوتا ہے ناں کبھی، کبھی کوئی ایسا مل جاتا ہے، جسے نہ ہم اپنا سکتے ہیں نہ چھوڑ سکتے ہیں۔''

''لگتا ہے آپ پھر ٹالنے کے موڈ میں ہیں۔'' وہ فی الفور تاڑ گیا۔ ''میں نے اِک روز آپ سے پوچھا تھا محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟''

''پہلے تم بتاؤ...... تم محبت کو کن معنوں میں لیتے ہو؟''

''ہم...... م...... م جب کسی کی یاد آپ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے اور اسے کھو دینے کا

خیال آپ کو تکلیف دے تو جان لیں کہ آپ کو اس سے محبت ہے......اب تو بتا ہی دیں......کون ہے وہ خوش نصیب......؟''

''سچ بتاؤں یا جھوٹ بولوں؟''

''سچ ہی بتا دیں...... جھوٹ آپ کہاں نبھا پائیں گی۔''

''اچھا تمہارے نزدیک میری شخصیت اتنی پازیٹو ہے؟''

''بالکل...... آپ جیسے لوگوں سے مل کر ہی یقین ہوتا ہے کہ دنیا اب تک کس بل بوتے پر قائم ہے۔''

میرے دل کو اِک بار پھر آفتاب جنید کی یاد نے جکڑا جو کہتے......عورت میں اگر سیرت و کردار نہ ہو تو وہ بظاہر کتنی بھی مکمل ہو، مرد کے لیے صفر ہوتی ہے یا بالآخر ہو جاتی ہے۔

''نہیں...... جو محبت کا منکر وہ فطرت کا منکر ہے، محبت تو انسان کی مٹی میں گندھی ہے ازل سے ہے اور تا ابد قائم رہے گی۔''

''اچھا! مجھے تو لگا کہ آپ کہیں گی، محبت تو بس حقیقی رشتوں میں ہوتی ہے اور یہ کہ حقیقی رشتے بھی اپنے نہیں ہوتے۔۔سو محبت کہیں نہیں ہے۔'' اب میں اسے کیا بتاتی کہ یہ سب محبت کا ہی تو پھیلاؤ ہے کہ اپنی ذات میں، میں خود کہیں نہیں ہوں۔

''مجھے محبت کی اہمیت سے انکار نہیں......مگر اسے خود پر حاوی کر کے اپنی کمزوری بنا لینے کے خلاف ہوں۔''

پھر میں نے اسے دھیرے، دھیرے آفتاب جنید انصاری کے بارے میں بتا دیا۔

''ہم......م......م اسی لیے آپ کا موبائل رات، رات بھر بزی رہتا ہے۔'' اس نے چٹخارا سا لیا۔

''ارے نہیں...... وہ تو...... کب مگر......؟''

میں سٹپٹا گئی تو وہ ہنس دیا۔ میں نے اس کی شرارت جان کر اسے گھورا۔

''ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ اِن کی اپنی اِک دنیا ہے جو چاروں طرف سے انہیں کھینچتی ہے بس صبح کا ایک میسج...... ہاں کبھی، کبھار ہم چیٹ ضرور کرتے ہیں مگر ہمارے درمیان محبت کم آتی ہے۔ یوں جیسے کوئی چیز ہمارے آس پاس ہو اور بس......صرف محسوس ہو، لفظوں میں نہ آئے۔''

''ہم......م......م اور پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟''

''ایک بار ہنگامی حالات میں مجھے انہوں نے لفٹ دی تھی۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا تو ان کے موبائل سے گھر پر کال کر کے میں نے اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی۔''

''پھر آپ نے بعد میں کال کر کے بخیریت گھر پہنچانے پر شکریہ کی کال بھی کی ہو گی؟ اسی طرح آپ کا نمبر انہیں مل گیا اور بس...... پھر بات چل پڑی...... ہے ناں......''

''کرکٹ......'' میں ہنس دی۔ ''شاید وہ ایک لمحاتی کیفیت تھی جس نے ایک پل کو مجھے مسحور کیا اور آج تک جکڑ رکھا ہے، ہوتا ہے ناں...کبھی کبھی کوئی احساس ہمیں آکٹوپس کی طرح جکڑ لیتا ہے۔ ہم اس کی گرفت سے تا زندگی نہیں نکل پاتے۔ بالکل اسی طرح اس محبت نے مجھے آہستہ، آہستہ جکڑا تھا۔ دوسری بار وہ اتفاقاً ہی میرے کالج میں اپنی بیٹی کے ایڈمیشن کے لیے آئے تھے، بہت کم عرصے میں، میں نے جانچ لیا کہ ہم دونوں کے مابین کوئی چیز سانس لینے لگی ہے۔ کچھ تھا جو دل خوش کن تھا...... کچھ عرصے کی بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت شکستہ اور محبت کو ترسا ہوا انسان ہے، ایسے لوگ یا تو بہت اچھے ہوتے ہیں یا بہت برے......''

''آہ...... اور جو آپ کا منظورِ نظر ٹھہرے...... وہ بہت اچھا ہی ہو سکتا ہے۔''

''کریکٹ...... میری ان سے چھ سالہ شناسائی ہے اور ان چھ سالوں میں، میں نے انہیں کبھی کمزور پڑتے نہیں پایا۔ میرا نظریہ ہے کہ محبت انسان سے نہیں، اس کی کوالٹیز سے ہوتی ہے، یقین جانو کہ وہ ایک بھرپور انسان ہیں۔ سوبر، سنجیدہ، باوقار سب کچھ خاموشی سے سہہ جانے والے ان ہی جیسے لوگوں کے لیے طے شدہ ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہے۔''

''اچھا .... مگر بڑی گھسی پٹی سی کہانی لگتی ہے۔ شادی کے نام پر کسی کو بھی گھر میں لا ڈالنا، پھر اس میں اپنا آئیڈیل کھوجنا...... یا اسے اپنے آئیڈیل کے سانچے میں ڈھالنا...... ناکامی پر آپ جیسی کسی لڑکی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر یہ اعتراف کہ اب تک کی زندگی آپ ہی کی تلاش میں گزری ہے۔''

''تمہاری تجزیہ نگاری سراسر حالات کے... برعکس ہے، انہوں نے بارہا مجھے سراہا ضرور تھا مگر چاہت کا اظہار تب کیا جب مجھے اس چاہت میں کلی طور پر انوالو پایا...... مگر مجھے پروپوز کرنے یا شادی کا جھانسا دینے کے بجائے ہمیشہ مجھ پر اپنی مجبوریاں عیاں رکھیں۔ وہ مجھ سے رابطے کے معاملے میں بے حد محتاط اور لیے دیے سے رہتے ہیں۔''

''یعنی ہر شریف آدمی کی طرح اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں؟ ایسا ہوتا ہے جب اولاد جوان ہو جائے تو گھر میں مرد کی حیثیت ثانوی اور عورت مضبوط ہو جاتی ہے۔''

''ارے واہ...... !تم نے تو ازدواجیات گھول کر پی رکھی ہے۔'' میں نے اس کی بات اڑا دی۔ اتنا بھی نہ بتا سکی کہ ایسا نہیں ہے، اپنے بچوں سے ان کا تعلق گہرا اور قریبی ہے۔ ماں کے ناکارہ پن پر باپ کی اجاڑ زندگی کا انہیں دکھ تو ہے مگر ظاہر ہے کہ کوئی اولاد ماں پر سوت نہیں چاہتی۔

''کبھی، کبھی حالات ہمیں بڑے غیر محسوس انداز میں چھلنی کر جاتے ہیں، ناکامیاں وجود کی گہرائیوں میں ڈیرا ڈال دیں تو زندگی خود اپنے معنی کھو دیتی ہے، مان لو کہ کچھ لوگ دنیا میں صرف دکھ اٹھانے اور قربانیاں دینے کے لیے آتے ہیں۔''

''اِک بات کہوں، زندگی کے سکھ بھی، کبھی خود ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہیں، ہم از خود...... خود کو بدقسمت گردان کر قسمت سے پیٹھ موڑے اپنی۔۔ بدقسمتی کا راگ الاپتے رہتے ہیں مگر تقدیر اِک ایسی قوت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔''

''سچ کہوں تو دل بہت چاہتا ہے کہ کبھی اچانک ہی وہ ہو جائے جو دل کی خواہش ہے مگر بعض خواہشات کا دورانیہ ساری زندگی پر محیط ہوتا ہے، زندگی ختم ہو جاتی ہے مگر ان خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔''

''اس سب سے قطع نظر زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے جو گمان، امید اور قسمت سے بالاتر ہے۔ زندگی میں بہت کچھ اچانک اور غیر متوقع بھی ہوتا ہے اور کبھی کچھ ایسا جو سراسر زیست کے معنی و مفہوم بدل دیا کرتا ہے، یک دم حیات کا دھارا پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔'' وہ بولا۔

''آہ...... گمان...... امید...... توقعات...... دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے، سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز آپ تھوڑی بہت جدوجہد سے حاصل کر سکتے ہیں لیکن محبت صرف اور صرف قسمت سے ملتی ہے۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
وہ بہت دیر سے ملا ہے مجھے

جب اولاد جوان ہو کے منہ کو آ گئی۔'' میں نے چلتے، چلتے راہ کا کنکر ٹھوکر سے اچھالا۔

''جوان اولاد...... پھر تو کافی فرق ہوگا آپ دونوں کی عمروں میں......؟''

''تم پاگل ہو، جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو بس وہ ہو جاتی ہے، محبت فاصلے کب دیکھتی ہے...... ویسے کچھ اتنا زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔''

''اور آپ کہتی ہیں کہ آپ کی محبت حلق میں پھنسی ہڈی ہے، تو ذرا نوچ پھینکیے اسے خود کو کسی اور کے لیے آمادہ کر کے دیکھیے ناں......''

''ہاں...... کبھی، کبھی لگتا تو ہے کہ سراب کے تعاقب میں ہوں...... پر اپنے دل کا کیا کروں جو کسی اور کے لیے آمادہ نہیں ہے۔''

''تو چلیے...... مان لیجیے کہ وہ آپ کے مقدر کا ستارہ ہیں۔''

''مگر تقدیر کسی، کسی کو زیادہ آزماتی ہے...... ورنہ اس سے بڑھ کر تکلیف دہ احساس اور کیا ہوگا کہ جو ہمارے لیے سب کچھ ہے، وہ ہمارا کچھ بھی نہیں یا ہمارے لیے نہیں...... بات تلخ سہی مگر سچ ہے کہ انسانی زندگی میں وفا، خلوص اور محبت کی جتنی اہمیت ہے، یہ اتنی ہی بے مول ہے۔''

''اِک بات کہوں...... انسانی زندگی کا دائرہ ایک نقطے سے سفر کرتا ہے اور پھر اسی نقطے پر تمام ہوتا ہے، یہ مسائل، مصائب سب انسان کے ساتھ چک پھیریاں کھاتے ہیں اور محبت ان سب سے ماورا کوئی چیز ہے، جو ساتھ ساتھ چلتی ہے مگر ان تمام حیات کی تلخیوں کو جذب کیے رکھتی ہے۔'' اس کے لہجے میں کچھ خاص الخاص بات تھی مگر محبت کو حاصل کر لینا بھی بڑی قسمت کی بات ہے۔''

''اور بہت کچھ ہے جو قسمت سے بھی بڑھ کر ہے، خیر...... یہ اگلی بار بتاؤں گا۔'' پھر وہ خود کئی دنوں کے لیے گم ہو گیا...... ایک، دو، تین...... کئی روز گزر گئے نہ ایس ایم ایس نہ ملاقات...... میرے لیے واک کا معمول ہی اپنے معنی کھو بیٹھا...... میں نے کئی روز انتظار.... کیا پھر پارک جانا ہی چھوڑ دیا...... اس دن کئی دن بعد علی الصباح اس کا ایس ایم ایس آیا۔ ''waiting'' تو مجھے جانا پڑا مگر اِک اضمحلال سا اس کے وجود پر طاری تھا۔ تھکن، پژمردگی......

''حد ہوتی ہے بے نیازی کی...... کسی کی جان جائے اور آپ کو پروا ہی نہیں۔'' اس نے یقیناً مصرعہ پڑھنا چاہا تھا۔ میں اس فاش غلطی پر مسکرائی۔

''میں سمجھ گئی تھی۔ میسج چل رہے تھے ناں......''

''ہاں...... زندگی کی لاسٹ اننگ......!''

''کیا مطلب......؟'' میں پوری کی پوری گھوم گئی۔

''یوں سمجھیں کہ کلین بولڈ ہوتے، ہوتے رہ گیا۔ جیسے فنا کی طرف بڑھتا قدم لوٹا ہے۔'' میں نے پہلی بار اس کے لہجے میں امید کو ٹوٹتے محسوس کیا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو، تم تو زندگی کے تاریک سے تاریک پہلو سے بھی امید کی کرن کھینچ نکالتے ہو۔''

''میں نے فنا اور بقا کا فلسفہ قدرت سے سیکھا ہے۔ زندگی ہو یا موت...... رفتہ، رفتہ اپنے انجام کی طرف سفر کرتی ہے مجھے لگتا ہے، آپ کی ست رو محبت ضرور خوشگوار انجام کو پہنچے گی۔''

''ہاہ! شاید اسی لیے کسی دانشور نے کہا ہے کہ خواب دیکھیے...... ضرور دیکھیے...... مگر یاد رکھیے کہ قسمت کو آپ کے خوابوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کبھی، کبھی میں سوچتی ہوں، وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جو جسے چاہتے ہیں اسے پا بھی لیتے ہیں۔''

"میں نے کہیں پڑھا تھا کسی کو چاہو تو یہ نہ سوچو کہ وہ مقدر میں ہے یا نہیں...... بلکہ اس شدت سے چاہو کہ رب اسے تمہاری تقدیر بنا دے...... خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے۔"

"شدت! کاش میں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھا سکتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ شدت کسے کہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ کو اپنے جذبے پر یقین بھی ہونا چاہیے، جن کے جذبے سچے ہوں وہ عمر بھر بھی انتظار کیا کرتے ہیں...... انسان تنہا ہو تب بھی امید تو زندہ رہتی ہے۔ آپ تو پھر بھی خوش بخت ہیں کہ وہ آپ کے ہم قدم تو ہیں۔"

شاید وہ ٹھیک کہتا تھا، میں جانتی تھی ان کی زندگی میں سو جھمیلے ہیں، بیمار بیوی کے سبب ساری گرہستی کا بار ان کے سر پر ہے۔ ایسے میں میرا خیال ان کے ساتھ، ساتھ چلتا تھا تو میری خوش بختی تھی۔ جب وہ کہتے کہ تم میرے لیے اہم ہو تب میں اتنا بھی نہیں کہہ پائی کہ آپ میری ساری حیات ہو...... دل کے سچے جذبے اظہار و بیان کے محتاج کب ہوا کرتے ہیں۔

"میں خوابوں کی دنیا میں سفر کروں تو حقائق سے بھٹک جاؤں۔ اس لیے آنکھیں کھلی رکھتی ہوں۔"

"مگر یاد رکھیے کہ زندگی ہمیں کبھی، کبھی...... سرپرائز بھی کرتی ہے، انسانی زندگی میں بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جو اس کے فہم و گمان سے بالاتر ہوتا ہے...... کبھی سنگین اور کبھی خوشگوار...... کبھی، کبھی جب کچھ ہونا ہوتا ہے...... تو اسی طرح ہو جاتا ہے...... خود بخود...... اچانک، غیر متوقع...... اور بس یونہی...... زندگی میں حادثات و واقعات نہ ہوں تو اسے زندگی کون کہے...... یہ چھوٹے، چھوٹے اتفاقات کبھی زندگی کو معنی فراہم کر دیتے ہیں اور کبھی زندہ رہنے کا جواز بھی بن جاتے ہیں۔"

خیر یہاں تک تو مجھے بھی انکار نہیں تھا...... زندگی میں کبھی، کبھی اچانک ہی کوئی ایسا حادثہ یا واقعہ ہو جاتا ہے جو ساری زندگی کا دھارا پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جیسے ابا اچانک نہ گزرتے تو میری زندگی کا یہ کو دُہری ذمے داریوں کا بوجھ اٹھاتی...... یا اگر آفتاب جنید سے ٹکراؤ نہ ہوتا تو تمام حقائق پر نظر رکھتے ہوئے کسی بھی ناٹھے ٹکڑے رشتے پر ہامی بھر کر اس کے بچے پال رہی ہوتی...... مگر زندگی کو صرف فہم، گمان یا امید کی نذر تو نہیں کیا جاسکتا ناں۔

"میں زندگی سے لمبی چوڑی امیدیں نہیں باندھتی کیونکہ سچ ہے کہ امیدیں ہی دکھ دیتی ہیں...... میں حقائق پر نظر رکھتی ہوں، محبت سے منکر نہیں...... مگر اس محبت کو اپنی کمزوری یا زندگی کا آزار نہیں بنایا...... زندگی کو جو ہے اور جیسی ہے کی بنیاد پر گزارہ جائے تو وہ سہل رہتی ہے، امیدیں، توقعات، گمان...... زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔"

"مگر جب زندگی سے امید نکل جائے تو باقی کچھ نہیں رہتا۔ صرف اندھیرا...... امید زندگی کو روشن رکھتی ہے۔ امید پر تو دنیا قائم ہے۔"

"اوہو...... تم بہت خوش فہم ہو۔"

"ہاں...... مگر یہ آپ کی طرح مایوس و ناامید ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ہر دکھ کے اندر اِک سکھ کا بیج ضرور ہوتا ہے۔"

کبھی، کبھی ہم اپنی بلند ترجیحات کے سبب اپنی زندگی کو از خود مشکل بنا لیتے ہیں۔ اگرچہ زندگی سے میری بہت اعلیٰ و ارفع توقعات وابستہ نہ تھیں۔ ہاں مگر اِک کمی سی تھی۔ زندگی کی باگ ڈور اگر آفتاب جنید جیسے من پسند شخص کے ہاتھوں میں ہوتی تو شاید یہ زندگی میرے لیے زیادہ پسندیدہ اور قابل قبول رہتی۔

"بہت کچھ طے شدہ ہوتا ہے مگر سب کچھ نہیں، ورنہ دعا کا لفظ بے معنی رہتا...... کہیں کہیں قسمت بھی تو سوال کا انتظار کرتی ہے اور پھر مانگنا بھی تو آپ کا حق ہے ناں......"

"میں جانتی ہوں...... قدرت کے کارخانے میں کسی چیز کی کمی نہیں...... مگر زندگی میں ہمیشہ سب کچھ حسب منشا نہیں ملتا اور میرے لیے یہ بھی کم نہیں ہے کہ رب نے مجھے اپنی منشا کا تابعدار بنا کر ٹھہراؤ عطا کیا ہے۔"

"یعنی آپ رب پر یقین تو رکھتی ہیں مگر اس پر بھروسا نہیں کرتیں جس کے کُن پر ساری کائنات تخلیق ہوئی ہے۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں...... مگر میں اس سے مانگوں تو کیا مانگوں......؟ اپنے لیے بہتری کا فیصلہ......؟ تو اس کا ہر فیصلہ انسان کے لیے بہتر ہی تو ہوتا ہے۔ دل کی خواہش بیان کروں تو وہ بے خبر نہیں اور اگر رحم و کرم مانگوں تو وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر چاہنے والا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں...... اگر جب رب کی اعلیٰ ذات دو انسانوں کو جوڑتی ہے تو کسی معمولی سی چیز کو بھی جواز بنا دیتی ہے، دعا تو پھر بھی بہتر و اعلیٰ وسیلہ ہے۔" اس کی بات میرے دل کو لگی تھی......

آفتاب جنید کہاں تھے اور میں کہاں......؟ بس اِک اتفاقی ملاقات ہی تو جواز بن گئی تھی۔ اگر حقائق کی آنکھیں کھول کر جائزہ لیا جاتا تو ہم دونوں کے مابین زمین، آسمان کا فاصلہ تھا۔ میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہ شخص میرے لیے حاصلِ زیست ٹھہرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ تب مجھے محبت پر یقین ہی نہیں تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ میں نے محبت سے جڑا ہوا احساس کسی اور کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ جو ہر جذبے کا جائز حق دار ٹھہرتا...... شاید

تم ایسا کرنا

تم ایسا کرنا
کوئی جگنو، کوئی ستارہ سنبھال رکھنا
میرے اندھیرے کی فکر چھوڑو
بس اپنے گھر کا خیال رکھنا
ہماری آنکھوں نے جول کے دیکھے
وہ سارے سپنے سنبھال رکھنا
یہ جدائی اپنی تو عارضی ہے
نہ دل میں اس کا ملال رکھنا
تمہاری سانسیں تمہاری دھڑکن
سنو ہماری امانتیں ہیں
اے معصوم ہماری خاطر ہی
ہمیشہ تم بس اپنا خیال رکھنا

شاعرہ: عنبرین اقبال، گاؤں بدر مرجان

ایسے ہی وقتوں میں تقدیر انسان کو منہ چڑا جاتی...... وہ کہتا تھا...... زندگی میں کبھی، کبھی کچھ بہت ناخوشگوار ہوتا ہے مگر یہی زندگی کبھی ہمیں سرپرائز بھی دیتی ہے۔ میں زندگی سے مایوس نہ تھی مگر اپنی ذات کے حوالے سے خوش فہم بھی نہیں تھی۔ میں جانتی تھی آفتاب جنید مخلص مگر مجبور ہیں...... میں قسمت سے ناامید نہ تھی مگر اس محبت کے دل خوش کُن احساس سے دامن چھڑا لینا بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ زندگی کا احساس دلاتا، محبت کی لو دیتا جذبہ...... میں اس جذبے کو دل سے نوچ پھینکتی تو میری زندگی میں صرف جدوجہد رہ جاتی جو بالآخر انسان کو تھکا دیتی ہے...... میں تھکنا نہیں چاہتی تھی، جینا چاہتی تھی۔ میں نے کبھی آفتاب جنید سے شادی کے خواب آنکھوں میں نہ سجائے تھے مگر دل کسی اور کے لیے بھی تو آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

دل بھی اِک ضد پہ اُڑا ہے کب سے
بس وہی چاہیے، اس کے جیسا بھی نہیں

اسی رات شاہ زیب کا ایس ایم ایس آیا۔

''نصیب کے بعد قیمتی چیز دعا ہے کیونکہ جب زندگی میں سب کچھ بدل جائے تو انسان کے پاس صرف دعا بچتی ہے جو نصیب بدل دیتی ہے۔''

اور اس کی بات میرے دل میں کُھب گئی۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زندگی میں ایسا بھی بہت کچھ ہوتا ہے جو حیات کا دھارا پلٹ کر رکھ دیتا ہے، کبھی خوشگوار اور کبھی سنگین......

میرے دل پر منوں بوجھ آپڑا تھا۔ بے ساختہ نگاہوں میں وہ لمحات گھوم گئے جب میں نے یونہی اچانک اور غیر متوقع ابا کو کھو دیا تھا۔ اسی رات میں نے رب کے حضور ہاتھ پھیلا کے صدقِ دل سے اپنے حالاتِ زندگی بدل جانے کے لیے دعا کی تھی۔

وہ جو چلتے دریاؤں کا رخ بدل سکتا ہے، اس کے ہاں تو کچھ بھی ناممکن نہیں...... میں نے مدت بعد رب سے اپنے لیے کچھ مانگا تھا

پھر ایک نیا سلسلہ چل پڑا۔

شاہ زیب کے ایس ایم ایس تسلسل سے موصول ہونے لگے۔ اس کے ایس ایم ایس چٹپٹے کرارے ہوتے...... کبھی، کبھی وہ چھیڑتا۔

''آج تو چہرے پر گلاب بکھرا تھا، لگتا ہے بات یا ملاقات ہوئی تھی۔''

اب میں اسے کیا بتاتی...... ان کی مصروفیت کا دائرہ کار ربیٹی کے کالج میں فیس بھرنے جانا ہے، وقت ہی نہیں مل رہا...... ٹماٹر پھر مہنگے ہوگئے ہیں...... اس بار وکیشنز پر بیاہی بیٹی آنے والی ہے یا آج بیگم کے ماہانہ چیک اپ کے لیے ڈاکٹر آئے گا...... اور یہ کہ صرف ایک مارننگ میسج یا کبھی، کبھار کی ملاقات محبت نہیں...... محبت تو دل کا دل سے ربط ہے جو انسانوں کو جوڑ کر رکھتا ہے۔ میرے پاس علمی، ادبی ایس ایم ایس کی بہتات رہتی جو یقیناً اس کی سمجھ سے بالاتر رہتے، میں اس کے ایس ایم پڑھتی، ڈیلیٹ کر دیتی، وہ چڑتا، لڑتا، روٹھتا پھر خود ہی مان جاتا...... میں اس پر دماغ کھپاتی تو وہ ساتویں آسمان پر جا بیٹھتا۔

وہ انہی دنوں میں سے ایک دن تھا، جب اس نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے...... آپ کی آنکھوں میں اِک عجیب سا اضطراب ہے۔''

''اور مجھے لگتا ہے، تمہاری نظروں میں کچھ کھو دینے کا خوف ہے...یا شاید جستجو اور کھوج...... ہے ناں......'' میں نظریں چرا کر اُڑ گئی۔

''نہیں، نہ کھوج، نہ خوف...... البتہ تعاقب ضرور ہے، زندگی کا تعاقب......''

''زندگی کا تعاقب......؟''

''ہاں...... جو چیز دسترس سے دور ہو، تعاقب تو اسی کا کیا جاتا ہے ناں......''

''احمق......! زندگی تو کسی کی دسترس میں نہیں ہے۔''

''سچ ہے۔ مگر زندگی سے جُڑے حقائق انسان کو زندہ رکھتے ہیں۔ مجھے اس شخص پر رشک آتا ہے جو آپ کے دل میں بستا ہے، مجھے تو آپ کبھی بھولے بھٹکے ہی یاد کیا کرتی ہوں گی۔''

''اچھا، تو میں تمہیں بھولتی کب ہوں...... سچ تو یہ ہے کہ تمہاری عادت سی ہوتی جا رہی ہے۔''

اس کے لہجے میں غیر معمولی پن محسوس کر کے اس کے اندر کو کھینچ نکالنے کے لیے میں نے اسے اکسایا تھا اور وہ کھل گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تلاش کس کو کہتے ہیں مگر آپ تک آ کر میں اپنی منزل کا راستہ بھول جاتا ہوں، آپ نے کہا تھا ناں کہ محبت انسان سے نہیں، اس کی کوالیٹیز سے ہوتی ہے، مجھے اعتراف ہے کہ تم

ایک بھرپور زندگی ہو۔''

وہ یک دم 'تم' پر اتر آیا تو مجھے اس کا انداز چہرہ، لفظ سب اجنبی سے لگے۔

''مانوگی؟ میں نے ہر اس جگہ کو چوما ہے، جہاں تم نے قدم رکھا...... مجھے نہیں پتا، محبت کس کو کہتے ہیں مگر تم تک آ کر میری تکمیل ہوگئی ہے۔ سنو تم نے کہا تھا ناں جو محبت کا منکر وہ فطرت کا منکر ہے۔ مگر میں تم سے کیسے کہتا کہ تم میرے اندر اترتی جا رہی ہو۔'' میں نے سر اٹھا کر بے یقین نظروں سے اس اونچے پورے تنومند نوجوان کو دیکھا اور اگلے ہی پل کائنات کو چومتی سورج کی ابتدائی کرنوں نے میری آنکھیں چُندھیا دیں۔

''نہ جانے کیوں آج دل کہتا ہے...... تم سے سب کہہ دوں...... پھر نہ جانے زندگی وفا کرے نہ کرے...... سنو، جب پہلے میں تمہارے ہاتھ دیکھتا تو سوچتا تھا۔ نہ جانے یہ چھونے میں کیسے ہوں اور کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص جو انہیں چھو سکتا ہے پھر رفتہ، رفتہ مجھے لگنے لگا ان ہاتھوں میں کہیں میری تقدیر بھی چھپی ہے۔'' اس نے میرا لرزتا ہاتھ زور سے دبوچ لیا۔

''مگر تم تو مجھے بڑی کہتے ہو؟'' مجھے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''بڑی اس لیے کہتا تھا کہ تم بڑی ہو، ورنہ دلوں کے معاملے میں فاصلے کہاں دیکھے جاتے ہیں۔''

میری آنکھوں میں ابھرتے دن کی تمام دھند سمٹ آئی۔ ایک پل کو اپنے قدموں پر کھڑے رہنا دشوار ہوگیا تھا...... جیسے چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ میرے اندر کانچ بکھرتا چلا گیا...... اس نے دو قدم آگے بڑھ کر مجھے شانوں سے تھاما تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ انسانی زندگی کا دائرہ ایک نقطے سے شروع ہو کر سفر کرتا ہے پھر اسی نقطے پر

تمام ہوتا ہے۔ وہی نقطہ اس کے سفر کا حاصل ہوتا ہے، مجھے اعتراف ہے کہ تم وہی نقطہ ہو جو میری ابتدا پر ہے، میری زندگی کا سفر اسی سے شروع ہوتا ہے اور شاید اس پر میرا انت ہے۔''

میں نے اِک جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا اور وہ جیسے ان نظروں کے مفہوم کو پا گیا۔

''تم نے مجھ سے تعلق میں کھرے پن کا عہد لیا تھا، میں اس پر قائم ہوں...... میں نے تم کو چاہا ضرور ہے مگر پانے کی تمنا نہیں رکھی...... تمہاری چاہت کو کسی مقدس امانت کی طرح سنبھال کر رکھا...... تم میرے لیے اس چاند کی طرح ہو جو لائقِ تعریف تو ہے مگر دسترس سے دور...... تم مجھ سے دور رہو، بے شک مجھے نہ چاہو مگر یہ ممکن نہیں کہ تم میرے اندر سے نکل جاؤ، میری زندگی......''

مگر اب میں اِک لفظ سننے کی روادار نہ تھی...... میں پلٹی اور پارک سے باہر جانے والے رستے کی طرف دوڑ لگا دی...... وہ پکارتا رہا...... میں دوڑتی چلی گئی۔

پھر ہمارے تعلق میں واقعی دراڑ پڑ گئی۔ میں پارک کو جانے والا رستہ بھول گئی۔ اپنے عہد پر قائم ہی نہ رہ سکی۔ اس نے کئی ایس ایم ایس کیے جیسے......

''سانس اور ساتھ ٹوٹنے کے لیے ہی بنے ہیں...... فرق صرف اتنا ہے کہ سانس ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرتا ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے بار بار......''

اور جانے کیا کیا کچھ...... مگر میں نے رابطہ نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ میسج بیپ ہوتی میں نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی...... اس نے کالز کیں...... میں نے ریسیو ہی نہیں کیں...... دوستی پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا تھا۔ مجھے سب سے بڑھ کر اپنی بے خبری پر غصہ تھا۔

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

☆☆☆

کبھی، کبھی سالوں پر محیط کہانی صرف چند سطروں میں سمٹ آتی، بالکل اسی طرح ''وہ'' مجھے مل گیا تھا۔ ایک دم اچانک اور غیر متوقع...... بات چھوٹی سی تھی مگر میری ساری حیات کا رخ پلٹ گئی۔ شاہ زیب نے ایک بار کہا تھا۔

''زندگی میں ایسا بھی بہت کچھ ہوتا ہے جو ساری حیات کا دھارا پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔''

اور اس کا کہا یوں کھٹ سے پورا ہوا...... جیسے کسی مقبول گھڑی میں مانگی گئی دعا...... جب آفتاب جنید انصاری نے میرے سامنے خم ہو کے مجھے پرپوز کیا تو میں دنگ رہ گئی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ بیگم کی اچانک وفات کے سبب منتشر تھے گویا اچانک ہی ان کی ساری حیات بکھر گئی اور یہ انہونی نہیں تو اور کیا کہلاتی کہ ان کی اولاد نے از خود انہیں دوسری شادی کا عندیہ دیا تھا۔

میرے تخیل میں اِک سراپا لہرایا جو کہتا تھا زندگی کبھی، کبھی ہمیں سرپرائز بھی تو کرتی ہے۔

کتنا عرصہ ہوا...... شاہ زیب کو دیکھے مگر ربط جیسے ٹوٹ کر بھی نہ ٹوٹا تھا۔ کبھی، کبھی وہ اچانک ہی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا اور پوچھتا...... ''جو کبھی آپ کہیں کھو گئیں تو کہاں ڈھونڈوں گا آپ کو......''

اور میں کبھی اس کے لفظوں کا مفہوم ہی نہ پا سکی، کبھی جو بھولے بھٹکے واک کو چلی جاتی تو لگتا کوئی ساتھ، ساتھ سفر کر رہا ہے۔

''خدا جانے اب کہاں اور کس حال میں ہوگا؟'' ذہن و دل میں ایک سوال ابھر رہا تھا اور میں نے سختی سے آنکھیں موند کر سر جھٹک دیا۔

نکاح بہت سادگی سے ہوا۔ مانو زمیں، آسمان کا فاصلہ چند دنوں میں سمٹ گیا۔ ان چند دنوں میں سارے جہاں کی خوشیاں میری جھولی میں آن گری تھیں...... اور میں نے جانا کہ چاہت کو پا لینے کا خمار چاہے جانے سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم ہنی

مون ٹرپ پر شمالی علاقوں کی سیر کو گئے تو بچوں نے فون کر کر کے کان کھا لیے...... آفتاب کی دونوں بیٹیوں کی شادی طے تھی...... بیٹا لندن فلائی کے لیے تیار تھا...... پھر بڑی بیٹی وکیشنز گزارنے بچوں سمیت آ گئی تو ہمیں کشتم پشتم لوٹنا پڑا۔ میری جان اماں اور عاطی میں اٹکی تھی۔ تو عاطی بھی میرے بِنا ایک پل نہ رہتا تھا اور اسے سنبھالنا اماں کے بس کا کہاں تھا۔ آفتاب نے دو فلیٹ ایک ساتھ بک کروائے تھے...... ایک ہمارے لیے اور دوسرا اماں اور عاطی کے لیے...... تاکہ میں قریب رہ کر ان کا خیال رکھ سکوں...... شادی کے لیے میری یہی شرط تھی...... سارے معاملات یوں سنور گئے تھے جیسے کوئی الجھی ہوئی گتھی سلجھتی چلی جائے۔ مجھے نہ صرف دعاؤں کی قبولیت بلکہ اس بات پر بھی یقین آ گیا کہ زندگی کبھی، کبھی ہمیں... سرپرائز بھی دیتی ہے۔ جانے کتنے دن گزر گئے۔

میں اس روز صبح کالج جانے سے پہلے کسی کام کے تحت اپنے پرانے گھر گئی تھی۔ واپسی میں پارک کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ساختہ مجھے شاہ زیب کی یاد نے گھیرا۔ میں نے آنکھیں موند کر ایک لمحے کو اس کا پتا زیرِ لب دُہرایا...... بلاک 8 بی 44 اور گاڑی بلاک 8 کی طرف موڑ لی۔ وہ پہلی ہی گلی کا کارنر والا بنگلا تھا۔ جس کے سامنے سے ایک تنو مند لڑکا ٹریک سوٹ میں ملبوس اچھلتا، کودتا جاگنگ کرتا گزر رہا تھا۔

''شاہ زیب......'' میں نے گاڑی روک کر بے اختیار اسے پکارا تھا اور کسی احساس کے تحت باہر نکل آئی۔ اچھلتا، کودتا لڑکا ٹھٹک کر مڑا پھر میرے قریب آیا تو جیسے ہر احساس پر اوس پڑ گئی۔ وہ کوئی اور تھا، گورا چٹا، لمبا تڑنگا سانولا عمر لڑکا۔

''آئی ایم زین...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''شاہ زیب......'' میں نے کارنر والے بنگلے کی جانب اشارہ کیا۔

''اوہ! یس...... وہ میرا بہترین دوست تھا مگر کئی ماہ پہلے سب کچھ بیچ کر یہ لوگ لندن چلے گئے تھے۔ شاہ زیب کے علاج کی خاطر...... وہ جاتے ہوئے بہت پُرامید تھا۔ مجھ سے جلد لوٹ آنے کا وعدہ بھی کیا تھا...... افسوس اس کی زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میرے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔

''وہاٹ! دماغ درست ہے تمہارا...... اس طرح اچانک کوئی کیسے......؟''

''آپ نہیں جانتیں، عرصے سے وہ خون کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا تھا۔ اس کی زندگی تو بڑی مشروط تھی۔'' اس نے جیسے میری لاعلمی پر ملامت کی اور پلٹ گیا۔

''میں جانتا تھا، میں اس کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔''

''زندگی کی لاسٹ انگ......''

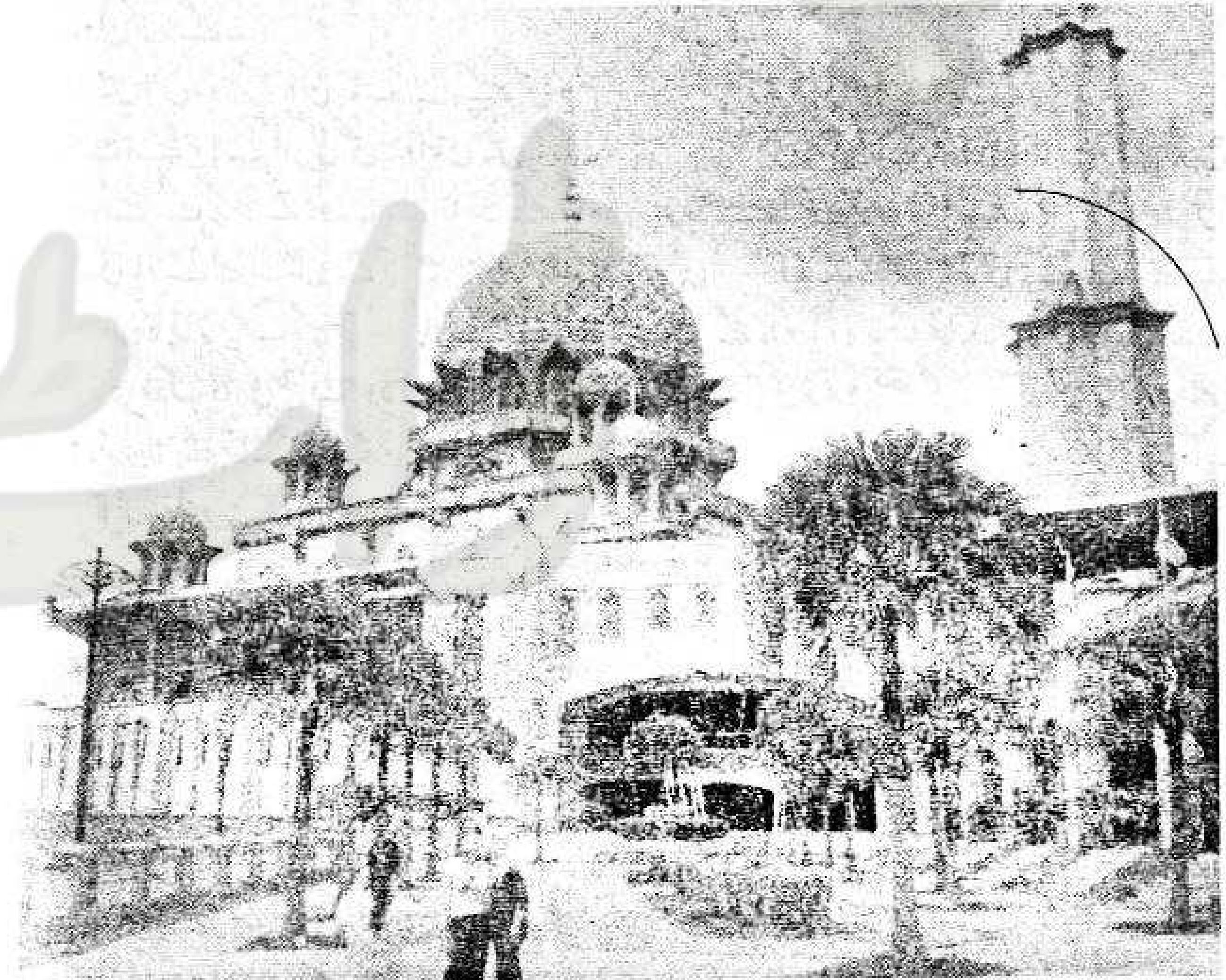
''کبھی، کبھی جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو اسی طرح ہو جاتا ہے۔ خود بخود...... اچانک غیر متوقع اور بس یونہی......'' ایک کے بعد ایک کئی تانے بانے جُڑتے چلے گئے۔ گویا وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی محدود ہے۔ اس کی زندگی مختصر تھی۔ یہ وہ بھی جانتا تھا پھر بھی اپنے لفظوں میں امید کو مرنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے زندگی سے کوئی لمبی چوڑی امید نہیں باندھی تھی مگر رب نے مجھے نواز دیا۔ میری محبت کو یک دم اور غیر متوقع کنارہ مل گیا...... اس کی زندگی اس سے وفا نہ کر سکی...... شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زندگی میں کبھی، کبھی کچھ گمان سے ہٹ کر بھی ہوتا ہے۔ بس یونہی...... اچانک اور غیر متوقع...... کبھی خوشگوار اور کبھی......؟

میں تھکے، تھکے قدموں سے پلٹ آئی۔

ملائیشیا یہ تو نے کیا کیا! (1)

عظمیٰ آفاق سعید

یہاں پر D-5 سینما بھی تھا۔ جس پر واٹر سلائڈ کے اوپر ہی ایک دس منٹ کی مووی کا بھی انتظام تھا۔ پہلی دفعہ D-5 واٹر پلس دیکھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم مووی کے اندر ہی ہیں۔ اگر کوئی پانی میں گرتا ہے تو لگتا ہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ پانی میں گرے۔ D-5 سینما کو دیکھنے کے لیے خاص چشمے دیے گئے تھے۔ جن کو پہن کر اسے دیکھا گیا۔ اس سینما میں کچھ ایسا انتظام بھی تھا کہ اگر کہیں پانی اچھل رہا تھا (مووی میں)



تو وہ سینما میں بیٹھے لوگوں کے اوپر بھی کہیں سے آرہا تھا اگر گاڑی مڑ رہی تھی تو سینما میں بیٹھے ہماری سیٹیں بھی اُسی رخ پر مڑ رہی تھیں جیسے ہم بھی گاڑی میں بیٹھے ہوں۔ بہت ہی مزے دار اور حیران کُن تجربے ہورہے تھے۔ (ویسے اب 3D اور 5D ٹیکنالوجی ہمارے یہاں بھی کافی حد تک متعارف ہوچکی ہے)

دس منٹ کے اس فلمی سفر میں اتنا مزہ آیا کہ اب تک کی ہونے والی تمام تھکن دور ہوگئی تھی۔ واپسی پر آتے وقت سینما کے اسٹاف نے چشمے واپس لے لیے جو فلم دیکھنے کے دوران دیے گئے تھے۔ ہمارے دو بچوں نے تو وہ بھی واپس نہیں کیے واپس ہوٹل لے آئے اور پھر بچوں کو کیا، کیا کہا گیا وہ لکھا نہیں جاسکتا۔

بچوں نے تو شاید دو تین دفعہ اس مووی والے سیشن کو دیکھا تھا مگر ان کا دل بھرنے کا نام نہیں لے رہا تھا...... ہاں میں ذکر کررہی تھی پارک کا۔

شام چھ بجے یہ پارک بند ہوجاتا ہے چاہے قیامت آجائے، چھ بجے کا مطلب چھ بجے ہوتا ہے کم نہ زیادہ۔ جو، جو لوگ پُول میں تھے وہاں کے اسٹاف نے سیٹیاں بجا، بجا کر انہیں نکالنا شروع کردیا تھا۔ پارک میں مصنوعی بارشیں، جھرنے، پانی کی آبشاریں، سلائڈز اور سوئمنگ پولز میں چلنے والی مصنوعی لہریں وغیرہ سب بند کرنی شروع کردی گئی تھیں۔

کسی بچے کا نکلنے کا کوئی موڈ نہیں تھا خیر وہاں سے نکل کر دوسری بلڈنگ میں آئس اسکیٹنگ (برفیلی زمین پر پہیے والے جوتے پہن کر چلتے ہیں) ہورہی تھی۔ سب لوگ وہاں جانے پر بضد ہوگئے۔

''ارے تم لوگ تھکے نہیں، پہلے کچھ کھاپی لو، پھر دیکھیں گے......!'' صائمہ بچوں کو کنٹرول کررہی تھی۔

''مامی، جلدی کریں کیونکہ تھوڑی دیر بعد وہ بھی بند ہوجائے گا، اب یہاں تک آئے ہیں تو اسکیٹنگ تو کرنی چاہیے ناں۔'' ڈولی سب بچوں کے دل کی باتیں کررہی تھی۔

خیر جی، کھاپی کر وہاں دوڑے، یہ ایک طرح کا شاپنگ سینٹر تھا۔ جس کے ایک حصے میں آئس اسکیٹنگ ہورہی تھی جبکہ دو تین منزلہ اس شاپنگ سینٹر میں مہنگی ترین دکانیں گاہکوں سے پٹی پڑی تھیں۔

مجھے ٹوئن ٹاور کا سووینیئر نظر آیا۔ پتا کیا تو اپنے پاکستانی کافی پیسے پڑتے خیر، اگر یہ ہی کرتے رہتے تو شاید وہاں کھانا بھی مشکل ہوجاتا۔ تھوڑی دیر دکانوں کا جائزہ لے کر واپس آئے تو صائمہ اور نایاب اپنے سامان کا بیگ ہمیں دے کر دکانیں دیکھنے چلے گئے اور میں اور آفاق بچوں کی مووی بنانے لگے۔ جو اسکیٹنگ کرنے میں مصروف تھے۔ کسوئی بار، بار گر رہی تھی مگر باز پھر بھی نہیں آرہی تھی۔

ملاکا تجھے ہوا کیا؟

چونکہ اب سفر آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی لیے ہماری اگلی منزل ملاکا تھی۔ ملاکا ایک ایسی لوکیشن سمجھیں کہ جس سے آگے ہمارے دو بہترین اسپاٹ آنے تھے۔ جن میں ایک عفاموئی اور دوسرا جینگ تھا۔ عفاموئی میں چونکہ رہائش کافی مہنگی ہے۔ اس لیے ہر چیز کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ رکا ملاکا میں جائے پھر وہاں سے گھومنے کے لیے نکلا جائے۔

ندیم بھائی نے اپنے ہوٹل سے ہی ہمارے لیے لیموزین کرائے پر لے لی۔ یہاں پر لیموزین کاریں بھی ٹیکسیوں کے لیے چلتی ہیں۔ چونکہ ہم تیرہ لوگ تھے۔ چھوٹے بڑے ملا کر، اسی لیے یہ کرائے پر لی گئی کہ بڑی گاڑی ہے۔ دو گاڑیوں کے جھنجٹ سے نجات ہوگی۔ سارا سامان اسی لیموزین پر لادا گیا اور اگلے سفر کا رختِ سفر باندھا گیا۔

چنئی بھارت سے تعلق رکھنے والا ہمارا ٹیکسی ڈرائیور جس کا نام کارتک تھا۔ شاید دور پرے کا اداکار رہرتھک کا رشتے دار ہو (نام جو مل رہا تھا)۔ اپنی ٹیکسی میں تامل گانے لگایا ہوا تھا۔

ملائشیا کی سب سے اچھی بات جو مجھے لگی۔ وہ یہ

تھی کہ انگلش بولنا کسی کو بھی اچھی نہیں آتی ہے۔ یہی حال اس ڈرائیور کا بھی تھا۔ وہ ہماری ساری باتوں کا جواب یس، اوکے اور نو منی میں دے رہا تھا۔ ہم بھی ایک نیک دل افسر کی طرح اس کا دل بڑا کرنے کی خاطر اس کی بات کافی خوش دلی سے سن رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ انگلش ہماری زیادہ بری تھی کہ وہ اپنی اچھی انگلش ہمارے سامنے ضائع نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

''شاید ہمیں فقیر سمجھ رہا ہے تبھی تو بار بار نو منی نو منی کہہ رہا ہے۔'' اجیہ آہستگی سے مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا ہے ناں...... ! پیسے کم لے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

کوالالمپور سے ملاکا تک کا راستہ تقریباً چار سے پانچ گھنٹے کا تھا۔ راستے کے دونوں طرف ہریالی، اونچے اونچے درخت، سبزہ اور صفائی ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔

وہ کہتے ہیں ناں کہ نیت صاف منزل آسان۔ اس گورنمنٹ کی نیت میں ایمانداری، سچائی اور اپنے ملک کے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہے تبھی تو سب لوگ ایک سسٹم میں بندھے ہوئے ہیں۔ کسی کی ہمت نہیں ہے کہ ایک ٹیکسی میں پانچ سے زیادہ مسافر بٹھا سکے۔ کسی کی جرأت نہیں ہے کہ سگنل توڑ دے، کوئی یہ سوچ نہیں سکتا کہ روڈ پر چلتے ہوئے تھوک دے یا کچرا پھینک تو دے۔ یہ پاکستان سے صرف چھ سے سات گھنٹے فلائٹ کی دوری پر ہے۔ جو چیزیں یہاں ہو رہی ہیں کیا ہمارے پاکستان میں نہیں ہو سکتیں؟ کیا ہمارے ملک کے حکمران جو بین الاقوامی دورے کرتے ہیں۔ کیا وہ کچھ نہیں سیکھتے؟ کیا انہیں کسی ملک کی اچھی چیزیں اپنے ملک میں لانے کی کوئی چاہ نہیں ہوتی؟ کیا ہمارا ملک پاکستان بھی ترقی یافتہ، قانون کا پابند اور امن پسند ملک نہیں بن سکتا؟ ایسے کئی سوال میرے ذہن میں اٹھتے تھے۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں کی خوب صورتی سمیٹوں اور واپس پاکستان جا کر سجا دوں...... یہاں کا امن، خوشحالی، نظم و ضبط، قانون، سکون سب چوری کر لوں اور اپنے ملک پاکستان میں جا کر یہ ساری چیزیں جو ہمارے یہاں ناپید ہو چکی ہیں قید کر دوں اور ایک تالا لگا کر اس کی چابی اس برمودا ٹرائی اینگل میں پھینک دوں کہ جو اسے لینے جائے وہ بھی غرق ہو جائے...... اور میرا ملک ایسا خوب صورت اور ترقی یافتہ ہو جائے کہ دنیا بھر کے سیاح یہاں آیا کریں۔ (آمین)

ہاں تو بات ہو رہی تھی...... ملائشیا کے ایک مقام ملاکا کی۔ ملاکا میں گھر، کمرے اور گیسٹ ہاؤسز دنوں کے حساب سے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں کافی اچھا دو بیڈ رومز کا پورا فرنشڈ گھر کرائے پر ملا تھا جو ہمارے ٹیکسی ڈرائیور بھائی نے دلوایا تھا۔ ضرور ان لوگوں کا بھی کمیشن ہوتا ہوگا۔ (یہ میرا اپنا خیال ہے)

پہنچتے، پہنچتے ہمیں شام ہو گئی تھی اور بھوک بھی اپنے عروج پر تھی۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد پروگرام بنایا گیا کہ اب تو رات ہو رہی ہے۔ ابھی ذرا نزدیک کے ہی کسی پارک گھومنے کے لیے چلا جائے۔

کہنے کو تو وہ ملاکا کا ایک عام سا پارک تھا مگر بوٹنگ وہاں ہو رہی تھی۔ ریل وہاں چل رہی تھی۔ بھوت بنگلا وہاں بنا ہوا تھا۔ بچوں کے لیے چارج والی بائیک وہاں تھیں۔ یعنی پورا تفریح کا سامان تھا۔ ایک ٹرک کو اس پارک انتظامیہ نے 6-D Plex کی شکل (یعنی منی سینما کی) دے رکھی تھی۔ اس کے اندر ایک ڈراؤنی مووی دکھائی جا رہی تھی۔ وہ بھی دیکھنے بیٹھے۔

سب چیزوں سے کھیل کود کر آخر میں، میں نے اور صائمہ نے کہا کہ اب گھر کی طرف چلیں بہت تھک گئے ہیں۔ آج معاف کر دو۔ کل تک ہمیں بھی چارج ہونے کا ٹائم دو۔ تب کہیں جا کر یہ بچے مانے، نیہا، اشعر، منال تو انجوائے کر ہی رہے تھے۔ صائمہ کا سب

سے چھوٹا بیٹا ارحم جو صرف دو سال کا تھا وہ تو ان سب کا ابا تھا۔ وہ ضد کرتا تھا کہ ابھی اور کھیلنا ہے واپس نہیں جانا۔

عفا موسیٰ کی باری

صبح ہوتے ہی بچوں نے دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا کہ جلدی کریں عفا موسیٰ جانا ہے۔ صبح کے ناشتے کا انتظام رات ہی کو کر لیا گیا تھا۔ چونکہ ہم ایک گھر میں رکے تھے اسی لیے یہاں کچن، فریج وغیرہ ہر طرح کی گھریلو سہولت موجود تھی۔

ملاکا سے عفا موسیٰ کا راستہ تقریباً آدھے گھنٹے کا تھا۔ اللہ کا نام لے کر تیاری شروع کی گئی۔ بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں کپڑے اور پانی وغیرہ کا ایک اٹیچی نما بیگ تیار کیا گیا۔ حسبِ ضرورت دو ٹیکسیاں کرائے پر لی گئیں اور ہم سب لوگ عفا موسیٰ پہنچ گئے۔

یہ ایک ریزورٹ ہے۔ ایک بہت بڑے رقبے پر ایک شہر سا آباد کیا گیا ہے جو تفریح سے بھرپور ہے۔ اس جگہ کے تین حصے ہیں واٹر پارک، وائلڈ پارک اور...... کاؤبوائے ٹاؤن۔ جیسے ہی ہم عفا موسیٰ کے انٹری گیٹ پر پہنچے دو چار ہاتھی کھڑے تھے۔ سارے ٹورسٹ ان کے ساتھ کھڑے ہو، ہو کر تصویریں کھنچوا رہے تھے ہم اور ہمارے خاندان کے بچے کیسے پیچھے رہ جاتے۔ تصویر تو تصویر بچوں نے ہاتھی والے سے گنّے کے ٹکڑے بھی خرید کر ہاتھی کو کھلانا شروع کر دیے تھے۔

''ارے بس بھی کرو۔ کیا پیٹ خراب کرو گے ہاتھی کا۔'' جب ہزار روپے کا گنا ہاتھی کو کھلا دیا گیا تو میں نے بچوں کو ڈانتے ہوئے کہا۔

''اب اندر تو چلو یا اسی ہاتھی سے کھیل کر واپس گھر جانا ہے۔'' میں نے بچوں کو کہا تو ہاتھی کی جان چھوٹی۔

جیسے ہر جگہ کا انٹری ٹکٹ ہوتا ہے۔ سو یہاں کا بھی تھا۔ بڑوں کا پورا اور پانچ سال سے چھوٹے بچوں کا آدھا...... ٹکٹ لینے کی جگہ پر ایک ناپنے والا بورڈ لگا تھا۔ جو اس بورڈ سے لمبا تھا اس کا پورا ٹکٹ اور جو چھوٹا تھا اس کا آدھا۔ میں نے اور صائمہ نے بچوں کو کافی اشارے کیے کہ چھوٹا بن کر کھڑے ہو جائیں مگر وہ بچے ہی کیا جو وقت پر اشارے سمجھ جائیں اور اچک، اچک کر کھڑے ہو کر دکھا رہے تھے۔ پتا پتا بوٹے بوٹے کا پورا ٹکٹ لگا۔

خیر جناب سب لوگوں کی کلائیوں میں انٹری بینڈ پہنا کر اندر داخل ہونے کی اجازت ملتی رہی۔

اندر ایک طرف واٹر سلائڈ تھی اور دوسری طرف وائلڈ سفاری یعنی جانوروں کا زُو۔ یہاں ہاتھیوں کا شو بھی ہونا تھا۔ ٹائم دیکھ کر پہلے یہ طے ہوا کہ واٹر سلائڈ پر جایا جائے۔

یہاں جگہ، جگہ پر صاف ستھرے چینجنگ رومز، لاکرز وغیرہ سے موجود ہیں۔ اس ٹکٹ میں دوپہر کا کھانا بھی شامل تھا۔ بچوں کا پول الگ تھا اور بڑوں کی الگ، ایسی واٹر سلائڈز تھیں کہ چھ منزلہ چڑھ کر جانا ہوتا تھا پھر ایک ٹیوب میں بیٹھ کر سلائڈ کرتے ہوئے نیچے آنا ہوتا ہے۔ کہیں پر مصنوعی بارشیں ہو رہی ہیں۔ کسی حصے میں اونچے سے پائپ پر ایک دیو جیسی لکڑی کی بالٹی لٹک رہی ہے جس میں جگہ، جگہ سے پانی آ کر جمع ہو رہا ہے۔ جب وہ پوری بھر جاتی ہے تو یک دم الٹی ہو جاتی ہے۔ جب وہ الٹی ہونے والی ہوتی ہے تو لوگ بھاگ، بھاگ کر اس جگہ جمع ہونے لگتے ہیں اور جیسے ہی وہ الٹتی ہے کئی ٹینکر پانی لوگوں کے اوپر گرتا ہے۔ شور شرابا مچ جاتا ہے۔ کسی حصے میں مصنوعی سمندر بنایا ہوا ہے۔ جس میں مصنوعی لہریں بن رہی ہیں۔ کوئی ٹیوب میں بیٹھا ان لہروں کے ہچکولوں کے مزے لے رہا ہے۔ تو کوئی ماہر تیراک کی طرح ان کا تیر کر مقابلہ کر رہا ہے۔ یہاں ہر قومیت کے لوگ ہر انداز میں دکھائی دیں گے۔ کہیں امریکن دو کپڑوں میں نظر آئیں گی تو کوئی عربی مسلمان عورت سر پر اسکارف سمیت بھی دکھائی دے گی کافی دیر پانی میں کھیلنے کے بعد بھی بچے کسی صورت باہر آنے کو تیار نہیں تھے۔

''بھئی بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کھانا کھا لیا

جائے تاکہ آگے بھی جائیں۔'' میں نے صائمہ اور نایاب سے کہا۔

سب لوگ کھانے کے بعد وائلڈ زو دیکھنے چلے گئے جہاں ایک بڑے سے ایریا میں کافی جانور ایسے ہی کھلے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ بذریعہ بس اس پورے ایریا کا چکر لگوایا جاتا ہے۔ جہاں جانوروں کی مخصوص جگہیں آتی ہیں وہاں پانچ دس منٹوں کے لیے بس کو روک کر تصویریں بنانے کے لیے ٹائم دیا جاتا ہے۔ مگر کسی کو بھی اترنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کوئی اتر بھی نہیں سکتا کیونکہ چلنے سے پہلے بس کو باہر سے تالا لگا دیا جاتا ہے اور بتا دیا جاتا ہے کہ ہم یہ سب کی سلامتی کے لیے کر رہے ہیں۔

بچوں نے خوب شیروں کی ہاتھیوں اور زرافوں کی تصویریں کھینچیں۔ یہ پورا بس کا ٹرپ آدھے گھنٹے کا ہوتا ہے۔ وہاں سے آئے ہی تھے کہ ہاتھیوں کا شو شروع ہو چکا تھا۔ جس کا بچے آتے ہی انتظار کر رہے تھے۔ خیر اس جگہ جا کر بیٹھے کچھ ہاتھی پینٹنگ کر رہے تھے اور کچھ رقص کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پانچ چھ ہاتھی ایک ہی انداز میں دو پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ کبھی کوئی بالٹی سے پانی لے کر اپنی سونڈ سے لوگوں کے اوپر پھینک رہا تھا۔ ہاتھی اپنے کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ بچے اس شو سے بڑے محظوظ ہو رہے تھے۔ آخر میں ہاتھی کی کی ہوئی پینٹنگ بک رہی تھی۔ جو زیادہ بولی لگا رہا تھا اس کی پینٹنگ ہو جاتی۔

''ارے بھئی علی۔ پینٹنگ لینی ہے؟'' آفاق علی سے پوچھ رہے تھے۔

''پاپا، یہ بھی تو ہاتھی ہی کی طرح پینٹنگ کرتا ہے۔ اپنی ہی پینٹنگ کو فریم کروا کر رکھ لے گا اور کہے گا کہ ہاتھی کی ہے۔'' ایمان اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ہاں۔ خود تو بڑا پکاسو کی اولاد ہے ناں۔'' اب علی غصے میں آ گیا تھا۔

''چلو، چلو بدتمیزی نہیں کرو۔ آگے دیکھو کیا ہے۔ شاید فورڈی سینما لگ رہا ہے۔'' میں بچوں کی توجہ دوسری طرف لگاتے ہوئے بولی۔

سارا دن کیسے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔ ابھی ایک جگہ باقی تھی اس ریزورٹ کی اور وہ تھا.... کاؤبوائے ٹاؤن۔

''اب یہاں کیا ہوگا؟'' آفاق بچوں سے پوچھ رہے تھے مگر نظریں ڈولی پر تھیں۔

''ارے ماموں چلیں تو۔ بتانے سے مزہ نہیں آئے گا۔'' ڈولی آفاق کو بتا رہی تھی۔

یہ ٹاؤن ذرا فاصلے پر تھا۔ پیدل جانا کافی مشکل تھا مگر ریزورٹ کی طرف سے یہاں بس سروس تھی۔ بس آپ کو مطلوبہ ٹاؤن پہنچا دیتی ہے اور واپسی پر یہیں پر لا کر اتار بھی دیتی ہے۔

شام کو سات بجے ہم سب لوگ کاؤبوائے ٹاؤن پہنچ چکے تھے۔ یہاں اندر جانے کا پھر ٹکٹ تھا۔ پیسے بنانے کا ذریعہ یہاں پر تفریح کو بنا لیا گیا ہے۔ اچھی اور صاف ستھری تفریح کے لیے لوگ خوشی خوشی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی بھی ہیں۔ یہاں پر مختلف چھوٹے بڑے جھولے، گیمز اور ہوٹلز ہیں جو رات آٹھ بجے شروع ہوتے ہیں۔ رات نو بجے کے قریب اس جگہ کی خاص چیز جو ریڈ انڈین شو اور جانوروں کا میوزیکل شو ہے، وہ ہوتا ہے۔ کافی دیر گھوم پھر کر بچوں نے یہ پتا کر لیا کہ جھولے کیسے اسٹارٹ ہوں گے۔ چونکہ ٹائم گزر نہیں رہا تھا۔ ہمارے پیارے بچوں نے کچھ بٹن وغیرہ دبا کر جھولے اسٹارٹ کر لیے۔ اب ایک بیٹھ رہا تھا اور دوسرا اسے اسٹارٹ کر رہا تھا۔ یعنی خود ہی انٹرٹین ہونا تو کوئی ہمارے بچوں سے سیکھے۔

یہاں کی اصل چیز وہ دو شوز ہیں جو تھوڑی ہی دیر میں اسٹارٹ ہونے والے تھے۔ سب لوگ ایک روڈ کے دونوں اطراف بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور روڈ کے آخری سرے کے بند دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور ریڈ انڈین پوری فوج کی

طرح نکل کر بھاگتے ہوئے باہر کی طرف آئے۔ تیز میوزک، لائٹ کا کھلنا بند ہونا ایک سماں سا بندھ رہا تھا۔ ایک لڑکا اور لڑکی مسلسل کمنٹری کر رہے تھے اور ان کے بارے میں بتا رہے تھے۔ مجھے تو یہ ریڈ انڈین اپنے لیاری والوں کی طرح لگے۔ کیونکہ سب سے پہلے تو انہوں نے شیدی ڈانس دکھایا پھر پیٹرول منہ میں لے کر آگ کے شعلے دہکائے۔ جیسے یہ سب تو ہمارے لیاری والے کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے تو اتنے تیز ہیں کہ سامنے والے کو کہیں گے تو آگ بھی لگا دیں گے۔ سوچ کر حیرت ہوئی کہ یہاں ملائشیا میں لوگ ان کی اتنی زیادہ قدر کر رہے ہیں۔ انہیں دنیا کے آگے اپنی ثقافت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ تو ہم اپنے لوگوں پر فخر کرنا کب شروع کریں گے؟ ہمارے ہاں تو اس سے بھی بڑے فنکار ہیں اور شیدی ڈانس دنیا بھر میں معروف ہو سکتا ہے مگر کوئی اپنے فنکاروں کو پروموٹ تو کرے...... ہمارے لیاری کی قدر تو کرے۔

ہمارے لیاری میں تو اتنا ٹیلنٹ ہے کہ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہاں کے بچوں کو ذرا سی ٹریننگ دے دی جائے تو فٹ بال کے میسی اور رونالڈو ہمیں اپنے ملک سے ہی مل جائیں۔ اتنا اچھا کھیلتے ہیں لیاری کے بچے فٹبال' اسٹریٹ چلڈرن فٹبال ٹیم کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے۔ (ماشاء اللہ ہمیں واقعی فخر ہے)

خیر بات ہو رہی تھی شو کی...... جو اب ختم ہونے والا تھا۔ تھوڑی دیر کی بریک ہوئی جس میں مختلف اسٹال والے اپنی چیزیں بیچنے کے لیے آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد اسی بند دروازے سے میوزک شروع ہوا اور اچانک دروازہ کھلتے ہی مرغیاں جو سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ ایسی صحت مند ماشاء اللہ کہ انہیں دیکھتے ہی پیار آ رہا تھا۔ مرغیوں کے بعد بھیڑیں، گھوڑے، ناچتے ہوئے ہاتھی، اڑتے ہوئے کبوتر، سرکس کے کردار اور نہ جانے کیا، کیا میوزک اور کمنٹری کے ساتھ سامنے سے گزر رہے تھے۔ لوگ انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کوئی تصویریں بنا رہا تھا۔ پھر پرانی گاڑیاں ایک کے بعد ایک آنی شروع ہوئیں جسے وہ لوگ تاریخی کہہ رہے تھے کہ دنیا میں شاید کم ہی رہ گئی ہیں۔ حالانکہ ایسی گاڑیاں جو ہم نے دیکھیں ایک ہمارے رشتے کے ماموں کے ہاں ہے۔ آفاق کی چچی کے ہاں تھیں پھر ان لوگوں نے ایسا کیوں کہا کہ یہ گاڑیاں اب ہوتی نہیں ہیں۔ یہاں پر ان ملائشین کی معلومات دھوکا دے گئی؟ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ پاکستان میں ایک سے ایک چیز موجود ہے۔ بس ہمیں غرور نہیں کیا۔

اس شو کے بعد شاندار آتش بازی کا مظاہرہ کیا ہوا۔ جو اپنے میں ہی ایک مثال تھا۔ شو میں بیٹھے ہر ٹورسٹ کا شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔ لوگوں کو بھی مختلف جو گیمز ہو رہے تھے ان کا حصہ بنایا جا رہا تھا۔ ہر آدمی اپنے آپ کو خاص تصور کر رہا تھا۔ کافی دیر جاری رہنے والا شو جب ختم ہوا تو واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن دوسرے دن ہم جینٹنگ جا رہے تھے۔ اسی لیے جلدی، جلدی اپنے ہوٹل نما گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

جینٹنگ ہائی لینڈ، میں آئی!

کراچی سے ملائشیا آتے وقت وہ لوگ جو پہلے بھی یہاں کا سفر کر چکے تھے۔ سب نے کہا تھا کہ جینٹنگ ہائی لینڈ ضرور جانا۔ وہاں بہت مزہ آئے گا۔ جھولے ہوں گے' پارک ہیں کافی گھومنے پھرنے کی جگہیں ہیں۔

''کوئی خاص بات یا کوئی خاص چیزیں جو وہاں کے لیے ضروری لے جانا ہو؟'' میں نے ان آنٹی سے پوچھا جو ہمیں کسی ماہر پروفیسر کی طرح وہاں کی خصوصیات اور باتیں سمجھا رہی تھیں۔

''نہیں نہیں کوئی خاص چیزیں نہیں بھئی، گھومنے پھرنے کے لیے زیادہ سامان لادنا نہیں چاہیے۔ جتنا ہلکا سے ہلکا ہو اتنا اچھا ہے۔'' آنٹی نے یقین دلانے کے لیے جو ڈائیلاگ بولنے ہوتے ہیں بول دیے۔

اس لیے میں نے جو ہو کے میں سامان بھر لیا تھا وہ

سب نکال دیا اور سوٹ کیس ایسے ہلکے کر لیے جن کو آرام سے سر پر بھی اٹھا کر بھاگا جا سکتا ہے۔

صبح، صبح سب نے اٹھ کر جینگ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ آج سب بچے کافی پُرجوش تھے کیونکہ ہم لوگ تین دن کے لیے جینٹنگ جا رہے تھے اور یہ گھر نما ہوٹل جس میں ہم دو تین دن سے ٹھہرے ہوئے تھے اب اسے الوداع کہنا تھا۔ اسی لیے سارے کمروں کی تلاشیاں لی جا رہی تھیں کہ کوئی چیز رہ نہ جائے۔

''لگ رہا ہے کہ پولیس نے ریڈ کیا ہے...... کوئی دہشت گرد گھس گیا ہے اسے ڈھونڈنے کے لیے پوری پولیس پارٹی آئی تھی۔'' اجیہ کمروں کا حال دیکھ کر بول رہی تھی۔

''اب اگر کوئی چیزیں رہ جائیں گی تو تم ہی لوگ بولو گے۔'' میں موبائل فونز کے چارجرز اور ہینڈی کیم کیمرا بیگ میں رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

حسبِ ضرورت دو لیموزین ٹیکسی کرائے پر لی گئیں ایک میں نایاب کی فیملی اور دوسری میں ہماری فیملی ایڈجسٹ ہوئی اور سب لوگ جینگ کے لیے روانہ ہوئے۔ بلکہ خوب آرام سے روانہ ہوئے۔

جینگ ہائی لینڈ جو نام سے ہی ظاہر ہے کہ ایک پہاڑی علاقہ ہے کچھ مقامی لوگ اسے گینٹنگ بھی کہتے ہیں۔ شاید مقامی زبان میں کہتے ہوں۔ خاص طور پر یہ جگہ جوئے اور سٹے کے لیے مشہور ہے۔ غیر ملکی سیاح آ کر یہاں پر جوا کھیلتے ہیں کچھ سب کچھ جیت جاتے ہیں اور کچھ اپنی زندگی کی کمائیاں تک ہار جاتے ہیں۔ ایک پہاڑی علاقے پر منگل کیا ہوا ہے۔ یہ ایک چائنیز آدمی جینگ کے نام پر ہے۔ ملاکا سے تقریباً پانچ گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ گاڑی پہاڑوں پر سے گزر رہی تھی۔ مگر لگ ایسا رہا تھا جیسے کسی میدانی علاقے سے گزر رہی ہو۔ سارے راستے بڑے، بڑے پہاڑ اور درخت تراش خراش کیے کھڑے تھے جیسے آج ہی سب نے اپنے کپڑے تبدیل کیے ہوں۔ پہاڑوں کے درمیان کھڑے اشخاص نظر آئے جو وہاں کی میونسپل کارپوریشن کے تھے سوکھے پتوں کو ایک ڈرم میں جمع کر رہے تھے۔

موسم کا یہ حال ہے کہ پندرہ، پندرہ منٹ میں یہاں بارش ہوتی رہتی ہے۔ موسم اتنا پیارا کہ یہیں پر گھر بنانے کو جی چاہ رہا تھا۔ بادل گاڑی کے اندر گھس، گھس کر آ رہے تھے اور ہم ان کے ساتھ ہی سفر کر رہے تھے۔ اتنی صفائی پہاڑوں پر نظر آ رہی تھی کہ اگر اتنی صفائی ہمارے ملک میں ہو جائے تو ہمارا ملک جنت نظیر کشمیر بن جائے۔ (یعنی خوب صورت ترین)

''امی سردی لگ رہی ہے ناں!'' ایمان نے سب سے پہلے اس خطرے کی طرف اشارہ کیا کہ جس سے نمٹنے کے لیے میرے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔

''نہیں نہیں بیٹا، ابھی راستے کی سردی ہے ہوٹل پہنچ کر سب ختم ہو جائے گی اور آنٹی نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے ایمان کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''ارے جب وہ آنٹی آئی ہوں گی اس وقت یہاں گرمی ہو گی آج تو درجہ حرارت یقیناً صفر ہو گا۔'' آفاق کو بھی شاید سردی لگ گئی تھی تبھی اتنا گرم بول رہے تھے۔

جینگ میں ہوٹلز، گیسٹ ہاؤسز، کمرے، فلیٹ وغیرہ کرائے پر مل جاتے ہیں۔ ہم نے بھی فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا جس میں تین کمرے، ڈرائنگ روم اور کچن وغیرہ شامل تھا۔ ہر آسائش سے آراستہ یہ فلیٹ کافی تھا۔ فلیٹ سینٹرلی ہیٹڈ تھا تو تھوڑا جان میں جان آئی۔

سب چھوٹے بچوں کو چار پانچ قمیصیں پہنائی گئیں۔ کیونکہ سردی کافی زیادہ ہو رہی تھی اور بارش تھی جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

شام ہونے لگی تھی اور بھوک بھی چمک اٹھی تھی ویسے بھی سفر کے دوران ہل، ہل کر جو کچھ بھی کھایا تھا سب ہضم ہو گیا تھا۔

یہاں کی خاص گھومنے کی جگہیں تو کافی ہیں جیسے

انٹرنیشنل فوڈ چین، کافی شاپ، مارکیٹ، شاپنگ سینٹرز، مگر جینگ تھیم پارک یہاں کی اصل گھومنے کی جگہوں میں سے ایک ہے۔ اس پارک کے بھی دو حصے ہیں آؤٹ ڈور اور ان ڈور۔ آؤٹ ڈور حصے میں جانے کا تو وقت ختم ہو گیا تھا۔ طے یہ ہوا کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر اس پارک کے اندر کے حصے دیکھے جائیں۔

انڈین ہوٹل میں کھانے کے لیے بیٹھے جو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال جیسا لگ رہا تھا۔ سارے انڈین ویٹرز، سارا ماحول ہندوستانی، دیواروں پہ مغلیہ شہزادیوں اور شہزادوں کے پورٹریٹ، دھیما انڈین میوزک چونکہ پاکستان، ہندوستان والوں کی شکلیں بھی ایک ہی ہوتی ہیں۔ ویٹرز بھی ہماری فیملی کو دیکھ کر کچھ شناسائی کی امیدوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس ہوٹل کی مقبولیت کا اندازہ اس ہوٹل میں آنے والے مہمانوں سے لگ سکتا ہے جن کے آٹو گراف سے مزین پلیٹ شوکیس میں سجی ہوئی تھی۔ ان مہمانوں میں ایتابھ بچن، کرن جوہر، کمار سانو، اے آر رحمان، مادھوری وغیرہ شامل تھے۔

''کیا ہم سے بھی آٹو گراف لیں گے؟ آخر ہم بھی تو اتنی دور کا سفر کر کے آئے ہیں۔ یہ لیں نہ لیں ہم تو آٹو گراف دیں گے۔'' ایمان کو خوب شرارت سوجھ رہی تھی۔ کھانا نہایت لذیذ اور گرما گرم تھا یا شاید ہم بھوکے بھی بہت تھے اس لیے کافی مزیدار لگا۔ ہماری صاحب زادی اجیہ صاحبہ کو ہر جگہ اپنے اسکول کی دوستیں یا ٹیچرز ٹکرا جاتی ہیں۔ کبھی بازار میں تو کبھی شادیوں میں۔ یہاں پر بھی یہی تاریخ دہرائی گئی۔ ان کو پھر اپنی اسکول کی دوست اور ان کی فیملی مل گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش اور حیران ہو رہی تھیں کہ ملے بھی تو جینگ کے پہاڑوں پر۔

جینگ کا یہ ہوٹل کئی منزلہ تھا جس میں ان ڈور جھولے وغیرہ تھے۔ کھانے کے بعد بچوں نے نقشے کو دیکھتے ہوئے وہاں کی جانب دوڑیں لگائیں کہ آج کا دن کہیں کسی جھولے میں بیٹھنے سے رہ نہ جائے۔

بھاگتے دوڑتے اس جگہ پہنچے تو یہاں بھی ایک دنیا آباد تھی۔ بچوں کے جھولے، مختلف ٹرینیں جو سروں کے اوپر سے جا رہی تھیں ساتھ ہی کھانے پینے کی دکانیں۔ کہیں بھوت بنگلا بنایا ہوا ہے تو کہیں میوزیم بنایا ہوا ہے۔ ایک چائنیز ہوٹل میں تو لائیو کنسرٹ چل رہا تھا چونکہ مختلف قومیتوں کے لوگ یہاں آتے ہیں تو وہ گلوکار جو پرفارم کر رہے تھے مختلف زبانوں کے گانے گا رہے تھے اور جب انہوں نے اپنے چائنیز لب و لہجے میں انڈین گانا گایا تو چند لمحوں کے لیے میں بھی وہیں رک گئی ایسا لگ رہا تھا کہ کتنے سالوں کے بعد کوئی اپنی زبان میں گا رہا ہے (ہندی، اردو کم و بیش ایک جیسی ہیں سمجھ میں تو آتی ہے) اپنے ملک سے محبت یا یوں کہیے کہ اپنے ملک کی اہمیت دوسرے ملک جا کر سمجھ میں آتی ہے۔ میں پاکستان سے باہر کہیں بھی جاؤں، جلدی مجھے یہیں آنے کی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارا ملک بہت سی چیزوں میں دنیا کے مقابلے میں نہیں ہے لیکن بہت زیادہ چیزوں میں اس کے مقابلے کا بھی کوئی نہیں۔ جس کی سب سے بڑی مثال ہماری شناخت اور ہماری پہچان ہے۔ پاکستانی ہونا ہمارا فخر ہے اور اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔

میں یورپ کے کئی ملکوں کا سفر کر چکی ہوں لیکن پاکستان آ کر جو سکون اور آرام ملتا ہے اسے وہی لوگ محسوس کر سکیں گے جو کہیں باہر ہو کر آئے ہیں۔ مثال اس کی ایسی ہے کہ آپ ایک اچھے سے ہوٹل کے فائیو اسٹار کمرے میں رہ آئیں لیکن وہاں جا کر آپ کی نیندیں اڑ جاتی ہیں چین آپ کو اپنے دو کمرے کے گھر کے بستر پر لیٹ کر اپنے چیکٹ تکیے کو سر کے نیچے رکھ کر جو نیند آئے گی اس کا کوئی سواد ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی فرق میں ہر جگہ محسوس کرتی ہوں، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ہمارے بچے ایک کے بعد ایک جھولوں میں بیٹھ رہے تھے چونکہ رات کے گیارہ بجے یہ پارک بند ہو جاتا

ہے اس لیے کوئی بھی بچہ ٹائم خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''ارے بھئی اب تو تھکن سے گر جائیں گے۔'' میں نے صائمہ کو مخاطب کر کے کہا جو اپنے چھوٹے ارحم کو پکڑ، پکڑ کر تھک گئی تھی۔

''آپ پاکستان سے ہیں؟'' برابر بیٹھی خاتون مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''جی ہاں، آپ بھی کیا گھومنے آئی ہیں؟'' میں نے ان سے انٹرویو شروع کر دیا۔ وہ پکی عمر کی خاتون تھیں جو شلوار قمیص اور اسکارف میں ملبوس تھیں۔

''ارے نہیں، نہیں۔ ہم تو یہاں ہی رہتے ہیں۔ بچے ہمارے ہیں نہیں جب کبھی دل گھبراتا ہے تو یہاں پر بچوں کی شوخیاں اور شرارتیں دیکھنے چلے آتے ہیں۔'' انہوں نے اتنی حسرت سے کہا کہ میرا پتا نہیں کیوں دل دکھ سا گیا۔

''ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ بس ہمیں دعا مانگنے کا طریقہ نہیں آتا۔ اللہ کہتا ہے کہ تم مانگو، میں دوں گا بس جب بھی اس سے مانگیں دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے اوپر اٹھا کر مانگیں۔ پہلے اس پروردگار کی تعریف کریں پھر اس کا شکر کریں پھر اپنی حاجت اس کے آگے رکھیں۔ تین دفعہ ضرور تکرار کریں۔ یہ میرا آزمودہ ہے۔ آپ کر کے ضرور دیکھیے گا۔'' میں نے اپنے دل میں جو کچھ تھا انہیں بتا دیا۔

وہ خاتون آنکھیں پھاڑے مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے میں کوئی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ شاید سوچ رہی تھیں کہ یہ جینز اور شرٹ پہنی ہوئی کیا باتیں کر رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں اٹھتا ہوا سوال میں پڑھ چکی تھی۔

''آپ بھی میرے لباس کو دیکھ کر دھوکا کھا گئیں؟'' میں نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ آج سے پہلے مجھ سے یہ باتیں کسی نے بھی نہیں کیں۔ جو کوئی بھی کچھ حاصل کرتا ہے وہ اس چکر میں لگ جاتا ہے کہ جو میں نے حاصل کیا ہے وہ کوئی اور نہ حاصل کر لے اور آپ نے کتنے آرام سے مجھے وہ ساری چیزیں بتا دیں شاید میں بہت عرصے سے اس کی تلاش میں تھی۔'' اب ان خاتون نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

''دیکھیے اچھی بات پھیلانا بھی نیکی ہے۔ آپ پہلے اسے آزمائیں پھر آپ بھی آگے بتائیے گا۔ ویسے کس چیز کا بزنس ہے آپ کا؟'' میں نے موضوع تبدیل کرنے کا سوچا کہ کہیں میری مُرید ہی نہ ہو جائیں۔ (خیال تو دیکھیں)

''ہماری تو بہت بڑی فوڈ چین کی برانچ ہے کیونکہ کوئی چھوٹا بزنس یہاں فوراً ٹھپ ہو جاتا ہے۔ اگر یہاں کوئی بزنس کی غرض سے آئے تو یا تو کوئی بڑے پیمانے پر آغاز کرے ورنہ کسی چلتے ہوئے بزنس کی برانچ کھول لے وہ بڑی تیزی سے ترقی کرتی ہے۔ ملائشیا ابھی تک دوسرے ملکوں کے شہریوں کو شہریت نہیں دیتا۔ اب پرمننٹ ریسیڈینس (PR) ملنی شروع ہو گئی ہے۔ شاید دو ہزار بیس تک شہریت بھی ملنے لگے۔'' خاتون جن کا نام مینا تھا کسی مینا کی طرح ہی بول رہی تھیں۔

آفاق نے مجھے آواز دی تو میں نے ان سے اجازت چاہی اور بچوں کو گن کر ہوٹل کی طرف راہ لی۔

جینٹگ آؤٹ ڈور پارک لاجواب

آج جینٹگ کا دوسرا دن تھا چونکہ آج جینٹگ کی اصل کشش اس کے آؤٹ ڈور تھیم پارک میں جانا تھا۔ اسی لیے سارے بچے صبح سے ہی اٹھ بیٹھے تھے۔ بڑے تو بڑے چھوٹے بچے بھی ایسے تیار ہو رہے تھے جیسے شادی میں جا رہے ہوں۔

یہ ایسا پارک ہے جس میں دنیا بھر کے خوب صورت جھولے موجود ہیں۔ بچوں کے لیے الگ جھولے، فیملی جھولے الگ ہیں جبکہ خطرناک جھولوں کا الگ سیکشن ہے۔ ہر جھولوں کا الگ نام ہے فلائنگ جمبو،

فلائنگ کوسٹر، ڈائنوسار لینڈ، منی ٹرین وغیرہ وغیرہ۔

پارک میں جانے کا الگ راستہ ہے اور نکلنے کا الگ۔ یہ ٹائم سے کھلتا ہے اور شام چھ بجے بند ہو جاتا ہے۔ چھ بجے کا مطلب چھ ہے۔ چھ بج کے پانچ منٹ بھی نہیں۔ قوانین جو بنا دیے گئے ہیں اس کے گرد پوری ملائشین قوم گھوم رہی ہے اور آنے والوں کو گھما رہی ہے۔ صفائی کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی بچے کا پیتے ہوئے جوس گر گیا تو ایک بندہ وہاں کھڑا ہو گیا اور واکی ٹاکی پر سوپر کو بلانے لگا اور جب تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ جگہ صاف نہیں ہو گئی اور لوگوں کو بھی وہاں سے ہٹاتا رہا تاکہ کوئی پھسل نہ جائے اسی چھوٹی سی بات سے وہاں کے قاعدے اور قانون کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انٹری ٹکٹ لینے کے بعد اندر کے سارے جھولے فری ہیں۔ بچے ہاتھ چھڑا چھڑا کر ان جھولوں میں بیٹھنے کے لیے مچل رہے تھے۔

خیر ایک جھولا جس کا نام فلائنگ کوسٹر تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لیے بچوں کی ٹولی جس میں اجیہ، ایمان، علی، نیہا، ڈولی، اشعر اور ہمارے میاں آفاق شامل تھے، گئے۔ عجیب خوف ناک جھولا تھا۔ ایک پنجرے میں لیٹتے تھے اوپر سے لوہے کا جال آ کر بند ہو جاتا تھا پھر وہ ریل کی پٹریوں ٹائپ ٹریک پر الٹا سیدھا ہو کر چلتا تھا۔ کبھی جھولا تیز ہوتا تھا کبھی ہلکا، کبھی ہوا میں لٹک جاتا تھا، کبھی اچھل کر دوبارہ ٹریک پر گر پڑتا تھا۔ بیٹھنے والوں کا تو پتا نہیں مگر دیکھنے والوں کی ضرور چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ایک منٹ یا شاید اس سے بھی کم کا دورانیہ تھا اس جھولے کا مگر لگ ایسا رہا تھا کہ جیسے گھنٹوں چلتا رہا ہو۔

''کیسا لگا؟ ڈر تو نہیں لگا؟ مزہ آیا؟'' میں نے جلدی، جلدی تمام بچوں سے پوچھا جب وہ اتر کر جھولے سے نیچے آئے۔

سب بچے ابھی تک اسی سحر میں گرفتار تھے۔ کوئی لڑکھڑا رہا تھا، کوئی رونے کا منہ بنا رہا تھا تو کوئی زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

''ارے ڈر کی کیا بات، بالکل آرام سے رہے۔ بس دیکھنے کا ہی خوف ناک ہے بیٹھنے کے بعد تو پتا بھی نہیں چلتا۔'' یہ ہمارے میاں صاحب کے ڈائیلاگ تھے جو بچوں کے ساتھ اس خطرناک جھولے سے واپس آئے تھے۔

''کیا واقعی؟ بہت مزہ آیا؟'' اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں کیوں نہیں بیٹھی۔

''کیا بات کر رہے ہیں چاچو۔ جھولے میں تو آپ مستقل یا اللہ، یا اللہ، امی بچاؤ، امی بچاؤ کر رہے تھے۔'' یہ نیہا صاحبہ نے پول کھولی۔

''بہ آواز بلند کلمہ الگ پڑھ رہے تھے۔'' اجیہ نے بھی موقع کا فائدہ اٹھایا۔ بچے بھی کہاں بخشنے والے تھے اور آفاق جی نہیں، جی نہیں کر کے اپنی جھینپ مٹا رہے تھے۔

مجھے ہمیشہ سے ہی ایسے جھولوں سے ڈر لگتا ہے جن میں بیٹھ کر خوف محسوس ہو یا دل گھبرائے۔ تفریح اس وقت تک تفریح ہے جب تک آپ اس سے مزہ اٹھا رہے ہیں لیکن جب اس سے وحشت اور گھبراہٹ محسوس ہو پھر وہ تفریح نہیں رہتی بلکہ سزا بن جاتی ہے مگر بچے کہاں ماننے والے تھے بڑھ بڑھ کر ایسے ہی جھولوں پر بیٹھ رہے تھے۔ آفاق کلمہ پڑھ پڑھ کر ان کے ساتھ ساتھ تھے تاکہ بچے اکیلے نہ ہو جائیں جبکہ میں کسوئی کو لے کر ہیلی کاپٹر، گول گول گھومنے والے گھوڑوں، ہاتھی اور بندروں والے جھولوں میں بیٹھی رہی۔

''امی آپ کا تو یہاں آنے کا فائدہ ہی نہیں ہوا۔ ملائشیا آ کر بھی آپ کے گھوڑے اور بندر نہیں چھوٹے ان پر تو آپ کلفٹن کے جھولوں پر بھی بیٹھ سکتی تھیں۔'' ایمان کو افسوس ہو رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، میں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں۔'' میں اسے پیار کرتے ہوئے بولی چونکہ یہ ایک گھومنے پھرنے کی جگہ ہے ایک ایسی جگہ جہاں امن و امان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دھوکے بازی کا

کوئی مسئلہ نہیں ہے، اغوا برائے تاوان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے تو اسی وجہ سے پوری دنیا سے ٹورسٹ اس جگہ کا رخ کرتے ہیں۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں۔ کئی عرب فیملیز بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی فلپائنی میڈ کسی گدھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ موٹے موٹے بچوں کو گودوں میں اٹھائے اور بڑے بڑے بیگز اپنے گلوں میں ڈالے ایسا بے زبان جانور لگ رہی تھیں کہ جن سے کتنا ہی کام کروالو کچھ نہیں بولیں گی۔ چونکہ ان میڈز کے پاسپورٹ ان کے مالکان کے پاس ہوتے ہیں تو یہ بے چاریاں نوکری چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتیں چاہے انہیں گدھا بنادو یا کتا ان لوگوں کا کام ان کے آگے بس سر ہی ہلانا ہوتا ہے۔

یہ جگہ چونکہ انٹرنیشنل کراوڈ کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے غیر قانونی مشروبات کا کھلا کھلم استعمال ہو رہا تھا۔ یہاں بڑی مشکل سے اذان کی آواز کانوں تک سنائی دیتی ہے۔ ہر لباس میں ملبوس لوگ اپنی قومیت اور ملک کی پہچان بنے نظر آتے ہیں۔ نیکر، پینٹ، اسکرٹ اور ملائی ڈریس جو کرتا اور دھوتی پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ عورتیں پیروں تک کی میکسی پہنتی ہیں۔

چائنیز لوگ یہاں پر بہت بڑی تعداد میں ہیں اسی لیے ان کا شمار ہر جگہ ہوتا ہے۔ وہ دکاندار بھی ہیں، ہوٹل منیجر بھی ہیں اور کسی کمپنی کے ہیڈ بھی۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے لگی وہ کبھی ہار نہیں مانتے۔ مجھے کئی بڑی عمروں کے چائنیز مرد جو کہ مفلوج بھی تھے اپنی آٹومیٹک سائیکلوں پر نظر آئے جو خاص طور پر ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی جاتی ہے۔ وہ ان سائیکلوں پر بیٹھ کر اپنی ضرورت کے تمام کام کر رہے ہوتے ہیں۔ شاپنگ کر رہے ہیں، لفٹ سے نیچے جا رہے ہیں اوپر آ رہے ہیں۔ مفلوج تو ہیں مگر کوئی انہیں بے چارہ نہیں سمجھ رہا اور نہ وہ خود کو مسکین سمجھ رہے ہیں۔

بوڑھی عورتیں ہیں تو اپنی ہم عمر عورتوں کا گروپ بنا کر مزے سے گھوم رہی ہیں میک اپ کر رہی ہیں۔ ہوٹلنگ کر رہی ہیں، خوش ہیں اور جینا جانتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہاں پچھتر یا اسی تک پہنچے تو ایک سائڈ کا بستر پکڑ لیا نہ کہیں آنا اور نہ کہیں جانا گھر بیٹھ کر اور دس بیماریاں چمٹ جاتی ہیں دو چار سال گھر میں پڑے رہے، ایک ہارٹ اٹیک اور زندگی دی اینڈ۔

میں کسوئی کے ساتھ تھی چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی خطرناک رائیڈ میں بیٹھنے کی اہل نہیں تھی یہ بھی یہاں کا اصول تھا۔

کئی ایسے پریمی جوڑے بھی نظر آئے جن کو اپنے علاوہ نہ کوئی نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کسی کی پروا تھی۔ کبھی فواروں پر کبھی سوئمنگ پول میں کود کر تو کبھی کہیں وہ اپنی تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔

ٹائم کیسے ختم ہو گیا پتا ہی نہیں چلا۔ ظاہر ہے جب دیکھنے اور کرنے کی اتنی چیزیں ہوں تو وقت کیسے ختم ہو جاتا ہے کہاں پتا چلتا ہے۔ بچے بھی نڈھال ہو رہے تھے۔ سب نے وہیں ہوٹل میں کھانا کھایا اور اپنے ڈرائیور Jefiny کو فون کیا۔ وہ بھی کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتا تھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر سب نے شکر کیا کہ آج کا دن بھی تمام ہوا۔

”امی میرا پیٹ نہیں بھرا۔“ علی ہوٹل کے کمرے میں لیٹے ہوئے میرے کان میں منمنایا۔

”کیا تم نے کھانا نہیں کھایا تھا؟ نکال کر دیا تو تھا میں نے روسٹ۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ تو میں نے کھایا تھا مگر کچھ اور کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔“ اب اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ میں نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آفاق کو بتایا۔

”ویسے بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ آفاق میاں نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا۔ جوں جوں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح باقی بچوں تک پھیلی وہ سب بھی پھیل گئے کہ بھوک لگ رہی ہے۔

”چلو کچھ کچن میں پکایا جائے، ہوٹل کا کھانا کھا کھا کر تھک گئے ہیں، کیوں بچوں؟“ نایاب صاحب نے ایک شوشا چھوڑا۔

”چلو صائمہ یہ بھوکوں کی فوج ہمیں چین سے نہیں رہنے دے گی۔“ میں نے صائمہ کو دیکھ کر کہا جو حیرانی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

اسی اپارٹمنٹ ہوٹل کے ہی ایک فلور پر اسٹور تھا۔ وہاں سے میں نے اور صائمہ نے چاول، آلو، مسالے وغیرہ خریدے۔ کچن میں پتیلیاں تھیں زور شور سے آلو چاول پکائے جس میں بڑے بچے سب شریک ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے پہلی دفعہ کھانا ملنے والا ہے۔ چاول کچھ کچے پکے بنے لیکن سب لوگوں نے خوش ہو کر کھائے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

”اب سب سو جائیں کل جانا بھی ہے۔“ میں نے بچوں کو جلدی، جلدی سونے کے لیے کہا۔

پھر ملیں گے دوبارہ

آج جینگ سے واپسی تھی کیسے یہ دن گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ جہاں بالکل نت نئی دنیا آپ کی منتظر ہو، نئی نئی چیزیں کرنے کو ہوں وہاں پر تو وقت بھاگا ہی کرتا ہے۔

سارا سامان ایک بڑی گاڑی میں لوڈ کروا کر ہم سب اب واپسی کے راستے پر اور اپنی اگلی منزل کی طرف رواں دواں تھے کیونکہ یہ پہاڑی زرعی علاقہ ہے تو راستے میں ڈرائیور نے ہمیں کافی فارمز دکھائے۔ ڈرائیور جو انڈین تھا اور ہندی بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ”کئی فارمز راستے میں پڑیں گے وہ میں آپ کو سب کو دکھاتا جاؤں گا۔“

سب سے پہلے اسٹرابیری فارم آیا۔ جب ہم یہاں پر داخل ہوئے تو دروازے کھڑکیاں حتیٰ کہ میز اور کرسیاں تک اسٹرابیری کی شکل کی بنی ہوئی تھیں۔ فارم کے اندر جاتے وقت چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں تھما دی جاتی تھیں کہ جو اسٹرابیری آپ توڑیں وہ اس میں ڈالیں اور باہر آ کر اس کے پیسے دے دیں۔ ہمارے بچے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے ٹوکری میں ڈال کم رہے تھے۔ فارم میں جانے کا ایک راستہ جبکہ نکلنے کا دوسرا راستہ تھا وہیں پر ہی مشروم فارم بھی دیکھا کہ کس طرح مشروم کو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ سارے فارمز ایک کے بعد ایک تھے وہیں پر ہی شہد کا فارم بھی دیکھا کہ کس طرح شہد کی مکھی کو پالا جا رہا ہے اور پھر شہد کی بوتلیں بھر بھر کر بک رہی ہیں۔ جس طرح ہمارے شمالی علاقہ جات میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ شہد کو چیک کرنے کے لیے وہیں پر ہی کچھ بوتلیں کھول کر بھی رکھی گئی تھیں۔ سب نے خوب چیک کیا۔ کچھ فوٹو گرافرز طوطے، سانپ، چکور، چیلیں لے کر کھڑے تھے کہ اسے اپنے ہاتھ پر بٹھا کر تصویر کھنچوائیں۔ سب بڑے چھوٹوں نے سانپ کو پکڑ کر اور ایمان نے تو گلے میں ڈال کر تصویر کھنچوائی۔ جتنے کی سب بچوں کی ملا کر تصویروں کی پے منٹ ہوئی اتنے میں تو ہم ہر بچے کے لیے الگ الگ سانپ خرید سکتے تھے۔ خیر فوٹو گرافروں کی ..... روزی روٹی بھی ہم سیاحوں کے طفیل ہی چل رہی ہے۔

صبح سے ہی جینگ میں تیز دھوپ نکل رہی تھی۔ موسم بالکل کھلا ہوا تھا مگر جیسے جیسے ہم لوگ اس علاقے سے نکل رہے تھے موسم دوبارہ بدل رہا تھا جیسے جیسے آگے جاتے جا رہے تھے بارش جو شروع ہو گئی تھی اس میں تیزی آ رہی تھی جیسے یہ جگہ یہ موسم نہ چاہتا ہو کہ ہم یہاں سے جائیں۔ شاید یہ جگہ چاہتی تھی کہ ہم یہیں کے ہو رہیں۔ جو محبت، جو خوشی، جو سکون اور اپنا پن ہمیں یہاں ملا تھا بہت کم جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں سے ہم ایسا کچھ پاتے ہیں۔ جب ہم اس وادی میں داخل ہوئے تھے تب بھی یہاں بارش ہو رہی تھی اور اب جاتے وقت بھی یہاں موسلا دھار بارش تھی شاید یہ جگہ آج ہمیں جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ تبھی جل تھل ہو رہی تھی۔ شاید جب ہم آئے تھے تو اس جگہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور اب جاتے وقت اس کی آنکھوں

میں درد اور تکلیف کے آنسو ہیں۔

میں آئی، لنگ کوی

شام ساڑھے چار بجے کی ہماری فلائٹ تھی جبکہ اس وقت فارمز میں گھومتے ہوئے یہاں دو بج گئے تھے۔ ہمارا ڈرائیور کافی ذہین اور ان راستوں سے واقف تھا۔ اس نے راستہ تو ذرا لمبا لیا لیکن بغیر رکے ہمیں سوا تین بجے تک ائرپورٹ پہنچا دیا۔ سب بچوں اور بڑوں کو گنا کہ پورے ہیں سارا سامان ٹرالی پر لادا اور ائرپورٹ کے اندر دوڑ لگائی۔ ہماری اگلی منزل لنگ کوی تھی جو ملائشیا کا ایک جزیرہ ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ ابھی تک لنگ کوی کے بارے میں ہمیں صرف اتنا ہی پتا تھا۔

خیر یہاں ائرپورٹ پر بھی نئے نئے طریقے رائج تھے اور ہم ٹھہرے غریب ملک کے باشندے کہ اول تو کوئی ائرپورٹ جاتا نہیں ہے اور اگر کوئی بھولا بھٹکا چلا بھی جائے تو وہ پورٹر جس کی ذمے داری خالی سامان اندر لے جانے کی ہوتی ہے۔ بڑھیا ماں اور غریب باپ کی شکلیں اور آنسو دیکھ کر اسے اتنا پگھلا دیتی ہیں کہ وہ اس غریب کی اولاد کو جہاز پر بٹھا کر ہی چین لیتا ہے جس سے ثواب اور دعائیں دونوں سمیٹتا ہے مگر یہاں ملائشیا میں تو ہر آدمی ، ہر ادارہ پروفیشنل، بورڈنگ کارڈ جو جہاز میں بیٹھنے کا انٹری کارڈ ہوتا وہ تک کمپیوٹر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اتنے لوگ تھے شاید جلدی میں کچھ غلط ٹائپ ہوگیا، گیارہ بورڈنگ پاسز تو نکل آئے دو میں مسئلہ ہوگیا اور یہ مسئلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر چیکنگ پر آفاق اور ڈولی کو روکا جا رہا تھا اور کسی طرح سمجھا کر ہم آگے جاتے جا رہے تھے مگر جب آخری چیکنگ ہوئی اور جہاز اڑنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے دوبارہ وہی مسئلہ ہوا اور انہیں روکا گیا۔ نایاب، آفاق، ایمان اور ڈولی دوبارہ باہر گئے اور ہم آخری کاؤنٹر کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ کاؤنٹر والی عورت بولی کہ اگر پانچ منٹ کے اندر، اندر یہ لوگ نہیں آئے تو ہم کاؤنٹر بند کردیں گے۔

”صائمہ ہم لوگ چلیں؟ یوں تو تین ٹکٹ ضائع ہوں گے ورنہ تیرہ ضائع ہوجائیں گے۔“ جب پانچ منٹ تک یہ لوگ نہیں آئے تو میں نے صائمہ سے کہا۔

”ہم اکیلے کیا کریں گے وہاں عظمیٰ بھابی؟“ صائمہ بھی پریشان ہورہی تھی۔

ہمارا سارا سامان لوڈ ہوگیا تھا۔ اب تو کچھ بھی پاس نہیں تھا۔ بچوں کے کپڑے بھی گئے۔ کسوئی کا دودھ کا ڈبا بھی میں نے سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔ اب میرا سارا دماغ سامان میں لگا ہوا تھا۔

”میں باہر جاکر دیکھتی ہوں۔“ اجیہ دروازے کے باہر کی طرف جانے لگی۔

”میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“ میں بھی اجیہ کے ساتھ چل دی۔

”آر یو کمنگ مادام اور ناٹ؟“ کاؤنٹر والی دوبارہ چیخی۔

میں اس دروازے کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے ان لوگوں کو آنا تھا اور دل ہی دل میں یاحیُ یاقیوم برحمتک استغیث کا ورد کرنے لگی۔ یہ وظیفہ بھی میرا آزمودہ ہے۔ ہمارے پیارے نبی کوئی پریشانی محسوس کرتے تھے تو وہ یہ ورد پڑھتے تھے تو ہمیں تو ان کے اُمتی ہونے کے ناتے ہر وقت یہ پڑھنا چاہیے کیونکہ انسان تو ہر وقت خسارے میں ہے۔ ابھی اسے پڑھتے ہوئے کچھ لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایمان اور آفاق سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جیسے ہی مجھے ایمان نظر آیا میں نے باقی تمام بچوں کو جو آہستہ، آہستہ منہ بنا کر میرے ہی ساتھ کھڑے ہوچکے تھے سب کو جہاز کی طرف دوڑایا۔

خیر جیسے تیسے کرکے گرتے پڑتے بھاگم بھاگ سب کی جہاز میں انٹری ہوئی۔ جیسے ہی ہم جہاز میں داخل ہوئے ویسے ہی جہاز کے دروازے کھٹا کھٹ بند ہونے لگے۔

”دیکھا، ہم ہی رہ گئے تھے سارا جہاز بھر گیا تھا۔ تھوڑی دیر اور ہوجاتی تو سارے ٹرپ کا ستیاناس ہوجاتا۔“ میں نے ایمان سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”امی آپ کو پتا نہیں کہ ہیرو ہمیشہ آخر میں آتا ہے اور ہم ہیرو ہیں........“ وہ کالر اٹھا کر کہہ رہا تھا۔

”بیٹا ابھی زیرو بنتے ‘بنتے رہ گئے۔ ابھی جاتی بھینس پانی میں جب سب رہ جاتے یہاں۔“ میں نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔ دل ہی دل میں اللہ کا بھی شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں کتنی بڑی پریشانی سے بچایا۔ پردیس ملک نہ جان نہ پہچان لٹے پٹے خاندان کی طرح بیٹھے ہوتے اگر خدانخواستہ......! بس اس سے آگے کی سوچنے کی میری ہمت نہ تھی۔

کوالالمپور سے لنگ کوی کی فلائٹ ایک گھنٹے کی تھی۔ ٹھیک وقت میں جہاز ٹیک آف ہوا۔ ائرپورٹ پر بورڈنگ پاسز کی وجہ سے اتنی بھاگم بھاگ ہوچکی تھی کہ اب پیاس کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس ہورہی تھی۔

”امی، مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“ کسوئی کو بھی پیاس لگ رہی تھی۔

”بیٹا ابھی کھانا پانی سب آرہا ہے۔“ میں نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ کھانے کی ٹرالی آتے دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنے آگے لگی ہوئی میز کھول لی۔ مجھے جہاز کا کھانا کبھی پسند نہیں آتا لیکن بھوک اتنی چمک کر لگی ہوئی تھی کہ دل میں سوچا جیسا بھی کھانا آئے گا کھالوں گی۔ کھانا تو کھانا ہوتا ہے۔ اس کو کبھی برا نہیں کہنا چاہیے اور نہ ہی اس کی بے قدری کرنی چاہیے۔

لیکن یہ کیا......؟ تھوڑی دیر میں ہر مسافر کے ہاتھوں میں مینیو کارڈ تھے اور ہر ڈش کے ساتھ اس کے پیسے درج تھے چاہے چاول کھائیں یا چکن، جوس پئیں یا پانی پہلے پیسے ڈھیلے کریں اور پھر پیٹ کا دوزخ بھریں۔ قیمتیں دیکھ کر جس تیزی سے تھوڑی دیر پہلے آگے لگی میز کھولی تھی اس سے کہیں زیادہ پھرتی اور ہوشیاری سے اسے بند کردیا چونکہ بچوں کی سیٹ آگے پیچھے تھیں دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ جوسز، چکن، پاستہ اور نہ جانے کیا، کیا لے چکے تھے اور پے منٹ کے لیے ائرہوسٹس کو ہماری شکلیں دکھا رہے تھے۔ خیر ایک گھنٹا کیسے ختم ہوا..... بہت پتا چلا۔ جب جہاز لنگ کوی کے ائرپورٹ پر اترا تو ایسے لگا کہ جیسے جہاز کسی باغ میں اتر گیا ہو۔ حدِ نظر تک ہری بھری گھاس جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہونے والی ہو اور ابھی کوئی ہیروئن ساڑی پہنے بھاگتی ہوئی اس گھاس پر گرے گی۔ گانا الگ گائے گی۔

ائرپورٹ پر ہی یہ جگہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی تو امید کی جاسکتی تھی کہ لنگ کوی کا یہ ٹرپ یادگار ہی رہے گا۔ ائرپورٹ کے اندر کی سہولیات کوئی زیادہ ورلڈ کلاس نہیں تھیں کیونکہ یہ ایک جزیرہ ہے اسی لیے زیادہ تر یہاں ٹورسٹ ہی آتے ہیں ائرپورٹ سے نکلتے وقت مختلف ٹورسٹ کمپنیوں کی نمائندہ لڑکیاں اپنے، اپنے بروشرز لیے کھڑی تھیں کہ ہم ان کی کمپنی کے ذریعے یہ جگہ دیکھیں لیکن کیونکہ ہم ساری چیزیں پاکستان سے ہی بک کروا کر گئے تھے اس لیے ہم لوگوں کو ان سب کی ضرورت نہیں تھی۔

ایگل پارک اور ہم

ائرپورٹ پر ہی گزشتہ ہوٹل کا ایک نمائندہ گاڑی لیے ہمارا منتظر تھا۔ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے اس آدمی کو ہم ڈرائیور سمجھ رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہاں وہ ایک ہوٹل کا مالک ہے امپریس کرنے کے لیے اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی ہمیں تھما دیا۔ ہماری بکنگ لنگ کوی کے بہترین ہوٹل بیلا وستا میں تھی لیکن کیونکہ یہ ملائشین ہوٹل تھا اور بھوک ہمیں پاکستانی والی لگ رہی تھی تو فیصلہ یہ ہوا کہ ان صاحب کے ہوٹل چلتے ہیں کڑاہی مرغ، بریانی وغیرہ کھائی جائے۔

ہوٹل جس کی تعریف وہ سارے راستے کرتے ہوئے آئے تھے ایک نارمل سا ہوٹل تھا۔ ہمیں بٹھا کر وہ

غائب ہوگئے تھے اور کھانا آنے کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ جب اجیہ اور ایمان ذرا اِدھر اُدھر سے انسپکشن کرکے آئے تو پتا چلا وہی صاحب ذرا اندر کچن میں روٹیاں بنا رہے تھے۔

''ظاہر ہے یہاں باہر پردیس میں سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔'' آفاق سب کو بتا رہے تھے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر اپنے ہوٹل میں آکر سکون کی سانس لی اور جو صبح سے سفر میں تھے اس سے چھٹکارا ملا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد چونکہ رات ہورہی تھی تو طے یہ ہوا کہ ایگل پارک جاکر دیکھا جائے۔ چیل یعنی ایگل یہاں کی پہچان ہے شاید یہاں پر بہت زیادہ ہوتی ہیں اس پارک کے بیچ میں ایک اڑتی ہوئی ایگل کا مجسمہ بنا ہوا ہے جس کے پاس کھڑے ہوکر سب تصویریں کھنچواتے ہیں کیونکہ رات ہوگئی تھی اور روشنی بھی کچھ کم تھی اور چاند بھی چودھویں کا نہیں تھا اسی لیے ہم سب بھی ایگل ہی کی طرح لگ رہے تھے۔

پارک میں گھوم کے آگے پیچھے ڈول کر اب ہم ایک شاپنگ سینٹر کی طرف بڑھ رہے تھے چونکہ دن کم تھے اور مقابلہ سخت تھا اس لیے سوچا کہ جتنی جلدی ہوسکے یہاں کی سب چیزیں دیکھ لی جائیں۔ یہ پورا جزیرہ ڈیوٹی فری تھا یعنی یہاں کچھ بھی خریدو اس پر ڈیوٹی ٹیکس نہیں لگتا۔

اتنے دنوں سے جو بچوں کو قابو میں کیا ہوا تھا آج یہاں کا شاپنگ سینٹر دیکھ کر قابو سے باہر ہوچکے تھے۔ یہاں انہیں اجازت تھی کہ وہ اپنی شاپنگ کرسکتے ہیں۔ اجیہ نے اپنے موبائل کے کورز لینے شروع کیے۔ ایمان صاحب نے کپڑوں کے سیکشن کی طرف دوڑ لگائی۔ علی چاکلیٹ کے کاؤنٹر پر تھے اور کسوئی کو تو صرف اور صرف ڈولز چاہیے ہوتی ہیں۔ اتنی ڈولز ہیں اس کے پاس مگر پھر بھی ایک نئی گڑیا ان کی نئی دوست بن جاتی ہے۔ میں نے بھی کچھ گفٹ خریدے تاکہ پاکستان جاکر منہ دکھانے کے قابل رہ سکیں۔

لنگ کوی کی صبح

لنگ کوی کا دوسرا دن صبح سے ہی زور شور کے ساتھ شروع ہوا کیونکہ یہی ہمارا اہم دن تھا۔ آخری دن تو روانگی کی تیاریوں میں ہی گزر جاتا ہے۔ تو اس دن کو ہم سب لوگ بھرپور انجوائے کرنے کے موڈ میں تھے۔ صبح ہی سے یہاں موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ صبح کے آٹھ بجے کا الارم لگا کر سوئے ہوئے بچے صبح چھ بجے ہی اٹھ بیٹھے تھے۔

''چلو چلو بچوں سب جلدی جلدی تیار ہوجاؤ پہلے نیچے ناشتے کے لیے چلتے ہیں پھر آگے کا پروگرام بھی بنانا ہے۔'' نایاب اپنے کمرے سے آکر بچوں کو الرٹ کررہے تھے۔

جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے یہ لنگ کوی کے بہترین ہوٹل اور ریزورٹ میں سے ایک تھا اس میں جم، ہیلتھ کلینک، بیوٹی کلینک، میس وغیرہ موجود تھے۔ یہ ایک جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے اسی لیے ہوٹل کے کمرے سے بھی سمندر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پر بحری راستے سے بھی آیا جاسکتا ہے۔ فیری چلتی ہیں مگر تقریباً پورا دن لگ جاتا ہے ہمارے ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے اور وقت بھی اتنا نہیں تھا اسی لیے ہم نے بحری راستے کا انتخاب نہیں کیا۔

''میں تو دیکھ بھی آیا چاچو کہ ڈائننگ روم کہاں ہے۔ بس چھتری لے کر جانا پڑے گا کیونکہ بارش کافی ہورہی ہے۔'' ایمان صاحب اپنی لیاقت جھاڑ رہے تھے جو تھوڑی ہی دیر پہلے کہیں سے گھوم کر آئے تھے۔ ناشتا اس ہوٹل میں فری تھا اسی لیے سب فری ہورہے تھے۔

''ارے بھئی، ایک، ایک فیملی کرکے جائے ایک ساتھ اتنے سارے لوگ جائیں گے تو کہیں اضافی چارجز نہ دینے پڑ جائیں۔'' نایاب اور صائمہ بچوں کی ٹولی کو ایک ساتھ جاتا دیکھ کر گھبراتے ہوئے بولے۔

''وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بھابی، دوسال پہلے ہم پانچ ستارے والے ہوٹل میں دوست کی فیملی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ ان کے بھی چار بچے تھے اور ہمارے بھی دو بچوں کے پیسے چارج کیے تھے۔ یہ ہوٹل بھی اسی حساب کتاب کا لگ رہا ہے اسی لیے کہہ رہے ہیں کہ ساتھ ساتھ نہ جائیں تاکہ الگ، الگ لگیں۔'' صائمہ اب تفصیل بتارہی تھی۔

''یہ تو بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ اب اگر اللہ رکھے کسی کے زیادہ بچے ہیں تو ان کا تو نقصان ہوگیا۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''تو آپ کیا چارہ رہی ہیں؟ آپ کے چکر میں ہوٹل والے اپنا نقصان کرلیں۔ آپ کا پورا خاندان، پوری کی پوری فصل چٹ کرلے اور وہ اُف بھی نہ کریں۔'' اب یہ لوگ مذاق کے موڈ میں اتر آئے تھے۔ خیر ہنستے مسکراتے سب ناشتے کی جگہ پہنچے نہ کچھ ہونا تھا اور نہ ہوا سب نے زبردست قسم کا ناشتا کیا۔

ملائی لوگوں کا بھی عجیب دستور ہے صبح کے ناشتے میں بھی ابلی ہوئی دال، چاول اور چٹنی کھانے لگتے ہیں۔ نہ دن دیکھا نہ رات، نہ صبح اور نہ شام بس یہاں آنکھ کھلی وہاں دال، چاول شروع۔ یہ لوگ چار دفعہ کھانا کھاتے ہیں پھر بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر تین دفعہ کھاتے تو پھر تو گودوں میں پھرتے۔

ناشتے کے بعد ہماری وین جس کو رات میں ہی بک کرلیا گیا تھا اپنے اوپر ہمیں لادنے کے لیے تیار کھڑی تھی کیونکہ آگے کا سفر ہمیں اسی پر ہی کرنا تھا۔

سمندر ہی سمندر

وین والے نے ہمیں سمندر کے ایک ایسے اسپاٹ پر اتار دیا جہاں سے لوگ بوٹ کرایے پر لے کر اس جگہ کی سیر کرسکتے تھے۔ بوٹ پر ہر آدمی کا کرایہ... الگ الگ تھا۔ ہم نے ایک بڑی سی بوٹ اپنی پوری فیملی کے لیے لی اور طے یہ ہوا کہ یہ ہمیں ہر جگہ دکھائے گی۔

اس جگہ کو ایسا سمجھا جائے جیسا فلموں میں نظر آتا ہے کہ سلمان خان بوٹ چلا رہا ہے۔ پیچھے چور پڑے ہیں کھلا سمندر چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ اوپر لوگ پیراشوٹ میں بھی اڑ رہے ہیں۔ سمندر میں ہر طرف نیلی، پیلی، چھوٹی، بڑی، سفید اور کالی کشتیاں چل رہی ہیں۔ کہیں کشتیوں کی ریس لگ رہی ہے یعنی فلم کا منظر لگ رہا تھا۔

کشتی پر بیٹھتے ہی اس کشتی کے ڈرائیور نے ہمیں لائف جیکٹ دی کہ اس کو پہن لیں۔ کچھ لوگوں کو کشتی کے ایک طرف جبکہ کچھ کو دوسری طرف بٹھایا تاکہ بیلنس میں رہے۔

اب جناب عالی ہماری کشتی بھی خراماں، خراماں اور کبھی تیز تیز اس سمندر کے پانی میں دوڑنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم بائی روڈ حیدرآباد جارہے ہوں۔ کبھی کبھی کشتی یوٹرن کبھی سائڈ وغیرہ پر بھی ٹرن لے رہی تھی۔ ایسا جم کر چل رہی تھی کہ کیا کوئی کار چلے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کشتی ایک اسپاٹ پر رکی جہاں ہمیں آدھا گھنٹا رکنے کا کہا گیا کہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد کشتی کھڑی ہے۔ یہیں واپس آنا ہوگا۔ یہ بیٹ کیو تھی یعنی چمگادڑوں کا غار۔ پہاڑوں کا غار تھا جہاں پر اندر جاتے وقت ٹارچ دیے جارہے تھے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ سب لوگ اندر جاتے جارہے تھے اب جو ٹارچ اوپر غار کی چھت کی طرف کی تو وہاں سیکڑوں چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں یعنی دیکھا جائے تو ان لوگوں نے اپنی قدرتی خوب صورتیوں کو کمائی کا ذریعہ بنالیا تھا۔ کافی کشتیاں اور بوٹ یہاں آکر رک رہی تھیں۔ مختلف جگہوں پر کھڑے ہوکر تصویریں بنوائی جارہی تھیں۔ بندروں کے غول کے غول بھی یہاں نظر آرہے تھے جو ٹورسٹ سے کھانے پینے کی چیزیں لے لے کر بھاگ رہے تھے۔ یہ مینگروو کے جنگلات تھے جس کے اندر آبی پرندے، چمگادڑیں، چیلیں، مچھلیاں وغیرہ بکثرت پائی جاتی ہیں چونکہ یہ آبی جنگلات

ہیں، پانی ہی یہاں کی خوب صورتی ہے اسی کو ان لوگوں نے کمالِ مہارت سے مشہور کیا اور ذریعۂ روزگار بنالیا۔ اس طرح کتنے ہی لوگوں کو روزگار میسر آگیا اور ملک کے نام میں بھی اضافہ ہوا۔

ایسی جگہوں پر آکر مجھے کافی تکلیف ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اس وجہ سے نہیں کہ میں حسد کرتی ہوں یا میں جل ککڑی ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی ایسی کئی جگہیں ہیں جو حکومتی امداد نہ ہونے کی وجہ سے زبوں حالی کا شکار ہیں۔ میں کراچی کی رہنے والی ہوں ہمارے کراچی میں ایک جگہ ریڑھی گوٹھ ہے کیا یہ جگہ لنگ کوی نہیں بن سکتی؟ اگر یہاں امن و امان ہوجائے تو ریڑھی گوٹھ اتنا ہی حسین ہے جتنا لنگ کوی...... آج میں لنگ کوی کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی ہوں...... کیا کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب میں ریڑھی گوٹھ کی تعریف میں اپنا قلم اٹھاؤں گی۔ وہ بھی ایک جزیرہ ہے، وہاں بھی کشتیاں چلتی ہیں، وہاں بھی چمگادڑوں کا غار ہے، وہاں بھی چیلیں سرِشام اپنے شکار کے لیے نیچے آتی ہیں' بس فرق یہ ہے کہ وہاں بھوک ہے، غربت ہے اور یہی دونوں چیزیں ہر برائی اور جرم کے لیے کافی ہیں۔ خیر بات ہورہی تھی بیٹ کیو کی، پانی کے اوپر ہی لکڑی کے پھٹوں کا ایک پل بھی بنا ہوا تھا۔ یہ پل کافی دور تک جارہا ہے اور جنگلات سے گھرا ہوا بھی تھا۔ ایک پُراسراریت سی ماحول میں تھی۔ تبھی میں نے بچوں کو جو کافی آگے جانے کے چکر میں تھے آوازیں دے کر بلایا اور واپس آنے کو کہا۔

بڑے اور بچوں کو گننے کے بعد ہم لوگ واپس اپنی بوٹ میں آگئے جو ہمیں لے کر آگے روانہ ہوگئی۔ بوٹ ہچکولے لے لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف سے ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں منہ پر تھپیڑے کی طرح لگ رہی تھی چونکہ صبح ہی یہاں بارش ہوئی تھی۔ اس لیے اب بھی موسم بے ایمان ہی ہو رہا تھا۔ یعنی لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی جل تھل ہوسکتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کشتی والے نے ہمیں ایک مچھلیوں کے پونڈ کے پاس اتار دیا۔ یہ ایک لکڑی سے بنا ہوا ہوٹل تھا جو مقامی لوگ ہی چلا رہے تھے۔ مختلف طریقوں اور نسلوں کی مچھلیاں یہاں ایک جگہ پر تیر رہی تھیں...... ہمارا گائڈ جو ہمارا کشتی والا ہی تھا ان کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مثلاً کہ ایک مچھلی کے بارے میں بتایا کہ یہ زہریلی ہے، یہ ٹھنڈے پانی کی ہے، یہ یہاں ہی ملتی ہے وغیرہ ...... وغیرہ...... یہاں کھانے میں مچھلی ہی تھی اگر آرڈر کریں گے تو اسی وقت وہ آپ کے لیے فرائی کردے گا لیکن کسی کا بھی اس وقت مچھلی کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے آگے کی راہ لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

اب بچوں کو سخت سردی لگ رہی تھی کیونکہ بارش جو پہلے ہلکی ہلکی تھی اب تیز ہوچکی تھی۔ کشتی خوب تیز چل رہی تھی حالانکہ یہ پوری طرح پیکڈ تھی مگر پھر بھی ہوا تو آرہی تھی۔

سمندر میں کہیں جیٹ بوٹ چل رہی تھی۔ ایمان صاحب تو اسے دیکھ کر باؤلے ہوگئے۔ ''پاپا میں جیٹ اسکائی میں بیٹھوں گا۔'' ایمان اپنے ابا کو منانے میں لگ گیا۔

''ارے نہیں...... بہت تیز چلتی ہے ہوا بھی بہت ہے اگر یہ گرگیا تو ملے گا بھی نہیں، سوئمنگ اسے ویسے بھی ابھی اچھی طرح نہیں آتی، میں پورے لوگوں کے ساتھ واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے آفاق کو ڈراتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تھوڑے سے اور بڑے ہوجاؤ...... پھر کرنا ابھی تم چھوٹے ہو، امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' آفاق کو بھی میری بات سمجھ آگئی تھی۔

کئی دفعہ ہماری کشتی ٹوٹے ہوئے پہاڑوں کے درمیان میں جو راستہ بنا ہوتا ہے اس کے اندر سے گئی...... یہاں پر چھوٹے چھوٹے کافی اسپاٹ بنا رکھے ہیں...... جن کو کئی نام دے دیے گئے ہیں مثلاً مگرمچھوں کا غار، ہم بھی اترے اس جگہ مگر ہمیں تو کوئی مگرمچھ نظر نہیں آیا...... شاید انہیں ہمارے آنے کا پہلے سے پتا چل گیا تھا تبھی تو سمندر میں کود گئے۔

کشتی سمندر میں دوڑ بھاگ کررہی تھی۔ اب تھکن ہونے لگی تھی اور یکسانیت بھی...... بس دل چاہ رہا تھا کہ خشکی پر پہنچ جائیں۔

ایک اسپاٹ کو انہوں نے نام دے رکھا ہے ایگل فیڈنگ...... بھئی وہاں بھی گئے کہ یہ کیا بلا ہے...... ذرا اسے بھی دیکھا جائے تو پتا یہ چلا کہ سمندر کے ایک کونے میں چیلیں جمع تھیں اور کشتی والے اپنی کشتی سے چھوٹی، چھوٹی مچھلیاں ہوا میں اچھال رہے تھے جو وہ پکڑنے نیچے آرہی تھیں تو بھئی یہ جگہ ہوگئی ایگل فیڈنگ اسپاٹ...... جب ہم لوگ پانی کی بلی بن، بن کر تھک گئے تو پھر ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا...... بچے سردی سے کانپ رہے تھے۔ حالانکہ پورے کور تھے مگر پھر بھی کھلے سمندر میں ٹھنڈ کافی تھی۔

واپس آکر سب سے پہلے کھانے کے لیے کہیں جانے کا سوچا گیا کہ اچھا سا کھانا کھایا جائے۔ کافی بھوک جو لگ رہی تھی۔

یہ ایک اچھا سا انڈین ہوٹل تھا۔ جس کا نام مہاراجا ریسٹورنٹ تھا۔ مہاراجا یا مہارانیاں ہی یہاں آتی ہیں۔ ہم جو آئے تھے کسی راجے مہاراجے سے کم تھی ہماری قوم...... کیونکہ جس کا جو دل چاہ رہا تھا وہ وہی کررہا تھا۔ کوئی ٹیبل نیپکن سے ناک پونچھ رہی تھی۔ صائمہ کا بچہ چمچ سے ٹیبل بجا رہا تھا اور باقی بچے ہوٹل میں کھو کھو کھیل رہے تھے۔ ہوٹل کے ویٹرز جس تکلیف اور اذیت میں تھے اس کا اندازہ ہمیں نہیں تھا کیونکہ ہم سب لوگ کافی تھکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی کھانا آگیا، کھانا تھا یا نانی، دادیوں کے ہاتھ کا کوئی پکوان کھاتے کھاتے تھک گئے مگر دل نہیں بھرا...... کیا وہاں کی سبزی اور کیا وہاں کا گوشت...... کیا مکھن لگی روٹیاں واہ مزہ آگیا...... اتنا لذیذ کھانا شاید میں نے بہت کم کھایا ہوگا...... اس جملے سے اس کھانے کی لذت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا کہ پیٹ بھر گیا مگر نیت نہیں بھری...... شاید ہندوستانیوں کو کھانا بہت اچھا پکانا آتا ہے...... جب ویٹر نے آکر کھانے کے بارے میں پوچھا کہ کیسا لگا...... تو اس سے بھی سب نے دل بھر کے تعریف کی۔

کھانا کھا کر ہوٹل پہنچنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ بچوں نے کہا کہ یہاں کا پارک تو دیکھا ہی نہیں تو جناب فوراً گاڑی کا پہیا برڈ پارک کی طرف موڑ لیا گیا...... مختلف انواع و اقسام کے پرندے اور جانور اپنے اپنے پنجروں میں بیٹھے تھے۔ ہم سب ایسے دوڑ دوڑ کر ان کو دیکھنے پہنچے تھے کہ اگر ان طوطوں، مرغیوں وغیرہ سے نہ ملے تو وہ بے چارے ناراض ہوجائیں گے۔

''واہ لنگ کوی یہ آئے اور ہم سے ملے بھی نہیں...... اتنی غیریت، اب ایسے تو حالات نہیں......''

ان شتر مرغیوں اور طوطوں سے ملنے کے بعد اب آہستہ، آہستہ ہم باہر نکلنے کے راستے میں تھے۔ جہاں واپسی کی جگہ پر جیولری بک رہی تھی۔ قیمتیں تو ہم سب ایسے پوچھ رہے تھے۔ جیسے آدھی سے زیادہ دکان آج ہماری جیب میں ہوگی۔ مگر وہی ہوا جو ہوتا ہے آرام سے دکان سے ٹہل کر نکل گئے

صبح سے شام ہوچکی تھی...... ہوٹل کے کمرے میں آکر اب مجھ سے بات بھی نہیں کی جارہی تھی، تھکن حد سے زیادہ ہو رہی تھی کہ کسی نے شوشا چھوڑا کہ یہاں کا فش میوزیم بڑا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''بھئی میری تو ہمت نہیں ہے، میں کافی تھک گئی ہوں...... ابھی کل سفر بھی کرنا ہے۔ میری طرف سے معذرت...... باقی آپ لوگ جانا چاہیں تو جائیں......'' میں نے صائمہ کو بتایا کہ کہیں میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب نہ ہوجائے۔

''نہیں، نہیں...... بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... یہ بچے تو بے وقوف ہیں...... عقل نہیں ہے ابھی اتنا تھک کر آئے ہیں، ذرا آرام کرلو......'' اور یہی ہوا کہ بستر پر لیٹتے ہی سب سونے لگے۔

خدا حافظ ملائشیا

آج ہمارا یہاں آخری دن تھا...... سب لوگ پیکنگ میں مصروف تھے۔ آج کا سارا دن سفر میں ہی گزرنا تھا۔ پہلے لنگ کوی سے ایک گھنٹے کی فلائٹ لے کر کوالالمپور پھر کوالالمپور سے چار گھنٹے کی فلائٹ سری لنکا...... پھر سری لنکا میں دس گھنٹے کا قیام تھا اس کے بعد چار گھنٹے کی مزید فلائٹ لے کر کراچی۔

ابھی ہم پہلے مرحلے میں تھے، اب جان گئے تھے کہ جہاز میں کچھ نہیں ملے گا اسی لیے بچوں کے لیے کافی کھانے پینے کی چیزیں رکھ لی گئی تھیں...... جو ہمارے بچے پوری فلائٹ میں کھاتے رہے۔

کوالالمپور ائرپورٹ پہنچ کر تھوڑی ہی دیر بعد سری لنکا کے لیے فلائٹ تھی...... وہی کالی، کالی ائر ہوسٹس ملیں...... فلائٹ اچھی گزری...... سری لنکا میں چونکہ دس گھنٹے کا اِسٹے تھا اسی لیے وہاں پر ائرپورٹ ہوٹل کے کمرے بک کرا لیے گئے تھے، تاکہ بچوں کے ساتھ پریشانی نہ ہو...... ائرپورٹ کی بس نے ہی ہوٹل چھوڑ دیا...... بچوں کا سارا سامان پیک تھا کہ بچے اپنے اپنے سوئمنگ کاسٹیومز مانگنے لگے۔ کسی کا ملا کسی کا نہیں ملا...... جس کا نہیں ملا وہ بچہ اپنے انہی کپڑوں کے ساتھ ہی پول میں کود گیا۔

آفاق بچوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہو رہے تھے کہ ان کے بچے ہر جگہ انجوائے کر رہے ہیں، کوئی بھی موقع ضائع نہیں کر رہے جبکہ مجھے کوفت ہو رہی تھی کیونکہ مجھ پر سفر سوار تھا کہ سب ساتھ خیریت کے واپس اپنے گھر پہنچیں۔

یہ ہوٹل بھول بھلیاں تھا، ایک طرف سے لگتا تھا کہ ابھی یہاں آئے تھے جبکہ یہ وہ جگہ ہی نہیں تھی۔ کسوئی سب بچوں کے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ بچے ذرا بھاگتے ہوئے آگے آ گئے...... وہ پیچھے رہ گئی...... جب سب جمع ہوئے تو ایمان نے کہا کہ کسوئی کہاں ہے پھر تو تو بچے نو مختلف سمت بھاگے۔ کسوئی، کسوئی کی آوازیں الگ لگ رہی تھیں اور کسوئی صاحبہ ایک ویٹر کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھیں...... پیچھے جو رہ گئی تھیں۔

اس ہوٹل میں رات ہی گزارنی تھی۔ صبح پانچ بجے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا...... ویٹر نے ہی صبح آ کر اٹھایا۔ بس کے ذریعے ائرپورٹ پہنچے...... جہاز جانے میں ابھی کافی ٹائم تھا تو ہم لوگ ائرپورٹ کی ہی ایک کافی شاپ پر بیٹھ گئے اور بچے گیمز کھیلنے لگے...... میں تھوڑی، تھوڑی دیر بعد کہہ بھی رہی تھی کہ دیر ہو رہی ہے مگر جناب فکرناٹ......

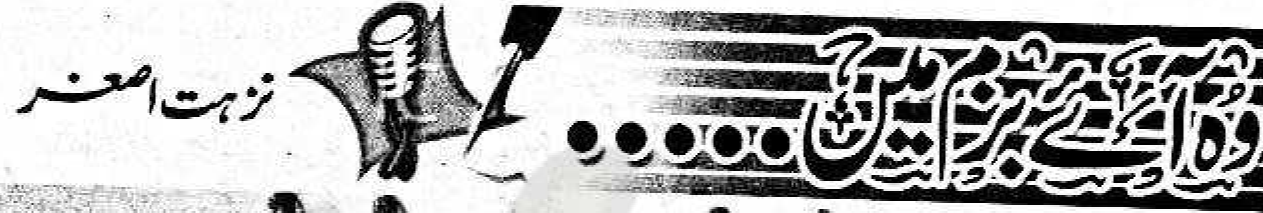
یہی ہوا کہ جب سب نے آرام سے اپنے دیو ہیکل کافی مگ ختم کیے تو جہاز کا عملہ لاؤنج کے باہر کھڑا اپنے لب و لہجے میں ہمارے نام پکار رہا تھا۔ آجا آفاق، اوظاما آفاق، اے مان آفاق وغیرہ......

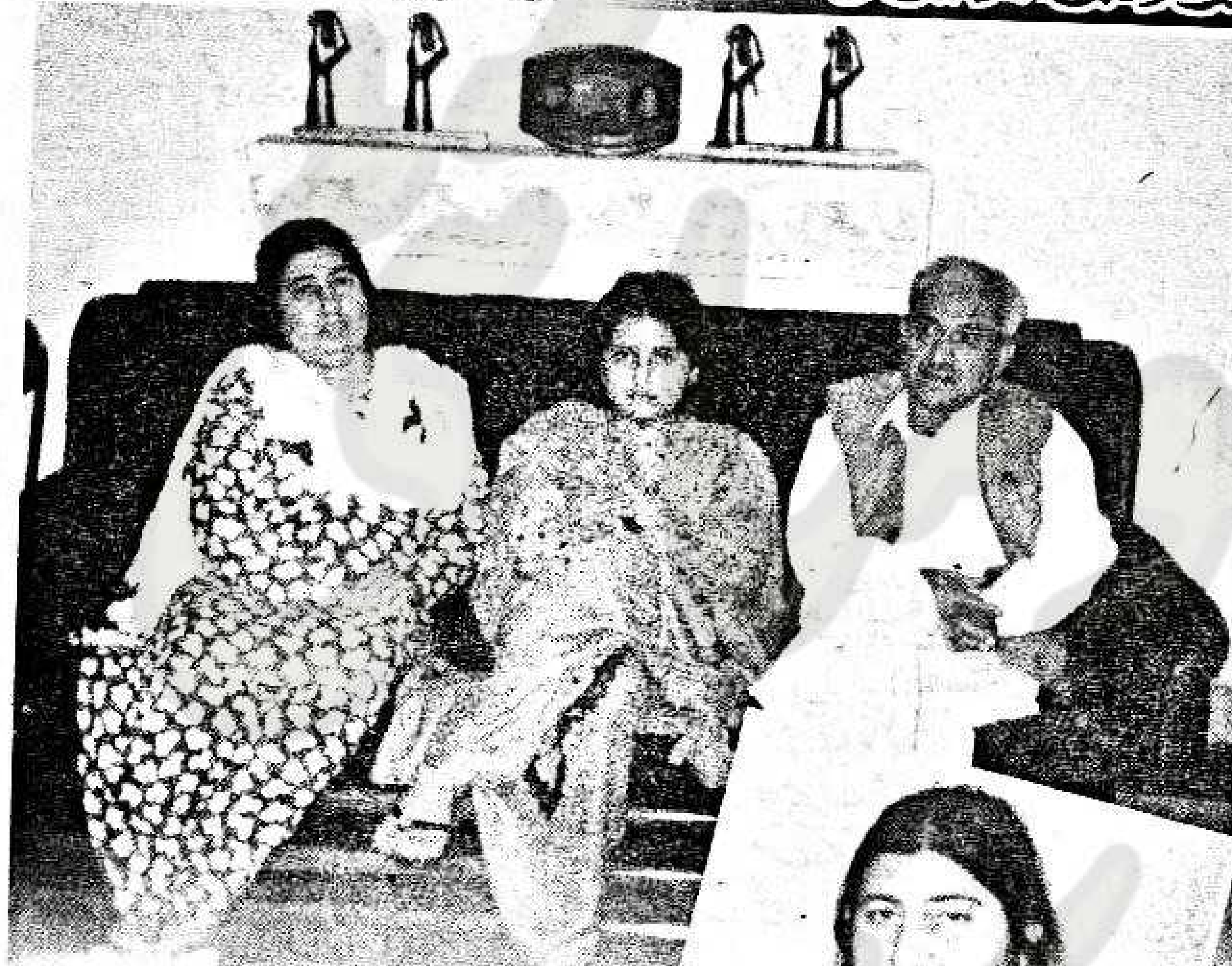
"ان لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمارے کان مروڑتے ہوئے ہمیں جہاز میں پہنچا ئیں...... کہ اتنی دیر سے آئے ہو......" میں نے صائمہ سے مذاق میں کہا۔

"دیر ہی ان لوگوں نے اتنی کر دی تھی۔" صائمہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

خیر جناب! کیسے اور کب یہ دن ختم ہو گئے...... بالکل پتا نہیں چلا...... میں تو سب سے کہوں گی کہ سفر کیجیے...... سفر میں انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے...... اپنی ان خوبیوں اور خامیوں سے آشنا ہوتا ہے، جس کا پہلے اسے گمان تک نہیں ہوتا...... ہر نیا سفر ایک نیا تجربہ ہوتا ہے اور یہ سفر ہماری زندگی کا ایک ایسا حسین تجربہ تھا جس کو میں تو کیا میرے بچے بھی کبھی فراموش نہیں کر پائیں گے۔ دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید تجربے کی حیثیت اور ہمت دے۔ (آمین) بے شک اللہ سب سے بڑا ہے اور ہم اس کا جتنا بھی شکر کریں وہ ہم ادا کر ہی نہیں سکتے۔

(ختم شد)





شمیم فضل خالق...... شوہر فضل خالق، بیٹی عندلیب خالق کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں

دلنواز شخصیت کی مالک

شمیم فضل خالق سے دلچسپ گفتگو

پُرذوق قارئینِ پاکیزہ کی خدمت میں بعد از سلام و دعا عرض ہے کہ آپ ماہِ رمضان المبارک کے برکات و فیوض سے فیض یاب ہو کر عیدالفطر کو شکرانے کے طور پر مناتے ہوئے اب واپس اپنے اپنے معمول کے امورِ زندگی انجام دے رہے ہوں گے۔

زندگی کے ماہ و سال یونہی گزرتے چلے جاتے ہیں اور وقت آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، کبھی ہم وقت کے ساتھ تو کبھی پیچھے، پیچھے چلتے چلے جاتے

ہیں۔ وقت سے آگے بڑھنے کی سکت وصلاحیت ہم عاصی بندوں میں کہاں...... ہاں وقت کے ساتھ ساتھ ضرور چلتے رہنا چاہیے تاکہ کسی بھی اعتبار سے نقصان اٹھانے والوں میں نہ رہیں۔

سو ہم بھی وقت کی باگ پکڑے رہنے کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اسی کوشش کے نتیجے میں دور دراز بسنے والی اپنی پیاری پیاری ہستیوں سے رابطے میں رہنے اور ان کے احوال آپ سب تک پہنچانے کے لیے مختلف اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اب امریکا سے ہوتے ہوئے ہم پشاور جا پہنچے جہاں ہماری بے حد محترم و روایت پسند ادیبہ نے بصد خلوص ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاکیزہ قارئین کے لیے نہایت مدلل اور مزیدار گفتگو کی...... چلیں اب زیادہ دیر نہیں لگاتے آج آپ کی ملاقات پاکیزہ رائٹرز کی چمکتی دمکتی کہکشاں میں شامل ایک خوش مزاج و باصلاحیت رائٹر محترمہ شمیم فضلِ خالق سے کرواتے ہیں کہ جن کی تحریر کا فضل وقتاً فوقتاً پاکیزہ قارئین کے ذوق کی تسکین کرتا رہتا ہے۔

حروفِ شمیم سے افسانوں کی صورت تو سب ہی مستفید ہوتے ہیں مگر آج ہم ان کے دل کی باتیں آشکار کرنے کی جرأت کر رہے ہیں جن سے قارئین یقیناً محظوظ ہوں گے تو عزیز ساتھیوں اور ہماری اس بزم کے بہی خواہوں کے لیے شمیم آپا کی دلچسپ و پُرلطف گفتگو حاضر ہے۔

پاکیزہ ✧...... سب سے پہلے تو شمیم آپا آپ ہمارا اور خوش ذوق قارئین کا سلام قبول کیجیے کہ جنہیں آپ سے باتیں کرنے اور آپ کی بابت جاننے کا شدید اشتیاق ہے اب بتایئے کہ آپ کو اس بزم میں شرکت کرنا کیسا لگ رہا ہے؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... نزہت جی، میں اپنی خوشی کو چھپا نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے اس بزم میں آ کر...... پاکیزہ کے پڑھنے والے اور لکھنے والے سب کے لیے میرے دل میں بے حد محبت ہے خدا سب کو خوش و خرم رکھے، آمین۔

پاکیزہ ✧...... شمیم آپا کچھ اپنے شہر کے حالات بتایئے؟ موسم اور معاشرت کس حد تک خوشگوار ہے؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... بس کچھ نہ پوچھو نزہت...... اپنے شہر پشاور کے حالات بہت ابتر ہیں۔ لوڈشیڈنگ نے الگ زندگی سے بیزار کر رکھا ہے۔ نہ جان محفوظ ہے نہ مال، ہاں موسم تو اب تک خاصا خوشگوار چل رہا ہے۔ جون کا مہینہ ہے لیکن پہلے جیسی گرمی نہیں۔ (قارئین خیال رہے کہ یہ بات چیت تین ماہ قبل کی ہے)

پاکیزہ ✧...... اچھا شمیم آپا آپ کا مکمل نام لینے کا اپنا ایک الگ ہی لطف ہے، آپ کو اپنا نام کیسا لگتا ہے؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... بہت اچھا، میرے نام کے ساتھ میرے شوہر کا نام جُڑا ہے اس لیے مجھے اپنے نام سے بہت پیار ہے۔ میرے شوہر نے ہمیشہ میرے لکھنے کے معاملے میں میری حوصلہ افزائی کی اس لیے ان کا یہ تو حق بنتا ہے ناں کہ میرے نام کے ساتھ ساتھ ان کا بھی نام لیا جائے۔ (جی ضرور)

پاکیزہ ✧...... لکھنے کے علاوہ کیا مشاغل ہیں؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... بہت سارے مشاغل ہیں۔ کوکنگ کا شوق ہے، لیڈیز کلبوں کی ممبر ہوں ان کی ہر تقریب میں شریک ہوتی ہوں۔ بے شمار فرینڈز ہیں ان کے ساتھ اس عمر میں بھی ہلا گلا رہتا ہے۔ رشتے داروں کے حقوق کا خیال رکھتی ہوں ان کی خوشی غمی میں شرکت کرتی ہوں اور کچھ کچھ سوشل ورک بھی کرتی ہوں غرض خاصی بزی لائف گزار رہی ہوں اور ہاں لکھنے کے علاوہ پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ پڑھنے کے لیے کوئی بک نہ ہو تو اداس ہو جاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... اگر آپ کا تعلق شروع سے ہمارے اس روایت پسند خطے سے ہے تو جہاں تک



شمیم فضلِ خالق لندن میں کچھ انگریز بچوں کے ساتھ۔ (ساتھ میں عندلیب (بیٹی) بھی ہے)

ہماری معلومات کا تعلق ہے یہاں تیس سے چالیس سال قبل تک خواتین کو صرف اندرونِ خانہ چھپا کر رکھا جاتا تھا، اب کیا صورتِ حال ہے؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... نزہت ڈیئر، اب صورتِ حال بدل چکی ہے اب گاؤں اور قصبوں میں تعلیم کی اہمیت تسلیم کی جا رہی ہے اور بہت غریب لوگ بھی اپنے بچوں بلکہ خاص کر بچیوں کو اچھی تعلیم دینے کے لیے کوشاں ہیں اور ایک بات کہوں نزہت...... کہ تیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مجھے لکھتے ہوئے تو اس وقت بھی مجھے کچھ خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا شاید کچھ مخصوص علاقے اب بھی ایسے ہوں جن میں خواتین کے حقوق کی پاس داری نہ کی جاتی ہو لیکن اکثریت ایسے علاقوں کی ہے جہاں خواتین کو سارے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آپ خود آزادیِ نسواں اور عورت کے بنیادی حقوق کی بحالی کی تحریک کی کس حد تک حامی ہیں؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... میں سمجھتی ہوں کہ عورتوں کو ان کے پورے حقوق ملنے چاہئیں کہ عورت اس معاشرے کا حصہ ہے اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں عورت کا اتنا ہی اہم رول ہے جتنا مرد کا۔ آج کی عورت کو تالوں میں بند نہیں رکھا جا سکتا آزادیِ نسواں کا نعرہ لگانے میں آپ مجھے سب سے پہلے پائیں گے۔

پاکیزہ ✧...... اسلامی نقطۂ نظر سے ایک مسلمان لڑکی یا عورت کیسی دکھائی دینی چاہیے؟

شمیم فضلِ خالق ✧...... حیا اور سادگی، مکمل لباس ایک مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا مذہب ہمیں بے حیائی کی تعلیم نہیں دیتا۔ سادگی زندگی کو آسان بناتی ہے۔ اوٹ پٹانگ فیشن اور عریانی کی اجازت نہ ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے نہ ہمارا معاشرہ اسے پسند کرتا ہے۔ آزادیِ نسواں کا ہرگز یہ

مطلب نہیں کہ ہم مادر پدر آزاد ہوکر زندگی گزاریں۔ آزادی بھی ایک قانون ایک قاعدے کے تحت حاصل کی جاتی ہے۔

پاکیزہ ✧......کیا آپ یا وہاں سے تعلق رکھنے والی دیگر رائٹرز اپنے اس فیلڈ میں کسی مشکلات یا پابندیوں کا شکار ہوئیں؟

شمیم فضل خالق ❖......نہیں نزہت، بالکل بھی نہیں ہمارا ویمن رائٹرز فورم ہے جہاں ہم ہر ماہ ایک میٹنگ کرتے ہیں جس میں مختلف لکھاری خواتین جمع ہوتی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ کسی رائٹر نے کبھی ایسی کوئی بات کی ہو کہ اسے کسی پابندی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ رہی مشکلات کی بات تو مشکلات کو پابندیوں کے ساتھ نتھی نہیں کیا جا سکتا۔ مشکلات مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں مثلاً ایک لکھاری خاتون کے چھوٹے، چھوٹے بچے ہیں اور وہ اسی مصروفیت میں لکھنے کو ٹائم نہیں دے پاتی تو یہ خالص اس کا ذاتی مسئلہ ہے اور ہماری خواتین ایسی پابندیاں خود پر خود ہی لگاتی ہیں ورنہ آج کل حالات بہت بہتر ہیں۔ (جی بالکل درست کہا آپ نے)

پاکیزہ ✧......آپ نے اپنے ذہن و قلم کو کب کہانیاں لکھنے کی طرف راغب پایا؟

شمیم فضل خالق ❖......میں سیونتھ کلاس میں تھی جب میں اخبارِ خواتین کے بچوں کے صفحے میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھتی تھی یہی وہ وقت تھا جب مجھ پر ادراک ہوا کہ میرا ذہن کہانیاں سوچ سکتا ہے اور میں اپنے قلم کو روک نہ پائی تب میں مختصر مضامین بھی لکھ کر اخبارات میں بھجوایا کرتی تھی۔

پاکیزہ ✧......آپ کے گھرانے کے کسی فرد نے کبھی آپ کے لکھنے پر کوئی اعتراض کیا؟

شمیم فضل خالق ❖......نہیں نزہت، میں جب گزرے زمانے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں آتی کہ کسی نے میری تحریر کے حوالے سے کوئی اعتراض کیا ہو ہاں جب میری پہلی بک منظرِ عام پر آئی تو اس کے فرنٹ پیج پر میری خاصی بڑی رنگین تصویر شائع ہوئی تھی اس پر خاصے اعتراضات ہوئے اور جب میرا ''پشتو ڈراما شاندار'' ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تو اس پر کچھ اعتراضات ہوئے تھے اس میں ہیروئن رات کے اندھیرے میں اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ فیملی والوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں لکھا لیکن خدا میرے میاں کو زندگی دے (آمین) وہ میرے سامنے ڈھال بن گئے اور انہوں نے یہ کہہ کر اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کر دیے کہ جب تک برائی کو عیاں نہیں کیا جائے گا تو اس کے برے نتائج لوگوں کو کیسے دکھائے جائیں گے۔ (ہاں یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧......ایک زمانے میں تو رسالے پڑھنا ہی برا فعل سمجھا جاتا تھا نا کہ رومانی یا عشقیہ داستانیں لکھنا بلکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاید لڑکی کی بھی یہی ذاتی خواہشات ہیں۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

شمیم فضل خالق ❖......بہت اچھا سوال ہے نزہت، میری جب شادی نہیں ہوئی تھی تو میں اپنے اکثر افسانے لکھ کر چھپا لیا کرتی تھی اور اس ڈر سے انہیں اشاعت کے لیے نہیں بھیجتی تھی کہ والد صاحب پڑھیں گے تو سوچیں گے کہ میری بیٹی کتنی بے شرم ہے لیکن جب شادی ہوئی تو بڑے دھڑلے سے عشق و محبت کے افسانے لکھا بھی کرتی تھی اور شائع بھی ہو جاتے لیکن میں نے اپنے یہ افسانے کبھی اپنے والد صاحب کو نہیں پڑھائے وہ مجھ سے اکثر پوچھتے بیٹی کوئی نیا افسانہ آیا ہے تمہارا تو میں مسکین سی شکل بنا کر کہہ دیتی کہ لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔ ہائے نزہت کیا، کیا یاد نہ دلا دیا تمہارے اس سوال نے......اب تو نہ والد صاحب رہے نہ ان کی محبتیں۔ (ارے آپا اداس نہ ہوں ان کی دعائیں ہر پل آپ



شمیم فضل خالق اپنی دوست کے ساتھ عندلیب کی سالگرہ کے موقع پر

کے ساتھ ہیں)

پاکیزہ ✧......آپ کے افسانے لائٹ موڈ اور معاشرتی موضوعات کے حامل ہوتے ہیں۔ فلسفے اور حکایتوں کے عمیق سمندر میں اترنا ضروری تو نہیں......آپ کا کیا خیال ہے؟

شمیم فضل خالق ❖......بالکل نزہت ایک ہلکی پھلکی تحریر کو آپ جتنا انجوائے کر سکتے ہیں اتنا ایک بھاری بھرکم تحریر کو نہیں کر سکتے اور ہم اس معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں کا ادراک کریں تو پڑھنے والوں کو کچھ آگاہی حاصل ہوگی۔ اگر کسی نے بھی ہمارے لکھے افسانوں سے کوئی سبق حاصل کیا تو یہ ہم رائٹرز کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گی کہ ہر رائٹر کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے اور ہر ایک کا اپنا الگ انداز۔ (جبھی تو مضامین میں تنوع نظر آتا ہے)

پاکیزہ ✧......ہم عصر لکھاریوں میں آپ کس سے متاثر تھیں یا آپ کو ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوئی ہو؟

شمیم فضل خالق ❖......بشریٰ رحمان میری پہلی پسندیدہ رائٹر تھیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا ان کے ناول اپنے کورس کی بکس میں چھپا کر پڑھتی تھی اور رضیہ بٹ بھی اس فہرست میں آتی ہیں ان کا ناول وحشی کئی کئی بار پڑھا تھا۔ ڈائجسٹوں کی دنیا میں آسیہ رزاقی کی تحریروں سے متاثر تھی بلکہ اب بھی ہوں۔

پاکیزہ ✧......آج کی رائٹرز کیسا لکھ رہی ہیں یا انہیں کیسا لکھنا چاہیے؟

شمیم فضل خالق ❖......زبردست لکھ رہی ہیں۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، انجم انصار، رفعت سراج...... کس، کس کا نام لوں کہ ہر رائٹر لاجواب لکھتا ہے اور نئی رائٹرز بھی بے حد اچھا لکھ رہی ہیں ان سب کے لیے کچھ کہنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا اللہ ان تمام کے قلم کو ہمیشہ چلتا رکھے، آمین۔ (بے شک آپا ہمارے یہاں بہت ٹیلنٹ

ہے۔بس سینئرز کی گائیڈنس کی ضرورت ہے تاکہ نئی آنے والیاں صحیح خطوط پر بہتر سے بہتر لکھیں)

پاکیزہ ✧......زندگی کے بدلتے رنگ کیسے لگتے ہیں۔آپ کس حد تک زندگی کے بدلتے رنگوں اور بدلتے موسموں کے ساتھ مطابقت رکھ پاتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......زندگی نام ہے پل، پل رنگ بدلنے کا اگر ہم زمانے کے ساتھ نہیں چلیں گے تو زمانہ ہمیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔اگر ہم ہر بات میں نئی نسل کو یہ کہتے رہیں کہ ہمارا زمانہ ایسا تھا اور ویسا تھا تو نئی نسل ہم سے کنی کتراتی پھرے گی۔اگر ہم ماضی کی طرف سفر کریں تو ہمارے زمانے میں ہماری نانی' دادی بھی اپنے زمانے کی باتیں کرتیں تو ہم بور ہوجایا کرتے تھے تو بھئی نزہت ہم کیوں اپنے بچوں کو بور کریں۔ان کو سن کر کیوں نہ خوش ہوا کریں۔ ویسے بھی ہم دوسروں کو بدلنے پر قادر نہیں ہیں لیکن خود کو تو بدل سکتے ہیں ناں اور میں اپنے نواسوں کے ساتھ پزا اور برگر کھانے جاتی ہوں ان کے ساتھ ٹی وی پر کارٹون فلمیں بڑے شوق سے دیکھتی ہوں اس لیے تو میں زرک خان اور ہاشم خان کی فیورٹ نانی ہوں۔(بہت خوب، جبھی تو جنریشن گیپ نہیں ہوگا)

پاکیزہ ✧......کیا سب بچے اپنے، اپنے گھریلو ماحول کے تابع ہوتے ہیں یا کوئی ایک بچہ اپنے خاندان سے بالکل متضاد رویوں کا حامل ہوتا ہے؟

شمیم فضل خالق ❖......اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو ایک ہی گھر میں پلے بڑھے بچے اور ایک والدین کی اولاد کی عادتوں اور رویوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔بہت کم بہن بھائی ایک جیسی عادتیں رکھتے ہیں۔میں یہاں اپنی مثال دوں گی کہ میرے گھر میں میرے خاندان میں کوئی ایک بھی رائٹر نہیں ہے۔ پڑھنے کے شوقین سب ہیں لیکن لکھنے کا شوق کسی کو بھی نہیں ہے۔(آپا یہ صلاحیتیں بھی خداداد ہوتی ہیں بس ان کو جلا بخشنے کی ضرورت ہوتی ہے)

پاکیزہ ✧......غیر شادی شدہ زندگی اور شادی شدہ زندگی میں آپ کی اپنی سوچ میں کس حد تک فرق آتا گیا؟

شمیم فضل خالق ❖......نزہت ڈیئر، غیر شادی شدہ زندگی میں لاابالی پن ہوتا ہے لڑکی کے اندر تھوڑی سی سرکشی ہوتی ہے ایک عجیب سی بہادری ہوتی ہے۔کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں ہوتا۔میں یہاں اپنی بات کررہی ہوں لیکن شادی ہونے کے بعد لڑکی کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے وہ رشتوں کو سمجھنے لگتی ہے اور اسے ان رشتوں کو نبھانے کا ہنر آجاتا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی عورت بن جاتی ہے ایک گھر کی مالکن بن جاتی ہے وہ بیوی، بھاوج، چچی اور ممانی بن جاتی ہے تو نزہت ان رشتوں کو میں نے ہمیشہ اہمیت دی اور میکے کے لاابالی پن کو وہیں چھوڑ دیا۔

پاکیزہ ✧......آج کی نوجوان نسل خاص طور پر لڑکیاں کیا سوچتی ہیں؟ آپ اپنی تحاریر میں جدید رنگ کس حد تک ڈالتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......مجھے آج کی لڑکی کی سوچ سے اختلاف ہے۔طلاق کی شرح زیادہ کیوں ہوتی جارہی ہے یہ اس لیے کہ بیوی اپنے آپ کو شوہر کے برابر نہیں بلکہ اس سے برتر سمجھتی ہے۔تعلیم اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی خود کو اتنے اونچے مقام پر فائز کرے کہ اسے شوہر کی کوئی پروا ہو نہ ساس سسر کی اور نہ دوسرے سسرالی رشتے داروں کی۔تھوڑا سا صبر، تھوڑی سی برداشت بہت سارے مسائل کا حل ہے جو آج کی لڑکی میں ناپید ہے۔میں اپنی تحریروں میں جدیدیت کو ساتھ لے کر چلتی ہوں لیکن میں اپنی تحریروں میں بھی نوجوان لڑکیوں کو بھلائی اور بہتری کا راستہ بتاتی ہوں۔(جی ہاں جب ہم مشرق کی زمین پر رہ کر مغرب کے رویوں کو اپنانا چاہتے ہیں تو انجام یہی ہوتا ہے۔ بالکل درست کہا آپ نے)



شمیم فضل خالق (دائیں طرف) اپنی بڑی بہن کے ساتھ نتھیا گلی میں

پاکیزہ ✧......ایک کہانی کار عام لوگوں سے کس طرح مختلف ہوتا ہے؟

شمیم فضل خالق ❖...... میرا نہیں خیال نزہت کہ رائٹر عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ہاں وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔حالات کو سمجھنے کی حس ایک لکھاری میں شاید عام لوگوں سے زیادہ ہوسکتی ہے ورنہ تو عام لوگوں اور لکھاری میں کوئی فرق نہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ نے اپنے بچوں کی تربیت میں کس بنیادی اصول کا خیال رکھا؟

شمیم فضل خالق ❖......میری ایک بیٹی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ایماندارانہ روش اپنائے اس کے کسی قول، کسی فعل میں تضاد نہ ہو اور میری اسی تربیت کو اس نے اپنایا اور آج وہ خدا کے فضل سے ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔(ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧......اپنے دن بھر کی مصروفیات اور مشاغل سے ہمیں بھی آگاہ کریں؟

شمیم فضل خالق ❖......نزہت، ہر صبح کی ابتدا اللہ کے پاک نام سے کرتی ہوں یعنی فجر کی نماز پڑھتی ہوں پھر دوبارہ سوجاتی ہوں۔ کیا کروں نزہت بس سونے کی دلدادہ ہوں پھر نو بجے اٹھتی ہوں' ناشتا کرتی ہوں ناشتا میرا ہلکا پھلکا سا ہوتا ہے پھر گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہوں کوکنگ کا شوق ہے لیکن ہر روز کھانا نہیں بناتی کبھی کبھار کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتی ہوں۔ تلاوت قرآن پاک کرتی ہوں لیکن پابندی سے نہیں کرتی۔میرا لکھنے کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔سرہانے کتابوں کا ڈھیر پڑا رہتا ہے قلم اور کاغذ ہروقت دستیاب ہیں جب بھی دل چاہا لکھنے بیٹھ جاتی ہوں اور پڑھنا تو ساتھ، ساتھ چلتا ہے۔فون پر دوستوں سے لمبی لمبی گپیں چلتی ہیں۔لنچ اپنے میاں کے ساتھ کرتی ہوں۔ بیٹی اور نواسے آجائیں تو سب مل کر لنچ کرتے ہیں دوپہر کو نیند تو نہیں آتی بس قیلولہ کرلیتی ہوں۔شام کو واک کرتی ہوں۔ٹی وی دیکھتی ہوں جس میں آٹھ بجے کا ڈراما نہیں چھوڑ سکتی اور دن اسی روٹین میں گزر جاتا ہے شاپنگ کا بھی شوق ہے اگر گرمی نہ ہو تو صبح سے شام تک بازاروں میں بور نہیں ہوتی۔(واہ بھئی)

پاکیزہ ✧......عمر کا کون سا دور اچھا ہوتا ہے اور کس حوالے سے؟

شمیم فضل خالق ❖......عمر کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔بچپن، جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپا اگر میرا خیال پوچھتی ہو نزہت تو جوانی قدرت کا وہ عطیہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں..... ہائے کیا جوش ہوتا

ہے کیا جذبہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر چڑھنے اور چاند پر کمند ڈالنے کو دل کرتا ہے۔ آسمان سے ستارے توڑ کر لانا آسان لگتا ہے۔ ہر مشکل حالات سے انسان اتنی آسانی سے گزر جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن افسوس کہ جوانی کا یہ دور بہت عارضی ہوتا ہے بے حد کم ہوتا ہے۔ شاید یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ (اور یہی حقیقت ہم سب کو نا قابلِ قبول ہوتی ہے)

پاکیزہ ✧......شادی ماں باپ کی پسند سے کی یا اپنی پسند بھی شامل تھی......؟ (معاف کیجیے گا)

شمیم فضل خالق ❖......کیا بات کرتی ہو نزہت جان......میں نے یقین کرو شادی کی رات کو ہی اپنے شوہر کو دیکھا تھا اور انہوں نے بھی مجھے شادی کی رات کو دیکھا تھا۔ پسندیدگی کی سند میرے والد صاحب نے ان کے حق میں دی تھی لیکن زندگی بڑی اچھی گزری اور گزر رہی ہے ان کے ساتھ اور آئندہ بھی اچھی گزرے گی انشاءاللہ۔ معاف کرنا میں اب بھی ان کو ان کہہ کر پکارتی ہوں۔ (واہ یہی تو مشرقی حسن ہے جس پر ہزار خوب صورتیاں قربان)

پاکیزہ ✧......عام لوگوں کے کون سے رویے دکھ پہنچاتے ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......جب کوئی مغرورانہ انداز میں پیش آئے۔ کچھ لوگ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں جبکہ برتر صرف خدا کی ذات ہے بندہ کوئی چیز نہیں پھر غرور کس بات کا......مجھے مغرور لوگ بالکل بھی پسند نہیں اور چاہے یہ رویے میرے ساتھ ہوں کسی اور کے ساتھ ہوں تو بھی میرے دل کو دکھ پہنچتا ہے۔ (یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧......اپنے دل کی خوشی کے لیے کیا کرتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......نزہت، میری عادت ہے کہ میں اپنے دل کے لیے نہیں دوسروں کی خوشی کے لیے زیادہ متردد رہتی ہوں اور دوسروں کی خوشی کے لیے بعض اوقات اپنے دل کی پروا نہیں کرتی۔

پاکیزہ ✧......وقت کی رفتار سے قدم ملا کر چلنے میں ہی کامیابی ہے کس حد تک آپ اس پر عمل پیرا ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......میرا خیال ہے کہ ہر انسان کو وقت کی رفتار سے چلنا چاہیے ورنہ جو وقت کی رفتار سے نہ چلے تو وہ انسان بہت پیچھے رہ جاتا ہے میں وقت کے ساتھ چلنے کی کوشش تو کرتی ہوں لیکن وقت بہت تیز رفتار ہے۔

پاکیزہ ✧......تنہائی میں کیا سوچتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......اگر میں کہوں کہ کہانیوں کے تانے بانے بُنتی ہوں تو آپ ضرور ہنسیں گی لیکن نزہت جی، ایک رائٹر کہانی کے بارے میں ہی سوچ سکتا ہے لیکن اور بھی لاتعداد سوچیں ہیں جو تنہائی میں حملہ آور ہو جاتی ہیں......اب کیا، کیا بتاؤں۔

پاکیزہ ✧......شعر و شاعری سے کس حد تک شغف ہے کوئی پسندیدہ شاعر یا شعر؟

شمیم فضل خالق ❖......شاعری سننی اچھی لگتی ہے لیکن شاعری کہنی مجھے بہت مشکل لگتی ہے مگر میں شاعروں سے بہت عقیدت رکھتی ہوں۔ ایسے ہی ایک بہت بڑے شاعر تھے غلام محمد قاصر وہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے وہ آپ بھی سنیے......

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو، ورنہ مے خانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جن کے نین نشیلے تھے

ایک ہماری ویمن رائٹرز فورم کی شاعرہ ہیں جن کا نام ہے سیدہ صوفیہ احمد ان کی ایک نظم مجھے بہت پسند ہے۔ طوالت کا احساس تو ہے لیکن اس کے ایک دو بند یہاں تحریر کرتی ہوں۔

میرا دل ہے یا الماری
اس دل میں کتنے خانے ہیں
میرا اپنا کون سا خانہ ہے

میں کس خانے میں رہتی ہوں
میں کیسے کیسے رشتوں میں
ہر لمحہ بٹتی رہتی ہوں
میں عورت ہوں یا بیٹی ہوں
محبوبہ ہوں یا بیوی ہوں
میرا اپنا کون سا خانہ ہے
میں کس خانے میں رہتی ہوں

پاکیزہ ✧......اپنی ذاتی پسند و ناپسند کا بھی اظہار کریں؟

شمیم فضل خالق ❖......رنگ میں پنک کلر پسند ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی نزہت لیکن مجھے پنک کلر صرف کپڑوں کی حد تک پسند نہیں میرا تولیا، باتھ روم میں میری بالٹی، دیواروں کے ٹائلز غرض ہر چیز کا رنگ پنک ہے۔ (آپ خود بھی تو ماشاءاللہ پنک ہیں) پسندیدہ موسم تو بہت سردی اور بہت گرمی تنگ کرتی ہے سمجھ لیں کہ بہار کا موسم ہی پسند ہے۔ لباس میں سادہ قمیص شلوار اور بڑا سا دوپٹا جس کے ساتھ نماز پڑھی جاسکے۔ پنک کلر کے میرے بے شمار سوٹ ہیں۔ کھانے میں سبزی پسند ہے لیکن گوشت بیچ میں ضرور موجود ہو مثلاً کدو گوشت، ساگ گوشت، قیمہ کریلے وغیرہ چکن اور بریانی شوق سے نہیں کھاتی ہاں پلاؤ کھا لیتی ہوں لیکن جس کے ایک ایک نوالے کے ساتھ گوشت موجود ہو۔ پٹھان ہوں نزہت جی کوئی مذاق نہیں ہے۔ (جی بالکل! ہم اس غیور اور بہادر قوم کا بہت احترام کرتے ہیں) خوشبو چنبیلی کی پسند ہے اور پھول گلاب کا۔ شخصیت، عمران خان کی پسند ہے لیکن پی ٹی آئی میں نہیں ہوں جہاں تک کسی پسندیدہ جملے کا تعلق ہے تو محبتیں بانٹو کہ محبتیں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ (واہ کیا بات کی ہے)

پاکیزہ ✧......کس کے سامنے بے جھجک اظہارِ رائے کرتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......میاں کے سامنے بھی بے جھجک اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں اور اپنی دوستوں سے بھی کوئی بات نہیں چھپاتی ان سے بھی بے جھجک اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......خدا کی دیگر مخلوقات مثلاً جانوروں اور پودوں کو کس حد تک پسند کرتی ہیں یا اہمیت دیتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......اس سلسلے میں، میں بہت رحم دل ہوں۔ کاکروچ کو مارنے سے بھی مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میری بیٹی نے ایک بلی پالی تھی یقین کریں میں اس کے کھانے پینے اور نہانے تک کا خود خیال رکھتی تھی۔ پودوں کو پانی دیتی ہوں لیکن مجھے نہ جانور پالنے کا شوق ہے نہ پیڑ پودوں سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی ہے لیکن سبزہ اور پھول کسے اچھے نہیں لگتے۔

پاکیزہ ✧......گھومنے پھرنے، سیر و تفریح کا کس حد تک شوق ہے؟

شمیم فضل خالق ❖......بہت شوق ہے، ہر گرمی میں ایبٹ آباد، مری اور نتھیا گلی کا چکر لگتا ہے۔ موسم سرما میں اسلام آباد اور لاہور کا چکر لگاتی ہوں۔ کبھی فیملی کے ساتھ کبھی دوستوں کے ساتھ لیکن اصل مزہ تو دوستوں کے ساتھ آتا ہے ابھی چند دن پہلے دوستوں کے ساتھ اسلام آباد کا چکر لگایا بہت مزہ آیا جی بھر کر ہنسے بہت باتیں کیں اور پیٹ بھر کر مختلف کھانے کھائے۔

پاکیزہ ✧......اپنی شخصیت میں کس بات کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

شمیم فضل خالق ❖......میں سادگی کو پسند کرتی ہوں بے حد سادہ سی ہوں اور جب کچھ فیشن ایبل ہستیاں حیران ہو کر پوچھتی ہیں کہ آپ سچ مچ رائٹر ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کیا رائٹر ہونے کے لیے فیشن ایبل ہونا ضروری ہے۔ مجھے تو اپنی شخصیت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی لیکن غالباً لوگوں کو ہوتی ہے تو میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ (سب

اپنے، اپنے حساب سے دیکھتے ہیں آپا!)

پاکیزہ ✧......اس بزم میں آنا اور ڈھیروں باتیں کرنا کیسا لگا؟

شمیم فضل خالق ❖......نزہت ڈیئر، بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنا مزہ آیا مجھے لگتا ہے جیسے میرا من ہلکا پھلکا سا ہوگیا ہے میں انتہائی مشکور ہوں۔ تمہاری اور پاکیزہ کی جس نے مجھے یہ موقع دیا۔ (آپ کا بھی بے حد شکریہ) مجھے بہت زیادہ اچھا لگا نزہت......لگتا ہے جیسے دل سے سارا زنگ اتر گیا اور اس کا کریڈٹ آپ کو اور پاکیزہ کو جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧......بچوں کو یا اپنے سے چھوٹوں کو کیا دعا دیتی ہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......خوش رہو، زندہ رہو۔

پاکیزہ ✧......پُرلطف ، پُرمزاح ، پُرروح کتاب کون سی ہوتی ہے؟

شمیم فضل خالق ❖...... پاکیزہ جیسی۔

پاکیزہ ✧......نو آموز رائٹرز اور شوقین لکھاریوں کے لیے کوئی اچھی بات؟

شمیم فضل خالق ❖......لکھنا بہت بڑی ذمے داری ہے اس ذمے داری کو دل سے نبھائیں۔ اگر آپ دل سے لکھیں گی تو آپ کے قلم سے کوئی بہت بڑا شاہکار جنم لے سکتا ہے ہاں اس کے لیے بہت زیادہ مطالعہ کیجیے۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ کے قارئین سے کوئی دل کی بات کہنا چاہیں؟

شمیم فضل خالق ❖......میرے افسانوں میں میرے دل کی ہی باتیں ہوتی ہیں اور وہ میں پاکیزہ کے قارئین سے ہر دوسرے تیسرے ماہ شیئر کرتی ہوں۔ ہاں ایک بات کہوں گی کہ پلیز میرے افسانے پڑھیے اور محفل میں ان پر رائے ضرور دیا کریں کہ مجھے آپ کی تعریف اور تنقید دونوں کا انتظار رہتا ہے۔ (جی قارئین آئندہ خیال رکھیے گا)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ کے مزید نکھار اور مقبولیت کے لیے کوئی تجویز، رائے، مشورہ؟

شمیم فضل خالق ❖......میری رائے ہے کہ پاکیزہ میں بھی ایوارڈز کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ہر ماہ ایک اچھی کہانی کا انتخاب کیا جائے اور ہر سال ایک گرینڈ فنکشن کیا جائے جس میں منتخب کہانیوں کے رائٹرز کو انوائٹ کرکے ان کو ایوارڈز سے نوازا جائے۔

واہ شیمم جی مزہ آگیا۔ آپ سے باتیں کرکے سب سے پہلے تو ذاتی طور پر مجھے بہت ہی اچھا لگا ایسا لگا کہ ایک کم سخن اور تنہائی پسند سے میں نے بھرپور نشست رکھی لیکن آپ کی کم سخنی اور تنہائی پسندی کی خود میں نے نفی کردی آپ تو بہت پُرجوش، زندہ دل اور محبت کرنے والی ہستی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حاضری اسی طرح پاکیزہ میں لگواتا رہا۔ الٰہی آمین۔

☆☆☆

جی قارئین ہماری اس رائے سے آپ بھی اتفاق کریں گے...کہ شیمم فضل خالق سے گفتگو کرکے بہت سے حقائق سامنے آئے اس طرح مختلف جگہوں سے تعلق رکھنے والی رائٹرز سے تبادلۂ خیالات ہوتے رہنا چاہیے۔ بہت کچھ سننے اور جاننے کا موقع ملتا ہے۔ بس انہی اختتامیہ کلمات کے ساتھ اب اس بزم سے اجازت کہ شیمم فضل خالق کو شوہرِ نامدار کی خدمت کے لیے اچھا سا ڈنر تیار کرنا ہے۔ اس گفتگو پر اپنے پیارے قارئین کے خیالات کے منتظر رہیں گے اس چھوٹی سی' اچھی سی بات کے ساتھ رخصت طلب کرتے ہیں کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں......

اللہ نگہبان!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

جا کے سسرال گوری میکے کی لاج رکھنا

شائستہ زریں

''کیا غضب ڈھا رہی ہیں آپ، بھتیجی لا رہی ہیں، گھر کا ماحول بھی خراب اور تعلقات الگ کمزور پڑ جائیں گے۔ دیکھا نہیں ہم ماموں کی بیٹی لائے تھے کیا تباہی مچادی ہے اس آفت کی پرکالہ نے۔''

''ضروری نہیں کہ ہر ایک کا تجربہ یکساں ہو، میری بھاوج نہایت سمجھدار اور محبت کرنے والی خاتون ہیں اور میری ہونے والی بہو ہما ان ہی کی صفات کا پرتو ہے۔ انشاء اللہ سابقہ تعلقات کبھی کمزور نہیں پڑیں گے۔''

یہ اور اس جیسی کئی باتیں ہمارے سماج کا المیہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی اپنوں میں ہو یا غیروں میں سارا انحصار فریقین کی طبیعت، مزاج اور تربیت پر ہوتا ہے، حسنِ سلوک سے تو ٹوٹتی ڈور بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بعض جگہ تو اپنے ہی گھرانے کے داماد وہ رنگ دکھاتے ہیں کہ لڑکی کو بھی ڈھنگ بھولنے سے لگتے ہیں لیکن دلہن اگر سمجھدار ہے تو نہ صرف میکے اور سسرال میں اپنے نرم رویے اور معاملہ فہمی سے بگڑی بات سنبھال لے گی بلکہ تعلقات کی کمزور ہوتی ڈور کو مضبوطی سے تھام کر سابقہ تعلقات بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، وہ دے گی کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ قربانی کبھی رائگاں نہیں جاتی اور پھر شادی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانے میں دعاؤں کا کوئی مول نہیں۔ بلاشبہ دعا ردِ بلا ہوتی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ دعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی جاری رکھیں اور اس دوا کا نسخہ بھی حسبِ موقع و ضرورت استعمال کریں تو کامیابی یقینی ہے۔

ان ہی امور کے پیشِ نظر حسبِ روایت پاکیزہ کے دلہن نمبر کے لیے ہم نے چند دلہنوں سے رابطہ کر کے معلوم کیا کہ۔

سوال ۱: قریبی رشتے داروں میں شادی کرنے سے دونوں گھرانوں میں تعلقات مزید مضبوط ہوتے ہیں یا کمزور پڑ جاتے ہیں؟ اس ضمن میں دلہن کا کیا کردار ہوتا ہے؟

سوال ۲: شوہر اور سسرال والوں کے دل پر راج کرنے کے لیے دلہن کو کیا قربانیاں دینی پڑتی ہیں؟ کیا یہ قربانیاں رنگ لاتی ہیں؟

سوال ۳: کوئی ایسی دعا، ٹوٹکا یا نسخہ جو شادی کی گاڑی کو کامیابی سے چلا سکے؟

شازیہ انوار
اسسٹینٹ ایڈیٹر
مصالحہ ٹی وی فوڈ میگ

۱: شادی رشتے داروں میں ہو یا غیروں میں دونوں صورتوں میں تعلقات کمزور ہی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمارا معاشرہ آج بھی دورِ جاہلیت کی روایات میں جکڑا ہوا ہے جہاں بیٹے کے لیے چاہ سے لائی جانے والی لڑکی خواہ بھانجی یا بھتیجی ہی کیوں نہ ہو چند دنوں میں محض اس لیے کھٹکنے لگتی ہے کہ وہ ان کے بیٹے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتی ہے، کچھ مائیں ان موقعوں پر سمجھداری سے کام لیتے ہوئے تعلقات کو مضبوطی کی جانب لے جاتی ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ دلہن چونکہ زندگی کا نیا سفر شروع کرتی ہے اس لیے اس کی

توقعات کی سطح بلند ہوتی ہے، تاہم اگر لڑکی سمجھداری سے کام لے کر سسرال میں میکے اور میکے میں سسرال کے مسائل کا تذکرہ نہ کرے تو یقیناً دونوں جانب سے بہتر تعلقات ہی استوار رہیں گے۔ بصورتِ دیگر میں سمجھتی ہوں کہ طرفین کے تعلقات کی مضبوطی میں دولہا اور دلہن دونوں کو اپنا، اپنا کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ اولاد کی باتیں خواہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہوں والدین کو زیادہ بری نہیں لگتیں جبکہ بہو یا داماد کی اچھی بات بھی بعض اوقات برے معنی پہن لیتی ہے۔

۲: میرے خیال میں تو قربانی نام کی گھٹی تو



شازیہ انوار

سامنے والی پارٹی کو بھی پلانی چاہیے لیکن فی الحال جو صورتِ حال ہے اس میں لڑکی کو اپنی گفتار کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ اصل میں ہوتا یوں ہے کہ دولہا کے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے شدید اختلافات ہوں تب بھی اس کی بیوی کو ان کی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حق نہیں ہے۔ شوہر کے والدین کی خدمت، اس کے بہن بھائیوں کی خوشی کا خیال رکھنا (جو کہ قرآن و سنت کی رو سے لڑکی کا فرض نہیں) اس کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کی ضروریات اور خواہشات کا خیال رکھنا ہی کسی دلہن کی خوشحال زندگی کا راز ہوسکتا ہے، وہ خاموشی سے ان جملہ امور میں جتی رہے تو ٹھیک ہے جہاں اس نے لب کشائی کی جرأت کی وہاں دلہن خواہ کسی بھی طبقے کی ہو اس کو گھریلو ناچاقی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

۳: عیاری، دوغلاپن اور چرب زبانی کا ایندھن شادی کی گاڑی کو روانی سے کھینچنے کا سبب بن سکتا ہے۔ عام زندگی میں اگر کسی انسان میں یہ تینوں صفات ہوں تو شاید ہم اس سے دوستی رکھنا بھی پسند نہیں کریں گے لیکن شادی شدہ زندگی کی گاڑی ان تین پہیوں پر چلتی نظر آتی ہے۔ لڑکی کو اتنا عیار ہونا چاہیے کہ وہ معاملات کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر بات کرے اس میں اتنا دوغلا پن ضروری ہے کہ وہ غلط کو صحیح قرار دیتی ہے جبکہ چرب زبانی اضافی خوبی سمجھی جائے گی، جس کے ذریعے وہ سیاہ کو سفید بناتی رہے۔ دیکھیے پھر کیسے زن، زن چلتی ہے گاڑی۔ میرے دوست میرے رفیق، دین اور دنیا سچائی کا درس دیتے ہیں لیکن درحقیقت سچ بولنے والوں کے لیے ہی دنیا کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے۔

تحریم زبیری
ٹی وی آرٹسٹ

۱: قریبی رشتے دار ہوں یا غیر اگر دولہا اور دلہن کے والدین ایک دوسرے کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کریں گے تو رشتہ بھی خراب ہوگا اور تعلقات بھی متاثر ہوں گے اور اگر ایک دوسرے کا خیال رکھا جائے تو یقیناً تعلقات مزید بہتر ہی ہوں گے۔ اس ضمن میں دلہن کا کردار دو طرح سے سامنے آتا ہے اول یہ کہ اگر وہ ناسمجھ اور کچے ذہن کی ہے، بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادت ہے تو اس سے بھی بات بہت بگڑتی ہے اس کے برعکس اگر سمجھدار ہوگی تو منہ بند اور آنکھیں کھلی رکھے گی۔ کسی بھی بات



تحریم زبیری

کو بڑھانے کے بجائے برداشت سے کام لے گی تو تعلقات کمزور پڑنے کا سوال ہی نہیں۔

۲: صرف لڑکی ہی نہیں بعض جگہ تو سسرال والے بھی قربانی دے رہے ہوتے ہیں۔ بیٹی کی تربیت میں یہ بات شامل کر کے ہی سسرال بھیجیں کہ وہ کوئی مظلوم کردار نہیں بلکہ ایک طاقتور ہستی ہے اور اسے اپنی طاقت کو رشتوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کرنا ہے۔ یوں بھی جب نیک نیتی کے ساتھ ہم اوروں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں تو بندوں سے زیادہ اللہ کی طرف سے اس کا صلہ بھی تو ملتا ہے ناں!

۳: برداشت اور صرف برداشت ...... یہ وہ واحد رشتہ ہے جو سب سے خوب صورت بھی ہے اور مضبوط بھی اور کسی وقت بہت نازک بھی ہو جاتا ہے سو اس خوب صورت رشتے کی ڈور کو محبت سے باندھیں رکھیں سیاست سے نہیں کہ اس سے ڈور الجھ کر ٹوٹ بھی سکتی ہے۔

شگفتہ یاسمین
اینکر پرسن

۱: اگر قریبی رشتے داروں میں آپس میں تعلقات اچھے ہیں تو شادی کریں ورنہ نہیں کیونکہ جب پرانا رشتہ ہی کمزور ہے تو ایک نیا رشتہ کیسے مضبوط ہوسکتا ہے؟ اور اگر شروع ہی سے تعلقات اچھے ہیں شادی کے بعد کمزور ہوئے ہیں تو اس میں دلہن کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کا کردار بھی اہم ہے کیونکہ اگر وہ اپنی سسرال میں پہلے جیسا رویہ نہیں رکھتی تو مسئلہ ہوگا اور اگر سسرال والوں کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے تو تب بھی دلہن پریشان ہوگی تو وہ اپنی ماں کو ضرور بتائے گی اس طرح دونوں گھرانوں میں مسئلہ شروع ہو جائے گا۔ اگر سسرال والے لڑکی کو ساتھ لے کر چلیں اسے space دیں تو دلہن اور سسرال والوں کی کوشش سے سدھار آسکتا ہے۔

۲: کافی جگہ خاموشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا، تحمل اور خاموشی



شگفتہ یاسمین

سے معاملات بڑھتے نہیں ہیں۔ دو تین مہینے بعد ہی کافی چیزیں دلہن کے فیور میں چلی جاتی ہیں۔ محض خاموشی اور برداشت کی وجہ سے اس سے اختلاف رکھنے والے بھی اس کے اپنے بن جاتے ہیں اور شوہر کے دل پر دلہن اس وقت بھی راج کر سکتی ہے جب وہ

تمہاری امی اور تمہاری بہنوں کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے امی اور بہنیں کہہ دے۔ اس سے دلہن کا سسرال والوں سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔

۳: انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کریں اور ایک ایک لمحہ خوشی سے گزاریں، ایک دوسرے کے اچھے دوست بنیں گے تو گاڑی دوڑ لگائے گی اور بغیر کسی حادثے کے چلتی رہے گی۔ انشاء اللہ!

ندا شہزاد
گھریلو خاتون

۱: شادی محض دو افراد نہیں بلکہ دو خاندانوں کو جوڑنے کا نام ہے۔ اس لیے کزنز میں شادی کرنے سے تعلقات مزید مضبوط ہوتے ہیں اور پہلے سے زیادہ دونوں خاندان ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں اور ان کو قریب لانے میں دلہن کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ دلہن سسرال والوں کی برائیاں میکے میں نہ کرے اور میکے والوں کی باتیں سسرال میں نہ کرے اور اپنے شوہر کو گھر والوں سے بدگمان نہ کرے اگر دلہن اپنا یہ کردار صحیح طریقے سے نباہتی ہے تو یہ ڈور مزید مضبوط ہوگی۔


ندا شہزاد

۲: حقیقتاً کافی قربانیاں دینی پڑتی ہیں سب سے بڑی قربانی تو یہی ہے کہ لڑکی ایک شخص کی خاطر اپنے ماں باپ اور گھر بار کو چھوڑ کر آتی ہے اور اپنا آپ مکمل طور پر اسے سونپ دیتی ہے۔ اپنا وقت انہیں دیتی ہے اور اپنی بعض خواہشات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قربانیاں رائگاں نہیں جاتیں کیونکہ دلہن کو اپنی قربانیوں کا صلہ خوشگوار ازدواجی زندگی کی صورت میں ملتا ہے۔

۳: دلہن میں قوتِ برداشت ہو، اپنی ذمے داری خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہے اور خدمت گزاری اور سلیقہ شعاری جیسی صفات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے تو اور کسی نسخے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

فائقہ فرحان
گھریلو خاتون

۱: تالی بجتی تو دونوں ہاتھوں سے ہے مگر اس معاملے میں دلہن پر زیادہ دباؤ ہوتا ہے کچھ باتیں اگر دلہن درگزر کر دے تو رشتے کمزور نہیں پڑتے بلکہ مضبوط ہو جاتے ہیں سارا دارومدار لڑکی پر ہوتا ہے۔

۲: سچ کہا جائے تو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں تب جا کر لڑکی اپنی جگہ بنا پاتی ہے۔ ہر گھر کے طور طریقے الگ ہی ہوتے ہیں چاہے رشتے دار ہوں یا غیر۔ اگر ابتدا میں لڑکی من مانی کرتی ہے تو اس کا اثر سسرال والوں پر اچھا نہیں پڑتا۔ میرے خیال سے نوے فیصد تو قربانیوں کا صلہ ملتا ہی ہے۔

۳: میرے خیال سے تو منوانے سے زیادہ ماننے میں مزہ آتا ہے۔ کچھ عرصہ صرف مانتی رہیے، پھر آپ کی ہی مانی جائے گی۔ اگر دل سے سسرال سے وابستہ رشتوں کی عزت کی جائے تو محبت ہر حال میں ملتی ہے مگر تھوڑا وقت لگتا ہے۔

ثنا کامران
گھریلو خاتون

۱: شادی کے فوراً بعد بہت اچھے اور جوں جوں


فائقہ فرحان


ثنا کامران

وقت گزرتا جاتا ہے خراب سے خراب تر ہوتے جاتے ہیں۔ دلہن پنگ پانگ کی گیند بن جاتی ہے۔ کس کی سنے کسے منائے۔

۲: دلہن کو ہر قدم پہ مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے، اپنے آپ کو وقف کرنا پڑتا ہے۔ تمام عادات اور اطوار کو بدلنا پڑتا ہے، اچھے لوگ ہوں تو قدر کرتے ہیں اور قربانی ضائع نہیں جاتی۔

۳: میاں بیوی ایک دوسرے پر بھروسا کر کے ہر فیصلہ کریں۔ ایک دوسرے کے باس بننے کی کوشش نہ کریں تو کامیاب سفر گزرے گا۔

نجمہ شکیل
گھریلو خاتون

۱: محبت بڑھتی ہے۔ لڑکی کا کردار بہت اہم ہے کہ سسرال اور میکے میں ہرگز ایک دوسرے کی باتیں نہ بتائے، سسرال کی بات سسرال میں اور میکے کی میکے ہی میں رہے تو بہتر ہے اور جو ایسا نہیں کرتیں وہاں لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوریاں بھی بڑھتی ہیں۔ لڑکی کی کوششوں سے دونوں گھرانے پہلے سے بھی زیادہ قریب آ سکتے ہیں اگر لڑکی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دے، اپنی مرضی مسلط نہ کرے اور سسرال اور میکے کے معاملات ان کی نفسیات سمجھتے ہوئے ڈیل کرے اور صلاح و مشورے سے بات کرے تو دونوں گھرانوں میں قربت بھی بڑھے گی۔ خاندان میں شادی کرنے سے چونکہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے گھر والوں کے بارے میں سب جانتے ہیں تو دونوں مل کر حکمتِ عملی سے اپنے خاندان کو مضبوط کر سکتے ہیں۔

۲: سب سے پہلے تو اپنے اندر صبر اور برداشت کو بڑھانا ہوگا اپنی مرضی چلانے کے بجائے شوہر کی باتوں کو فوقیت دے تو اپنا مقام بنا سکتی ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو سب سے زیادہ اپنے آپ کو بدلنا ہوتا ہے، سسرال میں جو دستور نافذ ہے اس کو اپنی زندگی پر لاگو کرے تو شوہر کیا تمام خاندان پر راج کیا جا سکتا ہے۔ ہر گھر کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے اور یہی سب سے بڑی قربانی ہے کہ اپنی زندگی، اپنے معمولات اپنی سسرال اور شوہر کے مطابق طے کرے اور یہ قربانیاں اس وقت رنگ لاتی ہیں جب لڑکی اپنے طرزِ عمل سے اپنے گھر کو جنت بنا کر پُرسکون زندگی



نجمہ شکیل

بسر کرتی ہے۔ اپنا مقام بناتی ہے، اس کے صلاح مشورے کو اہمیت دی جاتی ہے اور آئے گئے کے سامنے فراخدلی سے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔

۳: صبر اور برداشت سے سسرال میں زندگی آسانی سے گزاری جاسکتی ہے اور شادی کی گاڑی جہاز کی رفتار سے ہوا کے دوش پر اڑتی رہے گی۔

شفق شمس
معلمہ

۱: تعلقات مضبوط ہوجاتے ہیں اور شادی کے بعد یہ ذمے داری دولہا اور دلہن کی ہوتی ہے کہ وہ ان رشتوں کو ساتھ لے کر چلیں اور خاص طور پر دلہن کی بہت بڑی ذمے داری ہے کہ میکے اور سسرال میں فرق نہ رکھے اور توازن رکھے۔

۲: اس کے لیے تو دلہن کو وقت دینا پڑتا ہے۔ برداشت سے کام لینا اور رشتوں کی قدر دانی بھی ضروری ہے اگر دلہن کو ان رشتوں کی اہمیت کا احساس ہو تو اس کو اس کی قربانیوں کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

۳: سسرال کے ہر رشتے کو اس کے حق کے ساتھ نباہنا اور میاں بیوی کا ایک دوسرے کو سمجھنا ہی بہترین نسخہ ہے۔

☆☆☆

قارئین! ہر دو جانب تعلقات کی مضبوطی اور دل میں گھر بنانے کے لیے سروے میں شریک تمام دلہنوں نے صبر، برداشت، تحمل اور تدبر کے نسخوں اور ٹوٹکوں پر عمل کرنے کو ہی نسخۂ کیمیا قرار دیا لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ اس سفر میں ان کے ہمسفر بھی ان کے ہمرکاب ہوں، ان کے ایثار کی قدر کریں کہ شوہر کی



شفق شمس

جانب سے ملنے والا اعتبار اور اعتماد دلہن کو ثابت قدمی سے یقین کی منزل کی سمت رواں دواں رہنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے، یہ گمان نہیں رکھنا چاہیے کہ بہو ہمارا بیٹا ہم سے چھین لے گی۔ اسے تیسرا فریق سمجھنے کے بجائے اس سے محبت، شفقت اور دوستی کا تعلق باندھ لیجیے۔ اعتبارِ وفا پاتے ہی وہ خود بخود اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کی بھی وفادار ہوجائے گی۔ بزرگوں کی دعاؤں کا کوئی مول نہیں۔ دلہن کو اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھیے۔ آپ کی بے لوث اور پُرمحبت دعائیں رنگ لائیں گی تو گھر ارضی جنت کا نمونہ بن جائے گا، انشاءاللہ!

شادی مبارک

پاکیزہ بہنیں

میں بھی دلہن بنی

حسبِ معمول چھٹی جماعت کی چھٹیاں گزارنے، چھوٹے بچوں کی وجہ سے خالہ کی مدد کرنے ہم خالہ کے ہاں موجود تھے کہ ان کی خالہ (میری ساس) آئیں اور میرے گوشِ گناہ گار میں آواز آئی۔ ''انور چھیماں... توں کہہ کہ ننھی دا رشتہ خالہ نوں دے دو۔'' ننھی یعنی میں (کوثر خالد) میں اسکول گئی تو اپنی سہیلی ساجدہ سے پوچھنے لگی۔ ''بھلا ماموں سے شادی ہوسکتی ہے؟'' تو وہ بولی۔

''مجھے کیا پتا؟'' تو جناب امی کے انہی کزن سے نویں میں منگنی اور میٹرک کے چار سال بعد 18 اکتوبر 1982ء کو شادی ہوگئی۔ منگنی کے بعد میرے ماموں کی شادی پر یہ لوگ لاہور آئے تھے مگر ہم اجنبی بنے رہے مگر ان کی جڑانوالہ روانگی کے عین وقت محلے میں پرات بھر چاول تقسیم کرتے وقت نظر اٹھی تو شام کے ملگجے اندھیرے میں بھی ان کی آنکھیں اپنی طرف نظر آئیں تو پسندیدگی کا عندیہ دے گئیں اور ہم تمام عمر آنکھوں کا اٹھنا اور ملنا.... بےحیائی پر محمول کرتے رہے۔ اب جاکر سکون آیا کہ کہیں پڑھا تھا کہ منگنی کے بعد نکاح سے پہلے ایک نظر ضرور دکھا دینا چاہیے۔ شادی کا پہلا جملہ۔

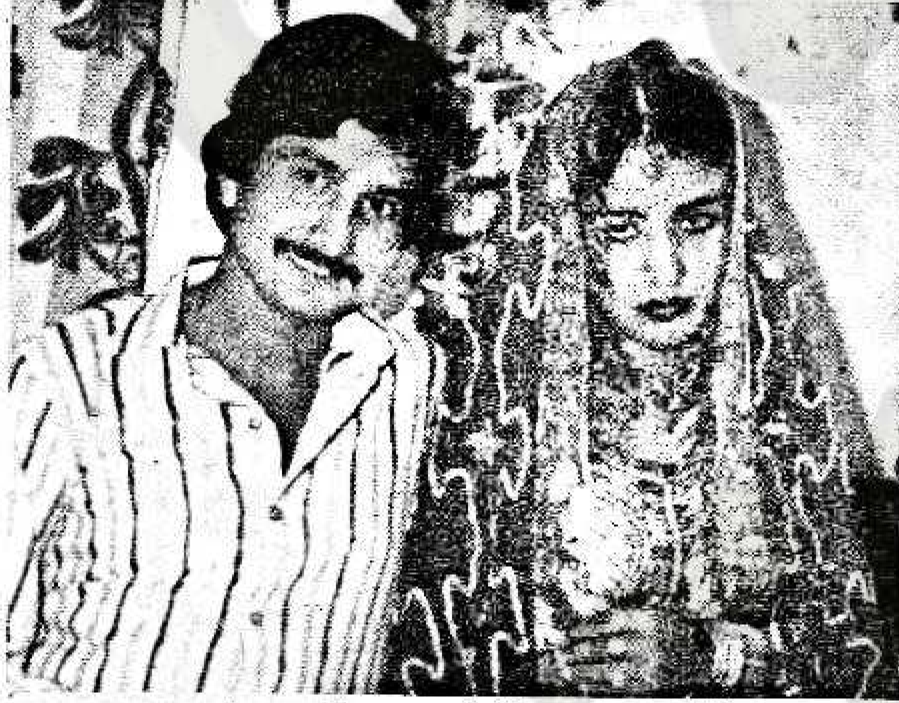
''السلام علیکم، آپ کا نام کیا ہے؟'' میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''آپ کو نہیں پتا۔''

''تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

''جی صالحہ کوثر۔''

''اگر میں صرف کوثر کہوں تو برا لگے گا؟''



''ہرگز نہیں۔'' پھر کچھ پیسے پکڑائے۔ ہم نے انکار میں سر ہلادیا بولے۔

''تھوڑے ہیں کیا؟'' ہم نے جھٹ پکڑ لیے پھر وعدے وعید... ہوئے۔ ہم غریب تھے، یہ امیر تھے کیسے دل پر راج کیا۔ بہرحال دونوں نے وعدے نبھائے۔ آج بھی شاعری میں اپنی ڈائری میں لکھ رہی ہوں جو اُن کی موت کے بعد شروع کی۔ ی کا قافیہ ہے اور تاعمر ختم نہ ہوگی۔ خوابوں میں ملتے ہیں اسی طرح جیسے کہ ملتے تھے۔ یکم محرم، 12 دسمبر

2009ء میں وہ مجھے ولی اور فرشتہ کا خطاب دے کر رخصت ہوئے جبکہ ہم سوچتے ہیں کاش اس سے اچھی بیوی ہم ثابت ہوسکتے۔

ہم لاکھ تمنا کریں کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

غزل

چاہت کے عجب رنگ سجے برسات کے موسم میں
شہنائیوں کے رنگ چڑھے بارات کے موسم میں
ہم تم میں سما جائیں تم ہم میں سما جانا
دیکھے نہ کبھی دنیا عداوت کے موسم میں
اِک وعدہ لیا ہم نے اِک وعدہ کیا تم نے
ناراض نہ ہوں گے کسی بھی حالات کے موسم میں
دلہن نے کہا دولہا سے یہ تمہید ضروری ہے
ورنہ ہے بڑا خطرہ شروعات کے موسم میں
تاحیات نبھایا پر اب خوابوں میں ملنا ہے
کلیہ رہا کارآمد خطرات کے موسم میں

تحریر: کوثر خالد، جڑانوالہ

میری شادی کا احوال

نومبر 2005ء کے پہلے ہفتے میں میری شادی ہونا قرار پائی۔ میرے بڑے بھائی یاسر کی شادی بھی ساتھ ہی طے تھی اس لیے گھر میں خوب رونق اور ہلا گلا تھا یعنی اس کا ولیمہ اور میری رخصتی۔ اس کی بارات ملتان سے اسلام آباد لے جانی تھی۔ رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہوچکا تھا جب 8 اکتوبر 2005ء کا خوف ناک اور شدید ترین زلزلہ آیا جس نے ہمارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ ساری ننھیال پنڈی، اسلام آباد میں ہونے کی وجہ سے پل، پل کی ہولناک خبریں مل رہی تھیں۔ خالہ، ماموں اور تمام کزنز جن سے بھی بات ہوتی پریشان کن صورتِ حال کا پتا چلتا۔ آفٹر شاکس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ تمام ہلا گلا اور خوشی ایک دم پریشانی میں بدل گئی


عقیلہ حق، کراچی


غزالہ یٰسین، سرگودھا

کیونکہ بھائی کی بارات بھی اسلام آباد جانی تھی اور خالہ کے گھر بھی دراڑیں وغیرہ آئی تھیں ان کے سامنے تباہی ہوئی اور سب ہی رو رہے تھے نہایت پریشان تھے۔ یہاں گھر میں ہم سب بھی بے انتہا غمگین اور پریشان تھے۔ ٹی وی چینلز سے بھی پل، پل کی خبر مل رہی تھی۔ امی کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور پھر امی کی پریشانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اس امر پر سوچنا شروع کردیا کہ مجھے پہلے رخصت کرکے پھر بھائی کی بارات اسلام آباد......

اس سلسلے میں امی ابو نے صلاح مشورے کیے خصوصی طور پر مجھ سے بھی پوچھا اور پھر علی میرے ہونے والے شوہر سے کہ ان کے والدین حیات نہ تھے انہوں نے اپنے بہن بھائیوں اور دیگر رشتے داروں سے مشورہ کیا پھر طے پایا کہ اسی جمعے کو مسجد میں نکاح اور پھر افطاری پر رخصتی ہوجائے یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ یہ بریکنگ نیوز جس، جس کو ملی سب حیران پریشان رہ گئے۔ نکاح کے لیے علی کی دو بہنیں اور بہنوئی اور دو بھائی آئے تھے۔ مغرب سے ذرا پہلے آئے امی اور باجی افطاری کی تیاری کررہے تھے۔ میں نے سادہ پنک اینڈ وائٹ جارجٹ کا سوٹ پہنا تھا اور محض پنک لپ اسٹک لگائی تھی۔ ابو، بھائی وغیرہ ڈرائنگ روم میں فارم پُر کرنے میں مصروف تھے۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی میں نے دسترخوان بچھانا شروع کیا۔ گھر میں خاموشی تھی سب ہی کاموں میں مصروف تھے۔ مجھے بھی عجیب سی خاموشی اور احساسات نے گھیر لیا تو میں اپنے کمرے میں چلی آئی ایک دم سب سے بڑے بھائی مجھے آواز دیتے ہوئے آئے۔

''گڑیا...... گڑیا، کہاں ہو؟'' میں پچھلے صحن میں کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ ان کے ہاتھ میں رجسٹر تھا اور مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ میرے باہر نکلتے ہی مجھے پین پکڑا کر بولے۔ ''جلدی سے فارم پر


شازیہ جمال، کراچی


عاصمہ طارق، ملتان

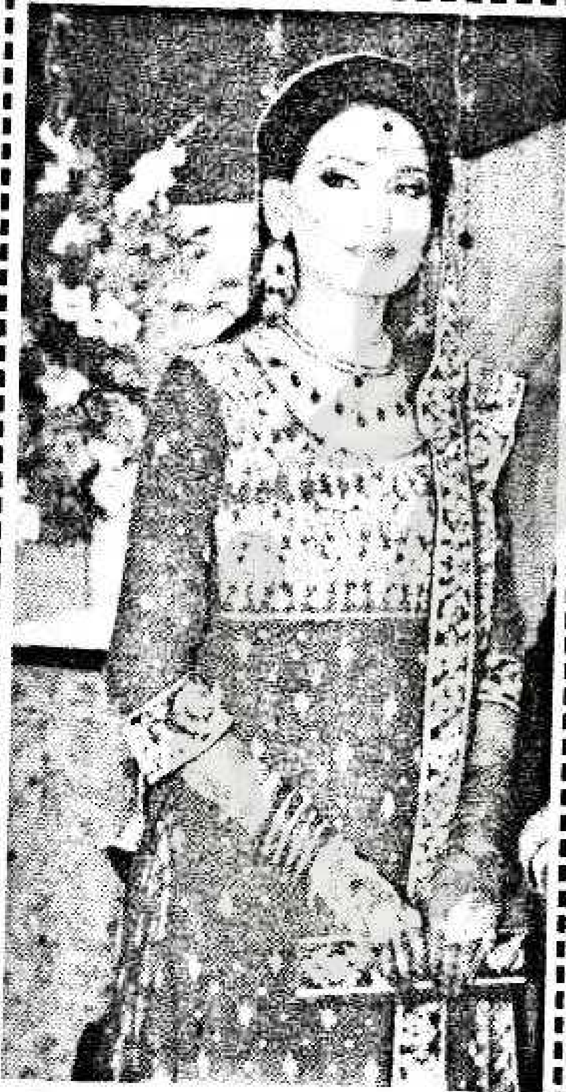

ڈاکٹر ندا نوید سیٹھی، راول پنڈی


رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان

سائن کردو۔'' میں ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ میں اکیلی کھڑی تھی اور وہ سائن کروانے آئے تھے۔ مجھے حیران دیکھ کر بولے:''جلدی کرو اذان ہونے والی ہے افطار کرنا ہے ٹائم نہیں ہے۔'' میں نے اس انتہائی عجیب و غریب سچویشن میں سائن کرنا شروع کیے۔ اتنے میں دوسرا بھائی بھی آگیا اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ میرے نکاح نامے پر سائن کرنے کی اس نے ایک تصویر بنائی۔ اسی لمحے اذان شروع ہوئی اور وہ جلدی، جلدی رجسٹر لے کر واپس چلے گئے۔ اندر افطاری کا اہتمام جاری تھا اور میں شام کے وقت اپنے نکاح کے وقت اکیلی باہر کھڑی حیران پریشان ہو رہی تھی اور اس عجیب و غریب سچویشن کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اس انتظار میں تھی کہ شاید کوئی آئے مجھے اندر لے جائے اور مبارک باد دے مگر نہ جی دلہن اکیلی کھڑی اور سب غائب۔۔آج بھی اس وقت کو یاد کرتی ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔ خیر افطار کرنے کے لیے میں بھی اندر گئی۔ مزے کی بات یہ کہ امی اور بہنوں کو مصروفیت میں پتا نہیں چلا کہ نکاح ہوگیا ہے۔ کھجور منہ میں رکھتے ہوئے میں خود ہی امی کے پاس کچن میں چلی گئی جہاں انہوں نے بھی کھڑے کھڑے روزہ افطار کیا تھا اور پکوڑے ڈش میں نکال رہی تھیں۔ میں چند لمحے چپ کھڑی رہی پھر بولی۔

''امی میرا نکاح ہوگیا ہے۔'' انہوں نے پکوڑے نکالتے ہوئے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر کہا۔

''اچھا چلو تم جلدی سے یہ ڈش اندر لے جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' میں اتنے شاندار رویے پر چپ چاپ ڈش اندر لے گئی۔ تمام مہمان، ابو بھائی اندر ڈرائنگ روم میں تھے اور ہم بہنیں لاؤنج میں ہی افطاری کر رہے تھے۔ دونوں بہنوں کو بھی بذاتِ خود اپنے نکاح کی خوش خبری سنائی تو انہوں نے ڈھیروں پیار اور مبارک باد دی لیکن وہ بھی حیران تھیں کہ یہ کیسے


بینش ندیم، اسلام آباد


روبینہ حیات مغل، کراچی

جلدی، جلدی نکاح کرلیا اور بتایا بھی نہیں۔ اتنے میں امی کچن سے آگئیں اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دینے لگیں۔ اتنے میں افطاری کر کے میری نندیں بھی وہیں آگئیں اور مبارک باد دی۔ تب مجھے پتا لگا کہ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔ جب سب کے پیٹ بھر گئے تب دلہن کے پاس آنے کا خیال آیا۔ اصل میں فارم فل کرنے کے کام کے بعد میرے جیٹھ نے کہا کہ ''کل روزے میں ہم کیسے نکاح کے لیے مسجد آئیں۔ فارم فل ہو رہا ہے تو بس دعا کریں اور نکاح بھی کرلیں۔'' تو جو کام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا وہ اس طرح سے انجام پایا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور نکاح بھی ہوگیا۔ خیر اگلے روز عصر کے بعد بارات نے آنا تھا اور کھانے وغیرہ کے بعد تراویح تک رخصتی ہو جانی تھی۔ خیر اگلے دن جمعے کی نماز تک تو میں اپنے روٹین کے کاموں میں مصروف رہی۔ آٹا گوندھا، ہنڈیا بھون رہی تھی تب امی کی ڈانٹ پڑی۔

''تم جاؤ اور تیار ہونا شروع ہو کام ہو جائیں گے۔'' اصل میں تب تک مہندی بھی نہیں لگی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ تین مہندی لگانے والیوں کو کہا تھا اور تینوں نے ہی ہامی بھری تھی مگر دوپہر تک کوئی نہ آیا۔ چھوٹی بہن نے اپنے بیوٹی پارلر کے سارے نسخے مجھ پر ہی آزما ڈالے اب دلہن عصر کے وقت سے تیار اور بارات غائب۔۔شام ہوگئی۔ افطاری ہوگئی، تراویح کا وقت ہوگیا، جب گھر والے پوچھیں تو پتا چلے کہ بس نکل رہے ہیں گھر سے۔ بیٹھ بیٹھ کر کمر۔۔۔۔بھی اکڑ گئی۔ حتیٰ کہ تھکن سے نیند آنے لگی۔ جو مہمان ہمارے گھر آئے تھے وہ بھی ایک، ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ ان کو کھانا کھلا کے روانہ کر دیا گیا کہ سب ہی عبادت کی رات کی وجہ سے مصروف تھے۔ خدا خدا کر کے بارات آئی۔ ماشاء اللہ میری سسرال بہت بڑی ہے اور یہ گیارہ



بہن بھائی ہیں اور پھر ان کے بھی بچے تو تیار ہونے میں تو سب ہی کو دیر لگنی تھی۔ نکاح تو ہو چکا تھا لہٰذا اب محض رخصتی ہونی تھی ۔ رسموں میں محض دودھ پلائی کی رسم ہوئی مگر اس میں کچھ لینا دینا نہیں ہوا بلکہ محض دودھ ہی پلایا گیا۔ دس منٹ میں ہی سب فارغ ہوگئے۔ اب رخصتی کا وقت تھا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے بالکل رونا نہیں آیا حالانکہ میں کسی کی شادی اور رخصتی کا سین ٹی وی پر بھی دیکھتی ہوں تو آنکھیں بھر آتی ہیں مگر میں اپنی رخصتی پر نہیں روئی بلکہ ایک حد تک خوشی ہو رہی تھی شادی کی رونا دھونا تو ساری زندگی چلتا ہی رہتا ہے ناں۔ خیر رخصت ہو کر اپنی سسرال آگئی جہاں پر کھیر کھلانے کی رسم ادا ہوئی اور علی نے مجھے اور میں نے علی کو کھیر کھلائی اور مٹھاس بھری زندگی کی ابتدا ہوئی خدا کرے کہ یہ ہمیشہ قائم و دائم رہے کہ سادگی کی اس شادی نے آج تک مجھے ہر سکھ عطا کیا ہوا ہے اور قارئین ایسا احوالِ شادی آپ نے کہیں نہیں پڑھا ہوگا۔

تحریر حمیرا کلیم، ملتان

شادی میری بیٹی کی

14 دسمبر 2013ء کو میری بیٹی عروبہ کی شادی فرحان احمد کے ساتھ بخیریت انجام پائی اور وہ رخصت ہو کر پیا دیس سدھار گئی۔ وہ دن بہت خوب صورت اور یادگار تھا نہ صرف اس لحاظ سے کہ عروبہ ماشاء اللہ دلہن بن کر بے حد پیاری لگ رہی تھی بلکہ اس لحاظ سے بھی یادگار تھا کہ اس روز میں ساس بن گئی تھی۔ میرے احساسات کچھ بزرگانہ اور مشفقانہ سے ہو رہے تھے۔ ابھی اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں بیٹی کی شادی کے بجائے ”جب میں بنی ساس“ کا عنوان لے کر آپ سب سے اپنے احساسات شیئر کروں۔ شادی والے روز تو جو گہما گہمی ہوتی ہے وہ اپنی جگہ مگر اس سے کئی دن پہلے ہی بالخصوص لڑکی کی شادی میں رونق اور ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے سو یہی حال یہاں پر تھا۔ کئی دن پہلے سے عروبہ کی سہیلیوں اور دیگر رشتے داروں کی آمد وقتاً فوقتاً شروع ہوگئی تھی۔ اس کو مہندی لگانے کے لیے بھی اس کی کزنز، پھوپی، تائی، مامی سب جمع ہوگئے

تھے۔ مایوں کی تقریب سادہ مگر جاندار رہی۔ عروبہ کی سہیلیوں اور کزنز نے گانے گا کر محفل کی رونق دوبالا کردی۔ عروبہ زرد جوڑے میں ملبوس اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پیلی ہری قناتوں سے آراستہ چھوٹے سے اسٹیج پر جب عروبہ آ کر بیٹھی تو مایوں کا سماں سا بن گیا۔ بارات والے روز عروبہ ریگل روز سے تیار ہوئی۔ تقریب میں مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی جان پڑتی جارہی تھی۔ نکاح ایک روز پہلے یعنی جمعے کے دن ہوگیا تھا سو وہ مخصوص قسم کی افراتفری اور ہڑبونگ نہ ہوئی جو کہ عموماً تقریبات میں نظر آتی ہے۔ بارات بھی اپنے وقت پر آگئی۔ میری توقع سے بڑھ کر میرے عزیز رشتے داروں نے شادی میں شرکت کی حتیٰ کہ میرے پڑوسیوں نے بھی شادی میں شریک ہو کر مجھے عزت بخشی۔ میری ایک دوست نے میرے ایک فون پر شادی میں شرکت کی اس کی مجھے بہت خوشی ہے۔ کچھ لوگ بوجوہ نہ آسکے سو ان سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ رخصتی سے پہلے باڑ رکوائی کی رسم بہت دلچسپ رہی۔ سب نے مل کر دولھا کا راستہ روکا۔ فقرے بازیاں اور دھکم پیل سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا رہا بالآخر میرے والد نے درمیان میں آ کر معاملہ ختم کروایا اور جو نیگ بند لفافے میں ملا اسے قبول کرلیا گیا۔ کوئی حجت، بحث تکرار نہ ہوئی۔ ہنسی خوشی سب کام ہوئے۔ بہت جلد عروبہ کی رخصتی کا وقت بھی آگیا۔ اس وقت جیسے دل پر سے اختیار ختم ہوتا جارہا تھا۔ میرے دل کا ٹکڑا آج مجھے چھوڑ کر جارہا تھا۔ میرا داماد فرحان احمد اس کے ساتھ کھڑا جچ رہا تھا اس وقت لگ رہا تھا کہ اپنی پیاری چیز کو کسی کے حوالے کرنا کس قدر دشوار کام ہے۔ لے جائیں گے......
لے جائیں گے دل والے دلہنیا لے جائیں گے اور دل والے دلہنیا لے کر چلے گئے۔ خدا اسے اپنے گھر میں شاد آباد رکھے، آمین۔

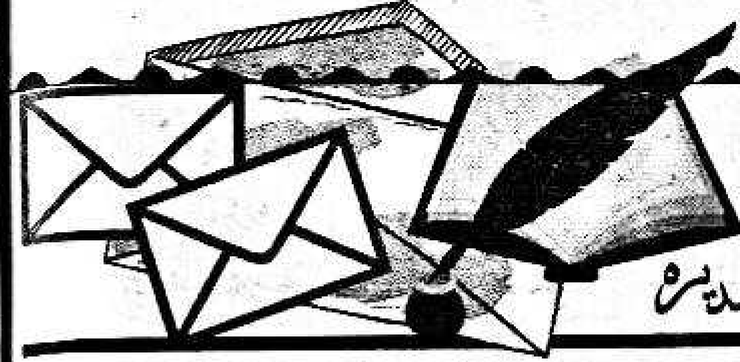
تحریر: سعدیہ رئیس



شہزادی، فیصل آباد



درشہوار مقبول، کراچی



بہنوں کی محفل

مدیرہ

✖ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

✖ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

✖ پیاری بہنو! ہم خواتین بہت سے گھریلو معاملات کو خود ہی سلجھایا کرتی ہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ اکثر خواتین ایسے معاملات میں اپنی بیٹیوں کو آگے کر دیتی ہیں گویا وہ خود اچھی بننے کے چکر میں اپنی بیٹیوں کو برا بنا دیتی ہیں مثلاً ایک بہن اپنی نندوں کو جو بھی برا بھلا کہلوانا چاہیں تو وہ اس کے لیے اپنی بیٹیوں کو استعمال کرتی ہیں...... معصوم، ناسمجھ بچیاں وہی کچھ کرتی ہیں جیسا سبق ان کی مائیں ان کو دیتی ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے بڑا اچنبھا سا لگا۔ جب ایک خاتون نے اپنی چھ سالہ بچی سے کہا جاؤ اپنی دادی کے کمرے میں آج تمہاری پھپیاں آئی ہوئی ہیں دیکھو جا کر ذرا کہ تمہاری دادی ان سے میری کیا کیا برائیاں کر رہی ہیں۔ پیاری بہنو اپنی بچیوں کی آپ ایسی تربیت ہرگز نہ کیجیے کہ بعد میں وہ ان کے لیے مصیبت بن جائے یوں بھی کسی کی ٹوہ لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی پیٹھ پیچھے آپ کی برائی کرتا ہے تو اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی اتنا جگرا رکھتا ہے کہ وہ بات برملا آپ کے منہ پر بھی کہہ دے تو اس وقت یقیناً آپ کو جواب ضرور دینا چاہیے مگر نرمی کے ساتھ کسی بھی بات کی گہرائی میں اتنی اتوالومت ہو جائیں کہ وہ پریشانی بن کر آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کر دے۔

سرگرمیوں سے پہلے یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس ماہ ہماری ہر دلعزیز رائٹر نگہت سیما کے نئے ناول اعتبارِ وفا کی پہلی قسط شاملِ اشاعت ہے جبکہ رفاقت جاوید کا تازہ ترین ناول آپ اگلے ماہ سے پڑھ سکیں گی اور عنیزہ سید کے ناول شام شہر یاراں سے متعلق اگر کچھ سوال ہوں تو لکھ بھیجیں ہم مصنفہ کو بھجوا دیں گے کافی بہنیں ناول پر بات کرنا چاہ رہی ہیں ہمارے پاس کافی سوال آ بھی چکے ہیں ان سب کے جوابات ماہِ نومبر کی اشاعت میں شامل ہوں گے۔ انشاءاللہ۔

اور آیئے اب اپنی سرگرمیوں کی جانب مگر اس سے قبل صرف ایک بار درودِ ابراہیمؑ پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالہ اِلاّ انت سبحانك انی کنتُ من الظالمین

ترجمہ ﴿ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے کہ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں کو ذرا جانچیں تو سہی۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

✖ معروف مصنفہ صبیحہ شاہ، کراچی کی پیاری بیٹی نور العین بنت سید عزیز احمد مرحوم کی شادی 14 اگست کو احمد ہاشمی کے ساتھ ہوئی جس میں مصنفات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری امبر مسرت اپنی نند کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی غرض سے ان دنوں دبئی سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری نسرین شفیق کی بیٹی زارا شفیق کی شادی کراچی میں ولید کے ساتھ ہوئی۔ (مبارک باد)

✖ معروف شاعر مشیر الحسن طالب اور ان کی اہلیہ آمنہ مشیر اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کے لیے نیو یارک سے کراچی آئے ہوئے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

✖ ادارہ پاکیزہ سے وابستہ حمید صاحب کی پیاری بیٹی بشریٰ کی شادی گزشتہ دنوں نوید کے ساتھ انجام پائی۔ (مبارک باد)

✖ گزشتہ دنوں راول پنڈی سے کرنل کلیم اختر، مسز نسرین کلیم اپنے بچوں کے ساتھ کراچی میں ہونے والی ایک شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئے۔ (مبارک باد)

✖ معروف مصنفہ دلشاد نسیم ان دنوں لاہور سے لندن گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی معروف شاعرہ اور تبصرہ نگار فصیحہ آصف خان کے دو ناولٹ منظرِ عام پر آئے ہیں پہلا عشق کا کوئی انت نہیں۔ جس میں معاشرتی اور رومانوی کہانیاں ہیں ان کی تحریر میں بے ساختگی ہے اور عام زبان استعمال کی گئی ہے۔ صفحات 352 ہیں اور انتساب مرحوم والدین کے نام ہے اور قیمت 500 روپے رکھی گئی ہے۔ دوسرا ناولٹ جیون جھیل میں چاند نگر میں ہے۔ اس مجموعے میں بھی ہلکی پھلکی محبت سے رچی کہانیاں شامل ہیں جو قارئین کو یقیناً پسند آئیں گی۔ اس کتاب کا انتساب ان تمام دوستوں کے نام ہے جو اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اس مجموعے کی قیمت بھی پانچ سو روپے ہے اور یہ دونوں خوب صورت کتابیں حاصل کرنے کے لیے آپ رابطہ کر سکتے ہیں۔ نواب سنز پبلی کیشنز، اقبال روڈ، کمیٹی چوک راول پنڈی فون نمبر 051-5555275

✖ ہماری کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے اور علاج کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ آ گیا ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار۔ لاہور فون نمبرز 042-37668958، 042-37652546۔

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز زاہدا اپنے نئے مکان میں شفٹ ہو گئی ہیں۔ (مبارک باد)

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری عالیہ بانو، سندھ کے ہاں چودہ سال کے بعد بیٹا تولد ہوا ہے۔ (ماشاءاللہ بے حد مبارکاں)

✖ اس سال پاکیزہ کی بہت سی مصنفات اور بے شمار قارئین نے اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ آپ سب کو بے حد مبارک باد اور معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا تم کو خصوصی مبارک باد کہ تمہاری پانچ سالہ بیٹی فروا نے پورے روزے رکھے۔ (ماشاءاللہ)

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات نے بھی اپنی خصوصی دعاؤں میں تمام قارئینِ پاکیزہ کو یاد رکھا۔ آپ کو صرف جزاک اللہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

✖ معروف مصنفہ نگہت نسیم، سڈنی سے ان دنوں لندن گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار رفیعہ ابدالی، کراچی کی والدہ ان دنوں کوما میں ہیں۔

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی تا حال کمر کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت ان دنوں پھر خراب چل رہی ہے۔

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی کی طبیعت ناساز ہے۔

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق، کراچی کے انگوٹھے کا آپریشن ہوا ہے۔

✖ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویریہ بخاری، کراچی کی ٹانگوں میں شدید تکلیف ہے۔

انتقالِ پُرملال

✖ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب کے شوہر ایوب زاہد شیخ کی اس ماہ تیسری برسی ہے۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری زارا، کراچی کی والدہ انتقال کر گئیں۔

★ پاکیزہ کی قاری عالیہ رضا کی اس ماہ برسی ہے۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کی دعا کریں۔ اللہ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

★ ★ ★

نگہت سیما، چکوال سے۔ ”سب سے پہلے تو عمرے کی مبارک باد قبول کریں۔ اللہ سب مسلمانوں کو یہ سعادت نصیب کرے اور آپ کو بھی بار بار اپنے در پر بلائے، آمین۔ غزالہ نگار کی گفتگو اچھی لگی۔ حیرت کے ساتھ بے حد خوشی بھی ہوئی کہ انہوں نے اپنے ساتھ اور اپنے سے پہلے اور بعد میں لکھنے والی سب خواتین رائٹرز کو یاد رکھا ورنہ عام طور پر تو لوگ اپنے ہم عصر رائٹرز کا نام بھی یاد نہیں رکھتے۔ میری ہم عصر اور مجھ سے پہلے اور بعد میں لکھنے والی کئی رائٹرز نے لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ میری طرح کبھی کبھار لکھ رہی ہیں لیکن جن رائٹرز نے لکھنا چھوڑ دیا ان میں دو نام ایسے ہیں جن کے لیے دل نے ہمیشہ چاہ کی کہ وہ لکھیں اور دعا کی کہ ان کی تحریر پڑھنے کو ملے اور وہ دو نام ہیں غزالہ نگار اور ہما کوکب بخاری۔ کسی روز ہما سے بھی ملاقات کروائیں۔“ (پیاری نگہت آپ نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ ہما کوکب بخاری جلدی سے یہ سوچ کر ہی آجاؤ کہ کبھی ہم میں تم میں قرار تھا)

شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”عید کا شمارہ پڑھا اچھا تھا مگر آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ خاص شماروں میں سینئر مصنفات کو اہمیت دی جانی چاہیے اور خصوصی شماروں میں سینئر مصنفات کی تحریریں زیادہ لگانی چاہیے کہ سینئر جس مقام پر آج پہنچے ہیں اس کے لیے ان کو برسوں لگے ہیں بہرحال یہ بات آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ اداریہ بہترین تھا۔ بہنوں کی محفل میں آپ کے دبئی اور عمرے کے سفر کا مختصر احوال پڑھا آپ سے بات کر کے اور آپ کی تحریریں پڑھ کر میں بالکل کہہ سکتی ہوں کہ جیسی آپ ہیں اسی طرح آپ لکھتی ہیں مگر اس خصوصی شمارے میں آپ کے افسانے کی مجھے کمی محسوس ہوئی۔ عنیزہ سید کے ناول کی قسط شاندار تھی۔ نگہت سیما کا مکمل ناول بھی ... بے حد پسند آیا اور ان کے شروع ہونے والے ناول کا شدت سے انتظار بھی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی ہر تحریر ہی مجھے ہمیشہ پسند آتی ہے۔ اس کے بعد مجھے شیریں حیدر کا افسانہ بوجہ بیٹیوں کے بہت پسند آیا۔ شیریں آپ بہت اچھی رائٹر ہیں، رضوانہ پرنس کا لیا ہوا انٹرویو بھی اچھا تھا بلکہ سیدھا سادہ سا تھا اور مجھے مول سے مل کر واقعی خوشی ہوئی میری بیٹی آپ کو اور عذرا کو سلام کہہ رہی ہے۔“ (شمیم بہن آپ کو مول سے مل کر اس وجہ سے بھی خوشی ہوئی کہ وہ تکبر اور شو بازی سے پاک ہیں۔ اس لیے ان کے جوابات بھی ان ہی کی طرح سچے اور سادہ تھے جن میں بناوٹ نہیں تھی اور ہماری جانب سے اسے پیار کہیے اور عذرا رسول بھی دعا کہتی ہیں)

مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کا عید نمبر اور رمضان میں رمضان کے حوالے سے تحریریں بہترین تھیں اس کے لیے انجم میں صرف جزاک اللہ ہی کہوں گی۔ سفرنامے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں مگر عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ یقیناً ندرت لیے ہوئے ہے اور اس میں انفرادیت بھی ہے اور دلچسپی بھی ہے کہ پڑھ کر بہت سی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ علم معرفت الٰہی کیا یہ کسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ یہ بات میں اس وجہ سے پوچھ رہی ہوں کہ یہی سب ... پہلے پڑھ چکی ہوں۔“ (ہماری پیاری مصنفہ اختر شجاعت نے یہ مضمون کسی ایک کتاب سے نہیں بلکہ کئی کتب سے استفادہ کر کے یہ مفید مضمون تیار کیا ہے۔ جو آپ سمیت سب بہنوں کو بہت پسند آرہا ہے)

انجم گلزار، کراچی سے۔ ”ہے تو یہ عجیب بات مگر میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں کہ میں جب بھی دعا مانگتی ہوں۔ آپ کا خیال مجھے آجاتا ہے اور میں آپ کے لیے ضرور دعا کرتی ہوں۔ انجم باجی آپ بھی میرے لیے دعا کیجیے گا۔ خاص طور پر میری اولاد کے لیے کہ اللہ مجھے اولاد کی نعمت ضرور عطا کرے۔“ (پیاری بہن میں یہ سمجھتی ہوں کہ مجھ پر صرف اللہ کا کرم ہے جو آپ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھتی ہیں۔ آپ کے لیے میرے سب قارئین یقیناً ضرور دعا کریں گے)

مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”عید نمبر طبیعت خرابی کے باوجود آہستہ آہستہ پڑھ لیا۔ سرورق اچھا ہے۔ مول کا انٹرویو بہت پسند آیا لیکن یہ مزید طویل ہونا چاہیے تھا۔ اگر رضوانہ ان کے ساتھ ایک نشست اور کرلیں جس میں ان کے شوہر بھی شامل ہوں؟ (آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھر تو لطف دوبالا ہوجائے گا) اس شمارے میں کرتار سنگھ بے حد خوب صورت افسانہ تھا۔ ناہید

سلطانہ اختر تو ہیں ہی ہماری موسٹ فیورٹ۔ شیریں حیدر کی کہانیاں بھی ہمیں ہمیشہ پسند آتی ہیں مگر عنیزہ سید کو مبارک باد دینی ہے بہت خوب صورت ناول لکھا ہے آپ نے۔ ماشاء اللہ دیگر تحریروں میں نگہت سیما، نایاب جیلانی، سمیرا حمید، عظمیٰ آفاق کی تحریریں بہت پسند آئیں۔“ (شکریہ)

فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے روحانی مشورے پڑھے، بہت پسند آئے۔ علم معرفت الٰہی پڑھ کر اچھا لگا۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ ملائشیا پڑھ کر نہ صرف وہاں کی معلومات حاصل ہوئیں اور اس کے ساتھ لطف بھی آیا کہ انتہائی سادگی اور سچائی سے لکھا گیا ہے۔ دل کی وہ باتیں جو کسی سے نہیں کہی جاتیں اس میں وہ بھی شیئر کی گئی ہیں یقیناً ایسی تحریریں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے اس ماہ ٹاپ کی تحریر ناہید سلطانہ اختر کی لگی۔ بہت خوب صورت انداز میں ایک اہم بات آسانی سے کہنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔ نایاب جیلانی اور عنیزہ سید کے ناولوں کی اقساط پسند آئیں۔ ہاں رضوانہ پرنس کا افسانوی انٹرویو کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ ہاں تصویریں اور زیادہ ہونی چاہیے تھیں۔“ (جی بالکل)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”الحمد للہ آپ سب بہنوں کی دعاؤں کے طفیل اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایک ادارے کی جانب سے کیبل آف فیصل آباد کے لیے عمرے کا ٹکٹ ملا ہے۔ انشاء اللہ ہم جلد ہی عمرے کی ادائیگی کے لیے جانے والے ہیں۔ اس ماہ ہمیں سب سے دلچسپ اور معلوماتی تحریر عظمیٰ آفاق کا ملائشیا کا سفرنامہ لگا ہر ہر سطر میں کوئی نہ کوئی پُرمزاح بات...... عظمیٰ آپ کو تو دلچسپ افسانے بھی لکھنے چاہئیں میں نے تو کئی مرتبہ آپ کی تحریر پڑھی۔ عنیزہ سید آپ نے اپنے ناول کا اتنا خوب صورت اختتام کیا ہے کہ دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لوں۔“ (چوم لو...... سیالکوٹ کوئی دوسرے ملک میں تھوڑی ہے)

مونا وقار، لاہور سے۔ ”میں اور میری امی پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور ہم دونوں کو ہی آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ پاکیزہ میں شائع ہر تحریر ہمیں نہ صرف بہت پسند آتی ہے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی پیغام بھی ضرور ہوتا ہے اپنی پاکیزہ بہنوں سے صرف یہی کہنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جلد از جلد پریشانیوں کے جال سے باہر نکال دے۔“ (انشاء اللہ آپ کی تمام پریشانیاں جلد دور ہوں گی اور ہماری بہنیں آپ کے لیے ضرور دعا کریں گی)

انیلہ ناہید، لیہ سے۔ ”میں اپنی مصروفیات کے باعث پورا پاکیزہ تو نہیں پڑھ سکی ہوں مگر روحانی مشورے، کارنرز اور عظمیٰ کا سفرنامہ پڑھ سکی ہوں۔ سب تحریریں اے ون تھیں یقیناً باقی پرچہ بھی بہترین ہوگا۔ جسے میں بعد میں پڑھوں گی۔“ (مگر پڑھنا ضرور)

سمیرا امجاد، ٹنڈو آدم سے۔ ”اپنی امی کے ہاں آکر پاکیزہ پڑھا اور بہت مزہ آیا۔ عنیزہ سید، نایاب جیلانی اور سمیرا حمید کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ بہت پسند آیا۔ ایسی تحریریں ہونی چاہئیں۔ رضوانہ پرنس کا انٹرویو بھی بہت مزے کا تھا۔“ (شکریہ)

عرشیہ جنید، کراچی سے۔ ”باجی میں گھر اور بچوں کے کاموں میں مصروف تو ضرور رہتی ہوں مگر آپ لوگوں سے غافل نہیں ہوں۔ آپ کے ساتھ منائی جانے والی ہر تقریب یاد ہے۔ اس ماہ کا شمارہ بھی بہت اچھا لگا اور مجھے تو ہر تحریر ہی بے مثال لگی۔“ (گڑیا ہمیں بھی اپنی پیاری پیاری عرشیہ یاد ہے۔ ہاں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت اپنے لیے بھی نکالو)

زرین زبیر کوٹھاری، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کا عید نمبر شاندار رہا۔ پاکیزہ سے متعلقہ کوئی تصویر بھی فیس بک پر دیکھ لیتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اس میں ہم بھی شریک ہوتے۔“ (گڑیا آپ نے جو تصاویر دیکھی ہیں وہ عذرا رسول کے ہاں ان کے عزیز و اقارب کے ڈنر کی تھیں۔ وہ تقریب پاکیزہ کے حوالے سے نہیں تھی)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”اس شمارے میں عید اور یوم آزادی کے حوالے سے تحریریں موجود ہیں۔ اختر شجاعت کے علم معرفت الٰہی میں امام جعفر صادقؒ کے سوالات تو پڑھ لیے جوابات کے لیے انتظار شروع۔ ساتھ ساتھ قرآن پاک کے ترجمے والا صفحہ بھی دوبارہ شروع کریں۔ (انشاء اللہ یہ مکمل ہوجائے تو وہ بھی شروع کریں گے جب تک آپ لوگ اس سے مستفید ہوں) امانت کی قسط نے ہلا دیا۔ برہان کے لیے بہت مشکل وقت ہے اللہ خیر کرے۔ شام شہر یاراں اختتام پذیر ہوا عنیزہ سید نے بہت اچھا اختتام کیا۔ نایاب جیلانی کا ناول بہت سلو چل رہا ہے۔ انہیں چاہیے کہ کہانی میں ذرا تیزی لے کر آئیں۔ ناہید سلطانہ اختر نے دس نمبر کا

سوال لکھ کر ہم سب کے ضمیر جگانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ہوتا ہے آئی سی یو میں۔ اللہ کسی کو بھی نہ لے کر جائے۔ سمیرا حمید اور نگہت سیما کی تحریریں اچھی تھیں۔ عقیلہ حق کا سرپرائز بس ٹھیک ہی تھا کیونکہ اس سے ملتی جلتی کہانیاں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں مگر دادی صابرہ کا کردار اچھا لگا۔ نیر رانی کی تحریر بھی ٹھیک تھی۔ رضوانہ پرنس نے صرف ہیروئن سے ملاقات کروائی ہمیں ان کے ہیرو کے بھی سوال وجواب چاہیے۔ ویسے سلطانہ صدیقی کی تینوں بہوؤں کے نام میم سے شروع ہیں اور تینوں ہی بہت قابل۔ عظمٰی کا سفرنامہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اس کی تحریر میں تمہاری جھلک بھی موجود ہے۔ مزاح کے رنگ میں رنگا سفرنامہ بہت دلچسپ لگا۔ آنے والی قسط میں یقیناً مزے مزے کی باتیں پڑھنے کو ملیں گی۔ بہنوں کی محفل اس مرتبہ بہت اچھی اس لیے لگی کہ تم نے آغاز میں مختصر مگر پُراثر انداز میں اپنے سفر کے متعلق بتایا۔ اب ہم منتظر ہیں اس سفر کی تفصیلات پڑھنے کے لیے۔ کیسے کیسے تجربے تمہیں ہوئے ہوں گے۔ آپ سب کو مبارک ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عظمٰی اب باقاعدگی سے سفرنامے اور دیگر تحریریں لکھے اور تمہارا سفرنامہ حجاز بھی جلدی شائع ہو جلترنگ میں غیر اہم لوگوں کا یہ حال تھا تو اہم لوگ کیسی تیاریاں کرتے ہوں گے۔ پودینہ ابال کر پینے والا نسخہ اچھا لگا۔ روحانی مشورے بروقت لگے۔ سندیسے پسند نہیں ہے۔" (بہتری کی کوئی تجویز بھی دیں، تبصرے کا شکریہ)

✍ شائستہ زریں، کراچی سے۔ "سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ پاکیزہ کے اداریے اتنے بہترین ہوتے ہیں کہ میں تو انہیں فیس بک پر لگا دیتی ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ عنیزہ سید کے ناول کا اختتام بہت پسند آیا۔ اختر شجاعت علم، معرفت الٰہی کے بارے میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس ماہ عظمٰی آفاق کا سفرنامہ پڑھا جو بہت دلچسپ لگا۔ اس میں معلومات کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والی پاکستانی شہری کے دلی جذبات جگہ جگہ نظر آ رہے ہیں۔ مکمل تبصرہ، اقساط ختم ہونے کے بعد کروں گی۔ اس ماہ ناہید سلطانہ اختر، نگہت سیما اور سمیرا حمید کی تحاریریں بے حد پسند آئیں۔ جلترنگ کا کوئی جواب نہیں۔ ہاں نایاب کا ناول بھی پسند آ رہا ہے۔ نزہت امن نے غزالہ نگار اورکزئی کا انٹرویو بہت خوب صورتی سے لیا اُن کے جواب بھی بہت عمدہ تھے پڑھ کر مزہ آیا۔" (شکریہ)

✍ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ "انجم آنٹی ماشاءاللہ پاکیزہ کی رائٹرز کی ہر جگہ دھوم ہے۔ صائمہ اکرم کا ٹی وی پر ڈراما چل رہا ہے اور دیگر بہنیں بھی لکھ رہی ہیں اور ان لوگوں نے پاکیزہ سے ہی لکھنے کا اسٹارٹ کیا تھا۔" (سعدیہ بیٹا ماشاءاللہ تمہاری شاعری اور تمہارے شعری مجموعے بھی ہر جگہ دھوم مچا رہے ہیں۔ آپ سب لوگ ٹیلنٹڈ ہو جب ہی تو ایسا ہے اور پھر سب سے بڑی بات کہ جب اللہ کا کرم ہوتا ہے تو عزت و شہرت میں بھی خوب اضافہ ہوتا ہے کہ جس کو اللہ پسند کرے اس کو سب پسند کرتے ہیں)

✍ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ "ابھی اگست کا پاکیزہ دیکھا۔ اختر شجاعت کا مضمون علم معرفت الٰہی پڑھا بہت مفید اور دلچسپ ہے لیکن اگر یہ مکمل ایک ساتھ شائع ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔" (سیما آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آئندہ اختر شجاعت کے مضامین قسط وار شائع نہیں کیے جائیں گے)

✍ حیات ترمذی، کاغان سے۔ "انجم باجی، کاغان سے شاید میں پہلی خاتون ہوں جو اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ پاکیزہ کی میں مستقل قاری تو عرصے سے ہوں مگر پاکیزہ مجھے مانسہرہ سے منگوانا پڑتا ہے۔ اگر آپ سے فون پر بات نہ کرتی تو شاید میں کبھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پاتی کہ اپنی رائے دے سکوں۔ پاکیزہ مجھے بے حد پسند ہے اور اس کی سطر سطر بہت ذوق شوق سے پڑھتی ہوں۔" (پیاری حیات، اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ اپنی تحریروں کے ساتھ ضرور شرکت کریں، میں منتظر ہوں)

✍ نورین، اسلام آباد سے۔ "مجھے پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے اور اس کے افسانے اور ناولٹ مجھے بہت پسند ہیں۔ بہنوں کی محفل اور جلترنگ کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ آپ میری دلی مبارک باد تمام مصنفات کو پہنچا دیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ عذرا بی بی، راولپنڈی سے۔ "اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آپ ہمارے لیے اتنا اچھا میگزین ترتیب دیتی ہیں۔ عظمٰی آفاق کا سفرنامہ بہت پسند آیا ہے۔ اب ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کا انتظار ہے کہ ہم اسے دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں۔" (آپ کی یہ فرمائش انشاءاللہ جلد پوری کی جائے گی)

✍ عصمت بخاری، لاہور سے۔ "پاکیزہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں غزالہ نگار اورکزئی کا انٹرویو پڑھ کر بہت سی پرانی

یادیں تازہ ہو گئیں۔ انجم اب ہم آپ کا انٹرویو بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ دونوں ناول بہت اچھے رہے۔ خصوصی طور پر عنیزہ سید کو مبارک باد اب عنیزہ سید کا انٹرویو بھی ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ سب سے خوب صورت محفل بہنوں کی محفل ہے مگر اس ماہ کے افسانے بھی اچھے لگے اور عظمٰی کے سفرنامے کی پہلی قسط بھی۔" (جی بالکل عنیزہ کا انٹرویو بھی جلد آئے گا۔ شکریہ)

✍ شبانہ نواز کاظمی، چوک لیہ سے۔ "سب سے پہلے تو بہت ساری دعائیں آپ کے لیے آپ کی پوری ٹیم کے لیے اور ماہنامہ پاکیزہ کے لیے۔ اللہ رب العزت ماہنامہ پاکیزہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے، آمین۔ مجھے کہانیاں پڑھنے کا شوق تب سے ہے جب سے میں اردو پڑھنے کے قابل ہوئی لیکن لکھنے کا شوق تب سے ہوا۔ جب میں نے عمیرہ احمد کا ناول میری ذات ذرہ بے نشان پڑھا۔ یہ بات سچ ہے عورت ہر دور میں مظلوم رہی ہے۔ ہر دور میں قربانیاں دیتی رہی ہے اور نہ جانے کب تک دیتی رہے گی۔ کبھی بیٹی کے روپ میں کبھی بیوی، کبھی بہن تو کبھی ماں کی صورت۔ بے شک ہر حکومت میں عورت کے حقوق اسے مل جائیں لیکن مرد لوگ اسے بھی تسلیم نہیں کرتے۔ خاص کر گاؤں میں عورتیں آج کے دور میں بھی اسی پستی میں سانس لے رہی ہیں۔" (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی اب تو خوش ہوناں!)

✉ تمثیلہ لطیف، پنجاب۔ آپ پاکیزہ کی سالانہ خریدار بن جائیں۔ اس طرح آپ کو پاکیزہ بروقت آپ کے گھر پر مل جایا کرے گا۔

✉ ذکیہ خانم، کراچی۔ گڑیا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کافی دن ہو گئے آپ کا خط اور فون آئے ہوئے۔

✉ شمائلہ سہیل، کراچی۔ کہاں گم ہو گئی ہو کافی دنوں سے رابطے میں نہیں ہو؟

✉ شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔ آپ اپنے مراسلات کے لیے الگ الگ صفحہ استعمال کیجیے۔

✉ افسر سلطانہ، کراچی۔ میں ہر ماہ آپ کا خط اس محفل میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے باقاعدگی سے شرکت کرو۔

✍ رابعہ عروہ، معظم آباد شریف سے۔ "سب سے پہلے امانت پڑھی۔ بہت اچھے انداز میں مجو سفر ہے پھر مول شنید سے ملاقات کی بہت زبردست انٹرویو کیا گیا اور یہ پاکیزہ کا ہی کمال ہے۔ عظمٰی آفاق کے دلکش اندازِ تحریر نے پاکیزہ کو اٹھارہ چاند لگا دیے۔ ان کے نٹ کھٹ بہو، بیٹوں کی دلچسپ باتیں ہنساتی رہیں۔ یہ آپ کی بیٹی ہیں کیا؟ پھر ترکِ وفا کی طرف سرپٹ دوڑے۔ آخر کار بے قرار، مضطرب، بے چین دل کا قرار ساتویں قسط میں ہی پوشیدہ تھا۔ کہانی اپنے جوبن پر نظر آ رہی ہے۔ مالا کی پریشانی، خوف اور ڈر کے ساتھ ہمارا نتھا دل بھی لرزتا رہا خاص طور پر نماز پڑھتے ہوئے اچانک ایک انہونی کا ہو جانا کسی غیر مرئی مخلوق کا دکھائی دینا یقیناً کہانی اسرار سے بھری ہے ہمیں بدیع الجمال اور سیف الملوک والا پارٹ بہت پسند آیا۔ ایک ایک لفظ کو بہت غور سے پڑھا۔ لفظوں کی بُنت پر مصنفہ کو سلام کرنے کو دل چاہا۔ آفاق اور سوزن سے نفرت محسوس ہوئی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے سمیرا حمید کو پہلی مرتبہ پڑھا لاجواب انداز پایا۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر پسند آئی۔" (شکریہ)

✍ آمنہ پرویز، جنوبی پنجاب سے۔ "ترکِ وفا کی یہ نئی قسط دھماکا خیز نکلی۔ مالا کے ساتھ ہونے والے واقعات نے ہر پل چونکایا اور دل دھڑکایا۔ سیف الملوک کی بدیع الجمال کے بارے میں نئی معلومات ملیں۔ سفر العشق المعروف بہ سیف الملوک یہ کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟ (لائبریریز سے پتا کریں یا پرانی بکس شاپ سے) مالا کے اردگرد سازشوں کا جال ہے کیا عیسیٰ بھی مالا کے ساتھ کوئی گیم کھیل سکتا ہے؟ مالا کی نادانی خوف میں مبتلا کرتی ہے ناول میں بہت زیادہ تجسس ہے اور دلچسپی آخر تک برقرار رہے گی۔ عظمٰی آفاق کا سفرنامہ بہت دلکش تھا۔ امانت کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ شام شہر یاراں کی آخری قسط پسند آئی۔ افسانے بس سو سو تھے۔ افسر سلطانہ کا خط بہت جامع تھا۔ رضوانہ پرنس کا مضمون بہت پسند آیا۔ نگہت سیما نے ایک عمر کے بعد لکھ کر تھوڑا بوجھل کیا تاہم اختتام پسند آیا۔ سمیرا حمید نے متاثر نہیں کیا۔ بوجھل سی تحریر تھی۔ فرحانہ ناز میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ مگر بیٹا نگہت سیما اور سمیرا حمید کی تحریریں بوجھل تو نہیں تھیں)

✍ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "عید سے پہلے پاکیزہ کا شمارہ ملا تو سمجھیں عید سے پہلے ہی ہماری تو عید ہو گئی۔ ٹائٹل بہت ہی اچھا تھا اداریہ ہمیشہ کی طرح کمال کا تھا۔ عید کا شاندار تحفہ عظمٰی جی کا ملائشیا یہ تو نے کیا کیا زبردست تھا یقین مانیے عظمٰی سے زیادہ ہم نے انجوائے کیا پانچ ہزار کی جائے تو عظمٰی کو ہمیشہ یاد رہے گی دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار شروع کر دیا ہے۔ شام شہر یاراں کی

آخری قسط نے سر کا درد ختم کر دیا ساری مشکل گتھیاں کھل کر ریشم ریشم ہو گئیں۔ عنیزہ وسید کو بہت بہت مبارک باد رولر کوسٹر کی طرح گھومتی ہوئی کہانی بالآخر اپنی منزل تک پہنچی۔ امینہ عندلیب میری خصوصی دعاؤں میں ہمیشہ شامل رہتی ہیں۔ آپ کو چوتھی بار خانہ کعبہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ یہ سن کر دل کو بے انتہا طمانیت اور خوشی ملی۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ پاکیزہ کی ساری بہنیں بن کہے بھی آپ کی دعاؤں میں ضرور شامل ہوں گی۔" (بالکل)

ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ "سب سے پہلے دین کی باتوں سے ہی آغاز کیا محترمہ اختر شجاعت کے قلم سے یہ سلسلہ اور زیادہ قابلِ ستائش ہو گیا ہے، جزاک اللہ۔ اس کے بعد جلدی سے محترمہ آنٹی غزالہ نگار اور کزنی سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ دیر آئے درست آئے کے مصداق بہت بہترین اور حقائق پر مبنی انٹرویو جس میں غزالہ آنٹی نے پُراثر ادبی گفتگو خالصتاً اردو لب و لہجے میں کی ہر سوال کا جواب بہت مدلل اور وضاحت سے دیا ایسے انٹرویو بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ہم ان کی بات کو بخوبی سمجھ تو گئے لیکن اگر وہ بقا پانے والے ادب کی کچھ یادگار تحریروں کا ذکر کر دیتیں تو ہم طفلِ مکتب کے لیے نالج کے نئے در کھل جاتے۔ انجم باجی ان کے انٹرویو میں ایک بات کچھ عجیب سی لگی کہ شادی کے بارے میں ان کے نظریات متضاد رویوں کا پرچار کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف تو شادی کو خرافات کہا جبکہ اگلی ہی لائن میں کہا کہ یہ بہت اچھی چیز ہے اللہ پاک اور ہمارے رسولؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ فیملی کے بارے میں سوال کا بھی مختصر جواب دیا جس سے تشنگی باقی رہی۔ نزہت آپا آپ دو کے بجائے چار افسانے غائب کروا دیتیں مگر انٹرویو اور طویل ہو جاتا۔ مجموعی طور پر انٹرویو پُرمغز تھا جس کا ہم نے نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ تصاویر کلرڈ ہوتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ باجی نگہت سیما اور بانو قدسیہ کا بھی انٹرویو کریں ناں۔ افسانہ صرف ایک پڑھا پاکٹ منی جو کہ اچھا لگا اصلاحی بھی تھا اور دکھی بھی کر گیا۔ آپ ہمارا فخر ہیں جی بالکل آپ نے بہت اچھا مضمون لکھا۔ باجی آپ کی تصویر کچھ فریش نہیں لگی مجھے اداس اداس سی لگی۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ نیلوفر آپا اور آپ میں بہت مشابہت ہے اور عذرا آپا بھی ہمیشہ کی طرح پیاری لگیں۔ ان کو میرا بہت سلام کہیے گا۔ جلترنگ میں دوسرا خاکہ اچھا لگا۔ ڈائری بھی بہترین ہے اور روحانی مشورے میں فضائلِ رمضان کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ایک ایک لفظ ہمارے لیے اہم اور قیمتی ہے، جزاک اللہ۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

کیتی آرا، کراچی سے۔ "سب سے پہلے آپ کو ہماری طرف سے عید کی مبارک باد۔ اللہ آپ سمیت ہم سب کو ہی ہزاروں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔ باجی آج مہینوں بعد آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ باجی شاید آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصے پہلے میں نے اپنی نند کے انتقال کی خبر دی تھی بس اس کے بعد تو جیسے دکھ نے گھر ہی دیکھ لیا ابھی میاں، بہن کے صدمے سے نکل نہیں پائے تھے کہ بہنوئی...... اور باجی فرحت کی اچانک موت نے جیسے کمر توڑ کر رکھ دی یکے بعد دیگرے موت نے میاں کو مزید بیمار کر کے رکھ دیا کہ ان کا سنبھلنا مشکل تھا بہرحال اس موقع پر آنے جانے والوں کا تانتا اور پھر میاں کو صدمے سے نکالنے کی کوشش ایک مشکل امر تھا سو جیسے تیسے طے ہوا اور اس دوران دو تین مہینے اس تیزی سے نکل گئے کہ دنوں کے آنے اور جانے کا پتا ہی نہ چلا اور تبعیت و حالات سنبھلتے ہی ہم کاغذ قلم لے کر آپ کی محفل میں شریک ہو گئے تاکہ اپنی غیر حاضری کی وجہ آپ کے علم میں لاسکیں بہرحال یہ تو ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے انکار یا فرار ناممکن ہے۔ دنیا کے کاروبار تو چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔" (اللہ تعالیٰ آپ کو تمام پریشانیوں سے باہر نکالے اور مرحومین کی مغفرت کرے، آمین)

امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ "سانحہ سمندر، عید کے روز دل ایسے تڑپ تڑپ کے رویا کہ ان کی موت تو ایسے لکھی تھی کاش والدین اپنے بچوں کو منع کرتے۔ خوشیاں ضرور منائیں، پانی کی لہریں وہ بھی سمندر کی لہروں کا کیا بھروسا اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ پہلے اداریہ پڑھا باجی انجم انصار ہمیشہ، اچھا اور خوب صورت نہ صرف پیغام دیتی ہیں بلکہ اس انداز میں دیتی ہیں۔ پڑھنے کی حد تک نہیں سوچنے اور عمل کرنے کا پیغام اس شمارے اداریہ میں تو ماہ رمضان کے حوالے سے معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ دین کی باتیں علم معرفت الٰہی سب کو بے حد پسند آ رہا ہے۔ بہت خوشی ہوئی باجی اختر شجاعت انتہائی سادہ لفظوں کے ساتھ ساتھ موضوع کو لے کر چل رہی ہیں اور اتنے اچھے انداز اتنی پیاری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اوہ مائی سوئیٹ باجی دعائے انسؓ روزانہ پڑھتی ہوں لیکن دعا ترجمے کے ساتھ نہیں تھی۔ آپ نے دعا کا ترجمہ لکھا ایک ایک لفظ پر آنسو گرتے رہے۔ ترجمہ سامنے رکھ کر پڑھتی ہوں اب کچھ اور ہی لطف آتا ہے۔ بہنوں کی محفل، پیاری بہن قیصرہ حیات کو زندگی کا نیا سفر مبارک ہو بہت سی دعائیں اللہ تعالیٰ ہمیشہ سکھی

رکھے، آمین۔ شگفتہ شفیق، عنبرین حبیب، شیریں ظفر، رفاقت جاوید، فرزانہ شعیب، زریں زبیر، شمیم فضل خالق، ناہید فاطمہ، غزل ہاشمی، فریدہ جاوید دلی مبارک باد اور میری جو پیاری بہنیں بیمار ہیں اللہ پاک سب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے آمین۔ باجی شمع حسین، کینیڈا طبیعت کیسی ہے؟ آپی غزالہ نگار اور کزنی سے اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی بے شک نیویارک میں رہتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں آج بھی وہی مقام ہے۔ ہمیشہ دعاؤں میں رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، آمین۔ شب قدر میں تمام بہنوں کے نام لے کر دعائیں مانگیں بلکہ وہ بھی بہنیں یاد آئیں جو عرصہ دراز سے غائب ہیں۔ پاکیزہ ادارے کے تمام اراکین کے نام لیے۔ جو ہماری بہن اس دنیا میں نہیں ان کی مغفرت کے لیے ہمیشہ ہاتھ اٹھتے ہیں۔ میں کسی بہن کا نام نہیں لکھتی یہ کام تو مینا کی باجی کے قلم سے اچھے لگتے ہیں۔ میری محبت نہ صرف قلم تک محدود، نور افشاں شکار پور سے لکھتی ہیں۔ بھائی براستہ ڈی جی خان، راجن پور سے ہوتے ہوئے کراچی آتے ہیں۔ شہروں کا ذکر کرتے ہیں۔ بہت توجہ دلچسپی سے سنتی ہوں۔ پچھلے سال شکار پور کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ سنبل ملک اعوان آپ شاہدرہ میں رہتی ہیں۔ شاہدرہ میں بہت وقت گزرا۔ رستم، اب فیکٹری کے سامنے فلیٹ تھا۔ آپ نے لکھا عظمیٰ آفاق ماشاء اللہ بہت خوش قسمت ہیں۔ ہاں ہماری بہن عظمیٰ آفاق کی خوشیوں کو اللہ پاک ہمیشہ سلامت رکھے۔ ان کے سر پر پیاری ماں کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے، آمین۔ سنبل بہن ہم بھی تو خوش قسمت ہیں ہمیں بھی تو ہیرے جیسی ہر روپ میں باجی، آپی، بہن، آنٹی، پھپو، دوستوں کی اچھی دوست ایک ماں کے جیسے ناتے سے سب کو دعائیں دینے والی بے لوث پیار کرنے والی۔ اپنے دکھ کو بھلا کر سب کے دکھ سننے والی خوشیوں میں سب کی خوش، پیار بھرے دل کی مالک۔ من موہنی سی باجی انجم انصار ہمیں ملی ہیں ناں ہماری سب کی باجی۔ ایسے پیارے لوگ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں، میں تو بہت خوش قسمت ہوں۔" (پیاری گڑیا اصل میں تو میں خوش قسمت ہوں جس کو اتنا پیار کرنے والی اور دعائیں دینے والی بہنیں ملی ہیں۔ اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش اور صحت مند رکھے، آمین)

حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔ "بہت طویل عرصے کے بعد آپ سے مخاطب ہوں یقیناً ذہن کے کسی گوشے میں میرا نام ضرور محفوظ ہو گا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں گی۔ پاکیزہ سے ایک قاری کی حیثیت سے تو ناتا جڑا رہا مگر لکھاری کی حیثیت سے سستی ہمیشہ چاروں خانے چت گراتی رہی مگر میں نے بھی اس بار سستی پر ایسا وار کیا کہ بیچاری ہاتھ، پاؤں، ٹانگیں، بازو سب کچھ سہلاتی رہ گئی اور میں فوراً سے پیشتر کود پڑی بہنوں کی محفل میں۔ اگر آئندہ ایسی جسارت کی تو گلا گھونٹ کے بے گور و کفن دفنا دوں گی کوئی جنازہ بھی نہیں پڑھے گا سستی کا۔ باجی شادی کو دس سال کا عرصہ گزر گیا دو بیٹوں کی مما جان کہلانے کی حقدار بن چکی ہوں۔ جاب چھوڑ کر اپنے ہی قائم کردہ پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوں۔ اب آتی ہوں ڈائجسٹ کی جانب۔ نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ ماڈل ٹھیک ہی لگی۔ ٹائٹل پر ہی یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ہماری ہر دلعزیز مصنفہ غزالہ نگار ہم سے ہمکلام ہیں تو بلا تاخیر غزالہ جی سے ملاقات کرنے پہنچے۔ واقعی یہ ایک پُرکیف ملاقات تھی۔ غزالہ کو ٹوٹکوں کا شوق ہے یہ جان کر میں نے فوراً ہی ٹوٹکے لکھے اور ارسال کر دیے ہیں۔ روحانی مشورے میں رمضان المبارک کی عبادت سے انشاء اللہ پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ مہینہ گھونٹ گھونٹ شربت پینے کے مصداق پڑھوں گی۔ اس لیے اس پر تبصرہ ممکن نہیں۔" (تبصرے کا شکریہ پاکیزہ میں خط لکھنے اور اپنی تحریریں بھیجنے کا ایڈریس بہنوں کی محفل کے اختتام پر بھی شائع ہوتا ہے)

شیریں ظفر، ملتان سے۔ "اقبال بانو جی کا خط سب سے پہلے جگمگا رہا تھا۔ انہیں خود اپنا انٹرویو اتنا پسند آیا۔ ماشاء اللہ قدم بڑھاتے بڑھاتے دھڑکتے دل سے صفحہ صفحہ پلٹتے چلتے اپنا نام دیکھ کر مزید پھول گئے۔ یا اللہ انجم آنٹی یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ میں نے تبصرہ قلم کے بجائے تلوار سے لکھا ہے۔ کیا آپ کو میری کوئی بات بری لگی۔ پلیز ایسا نہ کہیں۔ دراصل اتنا اپ گریڈ ہو گیا ہے اس لیے پاکیزہ کا معیار بھی قاری کی سوچ بھی، زمانہ اور وقت کی چال بھی۔ نہ لوگ سادہ ہیں نہ ماحول تو بچگانہ سی تحریریں بہت ہی وقت کا زیاں محسوس ہوتی ہیں۔ نیٹ، فیس بک اور سیل فون کا دور ہے۔ یہ ڈائجسٹ پڑھنے والے لوگوں کو تو لوگ جانے کس دور کی بی بی حوا سمجھتے ہیں۔ دقیانوسی خیال کرتے ہیں جبکہ میں انٹرنیٹ کے استعمال سے نابلد ہوں اور ٹی وی بھی نہیں دیکھتی سوا ایک دو پروگرام کی نالج اور معلومات انہی ڈائجسٹوں سے حاصل کرتی ہوں اور اپنے خاندان میں میری شہرت سب سے زیادہ اپ ٹو ڈیٹ معلومات والی عورت کے طور پر ہے۔ خیر اب اسی لحاظ سے اگر میرے پاکیزہ ڈائجسٹ میں مجھے کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو میں برملا کہہ دیتی ہوں کیونکہ یہ کمی ہے خامی نہیں جو دور نہ ہو سکے۔ عظمیٰ آفاق نے پاکیزہ ڈائری میں زبردست انتخاب چھاپا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور عالیہ ضیا کا کلام اچھا

تھا۔ جلترنگ نے دل میں جلترنگ بجادیے۔ ہیرے موتی پڑھ کر تو ہمارے اپنے خاندان کے ہیرے موتی آنکھوں میں گھوم گئے۔ ہاہاہا روحانی مشورے کے کالم میں بہت ہی زبردست معلومات دی گئیں میں نے اپنی روحانی ڈائری میں نوٹ کرلیں انشاءاللہ آنٹی دعا تو میں پہلے بھی مانگا کرتی تھی مجھے دعا میں سوز پیدا کرنا آپ نے سکھایا ہے۔ اللہ آپ کو اجر دے، آمین۔ نورافشاں نے اپنے شہر شکار پور کا ذکر کیا بہت دلچسپ مگرانجم آنٹی انہوں نے شکار پور کے اچار کا ذکر نہیں کیا۔ کیا مزے دار اچار ہوتے ہیں شکار پور کے۔'' (ہاں پتا ہے آپ بھی اپنے شہر کے ساتھ اپنا بھی انٹرویو بھیج سکتی ہیں)

✍ سنبل ملک، لاہور سے۔ ''بہنوں کی محفل شروع ہونے سے پہلے آیت کریمہ ترجمہ اور نوٹ بہت زبردست ایک معیاری ڈائجسٹ کی پہچان یہی ہوتی ہے۔ جس طرح کے گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کو ہر پورشن علیحدہ علیحدہ نظر آتا ہے کہ بغیر کسی تکلیف اور تردد کے اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ سکتے ہیں ایسے ہی پاکیزہ لگا۔ بے شک ادب زندگی ہے الحمدللہ میں بھی اب اس خوب صورت فیملی پاکیزہ ڈائجسٹ کا حصہ ہوں اور مزید اپنے قلم میں نکھار لانے کی خواہش مند ہوں۔ انشاءاللہ سچ میں اس میں شامل بہنوں کی تعداد......لاتعداد ہے۔ نورافشاں شکار پور، عنبر وسیم کی چلو کچھ تو خبر ملی حالانکہ مراسلات ہمیشہ ہر ماہ موجود ہوتے ہیں اور بہت سی نئی قاری بہنوں کو بھی میرا بہت بہت سلام۔ ہاں ایک بات مجھے یاد آگئی جو میں خط...... لکھنے سے پہلے سوچ رہی تھی وہ یہ کہ میری بہت زیادہ قاری بہنیں، سہیلیاں اور مصنفات کراچی سے تعلق رکھتی ہیں تو میں کھلے بازوؤں سب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہوں کہ آپ میں سے کوئی بھی لاہور آئے تو سنبل ملک کو ضرور یاد رکھیں مجھے دلی خوشی و مسرت ہوگی اگر میرے غریب خانے کی قسمت کسی مہمان بہن کے آنے سے جاگ اٹھے (فرمائش) آنٹی اگر راحت وفا اجبوت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پلیز فون نمبر دے دیں یا ایڈریس وہ میرے گھر کے پاس رہتی ہیں اگر وہ مناسب سمجھیں تو میں ان سے ملنا چاہوں گی۔ توشین ناز اختر صاحبہ کے کلینک کا اگر پتا مل جائے تو مہربانی ہوگی۔ آنٹی جانی میرا نام بھی شازیہ سرور ہے مگر اتنے زیادہ شازیہ نام کے بڑے بڑے لوگ تھے کہ میں نے اپنے نک نیم جو کہ سنبل ہے کو ہی استعمال کیا۔ شازیہ سرور نام میرے پاپا نے رکھا ہے مگر اب صرف میری اسناد میں یہ نام ہے کیونکہ سب کو سنبل نام پسند ہے اور سب لوگ سنبل ہی کہتے ہیں۔ شازیہ چوہدری مرحومہ اور رخ چوہدری کے ناول ادھر اردو بازار، لاہور سے مل سکتے ہیں؟ زم زم وہاڑی آپ کا نام اب آنٹی نے بھی لے لیا پتا نہیں آپ کدھر گم ہو۔ رابیل شاہ کو بھتیجے کی بہت بہت مبارک ہو، اللہ پاک زندگی صحت وتندرستی اور نیک بنائے۔ سب کے تبصرے اتنے خوب صورت جاندار اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ مجھے تو اپنے خط بھی نکمے سے لگتے ہیں یہ آپ کی محبت اور بڑا پن ہے کہ ہمارے لڑکھڑاتے، ٹوٹے پھوٹے، زخمی خط کو دیدہ زیب رنگا رنگ لفظوں کا لباس پہنا کر صفحات پر سجادیتی ہیں۔ سارہ چوہدری بھئی آپ کو تو آنٹی نے اپنی جان بنالیا، مبارک ہو سمجھو آپ کامیاب ہوگئیں۔'' (آپ بھی ہماری جان جاناں ہیں)

✍ شہلا نواز، لاہور سے۔ ''سرورق جاذب نظر تھا۔ سرورق کی حسینہ اپنی سالگرہ پر کافی خوش نظر آئیں لگتا ہے بہت اچھے تحائف ملے ہیں۔ اداریے میں آپ نے حوادث سے نمٹنے کا بہت عمدہ حل بتایا۔ زندگی میں دشواریاں تو سب کو ہی آتی ہیں لیکن ہم رونے کے بجائے ہنس کر گزارہ کرلیں تو زیادہ بہتر ہے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کریں کیونکہ شکر کرنے سے نعمت بڑھتی اور ناشکری سے چھنتی ہے۔ امانت میں کرداروں کے ساتھ ہمارے دل بھی دھڑکتے ہیں۔ وارث علی کی خباثت بہت بری لگتی ہے۔ اصیل خان کے تڑپ تڑپ کے رونے سے ہمارا دل بھی بہت تڑپا جانے کب اس کی سزا ختم ہوگی۔ ہم ہر ماہ امانت کی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ صائمہ اکرم بہت عرصے بعد اپنے ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آئیں دل خوش ہوا ان کا مختصر سا افسانہ بے چاری اچھا لگا مزید مزاحیہ تحریریں لکھیں کیونکہ مزاح ہمیں بہت پسند ہے۔ سادہ اور گیلوسی اقبال بانو سے انٹرویو بہت پسند آیا بانو آپا کے پرانے افسانوں میں ہجر کا دکھ رلاتا ہے بانو آپا سے عقیدت ہمیں اس لیے بھی ہے کہ ہم بھی ان کی طرح ملتان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بانو آپا کا اپنے استاد کو برجستہ جواب اور ان کے خوب صورت لان کی سیر ہمیں بہت اچھی لگی محبتوں سے گندھی بانو آپا پلیز کوئی رومینٹک سا افسانہ لکھیں۔ شائستہ زریں بہت محنت سے اپنا سروے مرتب کرتی ہیں ان سے بات ہوئی بہت دھیما بولتی ہیں بات سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔'' (شکریہ)

✍ سدرہ کلثوم، مروت سے۔ ''پاکیزہ کے لیے تو میرے پاس الفاظ نہیں جو لفظوں میں بیان کرسکوں۔ ہر کہانی، ہر ناولٹ، ہر افسانہ، ہر ماہ زبردست ہوتا ہے یہ تنقید بہت آسان یہ تعریف ہمیں مشکل لگتی ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ دنیا کا سب سے مشکل

ترین کام لکھنا اور دنیا کے سامنے لانا ہے۔ اب آتی ہوں اصل بات کی طرف میری بڑی خواہش ہے آپ سے بات کرسکوں لیکن میری ہمت نہیں پڑتی۔ میں نے پہلے تین غزلیں اور نظم آپ کی خدمت میں بھیجی تھیں معلوم نہیں آپ کی خدمت میں پہنچی یا نہیں۔ اب اپنی کچھ نظمیں بھیج رہی ہوں آپ کی تنقید اور تعریف میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ برائے مہربانی ضرور ضرور نظرثانی فرمایئے گا کیونکہ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ یا طریقہ نہیں جو اس میں مدد کرسکے بہت پُرامید ہو کے بھیجی ہے۔ آپ کی شکر گزار رہوں گی تاحیات دعا گو رہوں گی جس طرح آپ نے پہلے بھی میری حوصلہ افزائی کی اس لیے آپ کی بہت بہت شکر گزار ہوں۔ اس ماہ کے شمارے میں جس لڑکی نے میری دوستی کو ایکسپٹ کیا اس کی بہت شکر گزار ہوں سروری ارشد بہت بہت شکریہ کیوں نہ آپی آپ انہیں میرا نمبر دے دیں۔'' (ثریا، آپ نے اس دفعہ بھی اپنی نظم مجھے بکھرنے دو خط میں ہی لکھ دی ہے۔ میں بار بار تاکید کرتی ہوں کہ اپنے مراسلات اپنے خط کے بجائے علیحدہ صفحات پر لکھا کریں۔ جس پر اپنا پورا نام اور اپنے شہر کا نام بھی لکھیں مگر اس ماہ بھی کئی خطوط اور بہت ساری تحریروں پر ان کا نام ہی درج نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ شامل اشاعت نہیں ہیں)

✍ ڈاکٹر زاہدہ پروین، مقام نامعلوم سے۔ ''اللہ آپ کو ہدایت اور عافیت سے نوازے جولائی کا پاکیزہ دیکھ کر بہت دکھ اور افسوس ہوا۔ ٹائٹل پر صرف نام ہی پاکیزہ تھا۔ اس کے علاوہ تو کوئی پاکیزگی نظر نہیں آئی۔ رمضان کا مبارک مہینہ اور ٹائٹل پر موجود محترمہ کا دوپٹا ندارد......کھلا سر باقی مہینوں میں کافی بہتر ٹائٹل ہوتا تھا۔ سر پر دوپٹا رکھے خاتون واقعی پاکیزہ لگتی تھی مگر رمضان کے ماہ میں۔ اسلام صرف تسبیح کرنے، نمازیں پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ یہ عمل مانگتا ہے اور آپ جس عہدے پر ہیں آپ تمیز دار ٹائٹل بنوا سکتی ہیں اللہ سے ڈریں بے شک اللہ نے ہر بات کے متعلق پوچھنا ہے۔'' (پیاری زاہدہ ہم معذرت خواہ ہیں مگر یہ غلطی انشاءاللہ اب نہیں دہرائی جائے گی حالانکہ ہم ضرور اس بات کا خیال رکھتے ہیں بہرحال اللہ تعالیٰ کے بعد آپ سب سے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں)

✍ غزالہ نگار اورکزئی، امریکا سے۔ ''نزہت نے بہت خوب صورت انٹرویو لکھا شکریہ۔ انٹرویو لگانے کا اور اتنے اچھے

تعارفی جملوں کا بے حد شکریہ اللہ ان کو بہت خوش اور بلیسڈ رکھے کیا پتا کبھی کراچی بھی آدھمکوں لیکن جب سے پشاور کی ڈائریکٹ فلائٹس شروع ہوئی ہیں سیدھا اُدھر ہی جاتی ہوں کیونکہ چھٹیاں بہت کم ہوتی ہیں اللہ کو منظور ہوا تو ضرور ملاقات ہوگی۔ جیتی رہیں نزہت شاد و آباد رہیں اب کراچی آنا ہی پڑے گا تم سب سے زندگی میں کم از کم ایک بار تو مل لوں۔ اللہ سب کو اپنے گھروں میں آباد رکھے آتے جاتے رہیں بس اسی میں زندگی کا لطف ہے۔'' (انٹرویو پسند کرنے کا شکریہ۔ کراچی تمہاری آمد کے لیے پاکیزہ کا پورا ادارہ منتظر ہے۔ ہاں اب اپنا کوئی بھی افسانہ جلد بھیجو ماشاء اللہ تمہارا انٹرویو ہمارے قارئین کو بے حد پسند آیا ہے۔)

✍ صدف جاوید قریشی، ہری پور سے۔ ''اپنے فیورٹ ناول شامِ شہر یاراں ...کی آخری قسط پڑھ کر دل اداس ہوگیا۔ مجھے یہ ناول پہلی قسط سے ہی عزیز تھا۔ اپنے پلاٹ کے لحاظ سے، کردار نگاری کے لحاظ سے، اپنے تھیم کے لحاظ سے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر چیز پرفیکٹ تھی لیکن اس کا اختتام مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ عنیزہ جی ہر درجے سردار مہر زاد خان کے ساتھ زیادتی کی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ عنیزہ جی کو علم ہے کہ اس کے بعد تمام دخترانِ پاکستان ان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گی اس لیے ناول کے آخری پیراگراف میں انہوں نے لکھا ہے کہ لکھاری کو قاری سے دو قدم آگے ہونا چاہیے۔ آنٹی جی جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے کہ آج کل مرد بیوی کی عزت نہیں کرتے اور جو لوگ حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں پھر وہ حد سے زیادہ عزت دیتے ہیں اور سب سے پسندیدہ جملہ اس آخری قسط کا جب دانیال بینش کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان کو اپنے اوپر کانفیڈنس ہونا چاہیے اور اگر انسان ٹھیک ہے اور ساری دنیا اسے غلط کہہ رہی ہے تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ تمام دنیا کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ خیر اینڈ پڑھ کر دل اتنا برا ہوا کہ نہ مبارک باد دینے کو چاہ رہا تھا اور نہ ہی کوئی اور کہانی پڑھنے کو۔ اللہ بھلا کرے عظمیٰ جی کا کہ انہوں نے ملائشیا کی سیر کروا کے دل خوش کر دیا۔ اندازِ تحریر اچھا تھا بہت ہلکا اور شگفتہ اور آفاق میاں کے بارے میں پڑھ کر اپنے ابو جی نظروں کے آگے آگئے۔ ہمارے ابو جی اتنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں کہ خیر سے ہمارے جہاز اُڑ جاتے ہیں۔ بارا تیں رخصت ہو جاتی ہیں تب ہمارے ابو جی پہنچتے ہیں ہاں لیکن اگر گھومنے جانا ہے وہ بھی دوستوں کے ساتھ تو پھر اُن کی پھرتیاں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ عظمیٰ کے سارے سفرنامے میں ایک جگہ پر خاتونِ خانہ والی ٹینشن نظر آئی جب پانچ ہزار کی چائے پی باقی ہر جگہ اپنی بے وقوفیوں اور نا تجربے کاریوں کو بہت مزاحیہ انداز میں تحریر کیا گیا۔ میری طرف سے مبارک باد ابھی رسالہ پورا نہیں پڑھا آپ کو خط لکھنے کی جلدی ہے۔ آنٹی جی جلدی سے میری کوئی نظم لگا دیں اور ہاں پاکیزہ کی مستقل قاری بہن ناہید انور ہری پور ہزارہ جو میری آنٹی بھی ہیں اور ٹیچر بھی ہیں ان دنوں بہت بیمار ہیں ان کے لیے خصوصی طور پر دعائے صحت کی اپیل کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور نئی زندگی دے آمین۔'' (جی ضرور)

✍ پروین افضل، بہاول نگر سے۔ ''عید مبارک نمبر خوب صورت سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ عید کے حوالے سے آپ کا اداریہ واقعی شاندار تھا۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ کیا اور آگے بڑھے تو شامِ شہر یاراں کی آخری قسط سیدھی دل میں اتر گئی ویلڈن عنیزہ سید اچھا اینڈ کیا۔ باقی افسانے بھی جن میں دس نمبر کا سوال، کرتار سنگھ، بوجھ بیٹیوں کے، تجدیدِ محبت اور امید کے جگنو اچھے لگے۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ مصور شاہد حسین کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین اور امینہ عندلیب، شگفتہ شفیق، عذرا بی بی کو مکمل صحت عطا فرمائے، آمین۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور عروج دے، آمین۔'' (آپ اور دیگر بہنیں جو اپنے شہر کے حوالے کے ساتھ اپنا انٹرویو بھیجنا چاہتی ہیں وہ اپنا تعارف بھی تو لکھیں ناں۔ اب جیسے پروین نے صرف بہاول نگر کے بارے میں لکھ بھیجا ہے مگر ہمیں تو پروین کے بارے میں بھی جاننا ہے ناں۔ امید ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔ اس انٹرویو کے ساتھ اگر آپ کا دل چاہے تو اپنی تصویر بھیجیں اور اگر نہ چاہے تو بے شک نہ بھیجیں مگر اپنے تعارف کے ساتھ اپنے شہر یا اپنے گاؤں یا اپنے ملک کا مختصر احوال لکھ کر بھیج سکتی ہیں۔)

✍ نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ ''اب تو خیر عید گزرے بھی مہینہ ہو چلا مگر پھر بھی سب کو عید مبارک۔ جولائی، اگست کے شمارے تقریباً ساتھ ساتھ ہی پڑھے۔ افسانوں کا انتخاب لاجواب تھا۔ ناولوں میں عنیزہ سید نے شامِ شہر یاراں کا خوب اچھا انجام کیا۔ ایک سیاست داں کو بہت ہی پازیٹو دکھایا۔ اصل میں رائٹرز تو اچھے سے اچھا منظر دکھا سکتی ہیں۔ اس طرح یہ ان کی اصلاح کی کوشش بھی ہوتی ہے پھر زلزلہ زدگان کے حالات جان کر دل وہیں پہنچ گیا۔ میرا تعلق پنڈی سے ہے مارگلہ ٹاور کے گرنے کے حالات سے میں بھی کسی حد تک واقف ہوں آج بھی وہاں ویرانی برستی ہے۔ اللہ ان آفات سے محفوظ رکھے۔ انجم باجی اس دفعہ کا جلترنگ خاصا دلچسپ تھا۔ کہانیوں میں بھی کافی مختلف موضوعات لگے مگر ہلکی پھلکی دلچسپ اور مزاحیہ تحریریں بھی شامل کریں۔ نایاب جیلانی

سے کہیں تیزی سے ناولٹ آگے بڑھ جائیں۔ امانت کا بھی اختتام قریب ہی نظر آرہا ہے۔ بیوٹی ٹپس بھی دیتی رہا کریں۔ خوش ذائقہ میں ٹپس اچھی لگیں مجموعی طور پر پاکیزہ سب کا پسندیدہ رسالہ ہے۔'' (شکریہ)

✍ جبیں ضیا، ملتان سے۔ ''آپ سے ایک شکایت ہے کچھ خطوں میں جواب طلب باتیں بھی ہوتی ہیں ان کے جواب مل جائیں تو بہت سے قارئین کی تسلی ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ عمیرہ احمد کب لکھیں گی، ان کی شادی کا احوال کب شامل کریں گی، عنیزہ سید سے بھی ہم ناول کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں کیا وہ جواب دیں گی۔ اگست کے شمارے میں سفرنامہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عظمیٰ آفاق سعید نے دلچسپ انداز میں لکھا۔ رسالے میں یہ اضافہ اچھا لگا کبھی کبھی کسی موضوع پر مضمون بھی دیا کریں۔ ایک مرتبہ پھر شکریہ کہ اشعار اور دیگر مراسلے شامل کرتی ہیں مگر بعض دفعہ سندیسے میں بے تکی چیزیں لگتی ہیں۔'' (پیاری ثریا! عمیرہ احمد جب قلم اٹھائیں گی تو وہ انشاء اللہ پاکیزہ کے لیے ہی لکھیں گی۔ عنیزہ سید کے ناول سے متعلقہ سوالات ہماری بہنیں جلد از جلد ارسال کریں ہم عنیزہ سید کو بھجوائیں گے تاکہ وہ آپ کو جواب دیں۔ سندیسے، دلچسپ ہونے چاہئیں جیسے کسی کو مخاطب کر کے کوئی نصیحت کی جاتی ہے یا کوئی شوخ جملہ کہہ دیا جاتا ہے یا رازداری میں کوئی شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس انداز میں آپ سب بہنیں لکھیں گی تو سب پڑھنے والوں کو لطف آئے گا)

✍ اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ''سب سے پہلے حسبِ معمول بہنوں کی محفل کا نمبر آیا۔ آپ کے خوب صورت سفر کی خوب صورت مگر مختصر روداد پڑھ کر بہت اچھا لگا اور دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ ایسے سفر پر ہر مسلمان کا بار بار نصیب بنیں، آمین۔ سب سے پہلے باری آئی عنیزہ سید کے ناول کی جس کے خوب صورت اختتام کے بعد وہ حقیقی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ رفعت سراج بھی حالات و واقعات کو تیزی سے سمیٹتی نظر آرہی ہیں۔ اس بار کا سب سے مزیدار افسانہ ہاں افسانہ ہی کہوں گی اس افسانوی اور شرارتی ٹرپ کو جو عظمیٰ جی کی فیملی کے ٹرپ کے حوالے سے تھا۔ بہت مزہ آیا عظمیٰ جی۔ نایاب جیلانی کی کہانی میں سسپنس ابھی تک برقرار ہے۔ مالا کی موجودہ حالت کے پیچھے یقیناً مون کی پُراسرار صلاحیتوں کا ہاتھ ہے۔ دس نمبر کا سوال اف ایک دلگداز حقیقت کہ ہم ہمیشہ دوسروں کی خامیاں تلاش کرتے رہ جاتے ہیں اپنے گریبان میں جھانکے بغیر اُمِ ثمامہ آزادی کے حوالے سے ایک اچھی کاوش کے ساتھ نظر آئیں کہ انسانیت کسی ایک مذہب کی میراث نہیں ہے بلکہ ہر آفاقی مذہب انسانیت کو سب سے پہلے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ شیریں حیدر نے ایک بار پھر ہمارے معاشرے کے ایک بے حد حساس موضوع کو پیش کیا جو ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ سمیرا حمید پتا نہیں کیوں اس بار کچھ خاص متاثر نہیں کر پائیں۔ اُمِ مریم کا افسانہ بھی ٹھیک تھا۔ امید کے جگنو ہر پاکستانی کے دل کی آواز لگا کہ گھر کی خاطر سو دکھ جھیلیں گھر تو آخر اپنا ہے۔ بہت عرصے بعد نگہت سیما کا خوشگوار اینڈ کافی اچھا لگا۔ موبل شنید سے ملاقات خوب رہی۔ اگلی بار پھر کسی رائٹر کو لائیں ناں اس بزم میں۔ رضیہ ہاؤس کے مکینوں کا نظارہ مزے کا لگا۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

✍ تسنیم ماہ پارہ، کراچی سے۔ ''عید نمبر اچھا لگا۔ عنیزہ سید نے میلا لوٹ لیا۔ عظمیٰ آفاق کا سفرنامہ پڑھ کر ملائشیا جانے کا پکا پروگرام ہے۔ دیگر تحریریں بھی بہت اچھی تھیں مگر سب سے خوب صورت تحریر اس مرتبہ جلترنگ کے خاکے تھے پڑھ کر بے حد لطف آیا انجم۔'' (شکریہ)

✍ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''آپ نے ثنا بھلوال کی شاعری چھاپ کر بہت نیکی کی ہے۔ ثنا مبارک ہو، اب قلم ذرا جی دار کر لوں۔ ارم کمال، فیصل آباد بڑی کمال کی چیز ہو وہاں کس جگہ ہو؟ میری بہن عالیہ وہیں رہتی ہے۔ ہم آپ سے خوشیاں بانٹنے کو تیار ہیں۔ کیا ملنا چاہو گی اگر ہاں تو ایڈریس بتا دینا۔ مسز تسنیم زندہ باد۔ موبل شنید ہیں یا نیرہ نور میری پسندیدہ گلوکارہ روٹھے ہو تم...... شنید نیا نام ہے اپنی فارسی یاد آگئی۔ بھئی موبل کو ہم کہاں سے دیکھیں کہ ٹی وی کم دیکھتے ہیں۔ سیما سراج آپ بہت پیاری ہیں اللہ آپ کو ایسی خوشیاں دے کہ آپ کا دکھ کم ہو جائے۔ یقین کریں جب سے ہوش سنبھالا کبھی عید منانے کو دل نہیں چاہا۔ ہم تو آپ جیسی صورتیں دیکھ کر خوش رہتے ہیں۔ اپنے غموں کو ہم نے کبھی گھاس نہیں ڈالی۔ عظمیٰ تمہاری شاعری سے زیادہ دلچسپ تمہاری نثری تحریر ہے۔ ملائشیا کی سیر سرسری نظر میں مزہ دے گئی تو پڑھ کر کیا ہوگا۔ سندیسے کبھی بند مت کیجیے گا۔ باقی پاکیزہ کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔'' (نوازش)

✍ حمیرا کلیم، ملتان سے۔ ''اگرچہ رسالہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں مگر خط لکھنے کا ٹائم نہیں ملتا۔ جاب کے ساتھ بہت مشکل ہو جاتا ہے بہرحال اس بار ٹائم نکال کر خط لکھ رہی ہوں۔ اس کی سب سے بڑی تحریک شادی کا احوال تھا جو میں نے بھی لکھا ہے۔ رسالہ اس بار زبردست تھا سوائے چاندنی گنگنانے لگی کے وہ اچھی نہیں لگی۔ نہایت گھسا پٹا اور فضول ٹاپک تھا۔ باقی تحریریں اچھی تھیں۔ دس

نمبر کا سوال واقعی انسانی بے حسی اور غفلت ظاہر کرتی ہے۔ شام شہر یاراں شاندار تھا۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے لگے۔" (شکریہ)

✿ سارایہ چوہدری، گولارچی سے۔ "کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ہر چیز سے دل اچاٹ ہوگیا ہے نہ کوئی پاکیزہ پڑھا نہ کچھ لکھا۔ آج بھی مجبوراً قلم اٹھانا پڑا۔ سب سے پہلے تو آپ کا اور ان تمام بہنوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے میرا انٹرویو پسند کیا۔ کوئی بھی تحریر لکھتے وقت یہی خیال آتا ہے کہ یہ شائع نہیں ہوگی۔ انٹرویو لکھتے وقت بھی بار بار یہی خیال آیا مگر میں حیران رہ گئی جب اس کی پسندیدگی کے بارے میں پڑھا۔ آنٹی آپ نے ہمیشہ ہم جیسے انجان لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی جس سے ہمارے اندر نئی امنگ پیدا ہوئی۔ ایک بار پھر آپ کا بے حد شکریہ۔ سنبل ملک اعوان میں تو پہلے ہی پاکیزہ کے توسط سے دوستی کی خواہاں ہوں۔ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا میں یہ ہاتھ بڑی خوشی سے تھامتی ہوں ویلکم۔ سیدہ علیشاہ، بہاول پور اور صبا نور، لیہ میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں اور جو بھی مجھ سے دوستی کرنا چاہے موسٹ ویلکم۔ سعدیہ مریم سعدی اور سیدہ انیلا کرن شاہ تم دونوں سے مل کر بے حد وحساب خوشی ہوئی اور میری تلاش بھی ختم ہوئی۔ اب تا دمِ آخر پیکرِ وفا رہیں گے ہم۔ موبل شنید کا انٹرویو بہت زبردست رہا۔ رضوانہ پرنس جی مبارکاں۔ آپی عظمیٰ آفاق سعید آپ کا سفرنامہ بے حد مزہ دے رہا ہے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے اور آنٹی سلسلہ میرا انتخاب دوبارہ سے شروع کر دیں۔ اس سلسلے کو ہم بہن بھائی مس کرتے ہیں۔ امانت اِک نیا موڑ لے رہی ہے۔ شام شہر یاراں کو سرسری دیکھا میری فیورٹ کہانی ہے لیکن پوری نہیں پڑھی سو تبصرہ محفوظ ہے۔ ترکِ وفا بھی بہت اچھی ہے لیکن میں نے اسے بریک دیا ہوا ہے میں اسے پڑھ کر بہت ٹینس ہو جاتی ہوں مجھے انتظار ہے اس موڑ کا جہاں سے یہ شروع ہوئی تب ہی اس کو ریڈ کروں گی۔ جو مجھ سے فرینڈ شپ کرنا چاہیں اگر ان کی آئی ڈی ہے تو میرا آئی ڈی لنک انجم آنٹی سے لے لیں اور مجھے پاکیزہ لنک کا میسج ضرور کریں۔ میرا سیل نمبر بھی آنٹی سے لے سکتی ہیں آپ۔ مجھے انتظار رہے گا آپ سب کے میسج کا۔ سارایہ چوہدری آپ بھی میری فرینڈ بن جائیے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✿ کائنات اُم فروا، کوٹ مومن سے۔ "پاکیزہ کو پڑھنا ہمارے لیے ایک نیا تجربہ ہے جس کی ٹھوس اور مدلل وجہ نایاب جیلانی صاحبہ ہیں۔ جنابہ کی تعریف کے لیے کوئی پیمانہ یا پیمائش کے لیے آلہ نہیں ہے۔ ساتویں حصے میں لفظوں کی بازیگری نظر آئی۔ انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی سے ایک ایک لفظ تحریر کیا گیا تھا۔ اگرچہ ابھی بہت کچھ مبہم سا ہے پھر بھی لفظوں کی جادوگری عروج پر نظر آئی۔ ایک مصنفہ کے فن کا کمال اس کی تحریر کی روانی، تسلسل اور اندازِ بیان سے نظر آتا ہے۔ نایاب صاحبہ ہماری طرف سے مبارک باد کی مستحق ہیں۔ سب سے پہلے ترکِ وفا کو پڑھا پھر مزید کچھ پڑھنے کی خواہش نہیں رہی۔ باقی تحریروں پر جامع اور لازوال تبصرہ آئندہ ماہ تاہم عظمیٰ آفاق کے ساتھ ملائشیا کی سیر کر آئے۔ کیا مزہ دوبالا ہوتا اگر محترمہ آپ ملائشیا کی سیر کے ساتھ ایک خوب صورت ناولٹ بھی قارئین کے لیے لکھ مارتیں۔ تاہم آپ کے دلچسپ سفر کے ساتھ ہم بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔" (نایاب جیلانی شکریہ کہتی ہیں)

✿ مسز نسیم تاج، لاہور سے۔ "اگست کا شمارہ پڑھا۔ اچھا لگا آپ کو اور عظمیٰ کو عمرہ اور زیارتوں کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ اللہ کرے ہم بھی وہاں جانے والوں کی لسٹ میں آجائیں، آمین۔ افسانے اس بار سب اچھے لگے۔ قسط وار ناول میں مہر زاد کا کردار پاکستانی سیاست کی بالکل درست عکاسی کرتا رہا۔ انجام اچھا لگا۔ تمام کرداروں کو اچھے۔ طریقے سے مصنفہ نے نبھایا اور باقی تمام سلسلے اچھے لگے۔ اداریہ حسبِ معمول بہترین رہا۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا اور امینہ کے لیے دعائیں۔ معراج رسول صاحب کی صحت یابی کے لیے بھی دعا کرتی ہوں۔ اس بار عید اور پہلے رمضان کی وجہ سے بہت مصروفیت رہی۔ اس لیے اس بار زیادہ تفصیلی تبصرہ نہیں لکھ پائی ہوں۔ بس سب کے لیے دلی دعائیں کرتی رہی ہوں۔" (جزاک اللہ)

✿ ربیعہ رانا، پنجاب۔ "ترکِ وفا ایک چونکا دینے والے موڑ پر پہنچ گئی۔ مون یقیناً ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔ اس کا ہر ہر انداز چونکا دینے والا ہے۔ مون کی میکسیاں، ریشمی سلک کے روک، سرخ سلکی سیدھے بال اور سر کا کراؤن دل کھینچ لیتا ہے۔ مصنفہ جرمنی کے احوال کے ساتھ مون کی حسین پُراسرار شخصیت کا خاکہ بہت دل نواز انداز میں کھینچتی ہیں۔ کہانی اختتام کی طرف رواں دواں نظر آتی ہے۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال کا ذکر پسند آیا۔ پری کے ناز بھرے جواب حیران کن تھے۔ مالا کے ساتھ کیا ہوا؟ جاننے کی بے چینی ہے۔ مجھے خطوط کا سلسلہ بہت پسند ہے اور جو آپ انٹرویوز لیتی ہیں بہت لاجواب ہوتے ہیں۔ مجھے غزالہ نگار کا انٹرویو

بہت پسند آیا۔ ان کے سر پر موجود دوپٹا اور بڑے بڑے گلاسز بہت نفیس لگ رہے تھے۔ عظمیٰ آفاق نے ملائشیا کے احوال کے ساتھ محفل لوٹ لی۔ دس نمبر کا سوال اچھا افسانہ تھا۔ نگہت سیما کا ناول پسند آیا۔ بہار رُت بن کر آئی ہے عید، عید کے حوالے سے اچھی کاوش تھی۔ اُم مریم نے بھی بہتر لکھا۔ ام ثمامہ کو ابھی پڑھا نہیں۔ حمیرا خان کا بس سو سو افسانہ تھا۔ رضوانہ پرنس کا مضمون قابلِ توجہ تھا۔ موبل سے ملاقات بہترین رہی۔ تاہم ملائشیا کے سفر نے من لوٹ لیا۔ بہت دلچسپ سفرنامہ تھا۔ عظمیٰ آفاق کو مبارک باد۔ بہنوں کی محفل تمام پرچوں میں اول نمبر پر ہے کیونکہ یہ ایسا سلسلہ ہے جو ہر قاری اور مصنفہ سے باخبر کرتا ہے۔" (شکریہ)

✿ تابندہ جبیں، کراچی سے "سالگرہ نمبر میں آپ نے اپنی پیاری شہزادیوں میں مجھے بھی یاد رکھا جس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اب تک یاد رکھا ہے۔ اب تو مجھے مہینوں ہو جاتے ہیں آپ سے بات کیے یا خط لکھے مگر ماشاءاللہ ...ے آپ کے حافظے کی داد دینی پڑتی ہے کہ پرانے ممبرز کو بھی آپ بہت محبت سے یاد رکھتی ہیں۔ باجی میرا آپ سے ملنے کو بہت دل کرتا ہے اگر کبھی مصنفات یا قارئین بہنوں کی کوئی تقریب رکھیں تو مجھے بھولیے گا نہیں میں ضرور آؤں گی۔ آرزو بھابی اور ان کی فیملی عمرہ پر گئے میری طرف سے سب کو بے حد مبارک باد...... نزہت جبیں ضیا کے بیٹے کی منگنی کا احوال پڑھا بہت، اچھا لکھا ان کو بھی بہت، بہت مبارک ہو۔ تصویر سمجھ نہیں آئی اگر دولھا کے ساتھ نزہت صاحبہ خود بیٹھی ہیں تو ماشاءاللہ بہت ینگ اور اسمارٹ ہیں۔" (ہاں نزہت جوان لڑکی کی طرح دکھائی دیتی ہیں) سلسلے وار ناول امانت اچھا جا رہا ہے ... دوسرا ناول شام شہر یاراں بھی اچھا جا رہا ہے مگر الجھاؤ بہت ہیں، اب میرال کا بھی کوئی فیصلہ ہونا چاہیے۔" (تبصرے کا شکریہ، آپ عید کے بعد مجھے فون کر لیجیے گا...... انشاءاللہ کوئی تقریب ہوگی تو آپ کو ضرور شرکت کی دعوت دوں گی)

✿ زینت عبدالصمد، میر پور ساکرو سے۔ "جولائی کا شمارہ سحر انگیز نگاہوں والی طرح دار دوشیزہ سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل پر موجود سرخی نے سیروں خون بڑھا ڈالا، غزالہ نگار اور کزئی سے ملاقات کی نوید نے جلدی، جلدی صفحات پلٹنے پر مجبور کر ڈالا۔ اپنی پسندیدہ رائٹر سے ملاقات جن کا جداگانہ اسلوب ہمیشہ سے ہماری توجہ کھینچتا رہا۔ اس سے پہلے نزہت آپی نے اقبال بانو سے ملاقات کروا کے مانو دل مٹھی میں لے لیا تھا اور اس دفعہ غزالہ نگار صاحبہ کے کیا کہنے...... اپنی تحریروں کی طرح غزالہ جی کا انٹرویو بھی عام ڈگر سے ہٹ کر تھا۔ انہوں نے انتہائی صاف گوئی سے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا۔ رائٹر بننے کے لیے نادر و نایاب نسخوں سے نوازا۔ شادی کے متعلق ان کے خیالات سے ہم بھی سو فیصد متفق ہیں۔ یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔ اس بات کو جی کا روگ بنانا انتہائی درجے کی بے وقوفی ہے۔ کاشانۂ الفت، سکینہ فرخ نے بڑی خوب صورتی سے زندگی میں پیش آنے والی کٹھنائیوں اور اپنوں کے بدلتے ہوئے رویوں اور ان رویوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کو واضح کیا۔ خونی رشتوں میں در آنے والی محبتیں، خود غرضیاں کس طرح جیون کو بوجھل کر دیتی ہے اور انجام کار مالی کے جاتے ہی لہلہاتے چمن آندھیوں کی زد میں آکر اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ ترکِ وفا میں نایاب جیلانی سب کے ساتھ کہانی کو سلوموشن میں لے کر چل رہی ہیں مگر اسلوب ان کا بھی دلچسپ ہے۔ مون کی غیر معمولی صلاحیتیں...... جذبۂ انتقام میں اندھا ہو کر خیر و شر کی تمیز بھول جانا، باپ بھائی کا فرق سمجھانا اور پھر کہانی میں جا بجا اسرار کے پہلو قاری کی توجہ کھینچنے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ دوسری جانب امانت بھی اچھا جا رہا ہے۔ رفعت سراج ہر کردار سے بھرپور انصاف کرتی ہیں اور ہر کردار کی نفسیات کو بہترین انداز میں پیش کرتی ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

✿ شبینہ گل، راول پنڈی سے۔ "امانت، رفعت سراج کسی قاری بہن نے کہا بلکہ بہت سی بہنوں نے کہا یہ ناول رفعت صاحبہ کے تمام ناولز سے مختلف ہے لیکن ایک بات تو بالکل بھی مختلف نہیں...... جسے پڑھ کر صاف پتا لگتا ہے کہ اس ناول کی رائٹر رفعت سراج ہی ہیں۔ وہ بات ہے ان کے ناولز کی ہیروئنز یا ہیروئن...... اور بے شمار کردار، یہ رفعت صاحبہ کا ہی کمال ہے کہ درجنوں کردار والے ناول لکھتی ہیں اور ہر کردار قطعی مختلف مزاج کا دکھاتی ہیں پھر ان کے حالات و واقعات اور مکالمات سے بھی بخوبی انصاف کرتی ہیں۔۔ اور ہیروئن، چاہے ایک ہو یا درجن۔ سب کی سب انتہا درجے کی معصوم اور بھولی بھالی ہوتی ہیں۔ ترکِ وفا، نایاب جیلانی، ایک مکمل فیملی چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنا پُرمغز کیسے لکھ لیتی ہیں، مجھے واقعی ٹپس چاہئیں۔ نایاب کے ناولز میں بھی ایک خاص بات ہمیشہ ہوتی ہے۔ موضوعات تو منفرد ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی ہر کہانی کا شوہر بے انتہا محبت کرنے

والا بے حساب کیئرنگ، بے حد رومینٹک، بے حد متحمل مزاج، سمجھدار اور بہت ہی ستھری فطرت والا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ نایاب کے اپنے شوہر ایسے ہوں گے اور ہیروئن یعنی بیوی صاحبہ ہر ناول میں انتہائی ستی ساوتری قسم کی تابعدار، فرمانبردار، صبر والی، معاملہ فہم، معصوم، بے وقوف، بھولی اور بڑی ہی پیاری نیچر کی ہوتی ہے۔ ایک انٹرویو نایاب جیلانی کا بھی لیں۔ بی پازیٹو صائمہ قیصر میں کہتی ہوں ایوارڈ ملنا چاہیے اس افسانے پر آپ کو۔ اتنی عام سی گھریلو سی بات اور اس میں چھپا اتنا بڑا پوائنٹ یہ تو ہر گھر کی کہانی ہے۔ شام شہر یاراں، عنیزہ سید بس اب کیا کہوں...... عنیزہ سید صاحبہ سے بالمشافہ ملاقات کرنے کی خواہش زور پکڑنے لگی ہے۔ مکالموں اور فلسفوں کی سلاست و روانی دنگ کر دیتی ہے۔ عافیہ اینڈ فیملی کی محبت اچھی لگتی ہے۔ مہر زاد خان کی انفرادیت اٹریکٹ کرتی ہے۔ بے چاری زوئی اور نادر کی مصیبتیں بھی ختم کروا دیں اب۔ غزالہ نگار اور کزئی کا انٹرویو زبردست لگا۔ بہنوں کی محفل بھی کسی ناول سے کم اہمیت کی حامل نہیں۔ خوش ذائقہ میں میری بہنوں سے فرمائش ہے کہ گرمیوں کے حوالے سے ٹھنڈی، ٹھنڈی سویٹ ڈشز کی تراکیب بھیجیں۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

☆ عذرا بی بی، راولپنڈی سے۔ "آپ سے اکثر فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ پاکیزہ ڈائجسٹ میں جو سلسلے ہیں ان سے بہت کچھ پتا چلتا ہے اور بہت سارے مسائل کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ آپ بہت اچھے اخلاق کی مالک ہیں جب بھی آپ سے بات ہوتی ہے ہماری آدھی پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ پاکیزہ رسالہ جو اتنا اعلیٰ ہے یہ سب آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت عزت، صحت اور اسی طرح کامیابیاں نصیب فرمائے۔ بہنوں کی محفل میں ایک بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے سب کی خوشی اپنی خوشی سب کی پریشانی اپنی پریشانی لگتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا کے تبصرے اچھے لگتے ہیں۔ سلسلے وار ناول سب ہی اچھے ہیں۔ نایاب جیلانی کا ترک وفا بہت اچھا ناول ہے اس سے کافی معلومات ملی ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ عابدہ آپا اور ڈاکٹر ممتاز فوراً حاضر ہو جائیں)

☆ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ "اب تک مجھے جتنے ایوارڈ مل چکے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ مجھ پر، میں تو کچھ بھی نہیں۔ سب بہنوں کی محبتیں ہیں میرے ساتھ شہلا نواز جی۔ آپ نے میری تصویر کی تعریف کی آپ تو خود بے حد پیاری ہیں، میں نے پوچھا تھا کہ آپ لاہور میں کس جگہ رہتی ہیں ؟ اقبال بانو کا انٹرویو پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ بہن نگہت غفار جی کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے یاد رکھا اور علاج کے متعلق بتایا شکریہ نگہت جی۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

☆ بہنوں کے خطوط کے جوابات اب ختم ہوئے دیر سے آنے والے خطوط ہمیشہ کی طرح آئندہ ماہ شامل کر لیے جائیں گے۔

اب آیئے دعا مانگنے سے قبل درودِ ابراہیمی پڑھ لیں۔ یا اللہ یا رحمن یا رحیم۔ میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا رہے، یا رب العالمین تو مجھ سے اور میری آل اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا۔ ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

معرفت ماہنامہ پاکیزہ C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

من میں تو ہی تو، روح میں تو ہی تو
آنکھوں میں تو ہی تو، سانسوں میں تو ہی تو
دل میں تو ہی تو، لبوں پر تو ہی تو
میرا داتا تو ہی تو، میرا آقا تو ہی تو
میرے بگڑے کام بنانے والا تو ہی تو
میری ڈوبتی نیّا بچانے والا تو ہی تو
ہمیں ہر نعمت عطا کرنے والا تو ہی تو
یارب میری فریاد سن لے
جب دم آخر ہو نگہت کا
وردِ زباں ہو بس تو ہی تو

شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

میرا دل تو خالی ہے بس نور کی شمع جلتی ہے
کیونکر ہوگا من میں اندھیرا نور کی شمع جلتی ہے
سونا، چاندی دھن، دولت ہو کچھ بھی میرے پاس نہیں
نور کے رستے بھاگ رہی ہوں نور کی شمع جلتی ہے
یارب تو نے نور دیا ہے نور ہی دل میں بسائے رکھنا
نور کی شمع جلائے رکھنا دل میں تمنا پلتی ہے
من کے دریچے روشن، روشن دل کی دنیا جگمگ، جگمگ
پُرکیف نظارے ہوتے ہیں جب نور کی شمع جلتی ہے
جنگل، جنگل صحرا، صحرا جانے کب سے گھوم رہی ہوں
ہر سو نور ہی دیکھا ہے اِک نور کی شمع جلتی ہے
میرا مرنا میرا جینا سب کچھ یارب تیرے لیے
شکر کروں میں کیسے ادا، اب بالی عمریا ڈھلتی ہے
یارب تو ہی بخشے گا میری لغزش میری خطائیں
میں عاصی ہوں پریت کی ماری آس کی شمع جلتی ہے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: مسز شمع حسین، کینیڈا

دل چار قسم کے ہیں

مسند احمد میں ہے رسول ﷺ نے فرمایا کہ دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔

1۔ ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو۔
2۔ دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہوں۔
3۔ تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں۔
4۔ چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔

پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے، دوسرا دل کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا منافق کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے۔ چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں۔

ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اب جو مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آ جاتا ہے۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

شادی کے وقت باپ کی بیٹی کو نصیحت

☆ حضرت عبداللہ بن جعفر ابن ابی طالب نے اپنی بیٹی کو نصیحت کی کہ رشک اور غرور سے بچنا کیونکہ یہ طلاق کی چابی ہے، زیادہ ڈانٹ، ڈپٹ سے پرہیز کرنا کیونکہ اس سے بغض و حسد پیدا ہوتا ہے۔ سرمہ ضرور استعمال کرنا کہ یہ سب سے بہتر زینت ہے اور سب سے بہتر خوشبو پانی ہے۔

مرسلہ: صبا نور، لیہ

ہیرا اور کنکر

ایک قافلہ اندھیری سرنگ سے گزر رہا تھا کہ ان کے پیروں میں کنکریاں چبھیں، کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ پیچھے آنے والوں کو نہ چبھ جائیں۔ نیکی کی خاطر وہ کنکریاں اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیں کچھ نے زیادہ اٹھائیں، کچھ نے کم، جب وہ اندھیری سرنگ سے باہر آئے تو دیکھا ان کے پاس کنکریاں نہیں بلکہ ہیرے ہیں۔

جنہوں نے کم اٹھائیں وہ پچھتائے کم کیوں اٹھائیں۔ جنہوں نے بالکل نہیں اٹھائیں وہ بہت زیادہ پچھتائے۔ دنیا کی اس زندگی کی مثال بھی اسی اندھیری سرنگ کی طرح ہے اور نیکیاں یہاں کے ہیرے، موتی ہیں۔ اس زندگی میں جو نیکی کی وہ آخرت میں ہیرے جیسی قیمتی ہوگی اور انسان ترسے گا کہ اور زیادہ کیوں نہیں کی سو نیکی چاہے کسی پیاسے کی پیاس بجھا دینا ہی سہی، ہیرے جیسی قیمت رکھتی ہے۔

از: امینہ عندلیب، سلانوالی

غزل

دھوپ میں سائبان دیکھے ہیں
لوگ کچھ مہربان دیکھے ہیں
ہم بظاہر تو ایک ہیں لیکن
فاصلے درمیان دیکھے ہیں
بارشوں کی دعا نہیں کرتا
میں نے کچے مکان دیکھے ہیں
بستیاں بے چراغ دیکھی ہیں
راستے بے امان دیکھے ہیں
عشق دشوار ہے بہت ریحان
راہ میں امتحان دیکھے ہیں

شاعر: ریحان آفاق
مرسلہ: فلک جان، کراچی

دوستی

☆دوستی انسانی زندگی کا سب سے وفادار قیمتی رشتہ ہے۔

☆دوستی ایک آئینہ ہے جس میں انسان اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔

☆دوستی کرنا اتنا ہی آسان ہے جیسے مٹی سے مٹی پر لکھنا اور دوستی نبھانا اتنا ہی مشکل ہے جس طرح پانی سے پانی پر لکھنا۔

☆دوستی اس کو کہتے ہیں جو کسی غرض کے بغیر ہو۔

☆اچھے دوست کو کھونا خود اپنے آپ کو کھونا ہے۔

☆اپنے دل سے خود دوستی کا حال پوچھو کیونکہ یہ ایسا گواہ ہے جو رشوت نہیں لیتا۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

اک تیری کمی ہے

زمیں سے آسماں تک
چاند سے ستاروں تک
میرے ارد گرد
میرے آس پاس
اِس جہاں سے
اُس جہاں تک
یوں تو سبھی کچھ ہے پاس مگر
میری زندگی میں
بس
اک تیری ہی کمی ہے

کاوش: یاسمین اقبال، لاہور

1950ء کی دلہن

وہی میرا ہو جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو
ہر قدم ساتھ چلے عزم وفا رکھتا ہو
ناز اس کے نہ اٹھاؤں تو شکایت نہ کرے
رنج و غم سہہ کر بھی ہنسنے کی ادا رکھتا ہو

2014ء کی دلہن

وہی میرا ہو جو ہزار گز پہ بنگلا رکھتا ہو
دو قدم جانے کو سوک و کرولا رکھتا ہو
کھانا نہ پکاؤں تو شکایت نہ کرے
صبح شام ہوٹلنگ کرانے کا حوصلہ رکھتا ہو

مرسلہ: روبینہ حیات مغل، کراچی

یادیں

وہ سب کچھ نہیں رہا لیکن
ان دنوں سے وابستہ ان راتوں سے پیوستہ
کچھ یادیں ہیں کچھ باتیں ہیں
جو اب بھی یاد آنے لگتی ہیں
کسی مانوس لمحے میں کسی آشنا سے پل میں
کبھی آج کے گرداب میں بھی گزرے ہوئے کل میں
وہ سب کچھ نہیں رہا لیکن
یادوں کی سرسراتی ہوائیں اب بھی کبھی کبھی
ماضی کے در کھٹکھٹاتی ہیں چپکے سے کہہ جاتی ہیں
وہ سب کچھ نہیں رہا لیکن
وہ بھولی بسری یادیں، کل کے دن کل کی باتیں
ایسی ہیں جو اب بھی...... یاد آنے لگتی ہیں
خوابوں کے رنگ گہرے بہت ہی اجنبی ٹھہرے
کچھ خوشیاں دیکھیں کہ کچھ غم سہے
نہ وہ گھڑیاں رہیں نہ وہ پل رہے
کسی نکھری چمک میں کسی بکھری دھنک میں
کچھ آنسو کچھ مسکراہٹیں، کچھ دستکیں کچھ آہٹیں
ایسی ہیں جو اب بھی...... یاد آنے لگتی ہیں اور
دل تڑپانے لگتی ہیں

شاعرہ: ہالا احمد، کراچی

مزاحیہ قطعات

کہا جب اک کھلاڑی سے کہ لگ جائے اگر چوکا
تو فوراً آپ کو آؤٹ ہو جانے کی عادت ہے
وہ بولا کرکٹر بھی ہوں اور مرد مسلماں بھی
مسلماں مرد کو، بس چار ہی رن کی اجازت ہے

☆☆☆

جب ارے کہنا نہیں تھا وہ ارے کہتی رہی
اس کو جو کہنا تھا کوئی کیا کرے کہتی رہی
مجھ میں اس میں فرق بس چھوٹی بڑی بے کا تھا
میں پری کہتا رہا اور وہ پرے کہتی رہی

☆☆☆

باز آیا نہیں وہ تاک جھانک سے اب تک
بعد شادی کے بھی طوفان اٹھا رکھا ہے
جب سے ہمسائی پہ رکھی ہے نظر اکبر نے
اس کی بیگم نے اسے مرغا بنا رکھا ہے

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

زندگی

"باطل ہیں وہ تمام اعتقادات اور تعلیمات جو انسان کو اس کی زندگی میں بدقسمت بنائیں اور جھوٹے ہیں وہ سارے جذبے جو اسے مایوسی اور بدبختی کی طرف لے جائیں۔ انسان کا حق ہے کہ وہ زمین پر کامیابی کی زندگی بسر کرے۔" (خلیل جبران)

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

یہ موسم بھی!

آندھی بارش طوفان
جل تھل، جل تھل من
کچھ دکھ بھی اندر تک
اتر ہی جاتے ہیں
یہ موسم بھی
کتنے درد آشنا ہوتے ہیں

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

اصل وجہ

گاڑی چلاتی ہوئی ایک خاتون کو ٹریفک سارجنٹ نے اشارے سے روکا اور قریب آ کر پوچھا۔ "محترمہ آپ کا کب تک گھر سے باہر رہنے کا ارادہ ہے؟"

"کیا مطلب؟ تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟" خاتون نے برہم ہو کر پوچھا۔

"خاتون میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ گھر چلی جائیں گی تو دوسری گاڑیوں

میں بیٹھے ہوئے سیکڑوں لوگ اس سڑک کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔'' ٹریفک سارجنٹ نے شائستگی سے جواب دیا۔

مرسلہ: قیصر قدیر، ٹورنٹو

گوہر پارے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے۔

☆ کسی انسان کو دکھ دینا ایسا ہی ہے جیسا سمندر میں پتھر پھینکنا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہے۔

☆ سچے انسان کے جھوٹ میں شاید کوئی اچھا مقصد ہو سکتا ہے لیکن جھوٹے انسان کا سچ صرف آگ لگانے کے لیے ہوتا ہے۔

☆ مال موت تک ساتھ دیتا ہے، اولاد قبر تک اور نیک اعمال حشر تک ساتھ دیتے ہیں۔

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

حق

☆ شادی کے ایک ہفتے بعد شوہر نے نئی نویلی دلہن سے پوچھا۔ ''تم مجھ سے الگ گھر کی فرمائش تو نہیں کرو گی۔''

دلہن (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) ''نہ جی ناں میری توبہ اماں کا حق پہلے ہے، پہلے آپ ان کو الگ گھر لے کر دیں۔''

از: عزیزہ غنی، پاک پتن

ایک سنہرا جملہ ......

ماں کی ڈائری سے

میرا بیٹا تب تک میرا بیٹا ہے جب تک اس کی بیوی نہیں آجاتی...... اور میری بیٹی تب تک میری بیٹی ہے جب تک میری زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔

از: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

نارسائی

اب میں ہوں اور دکھ میرے
کھا گئی محبت سکھ میرے
زندگی اب اجاڑ رستوں کا بے رونق
جزیرہ ہے، آنکھوں میں کچھ
جل بجھی سی خواہشوں کا ذخیرہ ہے
اے رات کی سرد ہوا
میرے درد سے غافل بے درد ہوا
اس سے ملو تو کہہ دینا کہ
نارسائی ہی میرے پاس رہ گئی ہے
میری تمام عمر اس میں بہہ گئی ہے

شاعرہ: کوثر اعجاز چوہدری، للیانی ضلع قصور

غزل

محبت کا سفر تبدیل کر لو
مناسب گھر نہیں تحویل کر لو
دلوں کے پاس احساسِ محبت
تم اپنا ہم نشیں تبدیل کر لو
اگر پانی سے بڑھ جائیں روابط
کنارے پیاس کے تحلیل کر لو
سفر نامۂ محبت کیا ہو نازش
نہ یوں عہدِ وفا تذلیل کر لو
بدن کو روگ دے کر بولتے ہیں
کہ بند اقرار میں قندیل کر لو

شاعرہ: نبیلہ نازش راؤ، اوکاڑہ

اس طرح تو ہوتا ہے

ہر بیوی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہے، پوری تدابیر اختیار کرتی ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو چند چیزیں اس کے اور اس کے میاں کے بیچ حائل ہو جاتی ہیں۔ پہلی بدتمیز اور خود سر نندیں، دوسری ظالم ساس جسے کسی صورت اپنی بہو اچھی نہیں لگتی اور تیسری سب سے بڑی وجہ شوہر کے کچے کانوں کا ہونا۔

از: ذکیہ خانم، کراچی



غلط فہمی

بابو بھائی کی فیملی کے ہر گھر کا ایک لڑکا ملک سے باہر ضرور گیا ہوا تھا۔ صرف بنو آپا کے گھر...... کے چاروں کے چاروں لڑکے باوجود کوششوں کے باہر نہ جا سکے تھے...... بابو بھائی تو باہر بھجوانے کا کام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے خاندان کے پچاس فی صد لڑکوں کو خود باہر بھجوایا تھا مگر بنو آپا کے لڑکوں کا جب کام کروالیا وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی نہیں پایا۔

''ایسا لگتا ہے کہ تمہارے کسی بیٹے کے ہاتھ میں باہر جانے کی لکیر ہی نہیں ہے......'' ایک شب بابو بھائی نے ہنس کر کہا تھا مگر بنو آپا نے رو رو کر گھر بھر دیا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے خاندان میں ان کی ناک کٹ گئی ہو۔

اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بڑا لڑکا اسکالرشپ پر خود ہی امریکا چلا گیا۔

اب تو بنو آپا کے ہاتھ پاؤں پھول سے گئے...... انہیں یوں لگتا جیسے کوئی ان کے بیٹے کو اچک کر لے گیا ہو۔

شاید وہ ایسی جگہ چلا گیا ہے...... جہاں سے لڑکے واپس نہیں آتے...... ان سے لوگ اپنی دکھ بھری کہانیوں کے ساتھ جب ان کے بیٹے کے بارے میں کچھ پوچھتے تو ان کی آنکھوں سے برسات شروع ہو جاتی۔

شگفتہ جو اکلوتی بہن تھی۔ اسے اپنے بھائی کے جانے کا از حد رنج تھا۔ اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ یا تو اپنے بھائی کے بارے میں پاگلوں کی طرح باتیں کرتی یا اس کی تصویریں دیکھتی رہتی...... یا پھر وہ انہیں یاد کر کے روتی رہتی۔

بہنوں کو بھائیوں سے کس قدر محبت ہوتی ہے اس کا اندازہ کوئی بھائی لگا ہی نہیں سکتا مگر شگفتہ کا بھائی اس سے بے حد قریب تھا اور وہ اس قدر پُر مزاح مزاج کا حامل تھا...... کہ اپنی بہن کو ہر وقت ہنساتا رہتا تھا۔

پہلے فلمیں دیکھنے سے اسے چڑ تھی مگر جب عامر خان میں اسے اپنے بھائی کی شبیہہ نظر آئی۔ وہ اس ہیرو کی فلمیں بڑی باقاعدگی سے دیکھنے لگی تھی۔

بنو آپا کا بھی یہی خیال تھا کہ عامر خان کی فلمیں دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کا بیٹا امریکا کے بجائے بالی وڈ چلا گیا ہے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ یونیورسٹی میں شگفتہ کا نیا، نیا ایڈمیشن ہوا تھا...... ایک صبح وہ یونیورسٹی جا رہی تھی پوائنٹ میں خاصا رش تھا۔ لاابالی لڑکے ہر اسٹاپ پر چڑھنے والوں کی حاضری لے رہے تھے۔

چھپکلی	غیر حاضر
مولی	حاضر سائیں
شلجم	غیر حاضر
کدو	حاضر جناب
بھوت	لبیک
ڈھانچا	غیر حاضر
گنجی	غیر حاضر

شریر لڑکوں کی جملے بازیاں پوائنٹ میں قہقہوں کے پھول کھلا رہی تھیں کہ اچانک شگفتہ کی نظر ایک لڑکے پر پڑی۔

یہ دیکھ کر وہ متحیر سی رہ گئی کہ وہ لڑکا ہو بہو اس کے بھائی جیسا تھا۔ اس قدر مشابہت ہو سکتی ہے، وہ ایک لمحے کے لیے چکرا سی گئی۔ دوبارہ دیکھا وہ اپنے ساتھی کی کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔

اللہ مسکراہٹ کا انداز بھی بالکل وہی...... تیسری بار نہ چاہتے ہوئے بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈالی...... وہ بھی شاید اسے ہی دیکھ رہا تھا...... جیسے ہی شگفتہ نے اسے پھر دیکھا...... ان صاحب نے اپنی بائیں آنکھ انتہائی... بدمعاشی سے دبا دی۔

اُف، مارے رنج کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھوک دے۔ وہ ان کے بھائی جیسا تو بالکل بھی نہیں تھا۔

میرا قصور

پتا نہیں آپ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے یا نہیں...... مگر میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے کہ دل کی بات ہونٹوں کے کوٹھوں پر آنے کے باوجود...... وہ وہیں ٹھٹھری سی کھڑی رہ جاتی ہے...... نہ وہ نقارہ پیٹتی ہے اور نہ ہی ٹھمکے لگاتی ہے۔

آج کل لوگ منہ پر باتیں مارنے کے کس قدر شوقین نظر آتے ہیں۔ رشو بھابی تو جب بھی ہمارے گھر آتی ہیں...... دو چار کے منہ توڑ کے جاتی ہیں۔

ہم لوگوں کو ہراساں کرکے وہ اس قدر سرشاری نظر آتی ہیں کہ میری نظریں انہیں ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیتی ہیں مگر میرے ہونٹوں پر یہی جملے ہوتے ہیں۔

''رشو بھابی...... اب آپ کب آئیں گی، آپ کے آنے سے گھر میں رونق سی ہو جاتی ہے...... پتا ہی نہیں لگتا کہ کب دن ہوا سا ہو گیا...... پلیز آپ جلدی' جلدی آتی رہا کریں۔''

اگر میں دل کی باتیں ان سے کہہ دوں......

''خبردار جو آئندہ میرے گھر قدم بھی رکھا تو...... ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گی۔''

''اپنے آپ کو بہت قابلہ سمجھتی ہو کہ ہر فن میں یکتا ہو۔ بٹن تک تو تمہیں ٹانکنا آتا نہیں...... سلائی کڑھائی کی مہارت کے دعوے کرتی ہو...... ایسی بات کیا کرو جو تمہارے پھوہڑپنے پر ڈھکن بھی رکھ دے مگر تمہاری تو عادت ہے کہ بات کرتی ہو لاکھ کی مگر ہوتی ہے وہ خاک کی۔''

مگر میں اپنے دل کی باتیں اپنے دل کے اکاؤنٹ میں ہی رکھتی ہوں...... دل میں رکھی یہ فکسڈ باتیں...... اپنا اکاؤنٹ بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔

آئیں آج میں آپ کو ایسی ہی چند باتیں سناؤں...... جو شاید آپ کے دل کی باتوں سی مشابہت رکھتی ہوں۔

شاید آپ کی باتیں...... میری باتوں کی بہنیں لگیں۔

تو پھر اپنی بہنوں سے مل لینے میں کیا حرج ہے؟

میں ایک سو بیس گز کے گھر میں رہتی ہوں، جس میں بیس افراد رہتے ہیں اور مسز رحمان چھ سو گز کے مکان میں اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا گھر تمام آسائشات سے سجا ہوا ہے...... میرے گھر میں ضروریاتِ زندگی کی بھی بہت سی چیزیں پوری نہیں...... بارہا میرا دل چاہا ہے کہ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے نکال دوں اور خود اپنے بچوں کے ساتھ وہاں ٹھاٹ سے رہوں۔ کالی سیاہ چھوٹے سے قد کی مسز رحمان جب اپنا گیٹ کھولتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ملازمہ دروازے پر کھڑی ہو...... اتنے خوب صورت مکان میں وہ بجتی تک نہیں تو وہاں رہنے کا تو انہیں حق بھی حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

میں اتنی خوب صورت ہوں...... اس گھر میں رہتی ہوئی کتنی اچھی لگوں گی...... اس گھر کی قسمت بدل اٹھے گی...... مگر بعض مکانات کس قدر بدقسمت ہوتے ہیں کہ اتنے خوب صورت ہوتے ہیں مگر اس کے مکین اس سے قطعی مناسبت نہیں رکھتے...... یہ سوچ کر یہ دیکھ کر دل سے آہیں تو نکلتی ہیں ناں۔

اب اگر میرے بال روز بروز جھڑ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری ساس میرا دماغ کھا جاتی ہیں...... میری کسی بات سے تو وہ کبھی اتفاق ہی نہیں کرتی ہیں اگر میں یہ کہوں کہ میری نندیں بدشکل ہیں، بد مزاج ہیں...... موٹی عقل کی ہیں تو وہ کبھی مان کر نہیں دیں گی اور میں اپنی سسرال میں کتنا ہی سلیقہ دکھا دوں وہ اس میں ہزار عیب تلاش کرلیں گی...... اب جیسے میں نے اپنے میاں کے پاجاموں کو گھٹنے کے نیچے سے کاٹ کر ان کے گرمی کے نیکر بنا دیے مگر مجال ہے انہوں نے رتی بھر بھی تعریف کی ہو اور بڑی نندیں تو منہ پر ہاتھ رکھ' رکھ کر گھنٹوں ہنستی رہی تھیں۔

میرا سلیقہ تو کسی کو نظر ہی نہیں آتا...... کیا یہ ایک

المیہ نہیں ہے۔ اب مسز الیاس کے لمبے بالوں کا راز یہی ہے کہ سسرال میں نہ ان کا کوئی دماغ کھانے والا ہے اور نہ آگ لگانے والا...... ان کی ساس اس قدر پیاری سی ہیں کہ دیکھ کر رشک آتا ہے...... خوب بھاگ، بھاگ کر کام کرتی ہیں۔

مسز الیاس کو تو میں نے ہمہ وقت بستر پر دراز ہی دیکھا ہے۔ بارہا میرا دل چاہا کہ ان کی ساس سے اپنی ساس تبدیل کرلوں مگر میرے سسر کا مزاج ایسا ہے کہ ان کے مزاج میں کسی پہلو تختی نہیں ہے وہ انہیں بھی بگاڑ کر رکھ دیں گے تو پھر کیا فائدہ کہ دل کی باتیں میں اپنی زبان تک بھی لاؤں۔

اپنے میاں کی بائیک دیکھتی ہوں تو غصہ سا آجاتا ہے۔ تین بچوں، ایک ٹوکری، ایک بیگ اور ایک بڑے پرس کے ساتھ جب مجھے اس پر لاد کر کہیں جاتے ہیں تو بس میں بیٹھنے والے تو کیا گدھا گاڑی پر جانے والے لوگ بھی ہمدردی یا تمسخر کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اکثر میرا دل چاہتا ہے کہ مسز نادر کی پجیرو اپنی پھٹ پھٹی سے بدل لوں۔ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر میں زیادہ نادر تو کیا نایاب بھی لگوں گی۔ گاڑی کی کھڑکی سے اپنی کہنی باہر نکال کر جب میں باہر کا نظارہ کرتی نظروں سے اِدھر، اُدھر دیکھوں گی تو ہر شخص یہ ہی سوچے گا کہ شاندار گاڑی میں شاندار پرسنالٹی سفر کر رہی ہے۔

جبکہ میرا یہ پورا یقین ہے کہ مسز نادر جب ہماری پھٹ پھٹی پر بیٹھ کر کہیں جائیں گی تو بالکل بھی یہ محسوس نہیں ہوگا کہ وہ پہلی دفعہ بیٹھی ہیں بلکہ دیکھنے والوں کو یہی احساس ہوگا کہ اس ٹائپ کی عورت کو ازل سے ابد تک اسی پھٹ پھٹی پر بیٹھنا چاہیے کیونکہ وہ موٹو ہے ہی اس قابل۔

مگر یہ مسز نادر بے حد تھڑدلی سی ہیں...... ان کی گاڑی پر اگر کوئی محلے کا بچہ ہاتھ بھی لگا دے تو وہ کاٹ کھانے والے انداز میں ہنکارا مارتی ہیں اور اپنے ڈرائیور کو اتنی زور سے ڈانٹتی ہیں کہ اردگرد کے شریر بچے بھی سہم کر دور ہٹ جاتے ہیں۔

چھوٹے گھروں کے سامنے اگر بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی ہوں تو آمنے، سامنے کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق آجاتا ہے حالانکہ...... وہ میری ہم محلہ ہیں، تھانہ تک ایک ہی لگتا ہے، ان کے میاں بزنس مین ہیں اور میرے میاں پولیس میں ہیں۔ اس کے باوجود ان کے میاں اور ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ جب ہم ملیں تو انہیں سلام کرنے میں پہل کریں جس کا وہ اپنے سر کی جنبش سے جواب دیں۔

میرے میاں تو کترا کر نکل جاتے ہیں کہ وہ چھوٹے افسر ہی سہی مگر سلامیاں لینے کے عادی ہیں...... دینے کے نہیں...... مگر مجھے تو سلام کرنا ہی پڑ جاتا ہے...... بے شک اپنے ماتھے پر مکھی مارنے والے انداز سے کروں کہ یہ تو میری مجبوری ہے ورنہ وہ اپنے گھر میں ہونے والی تقریبات میں مجھے مدعو نہ کر کے محلے میں میرا سر جھکا سکتی ہیں۔

میری یہ بھی دلی تمنا ہے کہ اپنے محلے سے مس دل افروز کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں۔ اس کی شادی کے لیے میں نے کتنی دعائیں مانگی ہیں، یہ میں ہی جانتی ہوں کہ کسی طرح وہ اس محلے سے چلی جائے۔ نہ اس کے گھرانے سے میرا ملنا ملانا ہے اور نہ ہی میری اس سے کوئی پرانی دشمنی ہے مگر وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میرے میاں کو اس کا نام اس قدر پسند ہے کہ وہ بہانے، بہانے سے دُہراتے رہتے ہیں۔

''سنیے آپ کو شربت اور دوں......'' میں افطار کی میز پر ان سے پوچھا کرتی تو وہ مسکرا کر خلاؤں میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہتے...... ''ہاں یہ دل مانگے مور......''

''میں عید کا سوٹ کس کلر کا لوں......؟'' میں نے خاصے لاڈ سے ان سے پوچھا تھا۔

''افروزی کلر کا لے لینا۔'' وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں بولے۔

''سنیے پر افروزی کلر کون سا ہوتا ہے۔ میں نے تو آج تک نہیں دیکھا......'' اپنا غصہ داب کر ان سے

پوچھا تھا۔

”ارے فیروزی کلر کے بارے میں کہہ رہا ہوں کیا اتنی جاہل ہو کہ فیروزی کلر تک کو پہچان نہیں سکتیں......“ وہ غصے میں تنک کر بولے تھے۔

”مگر آپ تو کچھ اور کہہ رہے تھے۔“

”افوہ جان کو آجاتی ہو تم...... کہہ تو دیا کہ میرا مطلب یہی تھا۔“

”مگر اس سے پہلے تو آپ کو گلابی رنگ پسند تھا۔“

”اب فیروزی پسند ہے۔“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ ایک دم آپ کی پسند میں یہ تبدیلی کیسے آگئی؟“ میں اپنے تئیں اچھی خاصی تفتیش کر رہی تھی۔

”دل، دل کی بات ہے دل کو کبھی کچھ اچھا لگتا ہے اور کبھی کچھ...... ان دنوں مجھے فیروزی کلر خاص دل افروز سا لگ رہا ہے......“ وہ گنگناتے ہوئے بولے اور اپنے آپ پر پرفیوم کی آدھی بوتل انڈیل کر باہر چلتے بنے۔

دل افروز کسی غیر معروف پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہے اس کے اسکول جانے اور میرے میاں کے تھانے جانے کا ٹائم ایک ہوتا ہے۔ یا خدا جانے ان دونوں کی ملی بھگت ہے، دونوں ہر روز صبح دس بجے نکلتے ہیں۔

دل افروز نہ صرف محلے دار ہے بلکہ ان کے چہیتے دوست کی بہن بھی ہے جسے وہ بہت اہمیت دیتے ہیں...... اس لیے وہ روزانہ اس کو اپنی پھٹ پھٹی پر لفٹ دیتے ہیں...... جس اسکول میں وہ پڑھاتی ہے وہ راستے میں ہی پڑتا ہے۔ میری حالت ایسی ہے کہ نہ میں اپنے میاں کو روک سکتی ہوں (کہ ہرگز نہیں مانیں گے) اور نہ ہی ان محترمہ کو ٹوک سکتی ہوں کہ بے حد بدتمیز لڑکی ہے۔

ایک مرتبہ محلے کی عید ملن پارٹی میں ایسے بے ہودہ کپڑے پہن کر آئی تھی کہ کپڑے پہننے کے باوجود عریاں تھی۔ میں نے جب اسے کہا کہ کپڑے تو تمیز کے پہن لیا کرو۔ محلے کی چھوٹی بچیاں تمہیں دیکھ کر کیا سیکھیں گی تو اسی وقت تڑخ کر بولی تھی۔

”پہلے اپنے آپ کو تو دیکھ لو کہ مریخ سے تو نہیں اتر کر آئی ہو۔ جب اس زمین پر رہتے ہیں تو وہیں کے حساب سے رہا جاتا ہے۔ تمہارے حلیے سے اگر وحشت ہوتی ہے تو بات چیت میں ہی شائستگی سیکھ لو کہ تم سے کسی کا بات کرنے کو بھی دل چاہے۔“

اور مجھے غم اس لیے ہوا تھا کہ اس کی بات سن کر سب سے زیادہ میری نندیں ہنسی تھیں۔ اس لیے اب تو میں یہی دعا مانگتی ہوں کہ دل افروز کو اس کی ہیڈ مسٹریس نکال... باہر کرے اور کسی دوسری جگہ اتنی دور اس کو جاب ملے کہ وہ صبح اندھیرے گھر سے نکلے تو رات گئے واپس آئے کہ شادی تو اس کی خاک ہوگی۔

اور میری آخری دعا یہ ہے کہ اگر دل افروز نہیں جاتی اور اسی طرح میرے سینے پر مونگ دلنے کا کام کرنا چاہتی ہے تو میرے میاں کو جبری ریٹائر کر دیا جائے...... آخر وہ اتنی دیر سے تھانے پہنچتے ہیں۔ افسرِ اعلیٰ کو نوٹس لینا چاہیے۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ چیونٹی کی رفتار سے اسکوٹر چلاتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے چھوٹی، چھوٹی شاپنگ کراتے ہوئے بارہ ایک سے پہلے اپنے آفس نہیں پہنچتے ہوں گے۔

یہ نیوز تو مجھے بہت بعد میں ملی ہے کہ دل افروز اپنی ایک دوست کے ساتھ اسکول میں کینٹین چلاتی ہے۔ تفریح کے وقت اس کی دوست سنبھال لیتی ہے اور چھٹی کے وقت کینٹین کو دل افروز سنبھالتی ہے اور اس بیچ کے عرصے میں وہ کسی بے وقوف کو مزید بے وقوف بنا لیتی ہے تو کیا ہوا۔

دل افروز کے حوالے سے اگر میرے دل کی باتیں دل کی آہوں کا روپ دھار لیتی ہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس ضمن میں آپ میرا ہی ساتھ دیں گی ناں......

تو لائیں اپنا کاندھا جس پر سر رکھ کر میں رو سکوں۔

☆☆☆



مَیں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆عرشیہ جنید...... کراچی

مجھ سا نہیں ملے گا جھونکا ہوا کا ہوں
تجھ سا تراش لیں گے پتھر نظر میں ہے

☆نزہت جبیں ضیا...... کراچی

یہی دستورِ الفت ہے نمی آنکھوں میں لے کر بھی
سبھی سے کہنا پڑتا ہے ہمارا حال اچھا ہے

☆مسز تسنیم...... جہلم

اتنا ٹوٹے ہیں کہ چھونے سے بکھر جائیں گے
اب اگر اور آزماؤ گے تو مر جائیں گے
ہاں عارضی مسافر ہیں ہم تیری کشتی میں
تم جہاں ہم سے کہو گے، ہم اتر جائیں گے

☆شافعہ پرویز...... گوجرانوالہ

تمہاری بات لمبی ہے دلیلیں ہیں بہانے ہیں
ہماری بات اتنی ہے ہماری زندگی تم ہو

☆نرگس نسیم...... صابہ موہڑہ

عشق رستہ کاٹ کے ہر بار گزر جاتا ہے
جیسے پردیس میں تہوار گزر جاتا ہے
زندگی عشق میں یوں گزری ہے اپنی دانش
جیسے بازار سے نادار گزر جاتا ہے

☆ارم کمال...... فیصل آباد

کتنا دشوار ہوتا ہے کسی کو یوں بھلا دینا
کہ جب وہ شخص شامل ہو رگوں میں خون کے مانند

☆کوثر خورشید...... یو کے

رموزِ عشق و محبت سے میں نہیں واقف
رہی ہے تیری ضرورت مجھے ہوا کی طرح

☆شہزادی کائنات...... کراچی

چاک دامن کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند
جانے کیوں آپ کے رخسار مہک اٹھتے ہیں
جب کبھی کان میں چپکے سے کہا عید کا چاند

☆نفیسہ آرا...... راس الخیمہ

ہجومِ شوق سے فرصت ملے تو اہلِ وطن
وطن سے دور کسی بے وطن کو یاد کرو

☆صبا سجاد...... دبئی

ایک ہی مسئلہ میرا تا عمر کبھی حل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی، خواب مکمل نہ ہوا

☆فضہ بتول...... بہارہ کہو

ہم تسلیم کرتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں زمانہ بھول جاتے ہیں

☆نگہت اعوان...... سرگودھا

تجھے میں اس لیے آنکھوں سے اوجھل کر نہیں سکتی
کہ کھو جائے جو بینائی بڑی مشکل سے آتی ہے

☆فرخندہ اقبال...... ملتان

زندگی چین سے گزر جائے
وہ اگر ذہن سے اتر جائے

☆حمیرا نوشین...... منڈی بہاؤالدین

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا
یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

☆شازیہ شاہ......اسلام آباد

ہماری سوچ کی پرواز کو روکے نہیں کوئی
نئے افلاک پر پہرے بٹھا کر کچھ نہیں ملتا
یہ اچھا ہے کہ آپس کے بھرم نہ ٹوٹنے پائیں
کبھی بھی دوستوں کو آزما کر کچھ نہیں ملتا

☆امبر صادق......واہ کینٹ

مجھے تعلیم دی ہے میری فطرت نے یہ بچپن سے
کوئی روئے تو آنسو پونچھ دینا اپنے دامن سے

☆فائزہ شہزاد......پشاور

شجر سے پتے یوں ہی تو گرا نہیں کرتے
بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
جو آنے ولے ہیں موسم انہیں شمار میں رکھ
جو دن گزر گئے ان کو گنا نہیں کرتے

☆سنبل ملک اعوان......شاہدرہ

میں اگر آج ہوں خاموش، ہنسا تو بھی نہیں
بچھڑ کر مجھ سے کہیں اور ملا تو بھی نہیں

☆جبیں نیاز......ملتان

ہم نے سوکھی ہوئی شاخوں پہ لہو چھڑکا ہے
پھول اب بھی نہیں کھلتے تو قیامت کرتے

☆فائزہ شاہ......چکوال

جو تم نے بخشے ان ہی رت جگوں پر غور کرو
پھر اس کے بعد میرے حوصلوں پر غور کرو
سفر کا سب سے کٹھن موڑ اور میں تنہا
بچھڑنے والے میری وحشتوں پر غور کرو

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ

یہی نہیں کہ تجھے جیتنے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی مار سکتا ہوں

☆اقبال ناز......دبئی

بن، بن کے پھر رہے ہیں ہمارے وہ چارہ گر
جن کا ہم اہلِ درد سے ناتا نہیں کوئی
جالب یہ بات طے ہے بہت آزما چکے
کام اہلِ زر غریب کے آتا نہیں کوئی

☆صبا کمال......فیصل آباد

تناؤ ان میں آجائے تو دھاگے ٹوٹ جاتے ہیں
ذرا سی بات پہ دیرینہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
ہزاروں خواہشیں ترتیب پاتی ہیں خیالوں میں
مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو سپنے ٹوٹ جاتے ہیں

☆غزالہ طارق......سرگودھا

تیرا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی، نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے
یہ خود اذیتی کب تک فراز تو بھی اسے
نہ کر یاد کہ جسے بھولنے کی عادت ہے

☆نگینہ ضیا بنگش......کراچی

اسے بھی زعم تھا انکار پر مگر میں نے
وہ ایک لفظ محبت زباں سے کھینچ لیا

☆صائمہ بنگش......کوہاٹ

پرکھنا مت پرکھنے سے کوئی اپنا نہیں رہتا
کسی بھی آئینے میں دیر تک چہرہ نہیں رہتا

☆نفیسہ نہال......لاہور

جو حقیقت ہے اس حقیقت سے
دور مت جاؤ لوٹ بھی آؤ
ہوگئیں پھر کسی خیال میں گم
تم مری عادتیں نہ اپناؤ

☆امینہ مشیر......نئی دہلی

حالتِ گفتگو نہیں عشرتِ آرزو نہیں
کتنی اداس آتی ہے شامِ وصال شہر میں
خاک نشیں تیرے تمام خانہ نشین ہوگئے
چار طرف ہے اڑ رہی گردِ ملال شہر میں

☆سیدہ حیا عباس......تلہ گنگ

سلگتی چاندنی راتیں ہمیں واپس عطا کردو
ادھوری وہ ملاقاتیں ہمیں واپس عطا کردو
میرے سجدوں کی رعنائی، محبت میں نہ کام آئی
معطر باوضو راتیں ہمیں واپس عطا کردو

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



مرغ چاٹ

اشیاء: بون لیس چکن، دو سو گرام۔ لال لوبیا، آدھی پیالی۔ انڈے، دو عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ آلو ابلے ہوئے، دو عدد۔ ٹماٹر، ایک عدد۔ ہری مرچ، چار عدد۔ لیموں کا رس، دو چائے کے چمچ۔ چاٹ مسالا، چار چائے کے چمچ۔ سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔

ترکیب: چکن کی بوٹیوں کو نمک، مرچ لگا کر لیموں کے رس میں .... الٹ پلٹ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ لوبیا ابال کر ٹھنڈا کرلیں۔ انڈے ابال کر ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ ٹماٹر اور سبز مرچوں کو کاٹ کر باریک باریک کرلیں۔ چکن کی بوٹیوں کو گرل کرلیں تاکہ بوٹی گل جائے۔ تمام چیزوں کو شیشے کے پیالے میں ڈال کر چاٹ مسالا اور لیموں کا رس ڈال کر مکس کرلیں اور بیس منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں اور مزیدار مرغ چاٹ کا مزہ لیں۔

راحت امین، ملیر

بلیک پیپر مٹن کڑاہی

اشیاء: مٹن، ایک کلو۔ ٹماٹر، چار عدد۔ پیاز، (چوپ کرلیں) دو عدد۔ لہسن پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ ادرک، ایک ٹکڑا۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ ہری مرچیں، چھ عدد۔ گرم مسالا پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ہلدی پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: مٹن کو اچھی طرح صاف کرکے چھوٹی بوٹیاں بنالیں۔ پتیلی میں تیل گرم کریں اور پیاز ڈال دیں ساتھ ہی ہلدی پاؤڈر بھی ڈال دیں اچھی طرح بھونیں۔ اب اس میں مٹن، ٹماٹر، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال دیں اچھی طرح مکس کرکے ہلکی آنچ میں گلنے کے لیے رکھ دیں پندرہ منٹ بعد اچھی طرح سے بھونیں۔ گرم مسالا پاؤڈر، ہری مرچیں اور ادرک ڈال دیں۔ مزید پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ تندوری نان کے ساتھ سرو کریں۔

شمع فرید، گلستان جوہر

بادامی کوفتہ کری

اشیاء: قیمہ روکھا، پانچ سو گرام۔ ناریل پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ بادام پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ زیرہ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ پیاز چوکور کاٹ لیں، آدھا کپ۔ ہرا دھنیا کٹا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔ ہری مرچ چوپ کی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔

کری بنانے کے لیے: تیل، آدھا کپ۔ پیاز پسی ہوئی، آدھا کپ۔ دہی، آدھا کپ۔ نمک، لال مرچ پاؤڈر، حسب ذائقہ۔ دھنیا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، 1/4 چائے کا چمچ۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ بادام سلائس کاٹ لیں، گارنشنگ کے لیے۔

ترکیب: قیمے میں ناریل پاؤڈر، بادام پیسٹ، نمک، لال مرچ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈال کر چوپر میں پیس لیں اور گول کوفتے بنالیں۔ کری بنانے کے لیے ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے اس میں پسی ہوئی پیاز، لہسن، ادرک پیسٹ، نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر،

دھنیا پاؤڈر ڈال کر بھونیں۔ جب مسالا بھن جائے تو آدھا کپ پانی ڈالیں اور سارے کوفتے کری میں ڈال دیں۔ اس کے بعد دہی پھینٹ کر کوفتوں پر ڈالیں اور درمیانی آنچ پر پکائیں۔ جب سالن بھن جائے تو حسبِ پسند شوربہ بنا کر ڈش میں نکال لیں۔ فرائی کیے ہوئے بادام کے سلائس ڈال کر سرو کریں۔

شائستہ محمد علی، حیدرآباد

آئس کریم ٹرائفل

اشیا: سادے کپ کیک، آٹھ عدد۔ اسٹرابیری آئس کریم، ایک لیٹر پیک۔ مینگو ملک شیک، تین گلاس۔ ونیلا کسٹرڈ، آدھا لیٹر دودھ سے بنا۔ آم چھوٹے کیوبز، دو عدد۔ بنانا جیلی، ایک پیکٹ۔

ترکیب: آٹھ عدد شیشے کے گلاس درمیانے سائز کے لیں۔ گلاسوں کے اندر...... کپ کیکس چورا کر کے ڈالیں۔ ایک گلاس کے لیے ایک کپ کیک۔ آدھ لیٹر دودھ سے طریقے کے مطابق ونیلا کسٹرڈ تیار کریں اور پھر گلاس میں کسٹرڈ کی برابر مقدار کی تہ لگاتے جائیں۔ تین سے چار عدد آموں کے ساتھ تین گلاس دودھ اور حسبِ ذائقہ چینی ملا کر گاڑھا سا ملک شیک بنائیں اور کسٹرڈ کی تہ پر ملک شیک کی تہ لگا دیں۔ آموں کے چھلکے اتار کر چھوٹے چھوٹے کیوبز بنالیں اور اب ان کیوبز کی تہ لگائیں۔ آپ چاہیں تو یہ تہ نہ لگائیں۔ تہوں میں ورائٹی آپ کے اپنے ذوق پر منحصر ہے۔ آخر میں اسٹرابیری آئس کریم کی برابر مقدار کی تہیں بچھائیں۔ آپ چاہیں تو اوپر سجاوٹ کے لیے ایک اسٹرابیری بھی رکھ سکتی ہیں یا پھر بنانا جیلی بنا کر فریج میں جمائیں اور ہر گلاس پر اس کے کیوبز سجا کر پیش کریں۔ یاد رہے یہ ڈش سرو کرنے سے تین چار گھنٹے قبل ہی بنائیں اور تیار کر کے فریزر میں رکھ دیں پھر سرو کرتے وقت ہی نکالیں۔ شدید گرمی میں یہ ٹھنڈا ٹھنڈا ٹرائفل کھائیں۔

شبینہ گل، راولپنڈی

سنڈے ایسے



پاکیزہ بہنیں

لاجواب

زندگی میں کچھ کھونا پڑے تو یہ دو لائنیں ہمیشہ یاد رکھنا......

''جو کھویا ہے اس کا غم نہیں لیکن جو پایا ہے وہ کسی سے کم نہیں۔''

''جو نہیں ہے وہ ایک خواب ہے... اور جو ہے وہ لاجواب ہے۔''

از: انیلا ناہید، لیہ

ایک خوب صورت بات

کوئی خوشی، کوئی رشتہ، کوئی جذبہ بھی مستقل نہیں ہوتا، ان کے بھی پاؤں ہوتے ہیں، بس ہمارا سلوک اور رویہ دیکھ کر کبھی یہ بھاگ کر قریب آجاتے ہیں اور کبھی آہستہ آہستہ دور چلے جاتے ہیں۔

از: نورافشاں شیخ، شکارپور

دعائے عید

تیرا خاور درخشاں رہے تا ابد سلامت
تیری صبح نور افشاں، کبھی شام کو نہ پہنچے

پیشکش

اتنے اچھے موسم میں
روٹھنا نہیں اچھا
ہار جیت کی باتیں
کل پہ ہم اٹھا رکھیں
آؤ......
آج دوستی کر لیں

از: ارم کمال، فیصل آباد

دوستی اور زندگی

میں گھر دیر سے آیا تو ابو نے پوچھا۔ ''کہاں تھے بدتمیز؟''

''دوست کے گھر پر تھا۔'' میں نے کہا۔ تو ابو نے میرے سامنے ہی میرے دس دوستوں کو کال کی۔ چار نے کہا۔ ''جی انکل یہاں پر تھا، تین نے کہا ابھی، ابھی نکلا ہے، دو نے کہا۔ انکل! وہ یہاں پر ہی ہے، پڑھ رہا ہے۔ بات کرواؤں کیا؟ ایک نے تو حد ہی کر دی۔ وہ میری آواز میں بولا جی ابو جی کیا ہوا؟''

یہ سن کر ابو بھی ہنس پڑے اور بولے۔

''زندگی میں دوست نہیں، دوستوں میں زندگی ہے۔''

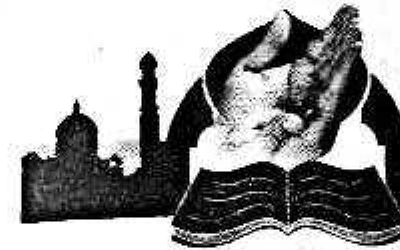
از: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

ساتھ

کچھ ایسا ہو یہ شام ڈھلے
کوئی ہاتھ میں تھامے ہاتھ میرا
کوئی لے کے مجھ کو ساتھ چلے
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں
میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ دھرے
اور پونچھ کے آنسو آنکھوں سے
وہ دھیرے سے یہ بات کہے
یوں تنہا چلنا ٹھیک نہیں
چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

روحانی مشورے



ادارہ

ابلیس اور اس کے لشکر سے حفاظت کی دعا

تاریخ دمشق میں حضرت عروہ بن زبیرؓ کا واقعہ ذکر ہے کہ حضرت عروہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے ہشامؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بننے سے پہلے ایک دفعہ میرے والدِ ماجد حضرت عروہؓ کے پاس آکر کہنے لگے۔ ”کل رات کو میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ میں اپنے گھر کی چھت پر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تبھی میں نے لوگوں کے آنے جانے کی آواز سنی۔ میں نے سمجھا رات کو گشت کرنے والے سرکاری اہلکار ہوں گے۔ میں اٹھا، دیکھا کہ شیاطین گروہ در گروہ آرہے ہیں۔ یہاں تک کہ سب میرے گھر کے پیچھے نشیبی زمین میں آکر جمع ہوئے۔ کچھ دیر بعد ابلیس آیا اور ایک آواز نکالی تو سب گھبرا اٹھے۔

ابلیس نے کہا۔ ”عروہ بن زبیرؓ کے لیے کون تیار ہے؟“

کچھ شیاطین نے کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“ یہ گئے اور واپس آکر کہنے لگے۔

”ہم کسی درجے میں بھی ان پر قابو نہ پاسکے۔“ ابلیس نے پہلے سے زیادہ گرج دار آواز نکالی اور کہا۔

”کون تیار ہے عروہ بن زبیرؓ کے لیے؟“

دوسرے شیاطین نے کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“ یہ بھی گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہنے لگے کہ ”ہم اس پر معمولی قابو بھی نہ پاسکے۔“

ابلیس نے تیسری مرتبہ اتنی زوردار آواز نکالی کہ میں نے سمجھا کہ زمین پھٹ گئی ہے۔ سب گھبرا گئے۔ اس نے کہا۔ ”عروہ بن زبیرؓ کے لیے کون تیار ہے؟“

کچھ شیاطین نے کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“ وہ گئے، کافی دیر بعد واپس آکر کہنے لگے۔ ”ہم اس پر کسی درجے میں بھی قادر نہ ہوسکے۔“ ابلیس سخت غضب ناک ہو کر چلا گیا اور اس کے پیچھے شیاطین کا لشکر بھی چل پڑا۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ نے سارا قصہ سننے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے فرمایا۔

”مجھے میرے والد حضرت زبیر بن العوامؓ نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص دن کے شروع حصے میں اور رات کے شروع حصے میں یہ دعا پڑھ لے گا اللہ تعالیٰ ضرور اس کو ابلیس اور اس کے لشکر سے حفاظت میں رکھے گا۔ دعا یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ ذِی الشَّانِ عَظِیْمِ الْبُرْھَانِ شَدِیْدِ السُّلْطَانِ مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ

(تاریخ مدینۃ دمشق لابن عساکرؒ جلد 4 صفحہ نمبر 268)

شیطان سے حفاظت کی دعا

حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں چاشت کے وقت مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا اچانک میں نے سنا کہ کوئی مجھے یوں سلام کررہا ہے۔ السلام علیک یا ابن الزبیر۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا البتہ میں نے سلام کا جواب دے دیا۔ میرے جسم کے بال خوف کے مارے کھڑے ہوگئے۔ تو کسی کی آواز آئی۔ ”ڈریں نہیں، میں خافیہ کا رہنے والا ہوں۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ کو ایک خبر سناؤں اور آپ سے ایک چیز کے بارے میں سوال کروں۔“ میں نے کہا۔ ”کون سی خبر سنانی ہے اور کیا پوچھنا ہے؟“ کہا۔

”میں نے تین دن سے ابلیس لعنت اللہ کو دیکھا اور اس کی جماعت میں ایک ایسے شیطان کو بھی دیکھا جس کا چہرہ کالا اور آنکھیں سفید تھیں۔ ابلیس روز شام کو

اس سے پوچھتا کہ تم نے اس آدمی پر کیا کام کیا؟ تو وہ شیطان کہتا۔ ”وہ صبح شام جو دعا پڑھتا ہے اس کی وجہ سے میں کچھ نہیں کرپاتا۔ آخر تیسرے دن میں نے اس شیطان سے پوچھا کہ ابلیس روزانہ تم سے کس کے بارے میں پوچھتا ہے؟ تو اس نے کہا۔ ”وہ مجھ سے عروہ بن زبیرؓ کے بارے میں پوچھتا ہے اور اس کو بھٹکانے کا حکم دیتا ہے مگر وہ (عروہ) صبح شام کچھ ایسے کلمات پڑھتے ہیں جن کی وجہ سے میں یہ کام نہیں کرپاتا۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا تاکہ آپ سے معلوم کرلوں کہ آپ صبح شام کیا پڑھتے ہیں تو حضرت عروہؓ نے فرمایا۔

”میں یہ پڑھتا ہوں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَاعْتَصَمْتُ بِہٖ وَکَفَرْتُ بِالطَّاغُوْتِ وَاسْتَمْسَکْتُ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی الَّتِیْ لَاانْفِصَامَ لَھَا وَھُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

صبح کو میں یہ دعا پڑھتا ہوں تو اس شخص نے کہا۔

”اے ابن زبیرؓ! اللہ آپ کو بہترین جزا دے، میں آپ سے بہت مستفید ہوا اور آپ نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا۔“

(تاریخ مدینۃ دمشق لابن عساکر جلد 4 صفحہ 269-268) (المجالسۃ جلد 4 صفحہ 457-456)

شیطان اور مکروہ چیز کو دور کرنے اور مجنون کے افاقہ کے لیے

دارمی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کی ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی چار پہلی آیات، آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری تین آیتیں پڑھے گا اس دن اس کے پاس اس کے اہل وعیال کے قریب نہ شیطان آئے گا اور نہ کوئی بری چیز اس کے پاس آئے گی (یہ آیات) جس مجنون پر پڑھی جائیں گی اسے افاقہ ہوجائے گا۔

24 گھنٹے شیطانی حیلوں سے حفاظت کی دعا

صبح ہوتے ہی یہ دعا پڑھے۔

اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْحَمْدُلِلّٰہِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

ترجمہ: ہم نے اور تمام ملک نے اللہ (کی عبادت واطاعت) کے لیے صبح کی۔ اسی کا سارا ملک ہے اور اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ خود ایسا زندہ ہے جس کے لیے مرنا نہیں ہے اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

فائدہ: حدیث شریف میں اس دعا کے پڑھنے کا بڑا ثواب آیا ہے۔ صبح پڑھے تو رات تک شیطان سے محفوظ رہتا ہے اور شام کو پڑھے تو صبح تک۔

شیطان اور حوادث سے حفاظت

حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد گفتگو سے قبل دس مرتبہ یہ دعا پڑھے گا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی، دس گناہ معاف ہوں گے، دس درجے بلند ہوں گے، دس غلاموں کی آزادی کا ثواب پائے گا۔ شیطان سے اس کی حفاظت ہوگی، مکروہات سے بچا رہے گا۔ شرک کے علاوہ کوئی گناہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

(ابو داؤد ص 296، الدعا ج 2 ص 1123، ابن سنی ص 123)

شیطان اور اس کے وسوسے دور کرنے کی دعا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”تم اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جائے۔ اسی طرح جو چیزیں شیطان کو دور کردیتی ہیں ان میں صبح شام کی دعائیں، گھر میں داخل ہونے اور گھر سے باہر جانے کی دعائیں، مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے باہر نکلنے کی دعائیں اور دیگر تمام دعائیں شامل ہیں جو شریعت مطہرہ سے ثابت ہیں مثلاً سوتے وقت آیت الکرسی، سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں۔



شوابے ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

سفید بال اور لیکوریا

مسز مشل ...... لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً سب بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔ میرا دوسرا مسئلہ لیکوریا ہے۔ یہ تقریباً 10 سال سے ہے۔ میرا پیٹ اسی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں۔ افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ گھمبیر ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔
Borax-30 ،Lycopodium-30،
Calc. carb-30،Pulsatilla-30
ہر دوا کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

وقتِ حیض

نجمہ یوسف، احمد آباد

ایام کے دنوں میں مجھے الٹیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ میری کمر اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ میرے جسم پر بھی سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھیلتے جارہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔
Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں۔ ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔
Ferrum ،Calc. flour-30
،Calc. phos-30 ،met -30
Pulsatilla-30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔



معدے کا مسئلہ

محمد اشفاق، سجاول

میرے معدے کا مسئلہ تقریباً پانچ سال سے ہے۔ یہ بارش کے دنوں میں ہوا تھا۔ میں نے اس کا علاج کرایا ہے۔ کوئی ڈاکٹر کہتا ہے گردے کا مسئلہ ہے اور کوئی کہتا کہ فلاں چیز کا مسئلہ ہے لیکن اس کا کوئی مناسب علاج نہیں ہوا ہے۔ ہم بھی اس کے علاج کی کوشش کرتے رہے اور اب ایک ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کو معدے کا السر ہے۔ ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کیا تھا، میں خط کے ساتھ رپورٹ منسلک کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔ میں ڈاکٹروں سے ناامید ہو چکا ہوں۔ آپ کوئی دوائی تجویز کریں جس کے سائڈ افیکٹ نہ ہوں۔

جواب: محمد اشفاق آپ نے کہانی تو لکھ دی لیکن اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا کیا ہے؟ لہٰذا اپنے حال کی تفصیل بیان کریں۔ الٹرا ساؤنڈ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں کہ دوا آپ کے حال کے مطابق تجویز کی جائے اور قارئین بھی اس کو نوٹ کرلیں۔

جوڑوں کی آوازیں

مسعود، کوٹ اڈو

ڈاکٹر صاحب میرا یہ عارضہ 7 سال سے ہے۔ ایلوپیتھک ڈاکٹرز اس کا حل آپریشن بتاتے ہیں جبکہ میں آپریشن نہیں کرانا چاہتا۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک ...... بدعادت کا شکار رہا ہوں، اب یہ عادت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب ٹانگ ہلاتا تھا تو ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا



تھا۔ ڈاکٹر صاحب اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: جب ہم بالغ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم اور جذبات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ والدین اور بڑے بزرگوں سے شرم و گھبراہٹ کے باعث ہم ان تبدیلیوں کا ذکر ان سے نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم عمر لوگوں سے کرتے ہیں جن کو خود کچھ نہیں پتا ہوتا۔ نتیجتاً غلط معلومات پر گمراہ ہو جاتے ہیں اور غلط عادات میں پڑ کر اپنی زندگی اور صحت خراب کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بہت عام مسئلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو اس جانب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اپنے نوجوان بچوں اور بچیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے رہنمائی کی جائے کہ وہ اس بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔ میڈیا اور پرنٹ میڈیا کو اس جانب غور کرنا چاہیے کہ مختلف اشتہارات جن میں لڑکیوں یا لڑکوں یا دونوں کو جن کپڑوں میں حرکات و سکنات کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور فلمیں، ڈرامے، انگریزی اردو میں ڈب کیے ہوئے بالخصوص انڈین و ترکی کے کہ ایک نوجوان کے دماغ کو کس طرح برانگیختہ Excited کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام ممالک جن کی فلمیں، ڈرامے اور ویب سائٹس بڑے شوق سے دیکھے جاتے ہیں ان میں جرائم کے واقعات اور مختلف جنسی جرائم و بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ سفلس گنوریا کے بعد ایڈز اب کیوں بڑھ گیا ہے؟

علاج: مسعود صاحب قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. phos-30، Staphisagria-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

گردے میں پتھری

حمیرا آصف، گوجرانوالہ

مجھے عرصہ پانچ سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی، علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹرا ساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 3cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی

کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Lycopodium-30، Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis vulg-Ø کے 11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

دور کی نظر

ارم، لاہور

میری دور کی نظر بہت کمزور ہے۔ اکثر سر میں درد رہتا ہے اور کن پٹیوں پر کھنچاؤ رہتا ہے۔ تقریباً ۱۰ سال پہلے میری نظر کمزور ہونا شروع ہوئی تھی اور ہر سال دو سال کے بعد مزید کمزور ہو جاتی ہے۔ ہومیوپیتھی میں کوئی علاج ہے تو تجویز کریں۔

جواب: گاجر، سیب اور بادام کا استعمال ... بڑھائیں۔ پڑھتے وقت روشنی مناسب ہونی چاہیے جو پیچھے سے یا اوپر سے ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کر کے حال بتائیں۔ Phyostigma-30، Calc. phos-30، Calc. fluor-30، Ruta-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

مسوڑھوں سے خون

فائق احمد، منڈی بہاؤالدین

میرے نیچے کے سامنے کے دانتوں سے خون آتا ہے۔ دانتوں پر اندر اور باہر کی طرف مسوڑھوں کے ساتھ کالی کائی سی جم گئی ہے جو بہت بری لگتی



ہے۔ مسوڑھے کمزور ہو گئے ہیں۔ ذرا سی چیز لگنے سے خون نکلنے لگتا ہے۔

جواب: ہر کھانے کے بعد دانتوں کو ایک خاص طریقے سے برش کرنا چاہیے۔ رات کو سونے سے پہلے بھی دانتوں کو خاص طریقے سے برش کرنا چاہیے اور صبح ناشتے کے بعد۔ اولاً ہم برش نہیں کرتے ہر کھانے کے بعد دوم رات کو تو بالکل نہیں کرتے۔ صبح ناشتے سے پہلے کرتے ہیں۔ سوم برش کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔ آپ کے دانتوں پر سے اینمل پالش نکل گئی ہے اور اب دانت خرابی کی آخری حد کو پہنچ چکے ہیں۔ بہرحال اب آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔ Calc.fluor-30، Merc.sol-6، Calendula-30، Fragaria-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ ہر کھانے کے بعد اور رات سونے سے پہلے آدھے گلاس پانی میں 15 قطرے CalendulaØ ڈال کر کلیاں کریں۔

نسوانی حسن

ہانیہ، کراچی

شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ایک بار ابارشن ہو چکا ہے۔ میرے نسوانی حسن میں کمی ہے جو میرے لیے تکلیف اور پریشانی کا باعث ہے۔

جواب: ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ بھی ایک بیماری ہے۔ بیماری کا علاج ہوتا ہے بشرطیکہ ہم باقاعدگی

سے کریں۔ بازاری واشتہاری ادویات بالکل استعمال نہ کریں۔ یقیناً ان کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں جن میں مچھلی ضرور شامل ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Iodium-30، Natr. mur-30 کے 5-5 قطرے اور Alfalfa-Ø کے 11 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

نفسیاتی مسئلہ

زہیر، کراچی

بیماری کے دوران دل گھبراتا ہے۔ دماغ کانپنا شروع کر دیتا ہے۔ گھر سے بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ سونے کی کوشش کرتا ہوں سو نہیں سکتا۔ دماغ میں ہلچل ہوتی ہے۔ اب اس بیماری نے تیسری بار حملہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔ جب درد ہو تو عجیب سی کیفیت ہوتی ہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہوتا ہے۔ تین بچوں کا باپ ہوں اور بیماری کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ مرنے کو دل چاہتا ہے۔

جواب: نمک کا استعمال بند کر دیں۔ پانی 8-10 گلاس روزانہ پئیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ سبزی فروٹ کا استعمال کریں۔ دوپہر کھانے کے بعد بالکل بھی نہ سوئیں۔ صبح و شام باغ کی سیر کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات باقاعدگی کے ساتھ استعمال کریں ایک ماہ تک۔ Belladona-30، Lachesis-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

چہرے کا رنگ و قد

نوشین، لاہور

میری عمر 15 سال ہے لیکن قد چھوٹا ہے۔ خاندان میں بھی زیادہ تر قد چھوٹے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ میرا قد ۴ فٹ ۱۱ انچ ہے۔ مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کریں۔ دوسرا مسئلہ ہے کہ میرا رنگ سانولا ہوتا جا رہا ہے جیسے جیسے میں بڑی ہو رہی ہوں۔

جواب: ماں، باپ اور ان کے والدین کے قد کے حساب سے قد دیکھا جاتا ہے جو کہ آپ نے نہیں لکھا۔ ذہنی دباؤ بھی قد اور رنگ پر اثر ڈالتا ہے۔ پہلے ہارمونز اثر انداز ہوتے ہیں بعد میں دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اچھا ماحول بنائیں، متوازن خوراک، تازہ پھل، سبزیاں، گوشت، دودھ، دالیں وغیرہ لیں۔ جنک فوڈز اور کولڈ ڈرنکس، مصنوعی شربت سے بچیں، لسی، ستو اور تازہ پھلوں کا جوس مفید ہے۔ ورزش کریں، چہل قدمی (واک) سے شروع کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات شروع کرائیں۔ Alfalfa Q کے 7 قطرے تین مرتبہ 1/2 کپ پانی میں لیں۔ Calc Phos 30 , Calc.Flour 30 کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔ 3 ماہ بعد حال بتائیں۔

☆☆☆